زیر نظر استاد محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیر نمونہ

١٥

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی

اہل علم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

زیرِ نظر: اُستادِ محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمونہ

۱۵

ترجمہ
سید صفدر حسین نجفی
پرنسپل جامعۃ المنتظر لاہور

اثرِ نگارش
اہلِ قلم کی ایک جماعت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور، پاکستان

Marfat.com

پیشکش، حوزہ علمیہ جامعۃ المنتظر لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	تفسیر نمونہ جلد ۱۵
زیر نظر	استاد محقق آیۃ اللہ ناصر مکارم شیرازی
مترجم	سید صفدر حسین نجفی، پرنسپل جامعہ المنتظر۔ لاہور
تصحیح و تجدید نظر	ثاقب نقوی و مولانا محمد علی فاضل
کتابت	دار الکتابت ۔حضرت کیلیانوالہ
ناشر	مصباح القرآن ٹرسٹ ۔ ۱۰ گنگارام مینشن شاہراہِ قائداعظم ۔ لاہور
مطبع	معراج دین پرنٹرز لاہور
تاریخ اشاعت	ذیقعدہ ۱۴۰۹ھ
ایڈیشن	اوّل
ہدیہ	۷۵ روپے

ملنے کا پتہ

قرآن سنٹر

۲۴۔ الفضل مارکیٹ، اُردو بازار۔ لاہور

Marfat.com

مدینۃ العلم دار العلوم محمدیہ
طور آباد - تحصیل کڑہ - سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Marfat.com

اللهم صل على محمد وآل محمد وعجل فرجهم

Marfat.com

قارئینِ محترم !

سلام ورحمت

تفسیر نمونہ کی پندرھویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت رمضان المبارک کے پاکیزہ مہینے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس مہینے کو ویسے بھی قرآنِ کریم سے گہری مناسبت ہے ——— ارشادِ الٰہی ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ

رمضان کا مہینہ وہ ہے کہ جس میں قرآن نازل ہوا، وہی قرآن کہ جو انسان کے لیے ہدایت ہے، ہدایت کی روشنیوں کا حامل ہے اور حق و باطل کے مابین امتیاز عطا کرنے والا ہے۔ (بقرہ ——— ۱۸۵)

ہمیں توقع ہے کہ چند جلدوں کی پیہم، مختصر وقفوں سے اشاعت سے آپ کی طرف سے تاخیر کی شکایت نہ رہی ہوگی۔ ہم اس خواہش کا تکرار کرنا چاہتے ہیں کہ اپنی مثبت تنقیدی آراء سے ہمیں ضرور مطلع فرمائیے گا کیونکہ ہم جیسے انسانوں کی عظمت کوتاہیوں کے اعتراف اور خامیوں کی اصلاح ہی میں پنہاں ہے۔

تفسیر نمونہ پندرھویں جلد کی اس اشاعت اوّل میں ہم سے جناب الحاج شیخ ظہیر علی جاوا صاحب مرحوم کے صاحبزادگان نے اپنے والد گرامی اور والدہ گرامی کے ایصالِ ثواب کی غرض سے تعاون فرمایا ہے۔ پروردگارِ عالم ان کے اس تعاونِ خیر کو قبول فرمائے اور ان کے محترم والدین کے درجات میں اضافہ فرمائے۔ بحق محمد و اهل بيته الطاهرين عليه وعليهم الصلٰوة والسلام

والسلام مع الاکرام

مصباح القرآن ٹرسٹ

Marfat.com

اِھداء

"مرکز مطالعاتِ اسلامی و نجاتِ نسلِ جوان"

جو

تمام طبقات میں عموماً اور جوانوں میں خصوصاً اسلام کی حیات بخش
تعلیمات پہنچانے کے لیے قائم کیا گیا ہے
اس نفیس تالیف کو
ان اہلِ مطالعہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے

جو

قرآن مجید کے متعلق بیشتر، بہتر اور عمیق تر معلومات حاصل کرنا
چاہتے ہیں۔

حوزہ علمیہ۔ قم

Marfat.com

یہ تفسیر

حسب ذیل علما و مجتہدین کی باہمی کاوش قلم کا نتیجہ ہے

- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد رضا آشتیانی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد جعفر امامی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید حسن شجاعی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے سید نور اللہ طباطبائی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمود عبد اللہی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محسن قرائتی
- حجۃ الاسلام والمسلمین آقائے محمد محمدی

Marfat.com

چند تفاسیر

جن سے اس تفسیر میں استفادہ کیا گیا ہے

۱۔ تفسیر مجمع البیان	از	مشہور مفسّر علامہ طبرسی
۲۔ تفسیر تبیان	از	دانشمند فقیہ بزرگ شیخ طوسی
۳۔ تفسیر المیزان	از	علامہ طباطبائی
۴۔ تفسیر صافی	از	علامہ محسن فیض کاشانی
۵۔ تفسیر نور الثقلین	از	مرحوم عبد علی بن جمعۃ الحویزی
۶۔ تفسیر بُرہان	از	مرحوم سیّد ہاشم بحرینی
۷۔ تفسیر روح المعانی	از	علامہ شہاب الدین محمود آلوسی
۸۔ تفسیر المنار	از	محمد رشید رضا تقریرات درس تفسیر شیخ محمّد عبدہٗ
۹۔ تفسیر فی ظلال القرآن	از	سیّد قطب مصری
۱۰۔ تفسیر قرطبی	از	محمد بن احمد انصاری قرطبی
۱۱۔ اسباب النزول	از	واحدی (ابوالحسن علی بن مقویہ نیشاپوری)
۱۲۔ تفسیر مراغی	از	احمد مصطفٰی مراغی
۱۳۔ تفسیر مفاتیح الغیب	از	فخر رازی
۱۴۔ تفسیر روح الجنان	از	ابوالفتوح رازی

Marfat.com

اس تفسیر میں مدِنظر اہداف

پوری دُنیا، جس کی نظریں اسلام کی طرف لگی ہیں، چاہتی ہے کہ اسلام کو نئے سرے سے پہچانے۔ یہاں تک کہ خود مسلمان بھی چاہتے ہیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ جن میں سے ایک "ایران کا اسلامی انقلاب" اور "دُنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی تحریکیں" ہیں۔ جنہوں نے تمام لوگوں کے افکار خصوصاً نوجوان نسل کو اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کا پیاسا بنا دیا ہے۔

ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام کی شناخت کے لیے نزدیک ترین راستہ اور مطمئن ترین وسیلہ و ذریعہ عظیم اسلامی کتاب قرآن مجید میں غور و فکر اور اس کا مطالعہ ہے۔

دوسری جانب قرآن مجید جو ایک عظیم اور جامع ترین کتاب ہے، عام کتب کی مانند کسی ایک مسئلہ کی گہرائی پر مشتمل نہیں بلکہ اصطلاح کے مطابق اس میں کئی بطون ہیں اور ہر بطن میں دوسرا بطن مضمر ہے۔

باالفاظ دیگر ہر شخص اپنی فکری گہرائی، فہم و آگہی اور لیاقت کے مطابق قرآن سے استفادہ کرتا ہے اور یہ مسلّم ہے کہ کوئی شخص بھی قرآن کے چشمۂ علم سے محروم نہیں لوٹتا۔

متذکرہ بالا گفتگو کی روشنی میں ایسی تفاسیر کی ضرورت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے جو افکار علماً میں موجود رشتوں کو ایک دوسرے سے منسلک کریں اور محققینِ اسلام کی محنتوں اور حاصل فکر سے استفادہ کر کے لکھی جائیں اور جو مختلف قرآنی اسرار کی گرہیں کھول سکیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسی تفسیر اور کونسا مفسّر...؟ وہ تفسیر، کہ جو کچھ قرآن کہتا ہے اسے واضح کرے، نہ کہ جو کچھ مفسّر چاہے اور پسند کرے اسے پیش کرے۔ اور وہ مفسّر جو اپنے آپ کو قرآن کے سپرد کر دے اور اسی سے درس لے، نہ وہ کہ جو نہ جانتے ہوئے یا جان بُوجھ کر اپنے پہلے سے کیے گئے فیصلوں اور نظریات کے مطابق جستجو کرے اور جو قرآن کا طالب علم بننے کی بجائے اس کا استاد بن جائے۔

البتہ عظیم مفسّرین اور عالی قدر محققین اسلام نے آغازِ اسلام سے آج تک اس سلسلہ میں قابلِ قدر کوششیں کی ہیں اور زحمتیں اٹھائی ہیں، انہوں نے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں میں بہت سی تفسیریں تحریر کی ہیں کہ جن کے پرتو میں اس عظیم اسلامی کتاب کے بعض حیران کن مطالب تک رسائی ہو سکتی ہے (شکر اللہ سعیھم)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ حق طلب اور حقیقت کے متلاشی لوگوں کو

Marfat.com

نئے نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مکاتبِ فکر کے تضادات اور ٹکراؤ کے باعث اور بعض اوقات منافقین و مخالفین کے وسوسوں کی وجہ سے، اور کبھی اس عظیم آسمانی کتاب کی تعلیمات کو ضروریاتِ زمانہ پر منطبق کرنے کے حوالے سے کچھ ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کا جواب موجودہ دَور کی تفاسیر کو دینا ہوگا۔

دوسری جانب تمام تفاسیر کو عوام الناس کے لیے ناقابلِ ادراک گوناگوں اقوال اور پیچیدہ مباحث کا مجموعہ نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس وقت ایسی تفاسیر کی ضرورت ہے جن سے خود قرآن کی طرح تمام طبقے استفادہ کرسکیں (اس کی وسعت اور اہمیت میں کمی کیے بغیر)۔

ان امور کے پیشِ نظر مختلف گروہوں نے ہم سے ایک ایسی تفسیر لکھنے کی خواہش کی جو ان ضروریات کو پورا کرسکے۔ چونکہ یہ کام خاصا مشکل تھا لہٰذا مَیں نے ان تمام فضلاء کو مدد و تعاون کی دعوت دی جو اس طویل اور نشیب و فراز کے حامل سفر میں اچھے ہمقدم اور ساتھی تھے اور ہیں تاکہ مشترکہ مساعی سے یہ مشکل حل ہوسکے۔ الحمد للہ! اس کام کے لیے توفیق شاملِ حال ہوئی اور ایسا ثمر و نتیجہ ملا کہ جس کا ہر طبقہ نے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ اکثر علاقوں کے لوگ مختلف سطحوں پر اس تفسیر کی طرف متوجہ ہوئے اور اس کی جلدیں جو اس وقت تک منظرِ عام پر آچکی ہیں (اور یہ اس کی ویں جلد ہے) بارہا چھپیں اور تقسیم ہوئیں۔ اس توفیقِ الٰہی کا مَیں از حد شکر گزار ہوں۔

یہاں یہ بات مَیں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس جلد کے مقدمہ میں اپنے قارئین کی توجہ چند نکات کی طرف مبذول کراؤں۔

۱۔ بارہا یہ سوال ہوتا ہے کہ مجموعاً یہ تفسیر کتنی جلدوں پر مشتمل ہوگی؟ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ظاہراً بیس جلدوں سے کم اور چوبیس جلدوں سے زیادہ نہ ہوگی[1]۔

۲۔ اکثر یہ شکوہ بھی کیا جاتا ہے کہ تفسیر کی جلدیں تاخیر سے کیوں شائع ہوتی ہیں؟ عرضِ خدمت ہے کہ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کام جلد از جلد ہو۔ یہاں تک کہ سفر و حضر میں، بعض اوقات جلاوطنی[2] کے مقام پر، حتیٰ کہ بسترِ بیماری پر بھی مَیں نے یہ کام جاری رکھا ہے۔

چونکہ مباحث کے نظم و نسق اور عمق و گہرائی کو جلد بازی پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس طرح سے کام کرنا چاہیئے کہ ان دونوں کے درمیان فاصلہ سمٹتا جائے۔ دوسری جانب طباعت و اشاعت کی مشکلات (خصوصاً جنگ کے زمانے میں) کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو تاخیر کے اہم عوامل میں سے ایک ہے۔

۳۔ بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر یہ تفسیر مختلف افراد کے قلم سے تحریر ہو رہی ہے تو

---

[1] بعد ازاں تعداد ۲۷ تک جا پہنچی۔ (مترجم)

[2] سابق شاہ ایران معدوم کے دَور میں مؤلف کو جلاوطنی کا سامنا کرنا پڑا۔ (مترجم)

Marfat.com

اس میں ہم آہنگی نہیں ہو گی۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ ابتدا میں معاملہ اسی طرح تھا۔ لیکن پھر اس صورتِ حال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ تفسیر میں قلم ہر جگہ میرا ہی ہو اور دوسرے دوست صرف مطالب کی جمع آوری میں مدد کریں۔ ان حضرات میں سے بھی ہر ایک اپنے کام کو پہلے انفرادی طور پر سرانجام دیتے ہیں اور ضروری یادداشتیں جمع کرتے ہیں۔ بعد میں اجتماعی نشستوں میں ضروری ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے تاکہ مختلف مباحث، گوناگوں مسائل اور تفسیر کی روانی میں بے ربطی پیدا نہ ہو اور ساری تفسیر ایک ہی طرز و روش پر ہو۔

انشاء اللہ امید ہے اس تفسیر سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کے لیے اس کا نہ صرف عربی بلکہ دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا جائے گا تاکہ اور لوگ بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔
(یہ تجویز قارئین محترم کی جانب سے بھی آئی ہے)۔

خداوندا!

ہماری آنکھوں کو بینا، کانوں کو شنوا اور ہماری فکر کو صائب، کارساز اور ارتقائی فرما تاکہ تیری کتاب کی تعلیمات کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں اور اپنے اور دوسروں کے لیے روشن چراغ فراہم کر سکیں۔

خداوندا!

جو آگ ہمارے انقلاب کے دشمنوں نے خصوصاً اور دشمنانِ اسلام نے عموماً ہمارے خلاف لگا رکھی ہے اور جس کی وجہ سے ہماری توجہ مسلسل ان کی طرف بٹی ہے، اس امتِ اسلامی کے مسلسل جہاد اور انتھک سعی و کوششوں کے نتیجہ میں اسے خاموش کر دے تاکہ ایک ہی جگہ تجھ سے دل لگا لیں اور تیرے راستے اور تیرے مستضعف بندگان کی خدمت کے لیے قدم اٹھائیں۔

بارالہا!

ہمیں توفیق اور زندگی عطا فرما کہ اس تفسیر کو مکمل کر سکیں۔ اس ناچیز و حقیر خدمت کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں اور یکجا و مجموعہ تیری بارگاہ میں پیش کر سکیں۔

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

ناصر مکارم شیرازی
حوزہ علمیہ قم۔ ایران

Marfat.com

تفسیر نمونہ جلد ۱۵

فہرست مضامین

مضامین	صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
سورۂ فرقان	۲۵	تمام پیغمبر ایسے تھے	۶۱
سورۂ فرقان کے مضامین	۲۷	ایک سوال اور اس کا جواب	۶۲
سورۂ فرقان کی فضیلت	۲۸	آیت ۲۱ تا ۲۴	۶۳
آیت ۱ تا ۲	۲۹	بہت بڑے دعوے	۶۳
موجوداتِ عالم کا صحیح اندازہ	۳۲	اعمال صالح کی تباہی	۶۴
آیت ۳ تا ۶	۳۶	آیت ۲۵ تا ۲۶	۷۰
طرح طرح کی تہمتیں	۳۷	آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا	۷۰
آیت ۷ تا ۱۰	۴۲	آیت ۲۷ تا ۲۹	۷۴
شانِ نزول	۴۲	شانِ نزول	۷۴
خزانے اور باغات کیوں نہیں ؟	۴۳	بُرے دوست نے گمراہ کیا	۷۵
آیت ۱۱ تا ۱۶	۴۹	دوستی کا اثر	۷۷
بہشت اور دوزخ کا موازنہ	۴۹	آیت ۳۰ تا ۳۴	۷۹
چند ایک نکات	۵۲	خداوندا ! لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا	۸۰
آیت ۱۷ تا ۱۹	۵۵	چند اہم نکات	۸۲
چند ایک نکات	۵۷	۱۔ "جعلنا لکل نبی عدوًا" کی تفسیر	۸۲
۱۔ معبود سے کیا مراد ہے ؟	۵۷	۲۔ قرآن کا تدریجی نزول کیوں ؟	۸۳
۲۔ توحید سے انحراف کیوں ؟	۵۸	۳۔ ترتیل قرآن کا معنیٰ	۸۵
۳۔ "بور" کیا ہے ؟	۵۹	۴۔ "یحشرون علی وجوھھم" کی تفسیر	۸۶
آیت ۲۰	۶۰	آیت ۳۵ تا ۴۰	۸۷
شانِ نزول	۶۰	درسِ عبرت سے لاپروائی	۸۸

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
چند اہم نکات	۹۰
۱۔ "اصحاب الرس" کون ہیں؟	۹۰
۲۔ کچھ لرزا دینے والے درس	۹۳
آیت ۴۱ تا ۴۴	۹۴
جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ	۹۴
چند نکات	۹۸
۱۔ ہوس پرستی اور اس کا دردناک انجام	۹۸
۲۔ جانوروں سے بڑھ کر گمراہ کیوں؟	۱۰۱
آیت ۴۵ تا ۵۰	۱۰۲
سائے کی حرکت	۱۰۴
چند اہم نکات	۱۰۹
۱۔ بہت سے چوپائے اور انسان	۱۰۹
۲۔ "نسقیہ" کا مفہوم	۱۰۹
۳۔ پہلے زمینوں کا ذکر	۱۰۹
۴۔ پانی کا پہلا فائدہ	۱۱۰
آیت ۵۱ تا ۵۵	۱۱۱
دو مختلف سمندر ساتھ ساتھ	۱۱۲
چند اہم نکات	۱۱۷
۱۔ صرف ایک قیادت	۱۱۷
۲۔ قرآن ـــــ ذریعہ جہاد ہے	۱۱۸
آیت ۵۶ تا ۵۹	۱۲۰
میری اُجرت تمہاری ہدایت ہے	۱۲۰
چند اہم نکات	۱۲۳
۱۔ اجر رسالت	۱۲۳
۲۔ کس پر بھروسہ کرنا چاہیے	۱۲۵
آیت ۶۰ تا ۶۲	۱۲۶
آسمانی برج	۱۲۶
آیت ۶۳ تا ۶۷	۱۳۱
خدا کے خاص بندوں کی صفات	۱۳۳
چند ایک نکات	۱۳۶
۱۔ مومنین کی رفتار	۱۳۶
۲۔ بخل اور فضول خرچی	۱۳۷
آیت ۶۸ تا ۷۱	۱۳۸
"عباد الرحمٰن" کی کچھ اور صفات	۱۳۸
سیئات کی حسنات میں تبدیلی	۱۴۲
آیت ۷۲ تا ۷۶	۱۴۴
عباد الرحمٰن کی جزا	۱۴۵
آیت ۷۷	۱۵۱
دعا کی اہمیت	۱۵۱
ایک نکتہ	۱۵۲
دعا خودسازی اور خداشناسی کا راستہ	۱۵۲
سورۂ شعراء	۱۵۷
سورۂ شعراء کے مندرجات	۱۵۸
سورۂ شعراء کی فضیلت	۱۵۹
آیت ۱ تا ۶	۱۶۰
وہ ہر نئی چیز سے خوف کھاتے ہیں	۱۶۱
چند ایک نکات	۱۶۴
۱۔ ایمان آزادی کے ساتھ ہی سودمند ہوتا ہے	۱۶۴
۲۔ کلام اللہ حادث ہے یا قدیم	۱۶۵
آیت ۷ تا ۹	۱۶۶

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
نباتات میں زوجیت	۱۶۶
آیت ۱۰ تا ۱۵	۱۶۹
حضرت موسیٰؑ کی رسالت کا آغاز	۱۷۰
آیت ۱۶ تا ۲۲	۱۷۴
فرعون سے معرکۃ الآرا مقابلہ	۱۷۵
آیت ۲۳ تا ۲۹	۱۸۰
دیوانگی کی تہمت اور قید کی دھمکی	۱۸۱
آیت ۳۰ تا ۳۷	۱۸۴
تمہارا ملک خطرے میں ہے	۱۸۵
آیت ۳۸ تا ۴۲	۱۸۹
ہر طرف سے جادوگر پہنچ گئے	۱۸۹
آیت ۴۳ تا ۵۱	۱۹۲
جادوگروں کے دلوں میں نورِ ایمان چمک اُٹھا	۱۹۲
آیت ۵۲ تا ۵۹	۱۹۹
ہم نے انھیں باہر نکال دیا	۲۰۰
چند ایک نکات	۲۰۲
۱۔ آیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی ہے؟	۲۰۲
۲۔ آیات کی ترتیب	۲۰۳
آیت ۶۰ تا ۶۸	۲۰۴
فرعون والوں کا دردناک انجام	۲۰۵
چند ایک نکات	۲۰۸
۱۔ بنی اسرائیل کی گزرگاہ	۲۰۸
۲۔ بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونوں کی غرقابی	۲۰۹
۳۔ قدرت کے باوجود رحیم ہے	۲۱۰
آیت ۶۹ تا ۸۲	۲۱۱

مضامین	صفحہ نمبر
میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں	۲۱۲
آیت ۸۳ تا ۸۷ حضرت ابراہیم کی اہم دعائیں	۲۱۷
آیت ۸۸ تا ۱۰۴ معبودوں اور گمراہ عابدوں کا جھگڑا	۲۲۱، ۲۲۳
چند ایک نکات	۲۲۶
۱۔ "قلب سلیم" ہی نجات کا راستہ ہے	۲۲۶
۲۔ آیت "فکبکبوا .... کا مفہوم	۲۲۹
۳۔ آیت "فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم" کا مفہوم	۲۲۹
آیت ۱۰۵ تا ۱۱۵	۲۳۱
نوحؑ کے گرد افراد	۲۳۲
آیت ۱۱۶ تا ۱۲۲	۲۳۶
نوحؑ نجات پاگئے اور مشرک غرق ہوگئے	۲۳۶
آیت ۱۲۳ تا ۱۲۵	۲۳۹
قوم عاد کے جرائم اور بے راہروی	۲۴۰
آیت ۱۲۶ تا ۱۴۰	۲۴۶
نصیحت ہم پر اثر نہیں کرتی	۲۴۶
آیت ۱۴۱ تا ۱۵۲	۲۴۸
مسرفین کی اطاعت نہ کرو	۲۴۹
اسراف اور فساد فی الارض کا باہمی رابطہ	۲۵۱
آیت ۱۵۳ تا ۱۵۹	۲۵۳
قوم صالح کی ہٹ دھرمی	۲۵۴
آیت ۱۶۰ تا ۱۶۶	۲۵۷
بے حیا قوم	۲۵۸
چند اہم نکات	۲۵۹
۱۔ لواطت ایک شرمناک فعل ہے۔	۲۵۹

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
۲۔ لواطت کے خطرناک نتائج	۲۶۰
آیت ۱۶۷ تا ۱۷۵	۲۶۲
قوم لوطؑ کا انجام	۲۶۳
آیت ۱۷۶ تا ۱۸۴	۲۶۷
شعیبؑ اور اہلِ ایکہ	۲۶۸
آیت ۱۸۵ تا ۱۹۱	۲۷۲
اس سرکش قوم کا انجام	۲۷۳
چند اہم نکات	۲۷۵
۱۔ انبیاء کی دعوت میں مکمل ہم آہنگی	۲۷۵
۲۔ سب کی دعوت کا آغاز تقویٰ ہے	۲۷۶
۳۔ شرک سب برائیوں کی بنیاد ہے	۲۷۶
آیت ۱۹۲ تا ۱۹۷	۲۷۸
گزشتہ کتابوں میں قرآن کی عظمت	۲۷۸
آیت ۱۹۸ تا ۲۰۳	۲۸۱
اگر قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا تو......	۲۸۱
چند ایک نکات	۲۸۲
۱۔ قومی اور قبائلی تعصبات	۲۸۲
۲۔ دنیا کی طرف لوٹ جانے کی درخواست	۲۸۶
آیت ۲۰۴ تا ۲۱۲	۲۸۸
قرآن پاک پر ایک اور تہمت	۲۸۹
آیت ۲۱۳ تا ۲۲۰	۲۹۲
قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت	۲۹۳
چند ایک نکات	۲۹۵
۱۔ "تقلبک فی الساجدین" کی تفسیر	۲۹۵
۲۔ دعوتِ ذوالعشیرہ	۲۹۷

مضامین	صفحہ نمبر
آیت ۲۲۱ تا ۲۲۷	۲۹۹
رسولِ اکرمؐ شاعر نہیں ہیں	۳۰۰
چند اہم نکات	۳۰۳
۱۔ پیغمبر پر شاعری کی تہمت کیوں؟	۳۰۳
۲۔ اسلام میں شعر و شاعری کا مقام	۳۰۴
۳۔ ذکرِ خدا	۳۰۸
سورۂ نمل	۳۰۹
سورۂ نمل کے مضامین	۳۱۱
سورۂ نمل کی فضیلت	۳۱۲
آیت ۱ تا ۶ قرآن ایک حکیم دانا کی طرف سے ہے	۳۱۳، ۳۱۴
حق بینی اور ایمان	۳۱۷
آیت ۷ تا ۱۴	۳۱۹
موسیٰ آگ کے شعلے کی امید لے کر آئے	۳۲۰
آیت ۱۵ تا ۱۶	۳۲۷
داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حکومت	۳۲۷
چند اہم نکات	۳۳۱
۱۔ دین اور سیاست ۲۔ نظامِ حکومتِ الٰہیہ	۳۳۱، ۳۳۲
۳۔ پرندوں کی بولی ۴۔ "لا نورث" حدیث	۳۳۳، ۳۳۴
آیت ۱۷ تا ۱۹ حضرت سلیمانؑ وادیٔ نمل میں	۳۴۰
چند اہم نکات	۳۴۲
۱۔ جناب سلیمانؑ کا جانوروں کی بولی جاننا	۳۴۳
۲۔ حضرت سلیمانؑ اور شکرِ الٰہی	۳۴۴
۳۔ حضرت سلیمانؑ اور عملِ صالح	۳۴۵
آیت ۲۰ تا ۲۶ ہدہد اور ملکہ سبا کی داستان	۳۴۶، ۳۴۷
چند اہم نکات	۳۵۱

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر
چند سبق آموز باتیں	۲۵۱
چند سوال اور ان کے جواب	۲۵۲
آیت ۲۷ تا ۳۵	۲۵۳
بادشاہ تباہیاں لاتے ہیں	۲۵۴
چند ایک نکات	۲۵۸
۱۔ نامہ نگاری کے آداب	۲۵۸
۲۔ آیا سلیمانؑ نے اپنی پیروی کی دعوت دی	۲۶۰
۳۔ اس داستان کے اہم اشارے	۲۶۰
۴۔ بادشاہوں کی علامت	۲۶۱
آیت ۳۶، ۳۷	۲۶۲
مجھے مال کے ذریعے نہ ورغلاؤ	۲۶۲
چند ایک نکات	۲۶۴
۱۔ زہد مادی وسائل سے استفادہ نہ کرنے کا نام نہیں	۲۶۴
۲۔ کچھ سبق آموز باتیں	۲۶۴
آیت ۳۸ تا ۴۰	۲۶۶
پلک جھپکتے ہی تخت موجود	۲۶۷
چند ایک نکات	۲۷۰
۱۔ چند سوال اور ان کے جواب	۲۷۰
۲۔ دو اہم چیزیں طاقت اور امانت	۲۷۱
۳۔ "علم من الکتاب" اور "علم الکتاب" میں فرق	۲۷۱
۴۔ "ھٰذا من فضل ربی"	۲۷۲
۵۔ تخت کو کیسے حاضر کردیا؟	۲۷۳
آیت ۴۱ تا ۴۴	۲۷۴
ملکہ سبا کے دل میں نور ایمان	۲۷۵
چند اہم نکات	۲۷۹
۱۔ ملکہ سباء کا انجام	۲۷۹
۲۔ سلیمانؑ کی داستان کا خلاصہ	۲۷۹
آیت ۴۵ تا ۴۷	۲۸۱
حضرت صالحؑ اپنی قوم کے سامنے	۲۸۱
ایک نکتہ	۲۸۴
"فال" اور "تطیّر"	۲۸۴
آیت ۴۸ تا ۵۳	۲۸۶
نو مفسد ٹولوں کی سازش	۲۸۷
چند اہم نکات	۲۸۹
۱۔ قوم ثمود کو کیا سزا ملی؟	۲۸۹
۲۔ بچ جانے والے	۲۹۰
۳۔ "خاویۃ" کا مفہوم	۲۹۰
۴۔ ظلم کا نتیجہ	۲۹۰
۵۔ قوم ثمود کو سزا کب ملی؟	۲۹۰
آیت ۵۴، ۵۵	۲۹۲
قوم لوط کی بے راہروی	۲۹۲
آیت ۵۶ تا ۵۹	۲۹۴
جہاں پاک دامنی عیب بن جاتی ہے	۲۹۴
آیت ۶۰ تا ۶۴	۲۹۹
یہ دلائل اور پھر بھی شرک	۳۰۰
چند اہم نکات	۳۰۶
۱۔ مضطر کون ہے؟	۳۰۶

Marfat.com

مضامین	صفحہ نمبر	مضامین	صفحہ نمبر
۲۔ ہر جگہ منطقی دلائل کی دعوت	۴۰۷	آیت ۸۲ تا ۸۵	۴۲۶
۳۔ گزشتہ آیات کا خلاصہ	۴۰۸	چند ایک نکات	۴۲۹
آیت ۶۵ تا ۶۸	۴۰۹	۱۔ "دابۃ الارض" سے کیا مراد ہے	۴۲۹
آیت ۶۹ تا ۷۵	۴۱۳	۲۔ "رجعت" کتاب و سنت کی روشنی میں	۴۳۲
ان کی سازشوں سے نہ گھبرائیں	۴۱۴	۳۔ رجعت کا فلسفہ	۴۳۶
ایک نکتہ	۴۱۷	۴۔ رجعت اور ارادے کی آزادی	۴۳۷
آیت ۷۶ تا ۸۱	۴۱۹	۵۔ عقیدہ رجعت اسلام کی بنیادی شرائط میں سے نہیں	۴۳۷
اندھے اور بہرے آپ کی بات نہیں مانیں گے	۴۲۰	آیت ۸۶ تا ۸۸	۴۳۹
چند ایک نکات	۴۲۲	زمین کی حرکت ـــــ قرآن کا سائنسی معجزہ	۴۳۹
۱۔ توکل کے اسباب	۴۲۳	آیت ۸۹ تا ۹۲	۴۴۵
۲۔ موت اور حیات قرآن کی رو سے	۴۲۳	رسول اللہ کی ذمہ داری	۴۴۶

Marfat.com

سورۂ فرقان

______ مکّہ میں نازل ہوئی

______ اس میں ۷۷ آیتیں ہیں

Marfat.com

سورۂ فرقان کے مضامین

یہ سورت مکّی ہے[1] لہٰذا اس کی زیادہ تر بحث مبداء و معاد اور پیغمبرِ اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی نبوّت کے بارے میں ہے اس کے علاوہ یہ شرک و مشرکین کے ساتھ نبرد آزمائی کرتی ہے اور کفر و بُت پرستی اور گناہوں کے خطرناک انجام سے ڈراتی ہے۔

یہ سورت درحقیقت تین حصّوں پر مشتمل ہے۔

پہلا حِصّہ جو اس کے آغاز پر مشتمل ہے مشرکین کے دلائل کی سختی کے ساتھ سرکوبی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی حیلہ سازیوں کو بیان کرتا اور پھر ان کا جواب بھی دیتا ہے اور انھیں خدا کے عذاب، قیامت کے حساب و کتاب اور جہنم کی دردناک سزا سے ڈراتا ہے اور اس کے بعد گزشتہ اقوام کی سرگزشت کو بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ انبیاء کی دعوت کی مخالفت کر کے زبردست عذاب اور بلامیں گرفتار ہوئے اور ان کی داستانیں، حق کے دشمن اور ہٹ دھرم مشرکین کے لیے کس طرح درسِ عبرت ہیں۔

دوسرے حِصّے میں مندرجہ بالا مباحث کی تکمیل کی صورت میں توحید کے کچھ دلائل اور عالمِ آفرینش میں عظمتِ خداوندی کی نشانیاں بیان کی گئی ہیں۔ ان نشانیوں میں سورج کی روشنی، رات کی تاریکی، ہواؤں کا چلنا، بارش کا برسنا، مُردہ زمینوں کا زندہ ہونا، زمین اور آسمانوں کا چھ دوروں میں پیدا ہونا، سورج اور چاند کی خلقت، ان کی آسمانی بُرجوں میں منظم گردش اور اس قسم کی دوسری چیزیں شامل ہیں درحقیقت پہلا حصّہ " لَآ اِلٰـهَ " اور دوسرا " اِلَّا اللّٰه " کے مفہوم کو واضح کرتا ہے۔

تیسرے حِصّے میں عباد الرحمٰن خدا کے خاص بندوں اور سچے مومنین کے اوصافِ حمیدہ کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے اور پہلے حصّے میں ذکر شدہ متعصّب، بہانہ جو اور گناہوں سے آلودہ کفار کے ساتھ ان کا موازنہ کیا گیا اور دونوں گروہوں کے مقام اور انجام کو ایک دوسرے سے جُدا کر کے نمایاں کیا گیا ہے۔ نیز جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا کہ مومنین کی یہ صفات ان کے اعتقادات، عملِ صالح، خواہشاتِ نفسانی کے خلاف ان کے جہاد، ان کے علم و آگہی اور اجتماعی حوالے سے ان کے احساسِ ذمّہ داری کا مجموعہ ہیں۔

اس سورہ کا نام " فرقان " اس لیے رکھا گیا ہے کیونکہ یہ نام اسی سُورت کی پہلی آیت میں ذکر ہوا ہے۔ جس کا معنی ہے حق کو باطل سے جُدا کرنے والا۔

---

[1] بعض مفسرین کا اصرار ہے کہ اس سورت کی تین آیتیں (۶۸ تا ۷۰) مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں شاید اس لیے کہ ان میں قتلِ نفس اور زنا کی حرمت جیسے احکام کا تذکرہ ہے لیکن اگر ان کے سیاق و سباق پر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ خدا کے خاص بندوں (عباد الرحمٰن) اور ان کی صفات کے ایک سلسلۂ بیان سے متصل اور متعلق ہیں۔ لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ یہ ساری سُورت مکہ میں نازل ہوئی۔

Marfat.com

سورۂ فرقان کی فضیلت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

من قرء سورة الفرقان بعث یوم القیامة و هو مؤمن ان الساعة اٰتیة لا ریب فیها، و ان الله یبعث من فی القبور

جو شخص سورہ فرقان کی تلاوت کرے (اس کے مضامین میں غور وفکر کرے اور اعتقاد وعمل میں اس سے ہدایت لے) تو وہ قیامت کے دن قیامت پر ایمان رکھنے والوں کی صف میں ہوگا اور اس کا حشر ونشر ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جنھیں یقین ہے کہ قیامت آکر رہے گی اور خدا مُردوں کو نئی زندگی کے ساتھ مبعوث کرے گا۔[1]

ایک اور حدیث میں "اسحاق بن عمار" نے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے روایت کی ہے:

لا تدع قرائة سورة تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده فان من قرأها فی کل لیلة لم یعذبه ابداً ولم یحاسبه و کان منزله فی الفردوس الاعلیٰ۔

سورہ تبارک الذی (فرقان) کی تلاوت ترک نہ کرو کیونکہ جو شخص ہر رات اس کی تلاوت کرے گا خداوندِ عالم ہرگز اسے عذاب نہیں دے گا اور نہ ہی اس سے حساب لے گا اور اس کی قیام گاہ بہشت بریں ہوگی۔[2]

جیسا کہ آگے چل کر اس سورہ کی تفسیر سے معلوم ہوگا کہ خدا کے خالص بندوں کی صفات کی اس طرح تشریح کی گئی ہے کہ جو شخص صدقِ دل کے ساتھ اسے پڑھے اور اپنی سیرت وکردار کو اس کے مندرجات کے مطابق ڈھال لے تو اس کا ٹھکانا یقیناً بہشت ہی میں ہوگا جس کا نام "فردوسِ اعلیٰ" ہے۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ضمن میں۔

[2] ثواب الاعمال صدوقؒ منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ تَبٰرَكَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِهٖ لِیَكُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۙ

۲۔ الَّذِیۡ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ شَرِیۡكٌ
فِی الۡمُلۡكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقۡدِیۡرًا

ترجمہ

۱۔ لازوال اور بابرکت ہے وہ ذات جس نے قرآن اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ وہ عالمین کو ڈرائے (اور انھیں عذاب الٰہی کی تہدید کرے)

۲۔ وہ خدا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حکومت اور مالکیت اسی کی ہے اور اس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا اور حکومت و مالکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں اس نے سب چیزوں کو پیدا کیا ہے اور ہر ایک کا صحیح صحیح اندازہ لگایا ہے۔

تفسیر

معرفت کا بہترین معیار

یہ سورت "تبارک" کے مبارک کلمہ سے شروع ہوئی ہے جس کا مادہ برکت ہے اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ کسی چیز کے بابرکت ہونے کا معنیٰ یہ ہوتا ہے کہ اس میں دوام و پائیداری، خیر اور ہر طرح سے نفع پایا جاتا ہے۔

فرمایا گیا ہے: بابرکت اور لازوال ہے وہ خدا جس نے "فرقان" کو اپنے بندے پر نازل کیا ہے تاکہ وہ تمام جہان والوں کو ڈرائے (تبارك الذی نزل الفرقان علی عبده لیکون للعالمین نذیرا)[۱]۔

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پروردگارِ عالم کے مبارک ہونے کی تعریف "فرقان" کے ذریعہ بیان کی گئی ہے یعنی وہ قرآن جو حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے والا ہے اور یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سب سے برتر خیر و برکت یہ ہے کہ انسان کے پاس حق و باطل میں امتیاز کا وسیلہ ہو۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ "فرقان" کا معنیٰ کبھی "قرآن" ہوتا ہے اور کبھی وہ معجزات جو حق اور باطل میں امتیاز پیدا کرتے تھے

۱۔ تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں سورہ اعراف کی آیت نمبر ۹۶ کے ذیل میں "برکت" کا مفہوم ذکر کیا گیا ہے۔

Marfat.com

کبھی یہ لفظ "تورات" کے معنیٰ میں بھی آیا ہے لیکن اس آیت میں اور بعد کی دوسری آیات میں لفظ "فرقان" سے مراد "قرآن" ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ "قرآن" اور "فرقان" میں کیا فرق ہے تو آپؑ نے ارشاد فرمایا:

قرآن اس آسمانی کتاب کے مجموعے کا نام ہے اور فرقان آیات محکمات کی طرف اشارہ ہے[1]

آپ کے اس فرمان میں اور تمام قرآنی آیات کے "فرقان" ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات محکمات حق اور باطل میں تمیز کرنے کے حوالے سے فرقان کا روشن ترین، آشکارترین اور واضح ترین مصداق شمار ہوتی ہیں۔

فرقان اور شناخت کی نعمت اتنی اہم ہے کہ قرآن مجید نے اسے متقی اور پرہیزگار لوگوں کے لیے بہت بڑے اجر کے عنوان سے ذکر فرمایا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:

یا ایها الذین اٰمنوا ان تتقوا الله یجعل لکم فرقانًا

اے ایمان والو! اگر تقویٰ اختیار کرو گے تو خداوند عالم تمھیں فرقان عطا فرمائے گا۔[2]

یقیناً تقویٰ کے بغیر حق اور باطل میں امتیاز کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ محبت و نفرت اور گناہ حق کے چہرے پر ضخیم پردے ڈال دیتے ہیں اور انسان کے ادراک و نگاہ کو اندھا کر دیتے ہیں۔

بہرحال قرآن مجید تمام فرقانوں کا فرقان ہے۔

انسان کے تمام نظامِ زندگی میں حق اور باطل کی پہچان کا بہترین وسیلہ ہے۔

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حق و باطل میں تمیز کا ذریعہ اور افکار و عقائد، قوانین و احکام اور اخلاق و آداب کے سلسلے میں ایک بہترین معیار اور بہترین کسوٹی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ فرمایا گیا ہے: "اس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا"۔ جی ہاں مقام عبودیت اور خالص بندگی ہی وہ چیزیں ہیں جو فرقان کے نزول کی لیاقت اور حق و باطل کی پہچان کے معیار کو وجود بخشتی ہیں۔

آیت کے آخر میں وہ آخری نکتہ پیش کیا گیا ہے جو فرقان کا اصل مقصد اور اس کا منتہائے مقصود ہے اور وہ ہے عالمین کا انذار کہ جس کا نتیجہ انسان میں ذمہ داری کے احساس کا ابھرنا ہے۔ "للعالمین" کی تعبیر اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے جو کسی خاص علاقے، قوم اور قبیلے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کلمہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت پر بھی دلیل قائم کی ہے۔ کیونکہ "عالمین" نہ صرف یہ کہ مکانی لحاظ سے محدود نہیں ہے بلکہ زمانی لحاظ سے بھی کسی قید و شرط کا پابند نہیں ہے اور تمام آنے والے ادوار اور افراد اس میں شامل ہیں (غور کیجئے گا)۔

دوسری آیت میں فرقان کے نازل کرنے والے خدا کی چار صفات بیان کی گئی ہیں ان میں درحقیقت ایک تو اصل اور جڑ ہے

---

[1] تفسیر برہان جلد ۳ ص ۱۵۵

[2] سورۂ انفال آیہ ۲۹

Marfat.com

اور باقی تین اس کی شاخیں ہیں ۔

پہلے تو کہتا ہے : وہ خدا ایسا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی مالکیت اور حکومت صرف اسی کے لیے ہے (الذی له ملك السماوات والارض)[1]

یقیناً وہی تو تمام عالمِ ہستی اور زمین و آسمان کا حاکم ہے ۔ اس کی قلمرو حکومت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے ۔ آیت میں مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "له" کو "ملك السماوات ....." پر اس لیے مقدم کیا گیا ہے کیونکہ عربی ادب کے مطابق یہ صورت "حصر" پر دلالت کرتی ہے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی واقعی اور حقیقی حکومت اور فرمانروائی صرف اور صرف اس کی ذات میں منحصر ہے کیونکہ اس کی حکومت کلی جاودانی اور حقیقی ہے بلکہ اس کے غیر کی حکومت کہ جو محدود اور ناپائیدار ہوتی ہے پھر بھی خدا ہی سے وابستہ ہوتی ہے ۔

پھر یکے بعد دیگرے مشرکین کے عقائد کی نفی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے ۔ وہ خدا جس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا: (ولم یتخذ ولدًا)[2]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں اصولی طور پر بیٹے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ کام کاج میں اس کی طاقت سے فائدہ اٹھایا جائے یا کمزوری، بڑھاپے اور ناتوانی کے دنوں میں اس سے امداد لی جائے یا تنہائی میں اسے اپنا انیس و جلیس بنایا جائے ۔ ظاہر ہے کہ خدا کی پاک ذات کو ان تینوں میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں ہے ۔

اس طرح سے نصاریٰ کے عقیدے کی نفی ہوتی ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا جانتے ہیں اور یہود کے عقیدے کی بھی نفی ہوتی ہے کیونکہ وہ جناب عزیر علیہ السلام کو خدا کا فرزند جانتے ہیں ۔ اسی طرح مشرکین عرب کے عقیدے کی بھی نفی ہو جاتی ہے ۔

پھر فرمایا گیا ہے : عالمِ ہستی پر مالکیت اور حاکمیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے (ولم یکن له شریك فی الملك)۔

مشرکین عرب خدا کے لیے ایک یا کئی شریکوں کا عقیدہ رکھتے تھے انھیں عبادت میں بھی خدا کا شریک گردانتے تھے، شفاعت میں ان سے متوسل ہوتے تھے اور اپنی حاجات میں ان سے مدد طلب کرتے تھے یہاں تک کہ حج کے موقع پر لبیک کہتے وقت بڑی صراحت کے ساتھ درج ذیل جملہ اور اس قسم کے دوسرے مشرکانہ جملے زبان پر جاری کرتے تھے ۔

"لبیك لا شریك لك، الا شریکًا هو لك، تملکه وما ملك"

ہم نے تیری دعوت کو قبول کیا اے خدا ! جو سوائے ایک شریک کے کوئی اور شریک نہیں رکھتا اور وہ شریک بھی اپنے تمام مملوک سمیت تیری ملکیت میں ہے ۔

---

[1] لفظ "ملک" (بروزن "گرگ") کے بارے میں "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی چیز اختیار میں لینے اور اس پر حاکمیت کے معنی میں ہے جبکہ "مِلک" (بروزن "سلک") ہمیشہ اور ہر موقع پر حاکمیت اور مالکانہ تصرف کی دلیل نہیں ہے گویا ہر مُلک، مِلک ہے لیکن ہر مِلک، مُلک نہیں ہے ۔

[2] بیٹے کی نفی کے بارے میں دلائل تفسیر نمونہ جلد اول سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۶ کے ذیل میں گزر چکے ہیں ۔

Marfat.com

غرض قرآن مجید ان تمام موہوم چیزوں کی نفی اور مذمت کرتا ہے ۔

اور اس آیت کے آخری جملے میں کہتا ہے ، اس نے تمام موجودات کو پیدا کیا ہے ، نہ صرف پیدا کیا ہے بلکہ ان کا صحیح صحیح اندازہ بھی مقرر کیا ہے (وخلق کل شیٔ فقدرہ تقدیرا) ۔

ثنویہ کے عقیدے کی مانند نہیں جو موجوداتِ عالم کی کچھ چیزوں کا خالق " یزدان " کو اور کچھ کا خالق " اہریمن " کو سمجھتے ہیں اور اس طرح سے وہ تخلیق کائنات کو یزدان اور اہریمن میں تقسیم کر دیتے ہیں کیونکہ وہ دنیا کو " خیر " اور " شر " یا نیکی اور بدی کا مجموعہ سمجھتے ہیں ۔ جبکہ ایک سچے موحّد کے نزدیک عالم ہستی میں خیر کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں اور اگر کہیں کہیں برائی نظر بھی آتی ہے تو یا تو اس کی نسبی حیثیت ہے یا وہ عدمی چیز ہے اور یا پھر ہمارے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہے (خوب غور کیجیے گا) ۔

موجوداتِ عالم کا صحیح اندازہ

نہ صرف عالم ہستی کا جچا تلا اور پختہ منظام ، خدا کی توحید اور اس کی معرفت کے محکم دلائل میں سے ایک دلیل ہے بلکہ اس کا صحیح صحیح اندازہ بھی اس کی وحدانیت کی ایک اور واضح دلیل ہے ہم کسی بھی صورت میں اس کائنات کی مختلف چیزوں کے اندازے ، مقدار اور تعداد کو " اتفاق " کا نتیجہ نہیں مان سکتے کہ یہ کائنات اور اس میں موجود اشیاء بس اتفاقیہ طور پر معرضِ وجود میں آگئی ہیں نہیں اور ہرگز نہیں ، کیونکہ یہ چیز تو " احتمالات کے قاعدہ " سے بھی میل نہیں کھاتی ۔

ماہرین نے اس سلسلے میں بہت مطالعہ کیا ہے اور کئی اسرار و رموز کا انکشاف کیا ہے جس سے انسان ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے اور زبان سے بے ساختہ اپنے پروردگار کی قدرت و عظمت کے گیت گانے لگتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ان تحقیقات کے نتائج کا ایک گوشہ ۔

جیالوجی (علم ارضیات) کے ماہرین کا کہنا ہے کہ زمین کی یہ ظاہری سطح اگر موجودہ حالت سے دس فٹ مزید بلند اور موٹی ہوتی تو زندگی کا اصل مواد یعنی آکسیجن گیس کا وجود ہی عمل میں نہ آتا یا اگر سمندروں کی گہرائی موجودہ حالت سے بیشتر اور کئی گنا ہوتی تو زمین کی تمام آکسیجن (Oxygen) اور کاربن (Carbon) گیسیں جذب ہو کر رہ جاتیں اور زمین کی سطح پر کسی حیوانی اور نباتی زندگی کے قطعاً کوئی امکانات نہ ہوتے اور قوی احتمال یہ ہے کہ موجودہ تمام آکسیجن کو زمین کی سطح اور سمندروں کا پانی جذب کر لیتے اور انسان کو اپنی نشو و نما کے لیے نباتات کے اگنے اور پروان چڑھنے کا انتظار کرنا پڑتا تاکہ وہ آکسیجن خارج کریں اور انسان اس سے استفادہ کرے ۔

صحیح صحیح حساب و کتاب کے بعد اور تحقیقات کے نتیجے میں جو بات سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تنفس کو بحال رکھنے کے لیے آکسیجن از حد ضروری ہے اور وہ مختلف ذرائع سے حاصل ہوتی ہے لیکن جو بات زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تنفس کے لیے آکسیجن کی ضروری اور لازمی مقدار اس فضا میں موجود ہے ۔

اگر زمین کی ہوا موجودہ حالت سے مزید ہلکی ہوتی تو آسمان سے تعلق رکھنے والے اجرام فلکی اور شہابیے جو روزانہ کروڑوں کی تعداد میں ہوا سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں مسلسل زمین پر گرتے رہتے جس سے یقیناً بے حد و حساب نقصان ہوتا ۔

Marfat.com

یہ شہاب ثاقب چھ سے چالیس میل فی سیکنڈ کے حساب سے حرکت کرتے رہتے ہیں اور جس چیز سے ٹکراتے ہیں وہیں پر دھماکہ کے ساتھ پھٹ کر آگ لگا دیتے ہیں چنانچہ ان اجرام کی رفتار موجودہ رفتار سے کم ہوتی مثلاً ایک گولی کی رفتار کے مطابق ہوتی تو وہ سب کے سب زمین پر آگرتے اور اس کے نتیجے میں جو تباہی پھیلتی اسے خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اگر خود انسان ان اجرام فلکی میں سے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے جرم کی راہ میں ہوتا تو اس کی زبردست حرارت اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی جبکہ اس کی رفتار گولی کی رفتار سے نوّے گنا زیادہ ہوتی ہے۔

زمین کی فضا میں ہوا کا دباؤ اس حد تک مناسب اور موزوں ہے کہ یہ ہوا سورج کی شعاعوں کو صرف اسی مقدار میں زمین تک آنے دیتی ہے جو نباتات کی نشوونما کے لیے ضروری ہوتی ہے اور ضرر رساں جراثیموں کو اسی فضا میں نیست و نابود کر دیتی ہے اور مفید وٹامن پیدا کرتی ہے۔

زمین کی گہرائیوں سے صدیوں سے اٹھنے والے مختلف بخارات فضا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں سے اکثر زہریلی گیسیں ہیں اس کے باوجود زمین کی فضا میں کسی قسم کی آلودگی پیدا نہیں ہوتی اور یہ فضا ہمیشہ متوازن اور موزوں رہتی ہے تاکہ انسانی زندگی کے لیے مناسب ماحول مہیا رہے۔

جس مشینری نے اس عجیب و غریب توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا ہوا ہے وہ سمندر ہی تو ہیں جو خوراک، بارش، اعتدال ہوا، حیات نباتات بلکہ خود انسان کے وجود کا منبع فیض ہیں۔ جو شخص ان مطالب کا ادراک کرتا ہے وہ سمندروں کی عظمت کا اعتراف کرتا ہے اور ان نعمتوں کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

"آکسیجن" اور "کاربن ڈائی آکسائڈ" کے درمیان عجیب تناسب اور صحیح توازن برقرار رکھا گیا ہے تاکہ حیوانات اور نباتات کی زندگی وجود پذیر ہو اور باقی رہے۔ — اسی چیز نے تمام مفکرین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرالی ہے اور انھیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

لیکن ابھی تک "کاربن ڈائی آکسائڈ" کی اہمیت بہت سے لوگوں پر مخفی ہے یاد رہے کاربن ڈائی آکسائڈ وہ گیس ہے جس سے گیس والے مشروبات تیار کیے جاتے ہیں۔

کاربن ڈائی آکسائڈ ایک بھاری اور بوجھل گیس ہوتی ہے جو خوش قسمتی سے زمین کی سطح کے بہت ہی نزدیک موجود رہتی ہے اور اسے آکسیجن سے بڑی مشکل کے ساتھ جدا کیا جا سکتا ہے۔ جب لکڑی سے آگ جلائی جاتی ہے تو لکڑی پر کیمیکل عمل ہوتا ہے خود لکڑی آکسیجن، کاربن اور ہائیڈروجن کے مجموعے کا نام ہے۔ چنانچہ حرارت کی وجہ سے جب اس کا کیمیکل تجزیہ ہوتا ہے تو کاربن فوراً ہی آکسیجن سے مل کر کاربن ڈائی آکسائڈ بن جاتی ہے اور اسی تیزی سے ہائیڈروجن بھی آکسیجن کے ساتھ مل کر بخارات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دھواں درحقیقت خالص اور غیر مرکب کاربن ہوتا ہے۔

جب انسان سانس لیتا ہے تو اس سے کچھ مقدار آکسیجن اس کے اندر چلی جاتی ہے جو جا کر خون کو بدن کے تمام حصوں میں تقسیم کرتی ہے اور یہی آکسیجن غذا کو بدن کے مختلف خلیوں میں بھیج کر آہستہ آہستہ اور مدھم سی حرارت کے ساتھ اسے جلا دیتی ہے اور اس سے کاربن ڈائی آکسائڈ اور بخارات خارج ہوتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو مذاق میں کہا جاتا ہے کہ وہ "تنور" کی مانند

Marfat.com

آ رہیں بھر رہا ہے تو یہ ایک حقیقت ہوتی ہے۔

بدن کے مختلف خلیوں میں غذا کے جلنے سے کاربن ڈائی آکسائڈ پیدا ہوتی ہے اور سیدھی پھیپھڑوں میں چلی جاتی ہے اور بعد والی سانسوں کے ذریعے پھیپھڑوں سے خارج ہو کر بیرونی فضا میں چلی جاتی ہے۔ اسی ترتیب کے ساتھ تمام ذی روح چیزیں آکسیجن لیتی اور کاربن ڈائی آکسائڈ خارج کرتی ہیں۔

اس کائنات میں توازن اور کنٹرول کا یہ طریقہ کار کس قدر تعجب خیز ہے؟ اسی توازن کا نتیجہ ہے کہ فطرت نے حیوانات اور درندوں کو اس دنیا پر مسلط ہونے سے روک رکھا ہے اگرچہ وہ جسم و جثے اور طاقت کے لحاظ سے بہت ہی عظیم ہیں اور یہ صرف انسان ہی ہے جو فطرت کے توازن کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے اور حیوانات اور نباتات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا رہتا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی اس ستم ظریفی کا بہت جلد مزہ بھی چکھ لیتا ہے کیونکہ نباتاتی آفات اور حیوانی بیماریاں اسے ایسا ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہیں کہ اسے اس کا مدتوں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

ذیل میں ہم ایک دلچسپ واقعہ پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی بقاء کے لیے کیوں اس توازن اور کنٹرول کا لحاظ رکھنا چاہیے۔

چند سال پہلے کی بات ہے کہ آسٹریلیا میں "جیدار" (Cactus) نامی پودے[1] کی کھیتوں کی باڑوں پر کاشت کی گئی اور چونکہ اس وقت اس پودے کا مخالف کیڑا آسٹریلیا میں موجود نہیں تھا۔ لہٰذا یہ پودا خوب پھلا پھولا اور پروان چڑھا اور تھوڑی سی مدت میں اس نے جزیرۂ انگلستان کی سرزمین کے برابر کے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا لوگوں کو مجبوراً دیہات اور قصبات چھوڑنے پڑے کھیتی باڑی ختم ہو کر رہ گئی۔

لوگوں نے اس کے خاتمہ کے لیے ہر قسم کی چارہ جوئی کی لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا بلکہ پورے آسٹریلیا کو اس سے خطرہ پیدا ہو گیا کہ اس پودے کا خاموش اور ضدی لشکر کسی نہ کسی دن سارے برِاعظم پر اپنا تسلط قائم کرلے گا۔ تمام ماہرین اور دانشوروں نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کی تدبیریں سوچنا شروع کر دیں۔ ساری دنیا کی خاک چھان ماری آخر کار انھیں ایک ایسا کیڑا مل گیا جس کی خوراک صرف اور صرف "جیدار" کے پتے اور ٹہنیاں ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ کوئی خوراک نہیں کھاتا۔ اس پر ہی اپنی نسل بڑھاتا ہے اور آسٹریلیا میں اس کا کوئی دشمن بھی نہیں۔

اس طرح سے حیوان نے نبات پر غلبہ پالیا اور آج پورے براعظم میں "جیدار" کا خطرہ مکمل طور پر ٹل چکا ہے اور اس نبات کے خاتمے کے ساتھ ہی کیڑوں کا بھی خاتمہ ہو چکا ہے صرف چند ایک کیڑے زندہ بچے ہوئے ہیں جو اس نبات کی نشوونما کو کنٹرول کیے ہوئے ہیں۔

قدرت نے فطرت میں اس توازن اور اعتدال کو برقرار رکھا ہوا ہے اور یہ نہایت مفید بھی ہے۔

آخر کیا وجہ ہے کہ ملیریا کے مچھر نے روئے زمین کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا اور نہ ہی نسلِ انسانی کو تباہی سے ہمکنار کیا ہے جبکہ قطبی علاقوں تک میں عام مچھر بہت بڑی تعداد میں پایا جاتا ہے۔

---

[1] یہ ایک طرح کا کانٹے دار پودا ہے اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک رنگ برنگے پھولوں والی قسم ہے جسے باغیچوں وغیرہ میں لگایا جاتا ہے اور دوسری قسم بڑی اور درخت کی سی ہوتی ہے۔

یا کیا وجہ ہے کہ تپ زرد (Yellow Fever) کے مچھر نے جو ایک موقع پر نیویارک کے قریبی علاقوں میں آیا تھا اس نے دنیا کو تباہی کے خطرے سے دوچار نہیں کیا یا خواب آور مکھی نے جو زندہ ہی صرف استوائی گرم علاقوں میں رہ سکتی ہے، انسانی نسل کو روئے زمین سے ختم نہیں کیا ؟ (ان سب کا تدارک صرف اور صرف ایک صحیح اور نپے تُلے نظام اور کنٹرول کے ذریعے کیا گیا ہے ۔)

اتنا بتا دینا ہی کافی ہے کہ انسانیت اپنی تاریخ کے دورانیے میں کیسی کیسی آفات و امراض سے دوچار رہی ہے اور کل تک اس کے پاس اپنی مدافعت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور حفظانِ صحت کے کسی اصول سے باخبر بھی نہیں تھی جب ان تمام باتوں پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہمارا وجود کس حیرت انگیز حد تک محفوظ و مامون رہا ہے۔[1]

---

[1] "رازِ آفرینش انسان" نامی کتاب کے ص ۳۲ تا ۳۶، ۳۹ تا ۴۱، ۴۹ تا ۱۵۲ سے خلاصہ کیا گیا۔

Marfat.com

۳۔ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ
وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا
حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ○
۴۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ اِۨفْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ
اٰخَرُوْنَ ۚ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ○
۵۔ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ
اَصِيْلًا ○
۶۔ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

ترجمہ

۳۔ ان لوگوں نے خدا کے علاوہ دوسروں کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ ایسے معبود جو کچھ بھی پیدا نہیں کرتے بلکہ وہ خود مخلوق ہیں نہ تو وہ اپنے نقصان اور نفع کے مالک ہیں اور نہ ہی موت وحیات اور قیامت کے دن جی اٹھنے کے۔

۴۔ اور کافروں نے کہا یہ تو اس نے جھوٹ گھڑا ہے اور کچھ لوگوں نے اس کام پر اس کی مدد کی ہے۔ یہ کہہ کر وہ ظلم اور بہت بڑے جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں۔

۵۔ اور انھوں نے کہا: یہ تو وہی گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جنھیں اس نے قلم بند کیا ہے اور صبح وشام اسے لکھوایا جاتا ہے۔

۶۔ کہہ دو: اسے تو اس نے نازل کیا ہے جس کے پاس آسمانوں اور زمین کے اسرار ہیں اور خدا غفور ورحیم تھا اور ہے بھی۔

Marfat.com

تفسیر

طرح طرح کی تہمتیں

یہ آیات درحقیقت گزشتہ آیات میں ہونے والی گفتگو کا تتمہ ہیں جس میں شرک اور بُت پرستی کے خلاف دلائل پیش کیے گئے ہیں۔ اسی طرح بتوں کے بارے میں بت پرستوں کے بے بنیاد دعووں ——— اور قرآن مجید اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر جو جو تہمتیں لگائی ہیں ان سب کی قلعی کھولی گئی ہے۔

پہلی آیت درحقیقت مشرکین پر فردِ جرم عاید کررہی ہے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے واضح، آسان اور قاطع دلائل کے ساتھ اُن سے مخاطب ہے۔ ان لوگوں نے اس خدا کے علاوہ جس کے اوصاف ابھی بیان ہوچکے ہیں، دوسروں کو خدا بنایا ہے وہ تو قطعاً کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ خود مخلوق ہیں (واتخذوا من دونہ الہۃ لا یخلقون شیئا وھم یخلقون)۔

معبودِ حقیقی عالمِ ہستی کا خالق ہے جبکہ بُت پرستوں کا اپنے خداؤں کے بارے میں اعتراف ہے کہ وہ کسی چیز کے خالق نہیں بلکہ وہ انھیں خدا کی مخلوق سمجھتے ہیں۔

جب صورتِ حال ایسی ہو تو پھر کس بناء پر وہ بُت پرستی کرتے ہیں۔ وہ بت جو اپنے نفع ونقصان، موت وحیات اور قیامت کے دن جی اٹھنے تک کے مالک نہیں، وہ دوسروں کو کیا دیں گے (ولا یملکون لانفسھم ضرا ولا نفعا ولا یملکون موتا ولا حیوۃ ولا نشورا)۔

جو اصول کسی انسان کے لیے زبردست اہمیّت کے حامل ہیں، یہی پانچ امور تو ہیں۔ نفع، نقصان، موت، زندگی اور دوبارہ جی اٹھنا۔

سچی بات یہ ہے کہ جو ہماری ان پانچ چیزوں کا اصل مالک ہے وہی ہماری عبادت کے لائق ہے تو آیا یہ بُت کسی بھی صورت میں خود اپنے ان پانچ امور کے مالک ہیں؟ چہ جائیکہ اپنے عبادت گزاروں کے ان امور کے مالک نہیں؟ یعنی جب یہ اپنے امور کے مالک نہیں ہیں وہ اپنے پوجنے والوں کے کس طرح مالک بن سکتے ہیں؟

یہ کیسی رذیلانہ حرکت ہے کہ انسان ایسی چیزوں کے پیچھے بھاگتا پھرے اور ان کے سنگِ آستاں پر جبہ سائی کرے جو خود اپنے لیے کچھ نہیں رکھتیں چہ جائیکہ دوسروں کے لیے ان کے پاس کچھ ہو؟

یہ بت تو دنیا میں اپنے پوجنے والوں کی کسی مشکل کو حل نہیں کرسکتے قیامت کے دن کسی کی مشکل کیا حل کریں گے؟

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشرکین کا یہ گروہ جو ان آیات میں مخاطب ہے کسی حد تک معاد (روحانی نہ کہ جسمانی) کا قائل ضرور تھا یا پھر یہ بات ہے کہ باوجود ان کے قیامت پر ایمان نہ ہونے کے قرآن مجید نے اس بات کو مسلّم بنا کر ذکر کیا ہے اور دوٹوک الفاظ میں ان کے ساتھ مخاطب ہے۔ عموماً طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی انسان کو کسی چیز کے منکر سے گفتگو کرنی پڑتی ہے

Marfat.com

تو وہ اس کے افکار کی پرواہ کیے بغیر اپنے مدّعا کو دو ٹوک الفاظ میں بیان کر دیتا ہے ۔

پھر اس آیت میں تو ضمنی طور پر معاد پر ایک دلیل بھی بیان کی گئی ہے کیونکہ جب خالق کسی مخلوق کو پیدا کرتا ہے اور اس کے سود و زیاں اور موت و حیات کا مالک ہوتا ہے تو اس تخلیق کا مقصد بھی اس کے پیشِ نظر ہوتا ہے اور جب تک قیامت کو تسلیم نہ کیا جائے تو یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کی موت کے ساتھ ہی سب کچھ ختم ہو جائے تو یہ زندگی بے فائدہ اور بے مقصد ہو گی اور اس بات کی دلیل ہو گی کہ انسان کا خالق صاحبِ حکمت نہیں ہے ۔

آیت میں لفظ "ضرر" "نفع" سے پہلے اس لیے ہے کہ انسان سب سے پہلے ضرر ہی سے خوف کھاتا ہے اور عقلائے عالم کا فیصلہ ہے کہ "ضرر کا دُور کرنا نفع کے حصول سے بہتر ہے"۔

نیز اگر "ضرر"، "نفع"، "موت"، "حیات" اور "نشور" کے الفاظ نکرہ کی صورت میں ذکر ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بُت تو ایک مرتبہ بھی یہ کام نہیں کر سکتے تمام دنیا کے بارے میں وہ کیا کریں گے ؟

اور اگر "لایملکون" اور "لایخلقون" کو ذوی العقول کے لیے استعمال ہونے والے جمع مذکر کے صیغوں میں ذکر کیا گیا ہے (جبکہ لکڑی اور پتھر کے بُت تو ذرہ بھر بھی عقل و شعور نہیں رکھتے) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس گفتگو سے مُراد صرف لکڑی اور پتھر کے بُت ہی نہیں بلکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو فرشتوں یا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی پرستش کرتے ہیں اور چونکہ اس جملہ کے معنی میں عاقل اور غیر عاقل اکٹھے ذکر ہوئے ہیں لہٰذا سب کو عاقل کی صُورت میں بیان کیا ہے ۔ ادبی اصطلاح میں اسے "تغلیب" کا نام دیا جاتا ہے ۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مدِمقابل کے عقیدے کے مطابق بات کی جا رہی ہو اور اس طرح سے ان بتوں کی عاجزی اور ناتوانی کو اجاگر کیا جانا مقصود ہو کہ جن چیزوں کو تم صاحبِ عقل و شعور سمجھتے ہو وہ اپنے سے ضرر کو دُور کیوں نہیں کر سکتیں اور منفعت کو کیوں حاصل نہیں کر سکتیں ۔

بعد والی آیت میں کفار کے تجزیہ و تحلیل یا بہتر الفاظ میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتِ اسلام کے جواب میں ان کے حیلے بہانوں کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے : کافروں نے کہا یہ تو صرف اس کا خود ساختہ جھوٹ ہے اور کچھ لوگوں نے اس بارے میں اس کی مدد کی ہے (و قال الذین کفروا ان ھٰذا الا افک افترٰیه واعانه علیه قوم اٰخرون)۔

درحقیقت انھوں نے اطاعتِ حق سے جان چھڑانے کے لیے یہ بات کی ۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح تاریخ کے مطابق پہلے لوگ خدائی رہبروں کی اطاعت سے جان چھڑانے کے لیے ان کی مخالفت کرتے تھے ۔ پہلے تو انھوں نے آنحضرتؐ پر جھوٹ کی تہمت لگائی اور خاص کر قرآن مجید کی توہین کے لیے "ھٰذا" یعنی "یہ" کا کلمہ استعمال کیا ۔

پھر اپنے اس دعوے کو سچا ثابت کرنے کے لیے کہ وہ تنہا ایسا کام نہیں کر سکتے کیونکہ مطالب سے بھرپور الفاظ کے لیے ایک زبردست علمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ اس بات کا کھلم کھلا اعتراف کریں کہ یہ ایک باقاعدہ اساسی پروگرام ہے لہٰذا کہنے لگے کہ : وہ تنہا ایسا کام نہیں کر سکتا بلکہ کچھ لوگوں نے اس سلسلے میں اس کی مدد کی ہے اور یہ ایک باقاعدہ اور سوچی سمجھی سازش ہے جس کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے ۔

Marfat.com

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ " قوم اٰخرون " (دوسری قوم سے) ان کی مراد یہودیوں کا ایک گروہ تھا بعض کہتے ہیں کہ مراد اہلِ کتاب کے تین افراد تھے جن کا نام " عداس "، " یسار " اور " حبر " (یا جبر) ہے۔

بہرصورت چونکہ مشرکینِ مکہ اس قسم کی باتوں سے ناآشنا تھے اور انبیاء ماسلف کی کچھ تاریخی داستانیں اور اس قسم کے کئی دوسرے قصے یہود اور اہلِ کتاب کے پاس موجود تھے۔ لہٰذا اس بہتان تراشی میں انھوں نے زبردستی اہلِ کتاب کو بھی ملوث کر دیا تاکہ اس طرح سے وہ لوگوں کے اس تاثر کو ختم کر سکیں جو وہ قرآنی آیات سننے سے لیتے تھے۔

لیکن قرآن مجید نے ان اتہامات کا جواب صرف ایک ہی جملے میں دے دیا ہے اور وہ یہ ہے: یہ کہہ کر وہ (کافر) ظلم اور بہت بڑے جھوٹ کے مرتکب ہوئے ہیں (فقد جاء وا ظلمًا و زورًا)۔[1]

" ظلم " اس لحاظ سے کہ انھوں نے ایک امین، پاکیزہ، مقدس اور حق و صداقت کے پتلے پر تہمت لگائی ہے (پیغمبر اسلامؐ پر) کہ وہ (نعوذ باللہ) اہلِ کتاب کے ایک ٹولے کی مدد سے خدا پر افترا پردازی اور جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اس طرح کا الزام لگا کر انھوں نے لوگوں پر بھی ظلم کیا اور اپنے اوپر بھی۔ " زور " یعنی جھوٹ اور باطل اس بناء پر کہ ان کی باتیں بالکل بے بنیاد تھیں کیونکہ پیغمبر اسلامؐ نے انھیں ایک نہیں کئی بار چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اپنے دعووں میں سچے ہیں تو اس قرآن جیسی کوئی کتاب یا اس کی سورتوں اور آیات جیسی کچھ سورتیں یا آیتیں لے آئیں لیکن وہ ایسا کرنے سے عاجز آ گئے تھے اور کچھ بھی پیش نہ کر سکے تھے۔

اس طرح سے واضح ہو گیا کہ یہ آیات کسی انسانی فکر کی اختراع نہیں بلکہ رب العالمین کا کلام ہیں کیونکہ اگر یہ انسان کا کلام ہوتا تو وہ بھی یہودیوں اور اہلِ کتاب کی مدد سے اس طرح کی کتاب تیار کر لاتے۔ بنابریں ان کا عجز ان کے جھوٹ کی اور ان کا جھوٹ ان کے ظلم کی دلیل ہے۔

لہٰذا " فقد جاء وا ظلمًا و زورًا " ایک ایسا جامع اور مانع جواب ہے جو ان کے دعووں کو باطل کر دیتا ہے۔

" زور " (بروزن " کور ") اصل میں " زَوَر " (بروزن " غور ") سینے کا بالائی حصہ کے معنیٰ سے لیا گیا ہے پھر اس کا اطلاق ہر اس چیز پر ہونے لگا جو حدِ اعتدال سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے۔ چونکہ جھوٹ حق سے ہٹ کر باطل کی طرف گیا ہوتا ہے لہٰذا اسے بھی " زور " کہتے ہیں۔

بعد والی آیت میں قرآن کے بارے میں کفار و مشرکین کی ایک اور رائے اور بے ہودہ بہانے کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

انھوں نے کہا یہ تو وہی گزشتہ لوگوں کے افسانے ہیں جسے اس نے قلمبند کیا ہے (و قالوا اساطیر الاولین

---

[1] " جاء وا " " مجیئ " کے مادہ سے ہے جو عام طور پر " آنے " کے معنی میں ہوتا ہے لیکن یہاں پر " لانے " کے معنی میں ہے جیسا کہ سورہ یونس کی آیت ۸۱ میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں سے فرمایا:

ما جئتم به السحر

جو کچھ تم لائے ہو وہ جادو ہے۔

Marfat.com

اکتتبھا)۔

وہ کہتے ہیں پیغمبر کے پاس اپنی طرف سے کچھ نہیں ہے خواہ وہ علم ہو یا دانش، ایجاد ہو یا اختراع، تو پھر وحی اور نبوت اس کے پاس کہاں سے آ گئے۔ اس نے تو کچھ لوگوں کی مدد سے چند قصے کہانیوں کو اکٹھا کر کے اس کا نام وحی یا آسمانی کتاب رکھ دیا ہے۔

وہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہر روز دوسرے لوگوں سے مدد حاصل کرتا ہے اور یہ کلمات صبح و شام اسے لکھوائے جاتے ہیں (فھی تملی علیه بكرة و اصيلاً)۔

یعنی وہ ہر صبح و شام جبکہ لوگ بہت کم اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں اپنے مقصد کو پانے کے لیے لوگوں سے مدد حاصل کرتا ہے۔

اس قسم کے کلمات درحقیقت گزشتہ آیت میں ان کے بیان شدہ اتہامات کی توضیح اور تشریح ہیں۔

اس طرح سے انھوں نے چند مختصر سے جملوں میں کچھ خامیاں اور کمزوریاں قرآن مجید کے سر منڈھ دی ہیں:

۱۔ قرآن میں کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ صرف گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں۔

۲۔ پیغمبر اسلامؐ ایک دن بھی دوسرے لوگوں کی مدد کے بغیر اپنا کام انجام نہیں دے سکتے بلکہ صبح و شام کچھ باتیں انھیں لکھوادی جاتی ہیں۔

۳۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتے ہیں لہٰذا اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ میں نے کسی سے سبق نہیں پڑھا تو خلافِ حقیقت کہتے ہیں۔

درحقیقت وہ اس قسم کی دروغ گوئی اور ظاہری اتہامات کے ذریعے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس سے ہٹانا چاہتے تھے جبکہ تمام صاحبانِ عقل اور اس ماحول کے رہنے والوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپؐ نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ آپ کو نہ تو یہود سے کوئی سروکار تھا اور نہ کسی اور اہلِ کتاب سے۔ اگر واقعاً آپ صبح و شام کسی سے کچھ حاصل کرتے تھے تو کیونکر ممکن تھا کہ کسی پر یہ بات مخفی رہتی؟ ان سب باتوں سے ہٹ کر قرآنی آیات تو سفر و حضر اور مجمع عام اور تنہائی میں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں۔

ان سب سے قطع نظر قرآن مجید صرف انبیاء ماسلف کی داستانوں پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اس میں اعتقادی تعلیمات، عملی احکام قوانینِ الٰہی اور کچھ انبیاءِ عظام کی سرگزشت بھی موجود ہے اور پھر گزشتہ اقوام کی جو جو داستانیں قرآن مجید میں موجود ہیں وہ عہدین (تحریف شدہ تورات اور انجیل) اور عربوں کے افسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ کیونکہ وہ تو خرافات اور فضول باتوں سے بھرپور تھے جبکہ قرآن مجید ان تمام خرافات سے بالکل پاک و پاکیزہ ہے۔ اس کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ اگر دونوں کا باہمی موازنہ اور تقابل کیا جائے تو حقیقت امر بخوبی واضح ہو جائے گی۔[۱]

---

[۱] بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "اکتتبھا" سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے دوسرے لوگوں کو فرمایا کہ وہ یہ آیات آپ کو لکھ کر دیں اور اسی طرح "تملی علیه" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ لوگ آپؐ کے سامنے پڑھتے اور آپؐ یاد کر لیتے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے ہم ان دونوں جملوں کی ظاہر کے خلاف تفسیر کریں لہٰذا جو تفسیر اوپر متن میں بیان کی گئی ہے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ درحقیقت وہ یہ چاہتے تھے کہ آنحضرتؐ کو اس طرح سے متہم کریں (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اسی بناء پر اس سلسلے کی آخری آیت میں ان بے بنیاد الزامات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کہہ دیجیے اسے تو اس نے نازل کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے اسرار و رموز سے اچھی طرح واقف ہے (قل انزله الذی یعلم السر فی السماوات و الارض)۔

آیت کا یہ حصہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کتاب الٰہی کے مضامین اور مختلف اسرار و رموز جن میں علم و دانش بھی ہے اور گزشتہ قوموں کی تاریخ بھی، انسانی ضروریات کی راہنمائی اور قوانین حتیٰ کہ عالم فطرت کے اسرار و رموز اور آئندہ کی خبریں بھی، یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ نہ تو یہ انسانی ذہن کی اختراع ہے اور نہ ہی کسی ایرے غیرے کے تعاون سے اسے مرتب کیا گیا ہے بلکہ یہ تو اس ذات کے علم کا نتیجہ ہے جس کے پاس آسمان و زمین کے اسرار موجود ہیں اور جس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔

ان کج اندیش مطلب کے بندوں اور جھوٹے دغابازوں کی تمام خیانتوں اور الزام تراشیوں کے باوجود اللہ نے ان کے لیے توبہ کی راہ کھلی رکھی ہے۔ چنانچہ اسی آیت کے آخر میں فرماتا ہے کہ توبہ اور بازگشت کی راہیں ان سب پر کھلی ہوئی ہیں کیونکہ خدا ہر دور میں غفور و رحیم ہے (انه کان غفورًا رحیمًا)۔

اس نے اپنی رحمت کی وجہ سے انبیاء عظام علیہم السلام کو مبعوث کیا اور آسمانی کتابوں کو نازل فرمایا ہے اور اپنے غفور ہونے کی بناء پر انسان کے ایمان اور توبہ کے پرتو میں اس کے بے شمار گناہوں کو معاف فرماتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا)

کہ وہ تو پڑھے لکھے ہیں اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو ان پڑھ بتاتے ہیں۔

Marfat.com

۷۔ وَقَالُوا مَالِ هٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ ۙ لَوْلَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُونَ مَعَهُ نَذِيرًا ۝

۸۔ أَوْ يُلْقَىٰ إِلَيْهِ كَنْزٌ أَوْ تَكُونُ لَهُ جَنَّةٌ يَأْكُلُ مِنْهَا ۚ وَقَالَ الظَّالِمُونَ إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا رَجُلًا مَسْحُورًا ۝

۹۔ انْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوا لَكَ الْأَمْثَالَ فَضَلُّوا فَلَا يَسْتَطِيعُونَ سَبِيلًا ۝

۱۰۔ تَبَارَكَ الَّذِي إِنْ شَاءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِنْ ذٰلِكَ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَيَجْعَلْ لَكَ قُصُورًا ۝

ترجمہ

۷۔ اور انھوں نے کہا یہ رسولؐ کھانا کیوں کھاتا ہے اور بازاروں میں کیوں چلتا پھرتا ہے، (یہ نہ تو فرشتوں کا طریقہ کار ہے اور نہ ہی بادشاہوں کا انداز) کیوں اس پر کوئی فرشتہ نازل نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ مل کر وہ لوگوں کو ڈرائے؟ (اور اس کی دعوت کی صداقت پر گواہی دے)

۸۔ یا آسمان سے اس کی طرف کوئی خزانہ بھیجا جائے یا اس کا کوئی باغ ہو جس (کے پھلوں) کو کھائے (اور زندگی گزارے) اور ظالموں نے کہا تم تو ایک دیوانے شخص کی پیروی کرتے ہو۔

۹۔ ذرا دیکھ! انھوں نے تیرے لیے کیسی کیسی مثالیں بیان کی ہیں اور اس قدر گمراہ ہو چکے ہیں کہ اب وہ راستہ تلاش کرنے کی قدرت بھی نہیں رکھتے۔

۱۰۔ بابرکت اور باعظمت ہے وہ خدا، اگر وہ چاہے تو اس سے بھی بہتر عطا کر سکتا ہے ایسے ایسے باغات جن کے نیچے نہریں چل رہی ہوں اور اگر چاہے تو تیرے لیے عظیم الشان محلات بنا دے۔

Marfat.com

شانِ نزول

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

میں نے اپنے والد (حضرت امام علی نقی علیہ السلام) سے پوچھا کہ آیا یہود اور مشرکین جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ کٹ حجتی اور کج بحثی کرتے تھے تو آپؐ بھی ان کے ساتھ کوئی استدلالی گفتگو فرماتے تھے یا نہیں ؟

تو انھوں نے فرمایا ضرور فرماتے تھے اور کئی بار ایسا ہوا بھی ہے چنانچہ اسی سلسلے کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن آپؐ خانہ خدا کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ عبداللہ بن ابی مخزومی آپؐ کے سامنے آکر کہنے لگا :

اے محمد! تم نے بہت بڑا دعویٰ کیا ہے اور بہت خطرناک باتیں کرتے ہو اس طرح سے تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم پروردگارِ عالم کے رسول ہو۔ لیکن مناسب نہیں کہ مخلوقات کا خالق اور عالمین کا پروردگار تم جیسے ایک عام آدمی کو رسول بنا کر بھیجے۔ تم بھی ہماری طرح کھانا کھاتے اور ہماری مانند بازار میں چلتے پھرتے ہو۔

یہ سن کر اللہ کے رسولؐ نے (بارگاہ ایزدی میں) عرض کی :۔

بارِ الٰہا! تو سب باتوں کو سنتا ہے اور ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے اور تیرے بندے جو کچھ کہتے ہیں تو انھیں بھی جانتا ہے (تو خود ہی ان کے اعتراضات کا جواب عنایت فرما)

تو اس موقع پر مذکورہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان کے اعتراضات کے جواب دیئے[1]

تفسیر

خزانے اور باغات کیوں نہیں ؟

جہاں تک گزشتہ آیات کی بات ہے ان میں قرآنِ مجید کے بارے میں کافروں کے کچھ اعتراضات کا تذکرہ ہے اور ان کا جواب بھی دے دیا گیا ہے۔ رہی زیرِ بحث آیات کی بات تو ان میں خود پیغمبر گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر اعتراضات کا ذکر ہے اور ساتھ ہی ان اعتراضات کا جواب بھی دیا گیا ہے۔

خدا فرماتا ہے : انھوں نے کہا کیوں یہ رسول کھانا کھاتا ہے اور کیوں بازار میں چلتا ہے (وقالوا مال ھذا الرسول

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶

Marfat.com

یأکل الطعام و یمشی فی الاسواق)۔
یہ کیسا پیغمبر ہے جسے کھانے کی ضرورت ہوتی ہے اور لین دین یا اشیائے ضرورت کی خریداری کے لیے بازار میں آتا جاتا ہے؟ یہ نہ تو انبیاء کا طریقہ کار ہے اور نہ ہی بادشاہوں کا شیوہ! اس کے باوجود وہ خدائی احکام کی تبلیغ اور سب پر حکومت بھی کرنا چاہتا ہے۔
اصولی طور پر ان کا نظریہ یہ تھا کہ باحیثیت اور معزز افراد اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے خود بازار نہ جایا کریں بلکہ ایسے کاموں کے لیے اپنے نوکروں چاکروں کو بھیج دیا کریں۔
وہ یہ بھی کہتے: اس پر فرشتہ کیوں نہیں بھیجا گیا تاکہ وہ اس کی دعوت کی صداقت پر گواہ ہوتا اور اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا (لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرًا)۔
چلو مان لیا کہ خدا کا رسول انسان بھی ہو سکتا ہے لیکن تہی دست اور نادار انسان ہی رسول کیوں ہو؟ آخر اللہ نے اس کے لیے آسمان سے کوئی خزانہ کیوں نہیں بھیجا یا کم از کم اس کا کوئی باغ کیوں نہیں ہے کہ جس سے وہ (پھل) کھاتا (او یلقیٰ الیہ کنز او تکون لہ جنۃ یأکل منہا)۔
پھر انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایک غلط نتیجہ نکالتے ہوئے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنون کی تہمت دی جیسا کہ آیت کے آخر میں ہے اور ظالموں نے کہا: اے اس پر ایمان لانے والو! تم ایک دیوانے اور سحر زدہ شخص کی پیروی کر رہے ہو (و قال الظالمون ان تتبعون الا رجلًا مسحورًا)۔
کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ جادوگر لوگ انسان کے ہوش وحواس اور عقل کو اپنے قابو میں لے سکتے ہیں اور اس کی عقل سلب کر سکتے ہیں۔
اوپر کی تمام آیات کو ملا کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر چند بے بنیاد اعتراض تھے جن سے وہ قدم بقدم پیچھے ہٹتے گئے۔
ان کا پہلا اعتراض تو یہ تھا کہ رسول کو فرشتہ ہی ہونا چاہیے یہ جو کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے یقیناً فرشتہ نہیں ہے۔
پھر کہا: چلو مان لیا فرشتہ نہ سہی خدا کم از کم کوئی فرشتہ اس کی اعانت کے لیے بھیج دیتا۔
کچھ اور پیچھے ہٹے اور کہا: یہ بھی نہ سہی کم از کم اسے ایک غریب آدمی تو نہیں ہونا چاہیے تھا ایک خوشحال زمیندار ہو اس کے پاس ایک باغ ہو جس سے اپنی گزر اوقات کرے۔
لیکن افسوس یہ چیز بھی اس کے پاس نہیں ہے اور پھر دعویٰ یہ کہ پیغمبر ہے!!
آخر میں وہ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکالتے تھے کہ ان حالات میں اس کا اتنا بڑا دعویٰ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی عقل ٹھیک نہیں (نعوذ باللہ)۔
بعد والی آیت ان سب کا جواب ان الفاظ میں دیتی ہے: دیکھ تو سہی کہ انھوں نے تیرے لیے کس طرح کی شالیں بیان

Marfat.com

کی ہیں - اب وہ اس حد تک گمراہ ہو چکے ہیں کہ انھیں تو راستہ بھی سجھائی نہیں دیتا (انظر کیف ضربوا لك الامثال فضلوا فلا یستطیعون سبیلاً)۔

یہ جملہ اس حقیقت کی واضح تعبیر ہے کہ انھوں نے دعوتِ حق اور اس قرآن کے مقابلے میں چند بے بنیاد اور فضول باتیں گھڑلی ہیں جبکہ قرآن کے مضامین خدا کے ساتھ تعلق اور ارتباط کے ناطق گواہ ہیں۔ اس طرح سے وہ حقیقت کے چہرے پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں، اِدھر اُدھر کی کھوکھلی بے بنیاد باتیں کرتے ہیں اور منطقی دلیل کا جواب ایسی بے سروپا باتوں کے ذریعے دینا چاہتے ہیں کیونکہ:

۱۔ آخر پیغمبر کو فرشتوں کی جنس سے کیوں ہونا چاہیے؟ جبکہ اس کے بالکل برعکس عقل اور دانش کا تقاضا یہ ہے کہ انسانوں کا رہبر انسان ہی کو ہونا چاہیے تاکہ وہ ان کے تمام دُکھ درد، مشکلات، تکالیف، ضروریاتِ زندگی اور مسائلِ حیات کو اچھی طرح سمجھ سکے، تمام مسائل میں ان کے لیے عملی نمونہ بن سکے اور لوگ ہر ہر قدم پر اس کی تاسی کر سکیں۔ فرشتہ نازل ہوتا تو یقیناً یہ مقصد پورا نہ ہوتا کیونکہ اگر وہ زہد اور دنیا سے بے نیازی کی باتیں کرتا تو وہ تو خود فرشتہ ہے اور ان چیزوں سے بے نیاز ہے اگر عفت اور پاکدامنی کی تبلیغ کرتا تو فرشتہ ہونے کی بنا پر قوتِ جنسی کے طوفان سے بے خبر ہوتا اسی طرح کے بیسیوں "اگر" پیدا ہو جاتے۔

۲۔ یہ کیوں ضروری ہے کہ اس کے ہمراہ فرشتہ آتا؟ آیا قرآن جیسے عظیم معجزے کے باوجود بھی اس کی ضرورت باقی رہ گئی تھی اور حقائق کے ادراک کے لیے قرآن ناکافی تھا؟

۳۔ دوسرے لوگوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے تو اس طرح سے لوگوں کے ساتھ اس کے مراسم پیدا ہوتے ہیں، میل جول بڑھتا ہے اور ان کے دل کی گہرائیوں اور زندگی کی تہ تک پہنچتا ہے اور اپنا پیغام بہتر طور پر ان تک پہنچا سکتا ہے یہ بات اس کے لیے مضر نہیں بلکہ مفید اور معاون ہے۔

۴۔ پیغمبر کی عظمت اور ان کی شخصیت نہ تو خزانوں کی مرہونِ منت ہے اور نہ ہی سرسبز اور شاداب باغوں اور پھلوں کی یہ تو کفار کی گمراہ کن منطق ہے کہ وہ کسی کی شخصیت بلکہ تقربِ خدا کا دارومدار سرمایہ داری پر ہی سمجھتے ہیں جبکہ انبیاء علیہم السلام مبعوث ہی اس لیے ہوئے ہیں تاکہ انسان کو یہ بتائیں کہ اے انسان! تیرے وجود کی عظمت مادی چیزوں کے ساتھ نہیں بلکہ علم و ایمان اور تقویٰ کے ساتھ ہے۔

۵۔ وہ کس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو "مسحور" اور "مجنون" سمجھتے تھے حالانکہ آپؐ کی تاریخ زندگی بتاتی ہے کہ آپؐ کی عقل کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ یہ آپؐ ہی کی عقل تھی جس کی وجہ سے دنیا میں ایک عظیم انقلاب برپا ہوا اور ایک اسلامی تمدن کی بنیاد ڈالی گئی پھر کیونکر ممکن ہے کہ آپؐ کو ناروا اتہامات کے ساتھ متہم کیا جائے ہاں البتہ چونکہ آپؐ نے بت شکنی کا کارنامہ انجام دیا اور گزشتہ لوگوں کی اندھادھند پیروی نہیں کی لہٰذا آپؐ کو "مجنون" کہا گیا۔

اس گفتگو سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں پر "امثال" سے مراد (خاص کر آیت میں موجود قرائن کی وجہ سے) کمزور اور بے بنیاد باتیں ہیں۔ انھیں "امثال" سے شاید اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ وہ ایسی بودی اور بے بنیاد باتوں کو حق کا جامہ پہنا کر اور منطقی اور مدلل صورت میں تبدیل کر کے پیش کرتے جبکہ حقیقت کچھ اور ہوتی ہے[1]

نوٹ: حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں شکریہ

Marfat.com

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ آپ کے دشمن کبھی آپ کو "ساحر" کہتے تھے یعنی جادوگر اور کبھی "مسحور" یعنی جس پر جادو کیا گیا ہو اگرچہ بعض مفسّرین کا خیال ہے کہ "مسحور" بمعنی "ساحر" کے ہوگا (کیونکہ کبھی کبھی اسم مفعول، اسم فاعل کے معنی میں بھی آجاتا ہے) لیکن ظاہر یہ ہے کہ ان دونوں کا آپس میں فرق ہے۔

اگر آپ کو ساحر کہا جاتا تھا تو اس لیے کہ آپ کے کلام میں بہت زیادہ تاثیر تھی جو لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتی اور چونکہ وہ اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا آپ پر جادوگر ہونے کی تہمت لگاتے تھے۔

لیکن "مسحور" کے معنی ہیں ایسا شخص جس کی عقل پر جادوگروں نے قبضہ کرکے اس کے حواس مختل کر دیئے ہوں یہ تہمت آپ پر اس لیے لگائی جاتی تھی کہ آپ نے غلط رسومات، ناجائز عادات اور خود غرضیوں کے خلاف قدم اٹھایا۔

ان سب الزامات کا جواب اوپر دیا جا چکا ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ خدا نے یہ کیوں فرمایا ہے "فضلوا فلا یستطیعون سبیلًا" یعنی وہ اس حد تک گمراہ ہو چکے ہیں کہ راہِ حق کی تلاش نہیں کر سکتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ انسان اس وقت راہِ حق کو تلاش کر پائے گا جب حق کا خواہش مند اور طلبگار ہوگا لیکن اگر کوئی شخص اپنی جہالت، ہٹ دھرمی اور دشمنی کی بناء پر اپنے غلط اور گمراہ کن اندازوں کے تحت فیصلے کرکے تو نہ صرف یہ کہ وہ راہِ حق کو تلاش نہیں کر سکے گا بلکہ حق کے مقابلے میں ڈٹ بھی جائے گا۔

سابقہ آیت کی طرح آخری آیت میں بھی خداوندِ عالم روئے سخن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف فرماتے ہوئے اور کفار و مشرکین کی باتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوئے اور انھیں ناقابلِ اعتناء سمجھتے ہوئے کہتا ہے: بزرگ اور بابرکت ہے وہ خدا کہ جو چاہے تو تجھے اس سے بھی بہتر چیزیں عطا فرما دے جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ ایسے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہوں اور ایسے محلات کہ جو عظیم ہوں (تبارك الذی ان شاء جعل لك خيرًا من ذٰلك جنات تجری من تحتها الانهار و يجعل لك قصورًا)۔

تو کیا دوسرے لوگوں کو خدا کے علاوہ کسی اور نے باغات اور محلات عطا فرمائے ہیں۔

اور کیا اس کائنات اور اس کی نعمتوں اور زیبائشوں کو سوائے پروردگار کے کسی اور نے تخلیق فرمایا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں تو پھر کیا ان صفات کے مالک خدا کے لیے کوئی مشکل بات ہے کہ تجھے ان سے بہتر چیزیں عطا فرمائے؟ یقیناً وہ ایسا کر سکتا ہے۔

(حاشیہ گذشتہ صفحہ کا) بہت سے مفسرین نے یہاں پر "امثال" کو "تشبیہات" کے معنی میں لیا ہے لیکن اس کی وضاحت نہیں کی کہ یہاں پر مشرکین نے کون سی تشبیہ دی ہے بعض نے "امثال" کا معنی "صفات" کیا ہے کیونکہ "مفردات راغب" میں "مثل" کا ایک معنی "توصیف" بھی کیا گیا ہے اگر یہاں پر "امثال" سے مراد "صفات" ہوں تو بھی بے بنیاد اور بے پایہ صفات ہی ہوں گی۔ کیونکہ آیت کی ابتداء اور انتہا میں کچھ ایسے قرائن پائے جاتے ہیں جو اسی بات پر دلالت کرتے ہیں ایک طرف تو بطور تعجب کہتا ہے کہ ذرا دیکھیے تو سہی کہ وہ کیسی مثالیں بیان کرتے ہیں اور دوسری طرف فرماتا ہے "ایسی توصیفات جو ان کی گمراہی کا سبب بن گئی ہیں اور وہ پھر پلٹ جانے کے قابل بھی نہیں رہے"۔

Marfat.com

لیکن اس لیے ایسا نہیں کرتا کہ لوگ تیری شخصیت کو مال و دولت اور محلات و باغات کا مرہونِ منت سمجھ کر تیری حقیقی شخصیت سے غافل نہ ہو جائیں خدا چاہتا ہے کہ تیری زندگی بھی عوام النّاس، مستضعف اور محروم و مظلوم لوگوں کی سی ہو تاکہ تو ایسے لوگوں کے لیے جائے پناہ بن سکے۔

خدا یہ کیوں فرماتا ہے کہ اس کے پاس ایسے باغات اور محلات ہیں جو ان چیزوں سے بہتر ہیں جو کفار چاہتے ہیں کیونکر خدا نے بذاتہ مشکلات کو آسان نہیں کرتے بلکہ وہ بہت محنت اور زبردست کوشش کے بعد باغات اور محلات میں تبدیل ہوتے ہیں اس کے علاوہ وہ یہ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ کے پاس ایک باغ ہوتا جس سے وہ اپنی گزر اوقات کرتے لیکن قرآن کہتا ہے کہ خداوندِ عالم اپنے رسول کو باغات بھی عطا فرما سکتا ہے اور محلات بھی دے سکتا ہے لیکن ان کی بعثت اور رسالت کا مقصد کچھ اور ہے۔

نہج البلاغہ کے "خطبہ قاصعہ" میں اس بارے میں ایک نہایت عمدہ بیان آیا ہے۔ امام علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

> موسیٰ اپنے بھائی (ہارون) کے ساتھ فرعون کے دربار میں پہنچے دونوں کے بدن پر اونی لباس اور ہاتھوں میں عصا تھا اس حالت میں انھوں نے شرط پیش کی کہ اگر فرمانِ الٰہی کے سامنے جھک جائے تو اس کی حکومت اور ملک باقی اور اقتدار قائم و برقرار رہے گا۔ لیکن فرعون نے حاضرین سے کہا:
>
> تمہیں ان کی باتوں پر تعجب نہیں ہوتا کہ میرے ساتھ شرط لگا رہے ہیں کہ میرے ملک کی بقا اور میری عزت کا دوام ان کی مرضی کے ساتھ وابستہ ہے جبکہ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ فقر و تنگدستی ان کی حالت اور صورت سے ٹپک رہی ہے (اگر یہ سچ کہتے ہیں تو) خود انھیں طلائی کنگن کیوں نہیں دیئے گئے؟

فرعون نے یہ سب باتیں اس لیے کیں کہ وہ سونا اور اس کی جمع آوری کو عظمت کی اور اونی لباس پہننے کو حقارت کی علامت سمجھتا تھا۔

لیکن اگر خدا اپنے انبیاء کو مبعوث کرتے وقت خزانوں کے اور سونے چاندی کی کانوں کے دروازے ان کے لیے کھولنا چاہتا اور سرسبز و شاداب باغات ان کی ملکیت میں دینا چاہتا تو دے سکتا تھا اگر آسمان کے پرندے اور زمین کے وحشی جانور ان کے ساتھ بھیجنا چاہتا تو بھیج سکتا تھا لیکن ایسا کرنے سے امتحان اور آزمائش کا وجود ختم ہو جاتا۔ سزا اور جزا کا کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ خدا کے وعدے اور وعید بے اثر ہوتے۔ حق قبول کرنے والوں کے لیے آزمائے ہوئے لوگوں کا سا اجر نہ ہوتا۔ مومنین نیکوکاروں کے سے ثواب کے مستحق نہ ہوتے اور الفاظ اپنا معنیٰ اور مفہوم کھو دیتے۔

لیکن خداوندِ عالم نے اپنے انبیاء کو عزم و ارادہ کے لحاظ سے قوی اور ظاہری لحاظ سے غریب اور کمزور بنا کر بھیجا۔ ان کی غربت میں دل کی امیری اور آنکھوں کی قناعت شامل ہوتی ہے ہر چند کہ ظاہری تنگ دستی سے ان کی آنکھوں اور کانوں کو تکلیف ضرور ہوتی ہے۔

Marfat.com

اگر انبیاء کے پاس بظاہر ایسی طاقت ہوتی جس سے کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوتی ان کے پاس اس قدر غلبہ ہوتا کہ کسی سے بھی مغلوب نہ ہوتے اور ایسی حکومت اور شان وشوکت کے مالک ہوتے کہ تمام دنیا کی آنکھیں انھی کی طرف لگی ہوتیں اور لوگ دور دراز سے رختِ سفر باندھ کر ان کی طرف کھنچے چلے آتے تو ان کی قدر و قیمت عام لوگوں کے لیے تو بہت ہوتی اور متکبرین ان کے آگے سرِ تعظیم جھکا دیتے اور اپنے ایمان کا اظہار کرتے لیکن ان کا یہ ایمان مقصد سے پیار اور دلچسپی کی بنا پر نہ ہوتا بلکہ اس خوف کی وجہ سے ہوتا جو ان پر غالب آتا یا مادیت سے محبت کی وجہ سے ہوتا ایسی صورت میں ان کی نیت ہرگز خالص نہ ہوتی بلکہ ان کے اعمال میں غیر خدا کی شرکت بھی ہوتی۔[1]

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ باغات اور محلات سے مراد آخرت کے باغات اور محل ہیں لیکن یہ تفسیر کسی بھی صورت میں آیت کے ظاہری مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتی۔[2]

---

[1] خطبہ ۱۹۲ نہج البلاغہ (خطبہ قاصعہ)۔

[2] اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اس سے مراد دنیا کے محل اور آخرت کے باغات ہیں آیت میں فعل ماضی اور مضارع (جعل اور یجعل) کو ایسے توہمات کا سبب نہیں بننا چاہیے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ عربی ادب کے قواعد کے تحت جب افعال جملہ شرطیہ میں استعمال ہوتے ہیں تو ان کا زمانی مفہوم ختم ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

۱۱۔ بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝
۱۲۔ اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝
۱۳۔ وَاِذَاۤ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا ۝
۱۴۔ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا ۝
۱۵۔ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ كَانَتْ لَهُمْ
جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ۝
۱۶۔ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ۝

ترجمہ

۱۱۔ (یہ تو سب بہانے ہیں) بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلایا ہے اور ہم نے قیامت کو جھٹلانے والے لوگوں کے لیے جلانے والی آگ مہیا کر رکھی ہے۔

۱۲۔ جب یہ آگ انھیں دُور سے دیکھے گی تو اس کی وحشت ناک آواز کو سنیں گے جس میں جوش و خروش شامل ہو گا۔

۱۳۔ جب وہ طوق و زنجیر میں جکڑے ہوئے جہنم کی تنگ جگہ میں ڈالے جائیں گے تو واویلا کریں گے۔

۱۴۔ آج ایک مرتبہ واویلا نہ کرو بلکہ کئی مرتبہ واویلا کرو۔

۱۵۔ کہہ دے کہ آیا یہ بہتر ہے یا بہشت جاودانی جس کا پرہیزگاروں کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے؟ ایسی بہشت جوان کے اعمال کی جزا اور ان کی رہائش گاہ ہے۔

۱۶۔ وہ جو کچھ بھی چاہیں گے ان کے لیے وہاں موجود ہے اور اس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے یہ ایک مسلّم اور حتمی وعدہ ہے جو تمھارے پروردگار نے اپنے ذمّے لے رکھا ہے۔

تفسیر

بہشت اور دوزخ کا موازنہ

گزشتہ آیات میں توحید اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت سے کفّار کے انحراف کے بارے میں گفتگو

Marfat.com

تھی۔ ان آیات میں ان کے انحرافات اور انکار کے ایک اور حصّے کو بیان کیا گیا ہے جو قیامت اور معاد کے بارے میں ہے۔
دراصل اس حصّے کو بیان کرنے کے ساتھ یہ بات واضح ہوجائے گی کہ وہ تمام اصولِ دین میں تزلزل اور انحراف کا شکار تھے۔ خواہ وہ توحید ہو یا نبوت یا معاد اور قیامت ہو۔ گزشتہ آیات میں تو توحید اور نبوت کے بارے میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے اب تیسرے حصّے کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: بلکہ انھوں نے قیامت کو جھٹلایا ہے (بل کذبوا بالساعة)۔
کلمہ "بَلْ" کا ذکر جو اصطلاح میں "اضراب" کے لیے آتا ہے، اس لیے ہے کہ کفار توحید اور نبوت کی نفی میں جو کچھ کہتے ہیں وہ درحقیقت معاد کے انکار کی وجہ سے پیدا ہونے والے بہانے ہوتے ہیں کیونکہ جو شخص خدا کی اس قدر عظیم عدالت ثواب وجزا پر ایمان رکھتا ہے وہ اس طرح بے پرواہ ہو کر حقائق کا منہ نہیں چڑاتا اور جس پیغمبر کی نبوت کے دلائل روزِ روشن کی طرح آشکار ہیں محض چند فضول اور بے بنیاد حیلے بہانوں کی وجہ سے اس کی دعوت کا انکار نہیں کرتا اور جن بتوں کو اپنے ہاتھوں سے بنایا سنوارا ہے ان کے آگے سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔
البتہ اس مقام پر قرآنِ مجید نے استدلالی جواب پیش نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ نہ تو اہلِ منطق تھے اور نہ قابلِ استدلال، بلکہ انھیں دل ہلا دینے والی تنبیہ کے ساتھ ان کے نحس اور دردناک مستقبل کو ان کی آنکھوں کے سامنے مجسم کرتا ہے کیونکہ اس طرح کے لوگوں کے لیے ایسی ہی منطق کارگر ہوتی ہے۔ لہٰذا فرمایا گیا ہے: جو لوگ قیامت کا انکار کرتے ہیں ہم نے ان کے لیے جلا دینے والی آگ مہیا کر رکھی ہے (واعتدنا لمن کذب بالساعة سعیرًا)۔[۱]
پھر اس آتشِ سوزاں کی عجیب وغریب صفات بیان کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: جب یہ آتش انھیں دُور سے دیکھے گی تو اس طرح طیش میں آجائے گی کہ وہ اس کی وحشت ناک اور خشم آلود آواز کو سنیں گے جس میں جوش وخروش شامل ہوگا (اذا رأتهم من مکان بعید سمعوا لها تغیظًا و زفیرًا)۔

اس آیت میں کچھ ایسی منہ بولتی تعبیریں ہیں جو خدا کے اس عذاب کی شدت کی خبر دیتی ہیں۔
۱۔ خدا یہ نہیں فرماتا کہ جہنمی لوگ جہنم کی آگ کو دُور سے دیکھیں گے بلکہ فرماتا ہے کہ آگ انھیں دُور سے دیکھے گی گویا اس کی آنکھیں اور کان ہیں اور وہ ان گنہ گاروں کی چشم براہ ہے۔
۲۔ اسے اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ لوگ اس کے نزدیک ہوں اور وہ طیش میں آئے بلکہ بعض روایات کے مطابق ایک سال کی راہ کے فاصلے سے انھیں دیکھے گی اور غضبناک ہوجائے گی۔
۳۔ اس جلا دینے والی آگ کی توصیف "تغیظ" کے کلمہ کے ساتھ ہوئی ہے اور "تغیظ" غصے کی اس حالت کو کہتے ہیں جسے انسان زور زور سے چیخ وپکار کرکے ظاہر کرتا ہے۔

---

[۱] سعیرًا "سعر" (بروزن "قعر") کے مادہ سے ہے جس کے معنی ہیں آگ کا بھڑک اٹھنا۔ اسی بناء پر "سعیر" اس آگ کو کہتے ہیں جس میں شعلے بھی ہوں، وسعت بھی ہو، زبردست حرارت بھی۔

Marfat.com

۴۔ دوزخ کی آگ کے لیے "زفیر" کا لفظ بیان فرمایا گیا ہے اور "زفیر" اس حالت کو کہتے ہیں جب انسان اپنی سانس اندر کی طرف لے جاتا ہے اور پسلیاں اوپر کو اٹھتی ہیں۔ یہ عموماً اس وقت ہوتا ہے جب انسان سخت غصے کی حالت میں ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ حالات اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جہنم کی آتشِ سوزاں اس بھوکے درندے کی مانند ہے جو اپنے شکار کے انتظار میں ہوتا ہے جہنم بھی ایسے کافروں کے انتظار میں منہ کھولے ہوئے ہے (خدا کی پناہ)۔

یہ تو تھی دوزخ کی وہ کیفیت جب وہ انھیں دُور سے دیکھے گی لیکن خود جہنمیوں کی کیا کیفیت ہو گی جب وہ اس میں ڈالے جائیں گے؟ تو فرماتا ہے: جب وہ طوق اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے آتشِ جہنم کی تنگ جگہ میں ڈالے جائیں گے تو ان کے واویلا کی چیخیں بلند ہوں گی (و اذا القوا منها مكانًا ضيقًا مقرنين دعوا هنالك ثبورًا)[1]

یہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ جہنم کی جگہ بہت کم ہے کیونکہ سورہ "ق" کی آیت ۳۰ کے مطابق:

يوم نقول لجهنم هل امتلأت و تقول هل من مزيد

بروزِ قیامت ہم جتنا بھی جہنم سے کہیں گے کہ کیا تو بھر گئی ہے تو وہ کہے گی کچھ اور ہے؟

بنابریں جہنم تو وسیع ہو گی لیکن انھیں اس وسیع و عریض جگہ میں اس قدر تنگ کر دیا جائے گا کہ بعض روایات کی تصریح کے مطابق جیسے دیوار میں میخ گاڑی جاتی ہے[2]

یہاں پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "ثبور" کا لفظ دراصل "ہلاکت" اور "گل سڑ جانے" کے معنی میں ہے۔ جب انسان کو کسی بھیانک اور مہلک چیز کے سامنے لایا جاتا ہے تو بسا اوقات "واثبورا" کہہ کر چیخ مارتا ہے جس کا معنی ہے "ہائے میں مرگیا"۔

لیکن فوراً انھیں کہا جائے گا: آج صرف ایک مرتبہ "واثبورا" نہ کہو بلکہ کئی مرتبہ واثبورا کی آوازیں بلند کرو (لا تدعوا اليوم ثبورًا واحدًا وادعوا ثبورًا كثيرًا)۔

بہرحال تمھاری یہ چیخ و پکار قطعاً کارگر ثابت نہیں ہو گی اور تمھیں ہرگز موت نہیں آئے گی بلکہ تمھیں وہاں پر زندہ رہ کر ہی عذاب کا مزہ چکھنا ہو گا۔

درحقیقت یہ آیت بالکل سورۂ طور کی آیت ۱۶ کی مانند ہے جس میں ارشاد ہوتا ہے:

اصلوها فاصبروا او لا تصبروا سواء عليكم انما تجزون ما كنتم تعملون

یعنی جہنم کی آگ میں جلتے رہو خواہ صبر کرو یا نہ کرو، تمھارے لیے دونوں صورتیں یکساں ہیں، تم

---

[1] "مقرنین" "قرن" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے دو یا چند چیزوں کا باہمی اجتماع۔ جس رسی سے کئی چیزوں کو باندھتے ہیں اسے بھی قرن کہتے ہیں لیکن جس شخص کو طوق اور زنجیروں میں جکڑ دیا جاتا ہے اسے بھی ——— اسی مناسبت سے ——— "مقرن" کہتے ہیں (اس لغت کی مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی دسویں جلد سورۂ ابراہیم کی آیت ۴۹ کی طرف رجوع فرمائیں)

[2] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اپنے کیے کی جزا پا رہے ہو۔

اب رہی یہ بات کہ کافروں سے یہ باتیں کون کرے گا ؟ تو قرآن یہ بتاتے ہیں کہ عذاب کے فرشتے ہی ہوں گے کیونکہ ان کے ساتھ فرشتے ہی سروکار رکھیں گے۔

انھیں کس لیے کہا جائے گا کہ " واثبورا " صرف ایک مرتبہ نہ کہو بلکہ کئی بار کہو۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ ان کے لیے دردناک عذاب عارضی اور محدود نہیں ہوگا کہ ایک بار واثبورا کہہ دینے سے ختم ہوجائے بلکہ وہ ہمیشہ اسی جملے کو دہراتے رہیں اور پھر یہ کہ ان ظالموں کو خداوند عالم مختلف انداز میں عذاب دیتا رہے گا اور وہ ہر نئے عذاب کے موقع پر اپنی موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے اور واویلا کریں گے گویا وہ بار بار مارے اور جلائے جاتے رہیں گے۔

پھر روئے سخن رسول اللہؐ کی طرف کرکے آنحضرتؐ کے ذریعے کفار کو ایک بات کے فیصلے کی دعوت دیتا ہے اور فرماتا ہے : اے پیغمبر! کہہ دیجیے کہ یہ دردناک انجام بہتر ہے یا وہ بہشت بریں جس کا پرہیزگار لوگوں سے وعدہ کیا جاچکا ہے، جو ان کے اعمال کی جزا بھی ہے اور رہائش گاہ بھی (قل اذالك خیر ام جنة الخلد التی وعد المتقون کانت لهم جزاء و مصیرًا)۔

وہی بہشت کہ جس میں ہر وہ چیز مہیا ہے جس کی وہ خواہش کریں گے (لهم فیها ما یشاءون)۔

وہی بہشت کہ جس میں وہ ہمیشہ کے لیے رہیں گے (خالدین)۔

" تمھارے پروردگار کا یہ حتمی اور مسلّم وعدہ ہے جسے اس نے اپنے ذمے لے لیا ہے (کان علی ربك وعدًا مسئولًا)۔

انھیں فیصلے کی دعوت اس لیے نہیں ہے کہ اس میں کسی کو کوئی شک وشبہ ہے اور نہ ہی اس دردناک اور وحشت ناک عذاب کا ان بے نظیر نعمتوں سے کوئی مقابلہ اور موازنہ کیا جاسکتا ہے بلکہ اس طرح کے سوالات اور فیصلہ جات کی دعوت صرف ان کے سوئے ہوئے ضمیروں کو بیدار کرنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ اس طرح سے وہ بیدار ہوکر کسی واضح امر اور ایک دوراہے پر آکھڑے ہوں۔

اگر تو وہ کہتے ہیں کہ وہی نعمتیں بہتر اور برتر ہیں (اور یقیناً کہنا بھی چاہیے) تو خود اپنے خلاف فیصلہ دیں گے کیونکہ ان کے عمل اس کے برعکس ہیں اور اگر کہتے ہیں کہ نعمتوں سے عذاب بہتر ہے تو اپنی حماقت اور بے عقلی پر مہر تصدیق ثبت کردیں گے۔ یہ ٹھیک اسی طرح ہوگا کہ جیسے ہم کسی سکول یا کالج سے بھاگنے والے طالب علم کو خبردار کرتے ہوئے کہیں کہ دیکھو! جو لوگ علم کے حصول سے فرار کرتے ہیں یقیناً وہ تباہ و برباد ہوجاتے ہیں اور ان کا ٹھکانا زندان ہوتا ہے آیا جیل بہتر ہے یا اعلیٰ منصب؟

چند ایک نکات

۱۔ اس نکتے کی طرف بھی توجہ کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا آیات میں ایک مقام پر تو " خلد " اور ہمیشگی کو بہشت کی صفات کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے اور دوسری جگہ اہل بہشت کے " خالد " اور ہمیشہ رہنے کی حالت بیان کی گئی ہے اور یہ دونوں

Marfat.com

چیزیں اس ــــــــ حقیقت کی غماز ہیں کہ بہشت بھی ہمیشہ کے لیے ہے اوراس میں رہنے والے بھی وہاں ہمیشہ رہیں گے ۔
۲۔ " لهم فیها ما یشاءون " (جو کچھ وہ چاہیں گے بہشت میں موجود ہوگا) کا جملہ جہنمیوں کے بارے میں آنے والے اس جملہ کے ٹھیک مقابل میں ہے؛

وحیل بینهم و بین ما یشتهون

جہنمیوں اوران کی مطلوبہ چیزوں کے درمیان رکاوٹ کھڑی کردی گئی ہے ۔(سبا ــــ ۵۴)

۳۔ بہشت کے بارے میں "مصیر" (ٹھکانا، لوٹ آنے کی جگہ) کو "جزاء" کے بعد ذکر کیا گیا ہے، درحقیقت جزا کے مفہوم میں جو کچھ آسکتا ہے یہ اسی کی تاکید ہے اور جہنمیوں کے ٹھکانے اوران کی سزا کا متقابل نقطہ ہے جو سابقہ آیات میں ذکر ہو چکا ہے کہ ان کے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوں گے اور خود ایک تنگ جگہ میں مقید ہوں گے ۔

۴۔ " کان علی ربك وعدًا مسئولًا " کا جملہ اس بات کا طرف اشارہ ہے کہ مومنین اپنی دعاؤں میں تمام نعمتوں سمیت بہشت کی درخواست کرتے ہیں گویا وہ "سائل" ہیں اور خداوندِ عالم "مسئول عنہ" ہے جیسا کہ خداوندعالم سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۹۴ میں مومنین کا قول بیان کرتا ہے :

ربنا و اٰتنا ما وعدتنا علی رسلك

"اے ہمارے پروردگار! جو کچھ تو نے ہمارے بارے میں اپنے رسولوں سے وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں عنایت فرما"

نیز زبانِ حال سے یہ درخواست تمام مومنین کی ہے کیونکہ جو شخص بھی اس کے فرمان کی اطاعت کرتا ہے زبانِ حال کے ساتھ اس کی یہی درخواست ہے ۔

اسی طرح فرشتے بھی مومنین کے بارے میں خدا سے یہی درخواست کرتے ہیں جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۸ میں ہے:

ربنا و ادخلهم جنات عدن التی وعدتهم

"اے ہمارے پروردگار! تو نے مومنین کے ساتھ بہشت کے جن جاودانی باغات کا وعدہ فرمایا تھا ان میں انھیں داخل فرما"

یہاں پر ایک اور تفسیر بھی ملتی ہے اور وہ یہ کہ "مسئولا" کا کلمہ خداوندِ عالم کے حتمی وعدے کی تاکید ہے یعنی یہ وعدہ اس قدر حتمی قطعی اور یقینی ہے کہ مومنین اس کا مطالبہ خدا سے کر سکتے ہیں۔ یہ بعینہ ایسے ہے جیسے ہم کسی سے کوئی وعدہ کریں اور اسے یہ حق بھی دے دیں کہ جب چاہے ہم سے اس کا مطالبہ کر سکتا ہے ۔

البتہ اگر ان تمام معنی کو "مسئولا" کے وسیع مفہوم میں جمع کر دیں تو کوئی حرج نہیں ۔

۵۔ "لهم فیها ما یشاءون" (جو کچھ وہ چاہیں گے وہاں موجود ہوگا) کے جملے کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ لوگوں کے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر جملے کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھیں تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ مثلاً اگر بہشتی لوگ انبیاء اور اولیاء کے مقام کی بھی خواہش کریں تو وہ انھیں مل جائے گا یا اگر اپنے گناہ گار دوستوں اور رشتہ داروں کی نجات کی خواہش کریں تو وہ بھی پوری

Marfat.com

ہو جائے گی یا اس قسم کے دوسرے سوالات۔

لیکن اگر ایک نکتے کی طرف توجہ کی جائے تو اس سوال کا جواب واضح ہو جائے گا وہ یہ کہ اہل بہشت کی آنکھوں کے سامنے سے تمام پردوں کو ہٹا دیا جائے گا۔ وہ حقائق کو اچھی طرح سمجھ لیں گے اور باہمی تناسب ان کے لیے مکمل طور پر واضح ہو جائے گا۔ وہ کبھی اس بارے میں سوچیں گے بھی نہیں کہ خدا سے ایسی چیزوں کی درخواست کریں جیسے ہم دنیا میں اس بات کا تقاضا نہیں کر سکتے کہ پرائمری کلاس کا ایک طالب علم یونیورسٹی کا پروفیسر بن جائے۔ آیا اس طرح کی باتیں دنیا میں کسی عقل مند کے ذہن میں آسکتی ہیں؟ اگر یہاں پر ایسا نہیں ہے تو وہاں پر بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔

ان سب چیزوں سے قطعِ نظر ان کی خواہشات خداوند عالم کی مرضی کے تابع ہوں گی۔ وہ وہی کچھ چاہیں گے جو خدا چاہے گا۔

Marfat.com

۱۷۔ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَقُولُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ
عِبَادِيْ هٰۤؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ۝
۱۸۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ
اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوْا
قَوْمًا بُوْرًا ۝
۱۹۔ فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا وَّلَا نَصْرًا وَمَنْ
يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ۝

ترجمہ

۱۷۔ اس دن کا سوچو جب خدا ان سب کو اور ان معبودوں کو جن کی یہ خدا کے علاوہ پرستش کرتے ہیں اکٹھا کرے گا اور ان سے کہے گا: کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا ہے یا وہ خود گمراہ ہوئے ہیں؟

۱۸۔ تو وہ (جواب میں) کہیں گے تو پاک و منزہ ہے ہمارے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ ہم تیرے علاوہ اور لوگوں کو اپنا ولی بناتے، لیکن تو نے انھیں اور ان کے آباؤ اجداد کو نعمتوں سے نوازا۔ یہاں تک کہ انھوں نے (شکر نعمت کی بجائے) تیرے ذکر کو فراموش کر دیا اور ہلاک ہو گئے۔

۱۹۔ (خداوند عالم ان سے فرمائے گا دیکھو) جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ تمھاری تکذیب کر چکے ہیں اب نہ تو تم عذاب خدا کو برطرف کر سکتے ہو اور نہ ہی کسی سے مدد طلب کر سکتے ہو اور تم میں سے جو شخص بھی ظلم کرے گا ہم اسے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔

تفسیر

معبودوں اور گمراہ پجاریوں کا مقدمہ

گزشتہ آیات میں قیامت کے دن مومنین اور مشرکین کے انجام کی بات ہو رہی تھی۔ زیر بحث آیات اسی موضوع کو

Marfat.com

ایک اور صورت میں پیش کر رہی ہیں خداوندِ عالم بروزِ قیامت "مشرکین کے معبودوں" سے جو سوال کرے گا اسے اور وہ جو جواب دیں گے اسے بھی ایک تنبیہ کی صورت میں بیان فرما رہا ہے۔

پہلے تو فرماتا ہے: اس دن کا سوچو جب خدا ان سب کو اور ان کے معبودوں کو کہ جن کی اللہ کے علاوہ یہ لوگ عبادت کرتے ہیں جمع اور محشور کرے گا (ویوم یحشرھم وما یعبدون من دون اللہ)۔

اور ان سے سوال کرے گا "آیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا ہے یا یہ خود گمراہ ہو گئے ہیں (فیقول ءانتم اضللتم عبادی ھؤلاء ام ھم ضلوا السبیل)۔

لیکن وہ جواب دیں گے پروردگارا! تو پاک و منزہ ہے ہمارے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ تجھے چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ولی بناتے (قالوا سبحانک ما کان ینبغی لنا ان نتخذ من دونک من اولیاء)۔

نہ صرف یہ کہ ہم نے انھیں اپنی طرف دعوت نہیں دی بلکہ ہم تو تیری ولایت اور عبودیت کے معترف بھی تھے اور تیرے علاوہ کسی اور کو نہ تو اپنا معبود سمجھا اور نہ ہی دوسروں کا۔

ان کی گمراہی کا سبب یہ تھا کہ تو نے انھیں اور ان کے آباؤ اجداد کو دنیاوی نعمتوں سے نوازا (اور وہ تیری ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے عیش و عشرت اور دنیاوی لذات میں کھو گئے) اور تجھے بھلا دیا (ولکن متعتھم واٰباءھم حتّٰی نسوا الذکر)۔

اسی وجہ سے وہ تباہ و برباد ہو گئے (وکانوا قومًا بورًا)۔

اب خدا کا روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور فرماتا ہے: تمھارے یہ معبود تو تمھاری تکذیب کر رہے ہیں (اور یہ جو تم کہتے تھے کہ انھوں نے تمھیں گمراہ کیا ہے اور اپنی عبادت کی طرف دعوت دی ہے اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ تمھیں جھٹلا رہے ہیں) (فقد کذبوکم بما تقولون)۔

جب صورتِ حال یہ ہے اور تم خود ہی گمراہ ہوئے ہو تو اب تم عذابِ الٰہی کو اپنے سے برطرف نہیں کر سکتے اور نہ تم اپنی مدد آپ کر سکتے ہو اور نہ ہی کسی دوسرے سے مدد طلب کر سکتے ہو (فما تستطیعون صرفًا ولا نصرًا)۔

اور جو شخص بھی تم میں سے ظلم کا ارتکاب کرے گا ہم اسے بڑے سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے (ومن یظلم منکم نذقہ عذابًا کبیرًا)۔

اس میں شک نہیں کہ ظلم کا ایک وسیع مفہوم ہے اگرچہ اس آیت میں موضوعِ بحث "شرک" ہے لیکن یہ بھی ظلم کا ایک واضح ترین مصداق ہے اس طرح سے مفہوم آیت کے کلی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ "من یظلم" فعل مضارع کی صورت میں آیا ہے اور اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ بحث کا ابتدائی حصّہ اگرچہ قیامت سے متعلق ہے لیکن آخری جملہ انھیں دنیا میں خطاب کی صورت میں آیا ہے۔ گویا قیامت کے دن گمراہ کاروں اور معبودوں کی گفتگو سن کر مشرکین کے دل اثر حاصل کرنے کے لیے تیار ہو چکے ہیں، لہٰذا روئے سخن آخرت سے دنیا کی طرف کر لیا اور فرمایا: تم میں سے جو شخص بھی ظلم کا مرتکب ہو گا ہم اسے بڑے سخت

Marfat.com

عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔[۱]

چند ایک نکات

۱۔ معبود سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب میں مفسّرین کے درمیان دو تفسیریں مشہور ہیں:

پہلی تفسیر تو یہ ہے کہ ان سے مراد انسانی معبود (جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام) یا شیطانی معبود (جیسے جنات) یا فرشتے ہیں ان میں سے ہر ایک کو مشرکین کے مختلف گروہوں نے انتخاب کیا ہوا تھا۔

چونکہ یہ صاحبانِ عقل وشعور ہیں لہٰذا ان سے پوچھ گچھ کی جائے گی کیونکہ مشرکین کہتے ہیں کہ ان معبودوں ہی نے ہمیں اپنی عبادت کی طرف بلایا ہے لہٰذا اتمامِ حجّت کے طور پر ان سے پوچھا جائے گا کہ آیا ان کی یہ بات صحیح ہے تو وہ بڑی صراحت کے ساتھ اس کی تردید کریں گے۔

دوسری تفسیر جسے کچھ اور مفسرین نے ذکر کیا ہے یہ ہے کہ بروز قیامت خداوندِ عالم "بتوں" کو ایک طرح کی زندگی، ادراک اور شعور عطا فرمائے گا تاکہ ان سے جو باز پرس کی جائے تو وہ اس کا بہتر طریقے پر جواب دے سکیں کہ خداوندا! ہم نے انھیں گمراہ نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی خواہشاتِ نفسانی اور کبر وغرور کی وجہ سے گمراہ ہو چکے ہیں۔

یہ احتمال بھی ہے کہ یہ جملہ تمام معبودوں کے لیے ہو خواہ وہ صاحبانِ عقل وشعور ہیں اور جو اپنی زبان سے حقائق اور واقعات بیان کریں گے خواہ عقل وشعور سے عاری خدا کی مخلوق ہے اور جو زبانِ حال سے حقائق کو بیان کرے گی۔

لیکن آیت میں پائے جانے والے قرائن پہلی تفسیر سے زیادہ ہم آہنگ ہیں کیونکہ افعال اور ضمائر بتا رہے ہیں کہ یہاں صاحبانِ عقل وشعور کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے اور یہ حضرت عیسیٰؑ اور فرشتوں جیسے معبودوں کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

اس کے علاوہ "فقد کذبوکم" (انھوں نے تمھیں جھٹلایا) کے جملے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین نے پہلے یہ دعویٰ کیا کہ ان معبودوں نے ہمیں گمراہ کیا ہے اور اپنی عبادت کی دعوت دی ہے اور یہ بعید ہے کہ وہ ایسا دعویٰ پتھر اور لکڑی کے بنے ہوئے بتوں کے بارے میں کریں کیونکہ ——— جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی داستان میں مذکور ہے کہ ——— انھیں اچھی طرح یقین ہے کہ بت بولا نہیں کرتے "لقد علمت ما هٰؤلاء ینطقون"۔ (سورۂ انبیاء ——— ۶۵)

جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہے کہ خدا عیسیٰؑ سے دریافت فرمائے گا:

"ء انت قلت للناس اتخذونی و امی الٰهین من دون الله"

آیا تم نے لوگوں سے کہا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بناؤ؟ (مائدہ ——— ۱۱۶)

---

[۱] ایک احتمال یہ بھی ہے کہ یہ آخری جملہ شاید قیامت میں مشرکین کے ساتھ گفتگو کا ایک حصّہ ہے اور فعل مضارع ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ "ومن یظلم ......" کا جملہ ایک کلیہ قاعدہ کی صورت میں آیا ہے جو کہ "جملہ شرطیہ" کی صورت میں ہے اہلِ علم جانتے ہیں کہ جملہ شرطیہ میں افعال کا تعلق صرف شرط اور جزا کی حد تک ہوتا ہے زمانے کا مفہوم ختم ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

معبودوں کی نوعیت خواہ کچھ ہو، یہ بات مسلّم ہے کہ مشرکین اور بُت پرستوں کے دعوے بے بنیاد اور فضول ہیں اور کسی معبود نے انھیں اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ معبود جواب میں یہ نہیں کہیں گے کہ خدایا ہم نے انھیں اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی بلکہ یہ کہیں گے کہ ہم نے تو اپنی عبادت کے لیے تیری ہی ذات کا انتخاب کیا تھا۔ یعنی جب ہم خود تیری عبادت کرتے ہیں تو دوسروں کو تو بطریق اولیٰ تیرے غیر کی طرف راہنمائی نہیں کی۔ خاص کر یہ بات "سبحانك" (تو پاک ہے) اور "ما كان ينبغى لنا" (ہمارے لیے زیبا نہیں تھا) کے جملوں سے مربوط ہے جو ان کے ادب اور توحید کے اعتراف کو نمایاں کرتی ہے۔

۲۔ **توحید سے انحراف کیوں؟** قابلِ توجہ یہ امر ہے کہ یہ معبود مشرک لوگوں کے انحراف کی وجہ ان کی آسودہ اور خوشحال زندگی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خداوندا! تو نے انھیں اور ان کے آباؤ اجداد کو اس زندگی کی نعمتوں سے نوازا جس کی وجہ سے انھوں نے تجھے بھلا دیا وہ نعمت عطا کرنے والے کی معرفت حاصل کرنے، اس کا شکر ادا کرنے اور اس کی اطاعت کرنے کی بجائے غفلت اور غرور کے چکر میں پھنس کر تجھے اور روزِ قیامت کو بھول گئے۔ یہی بات ہے کہ جن لوگوں کا ظرف چھوٹا اور ایمان کی بنیادیں کمزور ہیں ان کے لیے خوش حال زندگی ایک تو "غرور آفرین" ہے کیونکہ جب انھیں بے پناہ نعمتیں مل جاتی ہیں تو وہ اپنے قابو میں نہیں رہتے اور خدا کو بھلا دیتے ہیں حتیٰ کہ کبھی کبھی تو فرعون کی مانند "انا الله" (میں خدا ہوں) کا نعرہ لگانا بھی شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ بے لگام اور آزاد ہوں اور ان کی عیش و عشرت اور خواہشات کی تکمیل کے آگے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ہو اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز نامی چیزیں انھیں اپنے مقصد تک پہنچنے سے نہ روکیں، یہی وجہ ہے کہ وہ شرعی قوانین اور روزِ جزا کو تسلیم کرنے سے کنی کتراتے ہیں۔

اب آسودہ حال لوگوں میں سے بہت کم ایسے ہیں جو خدا کے دین اور انبیاء کی تعلیمات کے طرفدار ہوں یہ تو مستضعف اور غریب لوگ ہی ہوتے ہیں جو دین و مذہب کے طرفدار اور ایثار پیشہ و فاشعار ہوتے ہیں۔

البتہ استثناء تو دونوں طبقوں میں ہوتا ہی ہے لیکن بات اکثریت کی ہو رہی ہے اور اکثریت ان لوگوں کی ہے جو ابھی بتایا جا چکا ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ آیتِ بالا میں صرف ان لوگوں کی امارت اور خوشحالی تک ہی بات محدود نہیں ہے بلکہ ان کے آباؤ اجداد کی خوشحالی کا ذکر بھی ہے کیونکہ انسان جب بچپن ہی سے ناز و نعمت کی زندگی میں پرورش پائے گا تو فطری بات ہے کہ وہ عموماً اپنے اور دوسرے میں فرق محسوس کرے گا اور آسانی کے ساتھ خوشحال زندگی کو خیرباد کہنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

اس کے برعکس خدائی احکام کی بجا آوری اور مذہبی مسائل کی پابندی کے لیے ایثار، ہجرت، جہاد بلکہ بعض اوقات شہادت تک کو قبول کرنا پڑتا ہے انواع و اقسام کی نعمتوں سے محروم ہونا پڑتا ہے اور دشمن کے آگے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کرنا پڑتا اور یہ بات امراء طبقہ کے مزاج کے بالکل خلاف ہے البتہ جن لوگوں کی شخصیت مادیت کے بندھنوں سے بالکل آزاد ہے اگر کبھی کچھ پاس ہوتا ہے تو خدا کا شکر بجالاتے ہیں اور اگر نہیں ہوتا تو گھبرا نہیں جاتے دوسرے لفظوں میں وہ اپنی مادی زندگی پر حاکم ہوتے ہیں نہ کہ محکوم۔

اس وضاحت سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ "نسوا الذكر" کے جملے سے مراد یادِ خدا کو فراموش کر دینا ہے جیسا کہ

Marfat.com

سورہ حشر آیہ ۱۹ میں اس جملے کی بجائے " ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ " آیا ہے یاذکر کی فراموشی سے مراد یوم قیامت اور عدلِ الٰہی کی فراموشی ہے جیسا کہ سورہ ص کی آیہ ۲۶ میں ہے:

لھم عذاب شدید بما نسوا یوم الحساب

روزِ حساب کو فراموش کرنے کی وجہ سے ان کے لیے سخت عذاب ہے۔

اور یا خدا اور قیامت دونوں کو فراموش کرنا مراد ہے۔

۲۔ "بور" کیا ہے؟

"بور" کا لفظ "بوار" سے لیا گیا ہے جو اصل میں کسی چیز کی سخت کساد بازاری کے معنی میں ہے اور چونکہ کساد بازاری کی شدت اس کے فاسد ہونے کا سبب بن جاتی ہے جیسا کہ عربوں کی ضرب المثل ہے " کسد حتیٰ فسد " لہٰذا یہ کلمہ فاسد ہونے اور ہلاک ہو جانے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس بنجر زمین کو "بائر" کہتے ہیں جو درختوں، پھولوں اور سبزے سے خالی ہوتی ہے کیونکہ در حقیقت وہ مردہ اور فاسد ہو چکی ہوتی ہے۔

بنا بریں " کانوا قوما بورًا " اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امراء کا یہ گروہ خوشحال اور مادّی زندگی میں مستغرق ہو کر خدا اور قیامت کو فراموش کر چکا ہے اور اسی وجہ سے وہ فساد اور ہلاکت کا شکار ہو چکا ہے اور ان کے دل بنجر زمین کی مانند خشک ہو چکے ہیں اب ان سے نہ تو انسانیت کی سربلندی کے لیے قیمتی پھولوں کی توقع ہے اور نہ ہی معنوی زندگی اور فضیلت کے میووں کی۔

ان قوموں کے حالات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے جو آج ناز و نعمت میں غرق خدا اور خلقِ خدا سے بے خبر ہیں تو آیت کے عمیق معانی کا پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کس طرح اخلاقی فساد کے سمندر میں غرق ہو چکی ہیں اور فضائلِ انسانی کے میوے ان کی بنجر زمین سے کس طرح ناپید ہو چکے ہیں[1]

---

[1] بعض لوگ "بور" کو مصدر سمجھتے ہیں جو کبھی کبھار اس کے فاعل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور واحد تثنیہ اور جمع کے صیغے کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے جبکہ بعض نے اسے "بائر" کی جمع مانا ہے۔

Marfat.com

۲۰۔ وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ اِلَّاۤ اِنَّهُمۡ لَيَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَيَمۡشُوۡنَ فِى الۡاَسۡوَاقِ ؕ وَجَعَلۡنَا بَعۡضَكُمۡ لِبَعۡضٍ فِتۡنَةً ؕ اَتَصۡبِرُوۡنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيۡرًا ۠

ترجمہ

۲۰۔ ہم نے تجھ سے پہلے رسولوں کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہ بھی کھانا کھاتے اور بازار میں چلتے پھرتے تھے اور تم میں سے بعض کو دوسرے بعض لوگوں کے لیے آزمائش کا ذریعہ قرار دیا ہے کہ آیا صبر کرتے ہو؟ (اور امتحان سے عہدہ برآ ہوتے ہو؟) اور تیرا پروردگار بصیر اور دیکھنے والا ہے۔

شانِ نزول

بعض مفسرین نے مندرجہ بالا آیات میں سے پہلی آیت کی شانِ نزول کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ مشرکین کے کچھ سرغنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آکر کہنے لگے اے محمدؐ! تو ہم سے کیا چاہتا ہے؟ اگر حکومت کی ضرورت ہے تو ہم تجھے اپنا حاکم اور سرپرست بناتے ہیں اگر مال چاہتے ہو تو ہم تجھے مال دیئے دیتے ہیں وغیرہ۔ لیکن جب آپؐ نے ان کی کسی پیش کش کو بھی قبول نہ کیا اور نہ ہی ان کی خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تو لگے وہ مختلف قسم کی الزام تراشی کرنے اور کہنے لگے کہ تو خدا کا رسول کیسے ہو سکتا ہے جبکہ تو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازار میں بھی آتا جاتا ہے؟

وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کھانا کھانے پر مطعون کرنے لگے کیونکہ ان کے خیال میں پیغمبر کو فرشتہ ہونا چاہیے تھا وہ آپؐ کو بازار آنے جانے پر ملامت کرنے لگے کیونکہ وہ کسریٰ وقیصر اور دوسرے جابر بادشاہوں کے بارے میں جانتے تھے کہ انھوں نے کبھی بھی بازار میں قدم نہیں رکھا جبکہ آنحضرتؐ کا عام لوگوں کے ساتھ بازار میں میل ملاپ اور اٹھنا بیٹھنا تھا۔ جس سے وہ لوگوں کو خدا کے امر و نہی کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے چنانچہ مکار لوگوں نے اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ وہ ہم پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہا ہے جبکہ اس کی روش اور طریقہ کار بادشاہوں کے برعکس ہے تو ایسے موقع پر اوپر والی آیت نازل ہوئی اور اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کی سیرت سابقہ انبیاء جیسی ہے [۱]

---

[۱] اگرچہ روایت بالا کا مضمون بہت سی تفاسیر میں آیا ہے لیکن ہم نے جو کچھ اوپر ذکر کیا ہے اس روایت کے مطابق ہے جسے قرطبی نے اپنی تفسیر کی جلد ۷، ص ۱۴، ۴۷ پر درج کیا ہے۔

Marfat.com

تمام پیغمبر ایسے تھے

گزشتہ چند آیات میں مشرکین کی مکاری اور اعتراضات کا ذکر ہے کہ پیغمبر کیوں کھانا کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں آتا جاتا ہے؟ پھر ان اعتراضات کا مجمل اور مختصر سا جواب بھی دیا گیا ہے لیکن اس آیت میں مندرجہ بالا اعتراضات کا واضح اور صریح تر جواب دیا گیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے: تجھ سے پہلے ہم نے کسی بھی رسول کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ ان سب کا تعلق نوعِ انسانی سے تھا وہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی آیا جایا کرتے تھے (اور لوگوں سے بھی ان کا میل ملاپ تھا) (و ما ارسلنا قبلك من المرسلين الا انهم ليأكلون الطعام و يمشون فى الاسواق)۔

اس کے ساتھ ساتھ "ہم نے تم میں سے بعض کو دوسرے بعض لوگوں کے لیے آزمائش و امتحان کا ذریعہ قرار دیا" (وجعلنا بعضكم لبعض فتنة)۔

یہ آزمائش ممکن ہے کہ اس وجہ سے ہو کہ انبیاء کا انتخاب نوعِ انسانی سے کیا گیا ہے اور وہ بھی ان انسانوں سے جن کا تعلق معاشرے کے غریب اور محروم طبقے سے ہے اور یہ ایک بہت بڑی آزمائش ہے کیونکہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے ہم نوع افراد کا کہنا ماننے سے گھبراتے ہیں خاص کر ان لوگوں کا جو مالی لحاظ سے کمزور ہوتے ہیں اور ان کا اپنا تعلق معاشرتی لحاظ سے اونچے گھرانوں سے ہوتا ہے یا ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے یا معاشرے میں خوب جانے پہچانے ہوتے ہیں۔

آزمائش سے متعلق یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عام لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے آزمانا ہے کیونکہ جو افراد کام کرنے سے عاجز ہوتے ہیں، بیمار، یتیم اور مصیبت زدہ ہوتے ہیں وہ تندرست، قوی اور صحیح سالم لوگوں کے لیے آزمائش ہوتے ہیں اور جو صحیح سالم، تندرست اور طاقت ور ہوتے ہیں وہ ضعیف و ناتواں افراد کے لیے آزمائش ہوتے ہیں کہ اول الذکر اپنے انسانی فریضے کو دوسرے گروہ کے ساتھ کیسے پورا کرتا ہے اور ثانی الذکر خدا کی رضا پر کیونکر راضی ہوتا ہے۔

جہاں تک ان دونوں تفاسیر کا تعلق ہے ان کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ دونوں تفسیریں آیت کے وسیع مفہوم میں جمع کی جائیں اور وہ مفہوم ہے لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعے آزمائش۔ اسی کے ساتھ ساتھ قرآن سب کو خطاب کرتے ہوئے سوال فرماتا ہے: آیا صبر کرو گے (اتصبرون)۔

کیونکہ ایسی تمام آزمائشوں میں کامیابی کا اہم ترین عنصر صبر و شکیبائی ہے۔ ایسی سرکش خواہشات کا مقابلہ بھی صبر و استقامت ہی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے جو قبولِ حق میں مانع ہوتی ہیں اور صبر و استقامت ہی کے ذریعے ان مشکلات کا سامنا کیا جا سکتا ہے جو فرض کی ادائیگی میں حائل ہوتی ہیں۔ اسی طرح صبر ہی کے ذریعے ان مصائب اور سخت حوادث کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے جو قدم قدم پر ان کو درپیش ہوتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ صبر ہی کے ذریعے اس عظیم امتحان میں کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔[1]

---

[1] خدائی آزمائش کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۵۵ کی تشریح۔

Marfat.com

آخر میں تنبیہ کی صورت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: تمہارا پروردگار ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے بصیر اور دیکھنے والا ہے (وکان ربك بصیرًا)۔

مبادا وہ یہ تصور کرلیں کہ خدائی آزمائش کے سلسلے میں کوئی چیز اس کی دیدۂ بینا اور علم مطلق سے پوشیدہ رہ گئی ہے نہیں نہیں وہ ہر ایک چیز کو اچھے طریقے سے جانتا اور دیکھتا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پر ایک سوال پیش آتا ہے کہ آیاتِ بالا میں قرآن مجید نے انبیاء کے بارے میں مشرکین کے جن اعتراضات کا یہ جواب دیا ہے کہ وہ سب نوعِ انسانی میں سے تھے اس سے نہ صرف مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ اشکال اور بھی بڑھ جاتا ہے کیونکہ اس طرح سے وہ اپنے اعتراض کو پیغمبر اسلامؐ کی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے تمام دوسرے انبیاء پر بھی یہی اعتراض کرسکتے ہیں (کہ وہ کیسے پیغمبر تھے کہ کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی آتے جاتے تھے)۔

قرآنی آیات کی رُو سے ان کا اعتراض صرف پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی تک ہی محدود تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ آپ نے یہ روش اور طریقہ کار اپنا رکھا ہے لہٰذا وہ کہتے تھے۔

مال ھذا الرسول ....

یہ رسول اس طرح کیوں ہے؟

قرآن ان کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ "یہ صرف تجھی پر منحصر نہیں کہ تو کھانا بھی کھاتا ہے اور بازار میں بھی آتا جاتا ہے بلکہ انبیاء ماسلف بھی یونہی کیا کرتے تھے بالفرض اگر وہ اپنے اعتراضات کا دائرہ تمام انبیاء علیہم السلام تک وسیع کرتے ہیں تو قرآن اس کا بھی جواب دے رہا ہے اور وہ یہ کہ:

ولو جعلناہ ملکًا لجعلناہ رجلًا (الانعام ـــ ۹)

فرض کرلیا کہ پیغمبر اسلام کو ہم فرشتہ بناتے تو پھر بھی ناگزیر تھا کہ ہم اسے انسانی صورت میں بھیجتے (تاکہ وہ تمام حالات میں بنی نوعِ انسان کے لیے ایک نمونہ عمل ہوتا)۔

اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انسانوں کی رہبری اور پیشوائی صرف انسان ہی کرسکتا ہے جو ان کی ہر قسم کی ضروریات، مشکلات اور مسائل سے آگاہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

۲۱۔ وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰئِكَةُ أَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۗ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوا فِي أَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيرًا ○

۲۲۔ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلٰئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِينَ وَيَقُولُونَ حِجْرًا مَّحْجُورًا ○

۲۳۔ وَقَدِمْنَا إِلٰى مَا عَمِلُوا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَاءً مَّنْثُورًا ○

۲۴۔ أَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّأَحْسَنُ مَقِيلًا ○

ترجمہ

۲۱۔ اور وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی اُمید نہیں رکھتے (اور قیامت کا انکار کرتے ہیں) کہتے ہیں: ہم پر فرشتے کیوں نازل نہیں ہوتے؟ یا ہم اپنے رب کو اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھتے؟ انھوں نے اپنے بارے میں تکبّر کیا اور بہت بڑی سرکشی کے مرتکب ہوئے۔

۲۲۔ (وہ اپنی آرزوؤں کو پہنچ جائیں گے لیکن) جس دن فرشتوں کو دیکھیں گے تو وہ دن مجرمین کی خوشخبری کا نہیں ہوگا (بلکہ ان کی سزا اور عذاب کا دن ہوگا) اور وہ کہیں گے ہمیں امان دو، ہمیں معاف کر دو۔

۲۳۔ اور ہم ان کے ان اعمال کی طرف آگے بڑھیں گے جو وہ انجام دے چکے ہیں اور ان اعمال کو غبار کے ذرّوں کی مانند بکھیر دیں گے۔

۲۴۔ اس دن بہشتیوں کا ٹھکانا سب سے بہتر اور ان کی رہائش گاہ سب سے عمدہ ہوگی۔

تفسیر

بہت بڑے دعوے

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ توحید اور قیامت پر عقیدہ رکھنے کے نتیجے میں انسان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اور اسے جو ذمہ داریاں نبھانا پڑتی ہیں ان سے جان چھڑانے کے لیے ہٹ دھرم مشرکین نے پیغمبرِ خدا کی ذات پر مختلف قسم کے اعتراضات شروع کر دیے

Marfat.com

جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ پیغمبر ہماری طرح کھاتا پیتا کیوں ہے اور کیوں ہماری طرح بازار میں آتا جاتا ہے؟ اس کا جواب ہم ابھی ابھی پڑھ چکے ہیں۔

ان آیات میں ان مشرکین کے دو اور اعتراضات کا تذکرہ ہے اور ساتھ ہی ان کا جواب بھی پیش کیا گیا ہے۔

پہلے تو فرمایا گیا ہے: جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے (اور قیامت کا انکار کرتے ہیں) کہتے ہیں کہ ہم پر فرشتے نازل کیوں نہیں ہوتے یا اپنے پروردگار کو ہم اپنی آنکھوں سے کیوں نہیں دیکھ پاتے (و قال الذین لا یرجون لقائنا لولا انزل علینا الملائکۃ او نری ربنا)۔

بالفرض مان لیا کہ پیغمبر بھی ہماری طرح عمومی زندگی گزار سکتے ہیں لیکن یہ بات تو ماننے کے قابل نہیں ہے کہ وحی کا فرشتہ ان کے پاس آئے اور ہم نہ دیکھ پائیں اگر فرشتہ ظاہری طور پر ہمیں نظر آئے اور آپ کی نبوّت کی تصدیق کرے یا وحی کا کچھ حصہ ہمارے سامنے بیان کرے تو اس میں کیا حرج ہے؟

یا اگر ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو ہمارے لیے شک وشبہ کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ یہی باتیں بار بار سوال کی صورت میں ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں اور محمدؐ کی دعوت کو قبول کرنے سے روکتی رہتی ہیں۔

اہم نکتہ یہ ہے کہ قرآن مجید ایسے معترضین کو "لا یرجون لقائنا" کے عنوان سے موصوف کرتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان بے بنیاد باتوں کا سرچشمہ آخرت پر ایمان سے انکار اور خدا کی طرف سے عائد ہونے والی ذمّہ داریوں سے فرار ہے۔

سورۂ حجر کی آیت ، میں بھی اسی سے ملتی جلتی گفتگو موجود ہے، کفار کہتے ہیں:

لو ما تأتینا بالملائکۃ ان کنت من الصادقین

اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں لاتا تاکہ وہ آکر تیری تصدیق کریں۔

اسی سورہ فرقان کے آغاز میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین کہتے تھے:

لولا انزل الیہ ملک فیکون معہ نذیرًا

تیرے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نازل نہیں کیا گیا تاکہ وہ بھی لوگوں کو ڈراتا۔

جبکہ ایک حق طلب انسان کسی بات کے ثبوت کے لیے صرف دلیل ہی طلب کرتا ہے اس دلیل کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، جب اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ نے قرآن سمیت متعدد معجزات پیش کرکے اپنی دعوت کی حقانیت اور صداقت کو روز روشن کی طرح ثابت کر دکھایا تو پھر ان بے بنیاد باتوں اور حیلے بہانوں کا کیا معنیٰ؟

پھر یہ کہ وہ لوگ نبوت کی تحقیق اور ثبوت کے بارے میں آپ سے ایسی باتیں نہیں کرتے تھے اس کی بہترین دلیل یہ ہے کہ انھوں نے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ کرکے اسے ایک قابل رویت جسم کی حد تک گرا دیا۔ وہی بے بنیاد مطالبہ جو بنی اسرائیل کے مجرم لوگوں نے کیا تھا اور اس کا شافی جواب بھی سن لیا تھا اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیت ۱۴۳ میں گزر چکی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید ایسے مطالبات کا جواب زیر بحث آیت میں دے رہا ہے: انھوں نے اپنے بارے میں تکبّر سے کام لیا ہے اور غرور، تکبّر اور خود پسندی کا شکار ہوگئے ہیں (لقد استکبروا فی انفسھم)۔

Marfat.com

انھوں نے طغیان اور سرکشی کی، بہت بڑی سرکشی (وعتوا عتوًا کبیرًا)۔

"عتو" ("علو" کے وزن پر ہے) جس کا معنیٰ ہے اطاعت سے ایسی روگردانی اور حکم کی خلاف ورزی کہ جس کے ساتھ دشمنی اور ہٹ دھرمی بھی شامل ہو۔

"فی انفسهم" کی تعبیر ممکن ہے اس معنیٰ میں ہو کہ وہ خود اپنے بارے میں تکبّر اور خود پسندی کا شکار ہیں یہ معنیٰ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تکبر اور غرور کو تو اپنے دل میں چھپاتے ہیں اور اس قسم کے حیلے بہانوں کو آشکار کرتے ہیں۔

ہمارے اس دور میں بھی کئی ایسے لوگ موجود ہیں جو اس زمانے کے مشرکین کی منطق کو دہرا رہے ہیں کہ جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے اور روح کو آپریشن کے ذریعے نہ دیکھ لیں اس وقت تک نہیں مانیں گے۔ دونوں کے خیالات کا ایک ہی سرچشمہ ہے اور وہ ہے تکبّر اور سرکشی۔

اصولی طور پر جو لوگ شناخت کا معیار صرف حِس اور تجربے ہی کو جانتے ہیں تقریبًا ایسی ہی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ تمام مادہ پرست افراد (Meterialists) اسی گروہ میں شامل ہیں۔ حالانکہ ہماری حِس تو اس کائنات کے مادے کے صرف تھوڑے سے حصّے کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد قرآن دھمکی کی صورت میں فرماتا ہے کہ یہ جو فرشتوں کے دیکھنے کا مطالبہ کر رہے ہیں آخر کار انھیں دیکھ ہی لیں گے لیکن اس دن دیکھیں گے کہ جس دن مجرمین کے لیے خوشخبری نہیں ہوگی (کیونکہ وہ دن ان کے اعمال کی سخت سزا کا دن ہوگا) (یوم یرون الملائکة لا بشرٰی یومئذ للمجرمین)۔[1]

یقینًا اس دن فرشتوں کو دیکھ کر وہ خوش تو نہیں ہوں گے بلکہ جونہی وہ ان فرشتوں کے ہمراہ عذاب کی علامات دیکھیں گے تو اس قدر دہشت زدہ ہو جائیں گے کہ ایسے جملے زبان پر لائیں گے جو خطرناک مواقع پر لوگوں کو دیکھ کر کہا کرتے تھے چنانچہ وہ کہیں گے ہمیں امان دو، ہمیں معاف کر دو (ویقولون حجرًا محجورًا)۔

لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ انھیں اپنے حتمی بُرے انجام سے نہ تو یہ جملہ بچا سکے گا اور نہ ہی کوئی دوسرا جملہ کیونکہ جو آگ انھوں نے خود بھڑکائی ہے وہ انھیں ہر صورت میں اپنی طرف کھینچ لے گی اور جن برائیوں کا وہ دنیا میں ارتکاب کر چکے ہیں وہ مجسم ہو کر ان کے سامنے آجائیں گی اور خود کردہ را علاجے نیست۔

"حِجر" (بروزن "قشر") اس علاقے کو کہا جاتا ہے جس کے اردگرد پتھر چن دیئے جائیں اور اس طرح سے اس کی حد بندی کر دی جائے کہ اس حدود میں کوئی شخص داخل نہ ہو سکے۔ "حجر اسماعیل" کو اس لیے حجر کہا جاتا ہے کیونکہ اس کے اردگرد دیوار بنا کر باقی جگہ سے اسے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ عقل کو بھی حجر کہتے ہیں کیونکہ انسان کو غلط کاموں سے روکتی ہے اسی لیے سورۂ فجر کی آیت ۵ میں ہے:

---

[1] ممکن ہے کہ اس جگہ "لا" نفی کے معنی میں ہو جیسا کہ بہت سے مفسرین کہتے ہیں۔ یہ احتمال بھی ہے کہ شاید یہ نفرین کے لیے استعمال ہوا ہو تو ایسی صورت میں اس جملے کا معنیٰ یہ ہوگا کہ "اس دن مجرمین کے لیے خوشخبری نہ ہو"۔

Marfat.com

هل فی ذلك قسم لذی حجر

آیا ان باتوں میں صاحبانِ عقل کے لیے قانع کرنے والی قسم ہے۔

نیز قوم صالح کو "اصحاب حجر" کہا گیا ہے جیسا کہ قرآن مجید کی سورۂ حجر آیت ۸۰ میں ہے کیونکہ وہ پہاڑوں کے اندر اپنی رہائش کے لیے پتھروں کے بہت ہی پختہ مکانات تراش کر ان میں محفوظ ہوجایا کرتے تھے۔

یہ تو تھا لفظ "حجر" کے بارے میں، رہا "حجرًا محجورًا" کے بارے میں تو یہ عربوں کی ایک اصطلاح ہے کہ جب ان کا کسی ایسے شخص سے سامنا ہوجائے جس سے وہ ڈرتے ہوں تو امان حاصل کرنے کے لیے یہ جملہ کہتے ہیں۔

خصوصاً عربوں میں یہ رسم تھی کہ جن حرمت والے مہینوں میں جنگ ممنوع ہوتی تھی اگر کسی شخص کا سامنا کسی ایسے شخص سے ہوجاتا جس کے متعلق یہ احتمال ہوتا کہ شاید یہ شخص حرمت کی پابندی کو توڑ کر جنگ کا آغاز کر دے گا اور اس طرح سے دوسرے فریق کو صدمہ ہوگا تو دوسرا فریق یہی جملہ زبان پر لاتا تو اسے امان دے دی جاتی۔ اس طرح سے ہر قسم کی دہشت و پریشانی اور اضطراب دور ہوجاتا۔

بنابریں "حجرًا محجورًا" کا یہ معنیٰ ہوگا "میں ایسی امان چاہتا ہوں جس میں کوئی تبدیلی نہ ہو"۔[1]

جو کچھ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ "حجرا محجورا" کا یہ جملہ کہنے والے گناہ گار جہنمی لوگ ہوں گے۔ آیت میں موجود افعال کی مناسبت، جملے کا تاریخی سفر اور عربوں میں اس کا استعمال بھی اسی بات کا متقاضی ہے ہر چند کہ بعض لوگوں نے یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ ایسا کہنے والے فرشتے ہوں گے جن کا مقصد "مشرکین کو رحمتِ الٰہی سے محروم کرنا" ہوگا۔

بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ بات کہنے والے مجرم لوگ ہی ہوں گے جو ایک دوسرے سے حجرا محجورا کہیں گے لیکن بہتر اور ظاہر وہی پہلا معنیٰ ہے جسے بہت سے مفسرین نے بھی اختیار کیا ہے یا پھر اسے اوّلین تفسیر کے نام سے یاد کیا ہے۔[2]

رہی یہ بات کہ مجرمین کس دن فرشتوں سے ایسی ملاقات کریں گے تو مفسرین نے اس بارے میں دو احتمال ظاہر کیے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ موت کا دن ہے جب وہ موت کے فرشتے کو دیکھیں گے جیسا کہ سورۂ انعام کی آیت ۹۲ میں ہے:

ولو ترٰی اذ الظالمون فی غمرات الموت والملائکة باسطوا ایدیهم اخرجوا انفسکم۔

اگر تم ظالموں کو دیکھو کہ جب وہ موت کی موجوں میں پھنسے ہوئے ہوں اور موت کے فرشتے اپنے ہاتھ پھیلائے ان سے کہہ رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں ......

بعض مفسرین نے اس دن سے قیامت کا دن مراد لیا ہے کیونکہ اس دن مجرم اور گناہ گار لوگ عذاب کے فرشتوں کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے اور اپنی آنکھوں سے ان کا مشاہدہ کریں گے۔

آیات میں قیامت کے ذکر کے پیشِ نظر اور خاص کر "یومئذٍ" کے جملے کو مدنظر رکھ کر یہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے کہ اس دن سے

---

[1] ادبی نکتہ نظر سے "حجرا" فعل مقدر کا مفعول ہے اور "محجورا" اس مفعول کی تاکید کے طور پر ہے اس جملے کی اصل یوں ہوگی:

اطلب منك منعًا لاسبیل الی رفعه و دفعه

[2] اسی آیت کے ذیل میں ملاحظہ ہو تفسیر المیزان، تفسیر فخر رازی، تفسیر فی ظلال القرآن اور تفسیر ابوالفتوح رازی۔

Marfat.com

مراد قیامت کا دن آیت کے مفہوم سے زیادہ نزدیک ہے۔

بعد والی آیت آخرت میں مجرمین کے اعمال کی کیفیت کو مجسّم کرکے کہتی ہے: ہم ان کے ان اعمال کی طرف آگے بڑھیں گے جو وہ انجام دے چکے ہوں گے اور ان اعمال کو غبار کے ذرّوں کی مانند ہوا میں بکھیر دیں گے (و قدمنا الی ما عملوا من عمل فجعلناہ ھباء منثورًا)۔

راغب نے مفردات میں لکھا ہے کہ "عمل" سے مراد ہر وہ کام ہے جو ارادے کے ساتھ انجام دیا جائے لیکن "فعل" کا معنیٰ عام ہے خواہ وہ ارادے سے انجام دیا جائے یا بغیر ارادے کے یعنی عمل ارادی کاموں کا نام ہے اور فعل ارادی اور غیر ارادی دونوں کا نام ہے[۱]

"قدمنا" "قدوم" سے ہے جس کا معنیٰ "وارد ہونا" یا "کسی چیز کی تلاش میں نکلنا" ہے یہاں پر موضوع کے یقینی اور تاکیدی ہونے پر دلیل ہے یعنی یہ بات مسلّم اور یقینی ہے کہ انھوں نے جو اعمال بھی اپنے ارادے اور اختیار سے انجام دیئے ہیں خواہ وہ ظاہرًا کار خیر ہی کیوں نہ ہوں، ان کے کفر اور شرک کی وجہ سے ہم ان کے ان تمام اعمال کو غبار کے ذرّوں کی مانند ہوا میں بکھیر کر نیست و نابود کر دیں گے۔

اعمالِ صالح کی تباہی

لفظ "ھباء" کا معنیٰ غبار کے وہ نہایت ہی باریک ذرات ہیں جو عام حالات میں دیکھنے میں نہیں آتے لیکن جب سورج کی روشنی بند کمرے کے سوراخ سے کمرے کے اندر آتی ہے تو اس میں یہی ذرات تیرتے نظر آتے ہیں۔

اس تعبیر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کفار و مشرکین کے اعمال اس قدر بے قیمت اور بے اثر ہوں گے کہ گویا ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہوگا خواہ وہ اپنے ان اعمال کے لیے سالہا سال تک کوشش ہی کیوں نہ کرتے رہے ہوں۔

یہ آیت سورہ ابراہیم کی آیت ۱۸ کی مانند ہے جس میں خدا فرماتا ہے:

مثل الذین کفروا بربھم اعمالھم کرماد اشتدت بہ الریح فی یوم عاصف

جن لوگوں نے پروردگار کا انکار کیا ہے ان کے اعمال کی سزا ایسی ہے جیسے کسی طوفانی دن میں تیز ہوا کے سامنے راکھ کا ڈھیر۔

اس کی منطقی دلیل بھی واضح ہے کیونکہ جو چیز انسان کے اعمال کو شکل و صورت، حیثیت اور قدر و منزلت عطا کرتی ہے وہ ہے انسان کی نیّت اور اس کا قصد و ارادہ، کیونکہ مومنین کے اعمال میں رضائے خدا، توحید، پاکیزہ مقصد اور صحیح و سالم منصوبہ بندی پیشِ نظر ہوتی ہے جبکہ بے ایمان افراد کے پیشِ نظر ظاہر داری، ریاکاری، جھوٹ، فریب اور ذاتی مفادات ہوتے ہیں جن کی

---

[۱] راغب نے یہ فرق "عمل" کے مادہ میں ذکر کیا ہے جبکہ "فعل" کے مادہ میں اس کے برعکس کہا ہے لیکن ان دونوں کلموں کے استعمال کے پیشِ نظر یہ فرق صحیح معلوم ہوتا ہے البتہ ممکن ہے کہ کچھ استثنائی موارد بھی ہوں جیسا کہ کام کرنے والے بیلوں کو "عوامل" کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

وجہ سے ان کے اعمالِ صالح بھی اپنی قدر و منزلت کھو دیتے ہیں۔

مثال کے طور پر ہم ایسی مساجد کو بھی جانتے ہیں جو صدیوں پرانی ہیں۔ سینکڑوں سال گزر جانے کے باوجود بھی ان میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا جبکہ اس کے برعکس ایسے گھروں کو بھی جانتے ہیں جو ایک ماہ یا ایک سال گزر جانے کے بعد خراب ہونا شروع ہو گئے ہیں اور ان میں کوئی نہ کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مساجد کی تعمیر کے سلسلے میں خدا کی خوشنودی مطلوب ہوتی ہے لہٰذا انھیں ہر لحاظ سے پختہ اور تمام حوادث کو پیشِ نظر رکھ کر بہترین میٹریل کے ساتھ تعمیر کیا گیا، جبکہ رہائشی مکانوں کے سلسلے میں ظاہر داری اور فریب کاری کے ذریعے مال و دولت کا جمع کرنا مقصود تھا صرف ان کی ظاہری آب و تاب اور نقش و نگار کی طرف توجہ دی گئی۔[1]

اصولی طور پر اسلامی منطق کی رُو سے اعمالِ صالح کے لیے کچھ آفتیں ہیں جن کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے کہ کبھی تو وہ اپنے آغاز ہی سے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں جیسے وہ اعمال جو "ریا" کے طور پر انجام دیئے جائیں۔

کبھی ان اعمال کی انجام دہی کے دوران ہی انسان غرور، تکبّر اور خود پسندی کا شکار ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اعمال کی قدر و قیمت ضائع ہو جاتی ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اعمالِ خیر کی ادائیگی کے بعد انسان سے ایسے نامناسب کام سرزد ہو جاتے ہیں جن سے ان اعمال کا اثر بالکل ختم ہو جاتا ہے، مثلاً راہِ خدا میں خرچ کرنے کے بعد احسان جتانا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے یا جن نیک اعمال کی انجام دہی کے بعد انسان کافر یا مرتد ہو جائے۔

حتیٰ کہ بعض اسلامی روایات کے مطابق بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی انجام دہی سے پہلے کے گناہوں کی وجہ سے ان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ جس طرح شراب خور کے بارے میں ہے کہ اس کے اعمال چالیس روز تک بارگاہِ ایزدی میں قبول نہیں ہوتے۔[2]

بہرحال اسلام کے نزدیک عملِ صالح کا ایک جچا تلا اور منظم معیار ہے۔

ایک روایت میں جو حضرت امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ہے:

> قیامت کے دن خداوندِ عالم ایک ایسے گروہ کو مبعوث فرمائے گا جن کے سامنے سفید لباس کی مانند روشنی چمک رہی ہوگی (یہ روشنی ان کے اپنے اعمال ہوں گے) پھر خدا ان اعمال کو حکم دے گا کہ ذرات میں تبدیل ہو جاؤ (تو وہ سب ذرات میں تبدیل ہو جائیں گے)۔

وہ کون لوگ ہوں گے اس بارے میں امام علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

انہم کانوا یصومون و یصلون ولٰکن کانوا اذا عرض لہم شیٔ من الحرام اخذوہ واذا

---

[1] اس سلسلے میں ہم اس سے زیادہ مفصل طریقے پر تفسیر نمونہ کی جلد نمبر ۱۰ سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۸ کے ضمن میں بحث کر چکے ہیں۔

[2] سفینۃ البحار جلد ۱ ص ۴۲۲، مادہ "خمر"

Marfat.com

ذکر لهم شئ من فضل امیر المؤمنین انکروه۔

وہ لوگ نماز و روزہ کی بھی ادائیگی کیا کرتے تھے لیکن جب کوئی حرام چیز ان کے سامنے آجاتی تو وہ اس سے بھی جھپٹ جاتے اور جب علی امیر المومنین کی کوئی فضیلت ان کے سامنے بیان کی جاتی تو وہ اس کا انکار کرتے[۱]

جہاں تک قرآن مجید کا طریقہ کار ہے تو وہ نیک اور بد کو ایک ساتھ بیان فرماتا ہے تاکہ دونوں کا آپس میں موازنہ کر کے ہر ایک کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھا جا سکے چنانچہ بعد والی آیت دوزخیوں کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ خدا فرماتا ہے: اس دن بہشتیوں کا ٹھکانا سب سے بہتر اور ان کی رہائش گاہ سب سے عمدہ ہوگی (اصحاب الجنة یومئذ خیر مستقرا واحسن مقیلا)۔

اس بات کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دوزخیوں کی حالت اچھی ہوگی اور بہشتیوں کی حالت ان سے زیادہ اچھی ہوگی، کیونکہ "افعل التفضیل" کا لفظ بعض اوقات ایسے مواقع پر بھی استعمال ہوتا ہے جن میں ایک فریق میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں دوسرا فریق جن سے بالکل عاری ہوتا ہے جس طرح سورۂ حم سجدہ کی آیت ۴۰ میں ہے:

افمن یلقٰی فی النار خیر ام من یاتی امنا یوم القیٰمة

آیا جو شخص جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا وہ بہتر ہے یا جو شخص بروز قیامت مطمئن ہو کر عرصۂ محشر میں آئے گا۔

"مستقر" کے معنیٰ قرار گاہ اور ٹھکانا کے ہیں اور "مقیل" کا معنیٰ دوپہر کے وقت آرام کرنے کی جگہ ہے ("قیلولہ" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے دوپہر کی نیند)۔

---

[۱] تفسیر علی بن ابراہیم۔ منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹

Marfat.com

۲۵۔ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ○
۲۶۔ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ○

ترجمہ

۲۵۔ اس دن کا سوچو! جب آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے نازل ہوں گے۔
۲۶۔ اس دن حکومت صرف خداوند رحمٰن کی ہوگی اور وہ دن کافروں کے لیے بہت سخت ہوگا۔

تفسیر

آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا

ان آیات میں قیامت اور روز قیامت گناہ گاروں کے انجام کے بارے میں گفتگو کو آگے بڑھایا گیا ہے، پہلے فرمایا گیا ہے: گناہ گاروں کے مصائب اور رنج و غم کا دن وہ ہوگا کہ جب آسمان بادلوں سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتے پے در پے اترنا شروع ہوں گے (ویوم تشقق السماء بالغمام و نزل الملائکۃ تنزیلاً)۔[1]

"غمام" "غم" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کا چھپانا چونکہ بادل آسمان کو چھپا دیتے ہیں لہٰذا انھیں "غمام" کہتے ہیں۔ اسی طرح رنج و اندوہ کو "غم" کہتے ہیں کیونکہ وہ دل کو چھپا دیتے ہیں۔

یہ آیت درحقیقت مشرکین کے ایک مطالبے اور ایک اور بہانے کا جواب ہے وہ اپنے افسانوں کے مطابق اس بات کے منتظر تھے کہ خدا اور اس کے فرشتے بادلوں میں بیٹھ کر آئیں اور انھیں حق کی دعوت دیں اسی طرح یہودیوں کے قصے کہانیوں میں بھی ہے کہ کبھی کبھی خدا بادلوں کے درمیان سے ظاہر ہو جاتا ہے۔[2]

قرآن مجید انھیں اسی چیز کا جواب دے رہا ہے کہ ہاں (خدا تو نہیں البتہ) فرشتے ایک دن ان کے پاس ضرور آئیں گے لیکن کس دن؟ جس دن ان کے عذاب اور سزا کا موقع آجائے گا اور آ کر ان کی بے ہودہ باتوں کو ختم کر دے گا۔

اب دیکھتے ہیں کہ بادلوں سمیت آسمان کے پھٹ جانے سے کیا مراد ہے؟ جبکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے اطراف میں آسمان

---

[1] "یوم تشقق السماء" درحقیقت "یوم یرون الملائکۃ" کے گزشتہ جملے پر عطف ہے۔ بنابریں اس جملے میں بھی "یوم" کا تعلق اسی چیز سے ہوگا جس سے گزشتہ آیت میں تھا یعنی "لابشری یومئذ" والی آیت میں۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس کا تعلق "اذکر" فعل مقدر سے ہے پھر "بالغمام" میں یا تو "ملابست" کے معنی میں ہے اور یا پھر "سببیت" کے لیے ہے جو آیات بالا کی تفسیر میں منعکس ہو چکی ہے۔

[2] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۶ ص ۱۵۴ (اسی آیت کے ذیل میں)۔

Marfat.com

نام کی ایسی کوئی چیز موجود نہیں ہے جو پھٹ جانے کے قابل ہو۔

علامہ طباطبائی (رضوان اللہ علیہ) تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں:

آسمان کے شگافتہ ہونے اور پھٹ جانے سے مراد عالم شہود ہے اور جہالت اور نادانی کے حجابوں کا ہٹ جانا اور عالم غیب کا ظاہر ہو جانا ہے یعنی اس دن انسان کے اندر اس قدر فہم اور بینائی پیدا ہو جائے گی جو آج کے دن سے بہت مختلف ہوگی، سب پردے ہٹ جائیں گے اور لوگ فرشتوں کو عالم بالا سے اترتا ہوا دیکھیں گے۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ "سماء" سے مراد آسمانی کرّے ہیں جو پے در پے پھٹ جائیں گے اور تباہ ہوتے جائیں گے، ان دھماکوں سے اٹھنے والا اور پہاڑوں کے تباہ و برباد ہونے سے بلند ہونے والا دھواں صفحۂ آسمانی کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

بنا بریں آسمانی کرات پھٹ جائیں گے اور ان کے ساتھ ساتھ ان سے اٹھنے والے دھوئیں کے بادل بھی[1]

قرآن مجید کی بہت سی آیتیں خاص کر آخری پارے کی چھوٹی چھوٹی سورتوں کی آیات اس حقیقت کی وضاحت کر رہی ہیں کہ قیامت سے پہلے عالم ہستی میں عجیب و غریب تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح فضا میں پھیل جائیں گے سورج بے نور ہو جائے گا ستارے ماند پڑ جائیں گے حتیٰ کہ چاند اور سورج کے فاصلے سمٹ جائیں گے ساری زمین پر سخت زلزلہ آئے گا۔

ہاں تو اس دن آسمان کا تباہ ہو جانا یعنی آسمانی کروں کا گہرے بادلوں کی وجہ سے صفحۂ آسمانی سے پوشیدہ ہو جانا ایک فطری امر ہوگا۔

اسی تفسیر کو ایک اور صورت میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ:

کواکب اور سیاروں کے دھماکوں اور زبردست تبدیلیوں کی وجہ سے آسمان گہرے بادلوں سے ڈھک جائے گا لیکن چونکہ ان بادلوں میں کبھی کبھار کوئی شگاف پڑ جاتا ہے اور آسمان کو صحیح صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بنا بریں یہ آسمان جو ان آنکھوں سے دیکھا جاتا ہے ان پھٹے ہوئے عظیم بادلوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائے گا۔[2]

اس آیت کی اور بھی بہت سی تفاسیر بیان ہوئی ہیں جو علمی اور منطقی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتیں جبکہ مندرجہ بالا تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے ممکن ہے کہ اس مادی کائنات کے پردے انسان کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا دیئے جائیں اور وہ عالم طبیعت کا مشاہدہ کرے۔ دوسری طرف آسمانی کرّے دھماکوں کے ساتھ تباہ و برباد ہو جائیں اور ان دھماکوں سے دھوئیں کے بادل اٹھیں گے ان بادلوں کے درمیان کہیں کہیں شگاف پڑ جائیں گے یہی دن اس جہان کا آخری اور اس دوسرے جہان کا پہلا دن ہوگا جو بے ایمان گناہ گار مجرمین اور ہٹ دھرم ظالموں کیلئے نہایت ہی دردناک ہوگا۔

---

[1] ادبی نقطہ نظر سے اس صورت میں "با" ملابست کے لیے ہوگی۔

[2] اس صورت میں "بالغمام" میں "با" "سببیت" کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

اس کے بعد اس دن کی اور نمایاں خصوصیات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن حکومت خداوند رحمٰن ہی کی ہوگی (الملك يومئذ الحق للرحمٰن) ۔

حتیٰ کہ اس دنیا کی مجازی، فانی، محدود اور جلد ختم ہو جانے والی حکومتوں کے تختے اُلٹ دیئے جائیں گے اور ہر لحاظ سے اور تمام جہات سے حاکمیت صرف اور صرف خداوند متعال ہی کی ہوگی۔ اسی بناء پر وہ دن "کافروں کے لیے بہت ہی سخت ہوگا" (وكان يومًا على الكافرين عسيرًا) ۔

جی ہاں اس دن تمام خیالی اور تصوّراتی طاقتیں بالکل ختم ہو جائیں گی۔ حاکمیت اور اقتدارِ اعلیٰ صرف اور صرف خدا ہی کے لیے ہوگا، کافروں کی تمام پناہ گاہیں ملیامیٹ ہو جائیں گی اور تمام طاغوتی طاقتیں نابود ہو جائیں گی۔

اگرچہ اس جہان میں بھی ان طاقتوں کی خدا کے ارادہ و مشیت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں لیکن پھر بھی ظاہری طمطراق اور جھوٹا وقار تو ہے چونکہ عرصۂ محشر میں صرف حقائق ہی نمایاں ہوں گے اور مجازی، خیالی اور تصوّراتی امور کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ خداوندِ عالم کے عذاب سے بے ایمان افراد کو کوئی چیز نہیں بچا سکے گی لہٰذا وہ دن کفار کے لیے انتہائی سخت ہوگا جبکہ مومنین کے لیے بہت سہل اور نہایت آسان ہوگا۔

ایک حدیث میں ابو سعید خدری سے منقول ہے کہ ایک دن آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اس آیت کی تلاوت فرمائی "في يوم كان مقداره خمسين الف سنة" یعنی قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا تو میں نے عرض کیا جناب! یہ دن کس قدر لمبا اور عجیب ہوگا؟ تو آپؐ نے فرمایا:

والذی نفسی بیده انه ليخفف عن المؤمن حتّٰی يكون اخف عليه من صلٰوة مكتوبة يصليها في الدنيا

اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے وہ دن مومنین کے لیے اس قدر آسان ہوگا کہ جتنی دیر وہ دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے میں لگا دیتا ہے اس سے بھی زیادہ آسان [1]

قرآن میں دوسری آیات میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کا دن کافروں پر سخت ہوگا۔ کیونکہ کہیں پر تو ہے:

و تقطعت بهم الاسباب (بقرہ: ۱۶۶)

اس دن تمام دنیاوی اسباب اور وسائل منقطع ہو جائیں گے۔

کسی جگہ ہے:

ما اغنٰی عنه ماله وما کسب (تبّت: ۲)

انھیں نہ تو ان کا مال اور نہ ہی انھوں نے جو کچھ کمایا ہے کوئی فائدہ پہنچائے گا۔

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۷، ص ۴۷۲۹

Marfat.com

کسی مقام پر ہے :

یوم لا یغنی مولیٰ عن مولیٰ شیئًا (دخان : ۴۱)

وہاں کوئی کسی کی داد و فریاد کو نہیں پہنچے گا۔

حتیٰ کہ شفاعت بھی جو کہ گناہ گاروں کے لیے تنہا راہ نجات ہے صرف ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کا خدا اور اس کے دوستوں کے ساتھ تعلق ہوگا۔

من ذاالذی یشفع عندہ الا باذنہ (بقرہ : ۲۵۵)

نیز اس روز کسی کو عذر خواہی کی بھی اجازت نہیں ہوگی چہ جائیکہ کسی کے غیر معقول عذر کو قبول کیا جائے :

ولا یؤذن لہم فیعتذرون (مرسلات : ۳۶)

Marfat.com

۲۷- وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ○

۲۸- يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ○

۲۹- لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ○

ترجمہ

۲۷- اس دن کو یاد کیجیے جب سخت حسرت کی وجہ سے ظالم اپنے ہاتھ دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا: اے کاش! میں نے رسول کے ساتھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا۔

۲۸- مجھ پر افسوس ہے کہ میں نے فلاں (گمراہ شخص) کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔

۲۹- اس نے مجھے یادِ حق سے بھٹکا دیا جب کہ میرے پاس آگاہی پہنچ چکی تھی اور شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو چھوڑ دینے والا ہے۔

شانِ نزول

مفسرین نے ان آیات کی جو شانِ نزول بیان کی ہے، مختصراً یوں ہے:

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مشرکین میں "عقبہ" اور "ابی" نامی دو شخص رہتے تھے جو ایک دوسرے کے دوست تھے جب بھی عقبہ کسی سفر سے گھر واپس لوٹتا تو اپنی قوم کے سرداروں کو کھانے کی دعوت دیتا۔ اگرچہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ رسول اللہؐ کی بارگاہ میں بھی حاضر ہو۔

حسبِ معمول ایک دن جب سفر سے واپس آیا تو کھانے کا انتظام کیا اور دوستوں کو دعوت دی اور ساتھ ہی حضرت پیغمبرِ اسلامؐ کو بھی کھانے پر بلالیا۔

جب دسترخوان بچھا دیا گیا اور کھانا لایا گیا تو آنحضرتؐ نے فرمایا میں تمہارا کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک تم کلمہ شہادتین (اقرار توحید و رسالت) زبان پر جاری نہیں کرو گے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

یہ خبر جب اس کے دوست "ابی" تک پہنچی تو اس نے کہا: "عقبہ! کیا تم اپنے دین سے پھر گئے ہو"؟ عقبہ نے جواب دیا: "بخدا میں دین سے تو منحرف نہیں ہوا لیکن چونکہ ایک ایسا شخص میرا مہمان تھا جو میرے شہادتین کے اقرار کیے بغیر کھانا کھانے

Marfat.com

کے لیے تیار نہیں تھا اور چونکہ مجھے اس بات سے شرم آتی تھی کہ وہ کھانا کھائے بغیر میرے دستر خوان سے اٹھ کر چلا جائے لہٰذا مجھے یہ کہنا پڑا۔"

ابی نے کہا:" میں اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہوں گا جب تک کہ اس (پیغمبر اسلامؐ) کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی زبردست توہین نہ کرو"۔ چنانچہ عقبہ نے ایسا ہی کیا اور مرتد ہو گیا اور انجام کار جنگِ بدر میں کفار کی صف میں مارا گیا اسی طرح اس کا دوست" ابی" بھی جنگِ احد میں اپنے انجام کو پہنچ گیا۔[1]

مندرجہ بالا آیات نازل ہوئیں اور ان میں ایسے شخص کا انجام بیان کیا گیا جو اس دنیا میں اپنے گمراہ دوست کی دوستی کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے۔

ہم کئی مرتبہ بتا چکے ہیں کہ اگرچہ آیات کی شانِ نزول خاص ہوتی ہے لیکن اس سے آیات کا مفہوم ہرگز محدود نہیں ہوتا بلکہ ان کے کلیے اور قاعدے اس قسم کے تمام افراد کے لیے ہوتے ہیں۔

تفسیر

بُرے دوست نے گمراہ کیا

قیامت کے مناظر بھی عجیب و غریب ہوں گے جن کا کچھ حصہ ابھی گزشتہ آیات کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے اور ان آیات میں ان مناظر کا ایک اور پہلو اجاگر کیا جا رہا ہے اور وہ یہ ہے کہ ظالم لوگ بروز قیامت اپنے گزشتہ کردار پر حد سے زیادہ حسرت اور افسوس کریں گے، چنانچہ خدا فرماتا ہے:

"اس دن کو یاد کیجیے جب ظالم حسرت کی وجہ سے اپنے ہاتھ اپنے دانتوں سے کاٹے گا اور کہے گا اے کاش! میں نے رسول اللہ کا راستہ اپنایا ہوتا (ویوم یعض الظالم علیٰ یدیه یقول یالیتنی اتخذت مع الرسول سبیلاً)۔[2]

"یعض" "عض" (بروزن "سد") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ دانتوں سے کاٹنا ہے۔ عموماً یہ تعبیر ان لوگوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو افسوس اور حسرت کی وجہ سے سخت پریشان ہوتے ہیں۔ جیسا کہ فارسی میں بھی ضرب المثل ہے کہ "فلاں شخص حسرت کی وجہ سے اپنی انگلی دانتوں سے کاٹ رہا ہے" (لیکن عربی میں انگلی کے بجائے ہاتھ کا لفظ بولا جاتا ہے اور شاید یہ زیادہ فصیح بھی ہے کیونکہ انسان عموماً ایسی حالت میں انگلیوں کو ہی نہیں کاٹتا بلکہ ہاتھ کی پشت کو بھی کاٹتا ہے خصوصاً عربی زبان میں ایسے مواقع پر لفظ "یدیه" (دونوں ہاتھ) استعمال کیا جاتا ہے جو حسرت، یاس، ناکامی اور افسوس

---

[1] مجمع البیان انہی آیات کے ذیل میں۔

[2] "یوم یعض" کا جملہ ادبی لحاظ سے "یوم یرون" پر عطف ہے جو سابق میں گزر چکا ہے بعض مفسرین نے "اذکر" کو مقدر سمجھا ہے اور اسے اس سے متعلق قرار دیا ہے۔

Marfat.com

زیادہ بہتر صورت میں بیان کرتا ہے۔[1]

یہ شاید اس لیے کہ اس قماش کے لوگ جب اپنے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو خود کو قصور وار ٹھہراتے ہیں اور اس قصور کا انتقام بھی خود سے لینے کی ٹھان لیتے ہیں تاکہ وہ اس طرح سے قدرے اطمینان حاصل کر سکیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس دن کو "یوم الحسرۃ" کہنا چاہیے جیسا کہ خود قرآن نے بھی اسے اس نام سے یاد کیا ہے ملاحظہ ہو سورۂ مریم آیت ۳۹ کیونکہ مجرم اور گناہ گار لوگ اپنے آپ کو ایک ایسی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور پائیں گے جو کبھی بھی ختم نہیں ہوگی جبکہ وہ دنیا کی چند روزہ زندگی میں صبر و شکیبائی، خواہشات نفسانی کی مخالفت، جہاد بالنفس اور ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرکے ہمیشہ کی عزت افتخار اور سعادت کی زندگی حاصل کر سکتے تھے۔

حتیٰ کہ قیامت کا دن نیک لوگوں کے لیے بھی حسرت اور ندامت کا دن ہوگا کیونکہ وہ اس بات کا افسوس کریں گے کہ انھوں نے دنیا میں اس سے زیادہ نیکی کیوں نہیں کی۔

قرآن آگے فرماتا ہے کہ یہ ظالم بڑے افسوس کے ساتھ کہے گا: "پھٹکار ہو مجھ پر کاش کہ میں نے فلاں گمراہ شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا (یا ویلتیٰ لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا)۔[2]

ظاہر ہے کہ "فلاں" سے مراد وہ شخص ہے جو اسے گمراہی کی طرف کھینچ لایا تھا خواہ وہ شیطان تھا یا بُرا دوست اور گمراہ رشتہ دار یا "عقبہ" جیسے لوگوں کے لیے "ابی" جیسے دوست احباب۔

درحقیقت یہ آیت اور اس سے پہلے والی آیت نفی اور اثبات کی دو مختلف حالتیں بیان کر رہی ہیں ایک جگہ کہتا ہے اے کاش! میں نے پیغمبر کا رستہ اختیار کیا ہوتا اور دوسری جگہ کہتا ہے: اے کاش! میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ گویا وہ یہ کہنا چاہے گا کہ میری تمام بدبختی پیغمبر سے رابطہ ترک کرنے اور اس گمراہ دوست سے دوستی کی وجہ سے ہے۔

سلسلہ کلام جاری ہے آگے فرماتا ہے کہ وہ کہے گا: بیداری اور علم و آگہی میرے پاس آچکی تھی (سعادت اور خوش بختی نے میرا دروازہ بھی کھٹکھٹایا تھا) لیکن اس بے ایمان دوست نے مجھے گمراہ کیا (لقد اضلنی عن الذکر بعد اذ جاءنی)۔

اگر ایمان اور سعادت ابدی سے زیادہ دور ہوتا پھر تو افسوس کی ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن میں اس سعادت جاودانی کی سرحد کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا صرف ایک قدم کا فاصلہ باقی تھا کہ اس ہٹ دھرم متعصب اور دل کے اندھے شخص نے مجھے چشمۂ آب حیات کے کنارے سے پیاسا پلٹا کر بدبختی اور گمراہی کے دلدل میں ہمیشہ کے لیے پھنسا دیا۔

---

[1] البتہ فارسی میں کبھی ہاتھ کو دانتوں سے کاٹنا بھی بولا جاتا ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے ایک شعر میں اسی محاورے کو استعمال کیا ہے۔ سے

حذر کن ز آنچہ دشمن گوید آن کن — کہ بر دندان گزی دست تغابن

(جو کچھ دشمن کہتا ہے اس کے کرنے سے بچو ورنہ نقصان کے وقت ہاتھ کو دانتوں سے کاٹو گے)۔

[2] "خلیل" اس خاص اور جگری دوست کو کہتے ہیں جسے انسان اپنے مشوروں میں شریک کرتا ہے البتہ خلیل کے اور بھی بہت سے معانی ہیں جن کی تفصیل تفسیر نمونہ جلد چہارم (سورۂ نساء کی آیت ۱۲۵) میں گزر چکی ہے۔

Marfat.com

مندرجہ بالا جملے میں مذکورہ لفظ " ذکر " کے وسیع معنی ہیں اور آسمانی کتابوں کی تمام آیات خداوندی اس کے مفہوم میں شامل ہیں بلکہ ہر وہ چیز جو انسان کی بیداری اور آگہی کا سبب بنتی ہے اس میں آجاتی ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: شیطان تو ہمیشہ سے انسان کو چھوڑتا آرہا ہے (وکان الشیطان للانسان خذولاً)۔

کیونکہ وہ انسان کو کھینچ تان کر غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور خطرناک مقام پر پہنچا کر اسے حیران و سرگرداں چھوڑ کر اپنی راہ لیتا ہے۔

توجہ رہے کہ "خذول" مبالغہ کا صیغہ ہے جس کا معنی ہے بار بار چھوڑنے والا "خذلان" کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کی امداد کے لیے عہد کرے لیکن نہایت ہی حساس لمحات میں اس کی امداد سے ہاتھ اٹھالے۔

آیا اس آیت کا یہ آخری جملہ " وکان الشیطان للانسان خذولا " قول خداوندی ہے جو کہ تمام ظالموں اور گمراہ لوگوں کو تنبیہ کی صورت میں بیان ہوا ہے یا بروز قیامت ان حسرت زدہ لوگوں کے قول کا ایک حصہ ہے جو تتمہ کے طور پر بیان ہوا ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے دوطرح کی تفسیریں بیان کی ہیں اور دونوں ہی آیت سے مناسبت رکھتی ہیں۔ لیکن قولِ خدا ہونا زیادہ مناسب ہے۔

دوستی کا اثر

اس میں شک نہیں کہ انسان کی سیرت اور شخصیت کے تعمیری عوامل میں اس کے اپنے ارادے، منشا اور خواہش کے بعد اور بھی بہت مختلف امور شامل ہوتے ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم اور مؤثر عامل اس کا دوست اور ہم نشین ہوتا ہے کیونکہ انسان چار و ناچار اس کا اثر ضرور قبول کرتا ہے نیز اپنے اکثر و بیشتر افکار اور اخلاقی صفات اپنے دوستوں اور ہم نشینوں سے حاصل کرتا ہے اور یہ حقیقت علمی، تجرباتی اور مشاہداتی طور پر پایہ ثبوت تک بھی پہنچ چکی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر سے دوستی کے اثر کی اہمیت تو اس حد تک ہے کہ اسلامی روایات میں خدا کے نبی جناب سلیمان علیہ السلام سے یوں منقول ہے:

لا تحکموا علی رجل بشیٔ حتی تنظروا الی من یصاحب، فانما یعرف الرجل باشکالہ واقرانہ وینسب الی اصحابہ واخدانہ

جب تک کسی انسان کے دوستوں کو اچھی طرح نہ دیکھ لو تو اس وقت تک اس کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرو کیونکہ انسان اپنے دوست و احباب اور یار و انصار سے پہچانا جاتا ہے[1]

امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کا ایک فصیح و بلیغ ارشاد ہے:

ومن اشتبہ علیکم امرہ ولم تعرفوا دینہ، فانظروا الی خلطائہ فان کانوا اھل دین اللہ فھو علی دین اللہ، وان کانوا علی غیر دین اللہ فلا حظ لہ من دین اللہ

جب تک کسی شخص کی کیفیت اور حقیقتِ حال کو نہ پہچان سکو اور اس کے دین کے متعلق بھی تمہیں معلوم نہ ہو سکے تو اس کے

[1] سفینۃ البحار جلد ۲ ص ۲۷ (مادہ صدق) م۔

Marfat.com

دوست اور احباب کو دیکھ لیا کرو اگر تو وہ خدا کے دین کے پابند ہیں تو وہ بھی دینِ الٰہی کا پیروکار ہو گا اور اگر وہ اہلِ دین نہیں ہیں تو اس کا بھی دین میں کوئی حصہ نہیں ہے[1]

حقیقت بھی یہی ہے کہ بسا اوقات کسی شخص کی نیک بختی یا بدبختی کے لیے اس کے دوست کی دوستی سب عوامل سے موثر عامل ہوتی ہے۔ یا تو یہ دوستی اسے فنا کی سرحدوں تک لے جاتی ہے اور یا پھر اعزاز و افتخار کی بلندیوں تک جا پہنچاتی ہے۔

مذکورہ بالا آیات اور ان کی شانِ نزول سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کیونکر سعادت اور خوش بختی کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے لیکن ایک دوست کی طرف سے صرف ایک شیطانی وسوسہ کس طرح رجعت قہقری میں مبتلا کر کے اسے ہلاکت کی انتہا گہرائیوں میں ڈال دیتا ہے کہ جس پر وہ حسرت کرے گا اور بروزِ قیامت اپنے ہاتھوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے گا اور "یا ویلتیٰ" کی فریادیں بلند کرے گا۔

"کتاب العشرۃ" (آدابِ معاشرت) میں اس سلسلے میں بہت سی روایات ہیں جو بتاتی ہیں کہ اسلام نے دوست کے انتخاب کے سلسلے میں کس قدر سخت شرائط اور کڑی پابندیاں لگائی ہیں۔

اس مختصر سی بحث کو دو حدیثیں بیان کر کے ہم ختم کرتے ہیں جو احباب مزید تفصیل کے خواہش مند ہیں وہ بحار الانوار جلد ۷۴، کتاب العشرۃ کا مطالعہ فرمائیں۔

اسلام کے نویں عظیم الشان پیشوا حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

ایاك و مصاحبة الشریر فانه کالسیف المسلول یحسن منظره و یقبح اثره

بُرے شخص کی ہم نشینی سے بچو کیونکہ وہ شمشیر برہنہ کی مانند ہوتا ہے جس کا ظاہر خوبصورت اور اثر بہت خطرناک ہوتا ہے[2]

پیامبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اربع یمتن القلب، الذنب علی الذنب ... و مجالسة الموتی، و قیل له یا رسول الله و ما الموتی؟ قال کل غنی مترف

چار چیزیں انسانی دل کو مردہ کر دیتی ہیں، گناہ کا تکرار ... (یہاں تک کہ فرمایا) مُردوں کے ساتھ ہم نشینی، کسی نے پوچھا حضور! وہ مردے کون ہیں؟ فرمایا وہ دولتمند جو اپنی دولت کے نشے میں بدمست رہتے ہیں[3]

---

[1] بحار الانوار جلد ۷۴، ص ۱۹۷۔

[2] بحار جلد ۷۴، ص ۱۹۸۔

[3] خصال صدوق (منقول از بحار الانوار جلد ۷۴، ص ۱۹۵)۔

Marfat.com

۳۰۔ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○

۳۱۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِیٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ
هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ○

۳۲۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ
لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○

۳۳۔ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ○ؕ

۳۴۔ اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا
وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ○ ع

ترجمہ

۳۰۔ اور رسول نے عرض کیا: خداوندا! میری اس قوم نے قرآن سے دُوری اختیار کرلی ہے۔

۳۱۔ اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرم لوگوں میں سے دشمن بنا دیئے ہیں لیکن اسی قدر کافی ہے کہ خدا تیرا ہادی اور مددگار ہے۔

۳۲۔ اور کافروں نے کہا کہ آخر قرآن اس پر ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں ہوتا؟ اور یہ صرف اس بناء پر ہے تاکہ ہم تیرا دل محکم اور استوار رکھیں اور ہم نے اسے تجھ پر تدریجاً پڑھا ہے۔

۳۳۔ وہ تیرے لیے کوئی مثل نہیں لاتے مگر یہ کہ ہم تیرے لیے حق اور بہتر تفسیر لے آتے ہیں (اور دندان شکن جواب تاکہ وہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں۔)

۳۴۔ جو لوگ منہ کے بل جہنم کی طرف محشور کیے جائیں گے ان کا بدترین ٹھکانا ہو گا اور وہ خود گمراہ ترین لوگ ہوں گے۔

Marfat.com

تفسیر

خداوندا! لوگوں نے قرآن کو چھوڑ دیا

چونکہ گزشتہ آیات میں ہٹ دھرم مشرکین اور بے ایمان لوگوں کے مختلف الزامات اور اعتراضات بیان ہوئے ہیں لہٰذا ان آیات میں سے پہلی آیت میں پیغمبر اسلامؐ کی اس پریشانی اور شکایت کا تذکرہ ہے، جو لوگوں نے قرآن کے ساتھ رویہ اختیار کیا ہوا تھا انھوں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: خداوندا! میری اس قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے اور اس سے دوری اختیار کر لی ہے (وقال الرسول یا رب ان قومی اتخذ وا ھذا القرآن مھجورًا)۔[1]

رسول اللہؐ کی یہ گفتگو اور شکایت آج بھی اسی طرح فضا میں گونج رہی ہے گویا آپؐ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ کے خلاف بارگاہِ ایزدی میں استغاثہ کر رہے ہیں: خدایا! ان لوگوں نے قرآن کو بالکل بھلا دیا ہے جو قرآن زندگی کی علامت اور نجات کا ذریعہ ہے، جو قرآن فتح و کامرانی، تحرک اور ترقی کا عامل ہے، جو قرآن ہر شعبہ زندگی کے لیے راہنما اصول رکھتا ہے۔ اسی قرآن کو ان لوگوں نے چھوڑ دیا ہے حتیٰ کہ انھوں نے اپنے دیوانی اور فوجداری قوانین تک کے لیے دوسروں کی طرف گدائی کا ہاتھ پھیلایا ہوا ہے۔

اب بھی اگر ہم اکثر و بیشتر اسلامی ملکوں خاص کر ان ممالک کی طرف نظر کریں جو مشرقی یا مغربی کلچر اور ثقافت کے زیر تسلط ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں پر قرآن مجید کو تکلفاً ایک مقدس کتاب کا درجہ دیا گیا ہے اس کے صرف الفاظ کو خوبصورت آواز میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے نشریاتی اداروں سے نشر کر دیا جاتا ہے یا آیاتِ قرآنی کو فنِ تعمیر کے عنوان سے مسجدوں کی کاشی کاری میں جگہ دی جاتی ہے۔ نئے مکان کے افتتاح کے موقع پر یا مسافر کی جان کی حفاظت کے لیے یا بیماروں کی صحت یابی کے لیے یا زیادہ سے زیادہ حصولِ ثواب کی غرض سے اس کی تلاوت کی جاتی ہے۔

اگر کبھی قرآن مجید سے کسی چیز کا استدلال بھی کیا جاتا ہے تو اس سے ان کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنے پہلے سے کئے ہوئے فیصلوں کی تائید میں تفسیر بالرائے کی جائے۔

بہت سے اسلامی ملکوں میں "حفظِ قرآن" کے نام سے بلے چوڑے مدارس دیکھنے میں آتے ہیں جن میں لڑکے اور لڑکیوں کی بہت بڑی تعداد قرآن حفظ کرنے میں مصروف ہے جبکہ ان ملکوں کے آئین اور قوانین اسلام سے بے خبر ممالک سے درآمد شدہ

---

[1] "قال" ظاہراً فعل ماضی ہے اور اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بات اسی دنیا میں شکایت کے طور پر کہی ہے اور اکثر مفسرین کا بھی یہی نظریہ ہے لیکن بعض دوسرے مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی مرحوم نے "المیزان" میں یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اس بات کا تعلق قیامت کے ساتھ ہے اور فعل ماضی یہاں پر فعل مضارع کے معنی میں ہے علامہ طبرسی مرحوم نے بھی مجمع البیان میں اسی چیز کو احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے لیکن بعد والی آیت جو آپؐ کی دلجوئی کر رہی ہے اس بات کی دلیل ہے کہ مشہور تفسیر زیادہ صحیح ہے۔

Marfat.com

ہیں اور ان کے افکار و نظریات یا تو مشرق سے لیے گئے ہیں یا مغرب سے اور اپنی ان غلط کاریوں پر پردہ ڈالنے کیلئے انھوں نے قرآن کا سہارا لیا ہوا ہے۔

ہاں ہاں اب بھی پیغمبر اکرمؐ فریاد کر رہے ہیں: خداوندا! میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

قرآن کی روح اور مطالب کو، اس کے طرزِ تفکر کو اور اس کے تعمیری منصوبوں پر عمل درآمد چھوڑ دیا ہے۔

چونکہ حضرت رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو دشمنوں کے اس قسم کے معاندانہ سلوک کا سامنا تھا۔ لہٰذا خداوندِ عالم ان کی دلجوئی کے لیے بعد والی آیت میں فرماتا ہے: اسی طرح کے گناہ گار اور مجرم دشمن ہم نے ہر پیغمبر کے لیے قرار دیئے ہیں (وکذلك جعلنا لكل نبی عدوًا من المجرمین)۔

تو ہی نہیں کہ جسے اس قسم کے سخت دشمنوں کا سامنا ہے بلکہ سب انبیاء کا یہی حال تھا۔ مجرمین کا کوئی نہ کوئی ٹولہ ان کی مخالفت کرتا رہتا ہے اور ان کے ساتھ دشمنی پر ہمیشہ کمر باندھے رہتا ہے۔

لیکن تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ تو بے یار و مددگار نہیں" یہی بات کافی ہے کہ خداوندِ عالم تیرا ہادی، راہنما اور یار و یاور ہے (وکفٰی بربك هادیًا و نصیرًا)۔

چونکہ تیرا ہادی خداوندِ عالم ذوالجلال ہے لہٰذا ان کے وسوسے تجھ پر اثر انداز نہیں ہو سکتے اور چونکہ تیرا ناصر و مددگار خدا ہے لہٰذا ان کی ہر طرح کی سازشیں تیرا بال تک بیکا نہیں کر سکتیں کیونکہ اس کا علم تمام علوم سے برتر اور اس کی قدرت تمام قدرتوں اور طاقتوں سے بالاتر ہے۔ مختصر یہ کہ بلاجھجک کہہ دے: ؎

ہزار دشمنم ار می کنند قصد ہلاک　　　　تو ام چو دوستی از دشمنان ندارم باک

اگر میرے ہزاروں دشمن مجھے ہلاک کرنا چاہیں (تو وہ ایسا نہیں کر سکتے) کیونکہ جب تک تو میرا دوست ہے مجھے دشمن کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں۔

بعد والی آیت میں ان مجرموں کی ایک اور بہانہ جوئی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: کافروں نے کہا کہ اس پر قرآن ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں ہوتا (وقال الذین کفروا لولا نزل علیه القراٰن جملة واحدة)۔

آیا یہ سب کا سب خدا کی طرف سے نہیں ہے؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اوّل سے لے کر آخر تک اپنے تمام مضامین سمیت ایک ہی مرتبہ یہ کتاب نازل ہو جائے تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اس کی عظمت سے باخبر ہوں آخر کیا وجہ ہے کہ یہ آیات بتدریج اور وقفے وقفے کے بعد نازل ہوتی رہتی ہیں؟

سطحی فکر رکھنے والے افرادِ خاص کر جب وہ کسی بہانے کی تلاش میں بھی ہوں ان کے لیے نزولِ قرآن کی کیفیت کے بارے میں یہ اشکال پیدا ہوگا کہ دنیا جہان کی اس قدر عظیم آسمانی کتاب بیک وقت کیوں نازل نہیں ہوئی جبکہ یہ مسلمانوں کے تمام امور کا سرمایہ اور ان کی بنیاد ہے اور اس میں تمام سیاسی، اجتماعی، معاشرتی اور عبادی قوانین موجود ہیں اس طرح سے لوگ ہمیشہ اسے اوّل سے آخر تک پڑھتے اور اس کے مضامین سے آگاہی حاصل کرتے۔

بہتر یہی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم بھی اس سے مجموعی طور پر باخبر ہوتے تاکہ جب بھی آپؐ سے لوگ کوئی

Marfat.com

سوال کرتے تو اس کا فوری طور پر جواب دے دیتے ۔

لیکن اسی آیت میں انھیں اس اعتراض کا جواب دیا گیا ہے :

ہم نے قرآن کو تدریجی طور پر نازل کیا ہے تاکہ تیرے دل کو محکم و استوار رکھیں اور اسے جدا گانہ آیات کی صورت میں آہستہ آہستہ لیکن بطور مسلسل تجھ پر وحی کیا ہے (کذٰلک لنثبت به فؤادک و رتلناه ترتیلاً) ۔

چونکہ وہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں لہذا اس قسم کے اعتراضات کرتے ہیں ۔

البتہ قرآن کے تدریجی نزول کا پیغمبر اسلامؐ اور مومنین کے دل کی تقویت کے ساتھ کیا رابطہ ہے؟ یہ ایک مفصل اور دلچسپ گفتگو ہے جو انھی آیات کے آخر میں نکات کی بحث میں پیش کی جائے گی ۔

پھر مندرجہ بالا جواب کو مزید پختہ کرنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے : وہ تیرے لیے کوئی مثل نہیں لاتے اور تیری دعوت کو کمزور کرنے کے لیے کوئی بھی بات نہیں کرتے مگر یہ کہ ہم ایسی حق بات تجھے عطا کر دیتے ہیں جو دوٹوک انداز میں ان کے بودے دلائل کو ناکام کر کے رکھ دیتی ہے اور بہتر تفسیر اور دلچسپ بیان تجھے عطا کرتے ہیں (ولا یأتونك بمثل الا جئناك بالحق واحسن تفسیرا) ۔

ان کینہ پرور دشمنوں اور متعصب اور ہٹ دھرم مشرکوں نے اپنے چند اعتراضات کے ذریعے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ ان اوصاف اس کتاب اور ان پروگراموں کی وجہ سے (نعوذ باللہ) محمدؐ اور اس کے ساتھی غلط لوگ ہیں اور کیونکہ ایسی بے ہودہ سوچ اور گفتگو کا اسی انداز میں ذکر کرنا قرآن جیسی فصیح و بلیغ کتاب کے شایانِ شان نہیں تھا لہذا اس آخری آیت میں ان کی گفتگو کو ذکر کیے بغیر خداوندِ عالم اس کا جواب یوں دیتا ہے ۔

جو لوگ منہ کے بل محشور کیے جائیں گے اور اسی حالت میں انھیں جہنم میں ڈالا جائے گا وہی ان کا بدترین ٹھکانا ہو گا اور وہ خود گمراہ ترین افراد ہوں گے (الذین یحشرون علیٰ وجوههم الیٰ جهنم اولٰئك شر مكانا واضل سبیلا) ۔

سچ بات تو یہ ہے کہ انسان کے منصوبوں کا نتیجہ تو وہاں جا کر واضح ہو گا کچھ لوگ وہ ہوں گے جو سروقامت اور چاند ایسے نورانی چہرے کے مالک ہوں گے اور تیز تیز قدموں کے ساتھ بہشت میں داخل ہوں گے ۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہوں گے جن کے منہ پر خاک پڑی ہو گی اور عذاب کے فرشتے انھیں کشاں کشاں جہنم میں لے جائیں گے ۔ یہ دو متضاد اور مختلف انجام ہی بتائیں گے کہ کون لوگ گمراہ اور شریر تھے اور کون نیک بخت اور ہدایت یافتہ ۔

چند اہم نکات

۱۔ "جعلنا لکل نبی عدوا" کی تفسیر : ہو سکتا ہے مندرجہ بالا جملے سے یہ بات بھی جائے کہ خداوندِ عالم پیغمبرِ اسلامؐ کی دلجوئی اور تسلی خاطر کی غرض سے یہ فرما رہا ہے کہ "اے میرے حبیب ! صرف تیرے ہی دشمن نہیں ہیں بلکہ ہماری طرف سے ہر پیغمبر کے دشمن بنائے گئے ہیں یہاں پر دشمن بنانے کی نسبت خداوندِ عالم کی طرف ہے جو نہ تو حکمتِ خداوندی سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ ہی انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی سے مناسبت رکھتی ہے ۔

Marfat.com

مفسرین نے اس سوال کے کئی جواب دیئے ہیں ۔

لیکن ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ تمام انسانوں کے اعمال ایک لحاظ سے خدا کی ذات کی طرف منسوب ہیں کیونکہ ہمارا سب کچھ ہماری قدرت، ہماری طاقت، ہماری عقل وفکر حتیٰ کہ ہماری آزادی اور ارادہ واختیار بھی اسی کی طرف سے ہیں ۔ بنا بریں انبیاء کے دشمنوں کو بھی اس نظریہ کے تحت خدا کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے اور اس طرح سے نہ تو جبر کا مسئلہ پیش آتا ہے اور نہ ہی بے اختیاری کا جیسے انبیاء کے کاموں کی ذمہ داری بھی مخدوش نہیں ہوتی (خوب غور کیجیے گا) ۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ ان زبردست دشمنوں کا وجود اور انبیائے کرام سے ان کی مخالفت اس بات کا سبب بنتی ہے کہ مومنین اپنے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور زیادہ پائیداری اور ثابت قدمی کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اس ذریعہ سے سب لوگوں کے بارے میں خدا کی آزمائش بھی ہوتی رہتی ہے ۔

درحقیقت یہ آیت بھی سورۂ انعام کی آیت ۱۱۲ کی مانند ہے جس میں خدا فرماتا ہے :

وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوًا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورًا

اسی طرح ہم نے ہر پیغمبر کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیطانوں کو بنایا ہے جو بے بنیاد اور دھوکے پر مبنی باتیں ایک دوسرے سے مخفی طور پر بیان کرتے ہیں ۔

جہاں پھول ہوتے ہیں وہاں کانٹے بھی ہوتے ہیں اور جہاں نیک لوگ ہوتے ہیں وہاں بدکار بھی ہوتے ہیں اور ہر ایک اپنا اپنا کام کرتا رہتا ہے ۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ " جعلنا " (ہم نے بنایا ہے) سے مراد انبیاء کے اوامر، نواہی اور دوسرے تعمیری پروگرام ہیں جن سے چار و ناچار کچھ لوگوں کو دشمنی ہوجاتی ہے اور وہ گمراہی کا شکار ہوجاتے ہیں اور اگر اس کی نسبت خدا کی طرف دی گئی ہے تو اس لیے ہے کہ یہ اوامر اور نواہی خدا کی طرف سے ہیں ۔

ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ کچھ متعصب لوگ بھی ہیں جو اپنے تعصب، گناہوں پر اصرار اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے راہ راست سے اس قدر بھٹک چکے ہیں کہ خداوند عالم نے ان کے دل پر مہر لگادی ہے ان کی آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ انبیاء کے دشمن ہوجاتے ہیں لیکن اس دشمنی کے اسباب انھوں نے خود ہی فراہم کیے ہوتے ہیں ۔

ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے اور ان تینوں تفاسیر کو آیت کے ایک مفہوم میں جمع کیا جاسکتا ہے ۔

۲۔ قرآن کا تدریجی نزول کیوں ؟ یہ ٹھیک ہے کہ بعض روایات (بلکہ بعض آیات کے ظاہر) کے مطابق قرآن دو مرتبہ نازل ہوا ہے ؛ ایک " دفعی نزول" کی صورت میں جو کہ شب قدر میں بیک وقت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل ہوا اور دوسرا " تدریجی نزول" کی صورت میں ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوتا رہا ۔ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جس نزول نے قبولیت کی سند حاصل کی ہے اور پیغمبر اسلام اور دوسرے لوگوں کو جس سے واسطہ رہا ہے وہ یہی " تدریجی نزول" ہے ۔ یہی نزول حیلہ ساز دشمنوں کے اعتراض کا موجب بنا ہوا تھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن یکبارگی نازل نہیں ہوتا اور ایک ہی

Marfat.com

مرتبہ لوگوں کے پاس کیوں نہیں پہنچ جاتا تاکہ لوگوں کو مکمل آگاہی حاصل ہو اور ان کے لیے کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔

لیکن جیسا کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن مجید نے "کذلك لنثبت به فؤادك" کہہ کر انھیں ایک مختصر مگر جامع جواب دیا ہے۔ اس پر جتنا غور وفکر کیا جائے قرآن کے تدریجی نزول کے اثرات بیشتر واضح ہوتے جائیں گے۔

۱۔ اس میں شک نہیں کہ "وحی کی وصولی" اور اسے لوگوں تک پہنچانے کے لحاظ سے اگر مطالب قرآنی تدریجی طور پر اور ضرورت کے مطابق نازل ہوں اور ہر مطلب کے لیے اس کا شاہد اور مصداق عینی پایا جائے تو نہایت ہی مؤثر ہوگا۔

تربیت کے اصول بھی اسی بات کے متقاضی ہیں کہ زیر تربیت افراد کو قدم بقدم آگے بڑھانا چاہیے اور ان کے لیے ہر روز کا علیحدہ پروگرام مرتب کیا جانا چاہیے تاکہ وہ نچلے درجے سے شروع کر کے اعلیٰ مدارج تک جا پہنچیں اس طرح کا جو پروگرام تشکیل دیا جاتا ہے وہ بولنے والے کے لیے بھی بہت دلچسپ اور عمیق ہوتا ہے اور سننے والے کے لیے بھی۔

۲۔ اصولی طور پر جو لوگ قرآن پر اس قسم کا اعتراض کرتے تھے وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ قرآن کوئی کلاسیکی کتاب نہیں ہے جو کسی ایک موضوع یا کسی خاص علم کے بارے میں گفتگو کرے بلکہ وہ تو ایک انقلابی قوم کا ایک مکمل اور جامع نظام حیات ہے جس سے زندگی کے ہر شعبہ میں راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

بہت سی قرآنی آیات تاریخی مناسبت کے لحاظ سے نازل ہوتی رہیں۔ بدر، اُحد، احزاب اور حنین وغیرہ کی جنگوں کے موقع پر ایسا ہی ہوا ہے۔ ان مواقع پر نازل ہونے والی آیتوں میں جنگی دستور العمل یا ان کے نتائج کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ تو کیا کوئی تک بنتا ہے کہ ایسی آیات بھی ایک جگہ لکھ کر لوگوں کو پیش کر دی جائیں۔

بالفاظ دیگر قرآن مجید، اوامر ونواہی، احکام وقوانین، تاریخ وموعظہ اور امتِ مسلمہ کو مختلف حالات میں پیش آنے والے حربی و غیر حربی حوادث کے اسٹریٹیجک اور جنگی دستور العمل کا مجموعہ ہے۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے تمام امور حتیٰ کہ کلیہ قواعد کو موقع محل کی مناسبت سے بیان کرتی اور اس پر عمل درآمد کرنے کا حکم دیتی ہے کیونکر ممکن ہے کہ پہلے سے مرتب اور مدون ہو کر نازل ہو یہ تو ایسے ہی ہوگا کہ اپنے انقلاب کو کامیاب کرنے کے لیے ایک عظیم انقلابی لیڈر اپنے تمام اعلانات، بیانات، اوامر اور نواہی کو ایک ہی دن پیش کر دے جبکہ انھیں مختلف موقعوں کی مناسبت سے ہونا چاہیے۔

تو کیا ایسی صورت میں کوئی شخص اسے عاقلانہ اقدام تصور کر سکتا ہے؟

۳۔ قرآن کا تدریجی نزول درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وحی کے رابطے کا ایک ذریعہ تھا اس مسلسل رابطے نے آپؐ کے دل کو قوی اور ارادے کو محکم واستوار بنا رکھا تھا جس کا اثر آپؐ کے تربیتی پروگراموں میں بہت نمایاں اور ناقابلِ انکار تھا۔

۴۔ وحی کا تسلسل آنحضرتؐ کی رسالت اور سفارت کے تسلسل کو بیان کرتا ہے جس سے دشمنوں کے لیے یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی کہ اللہ نے انھیں ایک دن مبعوث کر دیا ہے اور اب ان کی بات بھی نہیں پوچھتا جیسا کہ تاریخ اسلام میں درج ہے کہ اوائل بعثت میں ایک مرتبہ وحی کے نزول میں دیر ہوگئی تو مخالف حلقوں میں مختلف چہ میگوئیاں ہونے لگیں جن کی تردید میں

Marfat.com

سورۃ "والضحیٰ" نازل ہوئی۔

۵۔ مان لیا کہ تمام قرآن کو یکجا نازل ہوجانا چاہیے تھا تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس پر یکجا عملدرآمد بھی ہونا چاہیے تھا ورنہ کوئی فائدہ نہ تھا اور نہ ہی اس کی کوئی اہمیت تھی اور اگر تمام احکام پر عملدرآمد کیا جاتا خواہ وہ نماز ہو یا زکوٰۃ، جہاد ہو یا دوسرا کوئی واجب یا تمام محرمات سے یکدم پرہیز کیا جانا خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے تو نہایت ہی مشکل کام تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ اسلام کو خیرباد کہہ جاتے۔

لہٰذا کیا ہی اچھی بات ہے کہ وہ تدریجی طور پر نازل ہو اور اس پر رفتہ رفتہ عمل درآمد کیا گیا۔

چاہیے کہ ایسے پروگرام آہستہ آہستہ عملی جامہ پہنتے جائیں اور لوگوں کے لیے قابلِ قبول بنتے جائیں اور اس بارے میں کوئی سوال یا بحث ہو تو وہ بھی پیش ہو اور اس پر گفتگو کی جائے اور اس کا جواب بھی دے دیا جائے۔

۶۔ تدریجی نزول کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قرآن کی عظمت اور اس کے اعجاز روز بروز روشن تر ہو گئے کیونکہ جب کبھی بھی کسی موقع پر کوئی آیت نازل ہوئی تو یہ بذاتِ خود قرآن کی عظمت اور اعجاز پر دلیل تھی اور جوں جوں ایسے واقعات کا تکرار ہوتا گیا قرآن کی عظمت اور اعجاز کو چار چاند لگتے گئے اور لوگوں کے دلوں میں اس کا اثر اور بڑھتا گیا۔

۲۔ **ترتیلِ قرآن کا معنیٰ:** "ترتیل" کا لفظ "رتل" (بروزن "قمر") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ منظّم اور مرتب ہونا ہے یہی وجہ ہے کہ جس شخص کے دانت خوب منظم اور مرتب ہوتے ہیں اہلِ عرب اسے "رتل الاسنان" کہتے ہیں۔ اسی بناء پر پے در پے اور ترتیب سے کی جانے والی گفتگو یا تنظیم اور ترتیب کے ساتھ آنے والی آیات پر بھی ترتیل کا لفظ بولا جاتا ہے۔

لہٰذا "ورتلناہ ترتیلا" کا جملہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ قرآن مجید تدریجی طور پر ۲۳ سال کے عرصے میں نازل ہوتا رہا لیکن یہ تدریجی نزول ایک باقاعدہ حساب و کتاب اور نظم و ترتیب کے تحت تھا کہ وہ دل و دماغ میں پہنچ کر انھیں اپنا والہ و شیدا بنا دیتا تھا۔

کلمہ "ترتیل" کی تفسیر میں دلچسپ روایات ذکر ہوئی ہیں جن میں سے ہم بعض کو ذیل میں نقل کئے دیتے ہیں۔

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابنِ عباس سے فرمایا:۔

اذا قرأت القراٰن فرتله ترتيلا

جب قرآن کی تلاوت کیا کرو تو اسے ترتیل کے ساتھ پڑھا کرو۔

ابنِ عباس کہتے ہیں "میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ترتیل کیا ہوتی ہے؟" تو آپؐ نے فرمایا:

بينه تبيينًا، ولا تنثره نثر الدغل (الرمل) ولا تهذه هذا الشعر، قفوا عند عجائبه، وحركوا به القلوب، ولا يكونن هم احدكم اٰخر السورة

حروف اور کلمات کو صحیح طریقے پر ظاہر کرو، خشک کھجوروں (یا ریت کے ذروں) کی مانند اسے منتشر نہ کرو اور نہ ہی اشعار کی مانند اسے فرفر اور جلدی جلدی پڑھا کرو جب اس میں عجائبات کا تذکرہ آ جائے تو

Marfat.com

وہاں پر ٹھہر جاؤ اور غور و فکر کرو، دلوں کو اس کے ذریعہ متحرک کرو، ہرگز تمہاری نیت یہ نہیں ہونی چاہیے کہ جلدی سے سورت کو ختم کرنا ہے (بلکہ اہم مقصد قرآن میں غور و فکر اور اس سے استفادہ کرنا ہے)[1]

بعینہ یہی چیز "اصول کافی" میں حضرت امیر المومنین سے منقول ہے[2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے بھی اس طرح کی حدیث نقل ہوئی:

الترتیل ان تتمکث بہ و تحسن بہ صوتک، واذا مررت بآیة فیھا ذکر النار فتعوذ باللہ من النار واذا مررت بآیة فیھا ذکر الجنة فاسئل اللہ الجنة

ترتیل یہ ہے کہ آیات کو ٹھہر ٹھہر کر اور اچھی آواز کے ساتھ پڑھو جب کسی ایسی آیت پر پہنچو جس میں جہنم کا تذکرہ ہے تو خدا کی پناہ مانگو اور جب کبھی ایسی آیت پڑھو جس میں بہشت کا ذکر ہے تو خدا سے بہشت کی دعا مانگو (خود کو بہشتیوں کے اوصاف سے متصف کرو اور جہنمیوں کی صفات سے بچاؤ)[3]

۴۔ "یحشرون علی وجوھھم الی جھنم" کی تفسیر: "گناہ گار ٹولے کا منہ کے بل محشور ہونے" کا کیا مقصد ہے؟

اس بارے میں مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے کچھ مفسرین نے تو اسے اس کے حقیقی معنیٰ سے تفسیر کی ہے اور کہا ہے کہ یہ مجرم ٹولا منہ کے بل گرا ہوا ہو گا اور فرشتے انھیں کشاں کشاں جہنم میں لے جائیں گے ان کا یہ عذاب ایک طرف سے تو ان کی ذلت و رسوائی کی علامت ہو گا کیونکہ وہ دنیا میں انتہائی مغرور، متکبر اور خود پسند تھے دوسری طرف سے ان کی گمراہی مجسم ہو کر سامنے آجائے گی کیونکہ جس شخص کو ایسی حالت میں گھسیٹ کر لے جائیں گے وہ کسی بھی صورت میں اپنے سامنے نہیں دیکھ سکے گا اور نہ ہی وہ اپنے اطراف میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر ہو گا۔

لیکن بعض مفسرین نے اس جملے کو کنایے کے معنی میں لیا ہے کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ جملہ ان گناہ گاروں کے دنیا کے ساتھ قلبی تعلق کیلئے کنایہ ہے یعنی کیونکہ ان کے دل اب بھی دنیا سے لو لگائے ہوئے ہونگے لہٰذا وہ جہنم کی طرف گھسیٹے جائیں گے[4]

اور کچھ نے کہا ہے کہ یہ کنایہ اس مخصوص تعبیر کی مانند ہے جو ادبیات عرب میں استعمال ہوتی ہے کہ:

فلان مر علی وجھہ

فلاں شخص کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کنایہ کے معنی پر کوئی دلیل موجود نہ ہو وہی پہلے یعنی حقیقی معنی والی تفسیر مناسب ہو گی۔

۱۔ مجمع البیان، زیر بحث آیت کے ذیل میں۔

۲۔ اصول کافی جلد ۲ ص ۴۴۹ (باب ترتیل القرآن بالصوت الحسن)۔

۳۔ مجمع البحرین مادہ "رتل"۔

۴۔ اس تفسیر کی رُو سے "علی وجوھھم" کی تعبیر نے درحقیقت لام کی جگہ لی ہے اور اس جملے کا مفہوم یوں ہو گا:

یحشرون الی جھنم لتعلق وجوہ قلوبھم الی الدنیا

Marfat.com

۳۵۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَا مَعَهٗٓ اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ۝

۳۶۔ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ فَدَمَّرْنٰهُمْ
تَدْمِيْرًا ۝ۭ

۳۷۔ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ۭ
وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝

۳۸۔ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَا۟ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًۢا بَيْنَ ذٰلِكَ
كَثِيْرًا ۝

۳۹۔ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۡ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ۝

۴۰۔ وَلَقَدْ اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ۭ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا
يَرَوْنَهَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ۝

ترجمہ

۳۵۔ ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب عطا کی اور ان کے بھائی ہارون کو مدد کے لیے ان کے ہمراہ کر دیا۔

۳۶۔ اور ہم نے کہا کہ اس قوم کی طرف جائیے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے (چونکہ اس قوم نے ہماری مخالفت پر کمر باندھ لی تھی لہذا) ہم نے اس کی ایسی سرکوبی کی کہ وہ نیست ونابود ہوگئی۔

۳۷۔ اور چونکہ قوم نوح نے پیغمبروں کو جھٹلایا لہذا اسے غرق کر دیا اور اسے دوسرے لوگوں کے لیے درس عبرت بنا دیا اور ہم نے ستم گروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

۳۸۔ (اسی طرح) قوم عاد و ثمود، اصحاب الرس (جو درخت صنوبر کی پرستش کیا کرتے تھے) اور بہت سی دوسری قوموں کو جو ان میں موجود تھیں ہم نے ہلاک کر دیا۔

۳۹۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لیے مثالیں بیان کیں (کیونکہ ان مثالوں سے انھوں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا لہذا)

Marfat.com

ان میں سے ہر ایک کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

۴۰۔ وہ (قوم لوط کے) اس شہر کے پاس سے گزرے جس پر بُری بارش ہوئی (آسمان سے پتھر برسے) آیا انھوں نے اسے نہیں دیکھا؟ (ضرور دیکھا) لیکن وہ قیامت پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

تفسیر

درسِ عبرت سے لاپروائی

ان آیات میں خداوند عالم ایک تو اپنے پیغمبرؐ اور مومنین کی تسلّی اور دلجوئی کے لیے کہ دوسرے ان حیلہ ساز مشرکین کی تنبیہ کے لیے جن کی باتیں ابھی بیان ہو چکی ہیں، گزشتہ اقوام کی تاریخ اور ان کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور گزشتہ اقوام میں سے چھ قوموں کا خاص طور پر تذکرہ فرما رہا ہے (یعنی قوم فرعون، قوم نوح، قوم عاد، ثمود، اصحاب الرس اور قوم لوط) اور ان اقوام کے انجام کو بطور درسِ عبرت پیش فرماتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ہم نے موسیٰ کو آسمانی کتاب دی اور ان کے بھائی ہارون کو مدد کے لیے ان کے ہمراہ کر دیا (ولقد اٰتینا موسی الکتاب وجعلنا معه اخاه هارون وزیرًا)۔

کیونکہ انھوں نے فرعون کے ساتھ مقابلے کی عظیم ذمہ داری اٹھا رکھی تھی لہٰذا اس انقلابی کام کو انھیں مل جل کر سرانجام دینا تھا تاکہ وہ اس انقلابی تحریک کو ساحلِ کامرانی تک پہنچا سکیں۔

"ہم نے (ان دونوں بھائیوں سے خطاب کرتے ہوئے) کہا: اس قوم کی طرف جائیے جس نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے" (فقلنا اذهبا الی القوم الذین کذبوا بایاتنا)۔

انھوں نے ایک تو آفاق و انفس اور کائنات میں موجود آیاتِ خداوندی کی عملاً تکذیب کی اور شرک و بت پرستی کی راہ اپنائی اور دوسرے انبیائے ماسبق کی تعلیمات کو نظر انداز ہی نہیں کر دیا بلکہ ان کی تکذیب بھی کی۔

لیکن جناب موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ کی تمام کوششوں کے باوجود اور عظیم اور روشن معجزات کے بعد بھی انھوں نے کفر اور انکار کا راستہ اپنایا" لہٰذا ہم نے انھیں ایسے سرکوب کیا کہ وہ نیست و نابود ہو گئے (فدمرناهم تدمیرًا)۔

"تدمیر" کا لفظ "دمار" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے تعجب خیز ہلاکت اور سچی بات ہے کہ دریائے نیل کی متلاطم موجوں میں قوم فرعون کی ایسے انداز میں تباہی تاریخ بشریت کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے۔

اسی طرح جب قوم نوح نے پیغمبروں کی تکذیب کی تو ہم نے اسے بھی غرق کر دیا اور اس کے انجام کو عام لوگوں کے لیے ایک واضح اور روشن نشانی قرار دیا اور تمام ظالموں کے لیے ہم نے دردناک عذاب مہیا کر رکھا ہے (وقوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقناهم وجعلناهم للناس اٰیة واعتدنا للظالمین عذابًا الیمًا)۔

اور یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ انھوں نے رسولوں کو جھٹلایا (صرف ایک رسول کو نہیں بلکہ کئی رسولوں کو جھٹلایا)

Marfat.com

کیونکہ خدا کے انبیاء اور رسولوں کے دعوتی اصولوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے لہٰذا ایک کی تکذیب گویا سب کی تکذیب ہے اور پھر یہ کہ اصولی طور پر قوم نوح کو تمام انبیاء کی دعوت سے مخالفت تھی اور وہ تمام ادیان کے منکر تھے۔

اسی طرح "ہم نے قوم عاد و ثمود، اصحاب رس اور دوسری بہت سی قومیں جو ان میں موجود تھیں کو ہلاک کر دیا (و عادًا و ثمودًا و اصحاب الرس و قرونًا بین ذٰلک کثیرًا) [۱]

قوم عاد وہی حضرت ہود علیہ السلام کی قوم ہے حضرت ہودؑ کو اللہ نے احقاف (یا یمن) میں مبعوث فرمایا اور قوم ثمود اللہ کے پیارے نبی جناب صالح علیہ السلام کی قوم ہے حضرت صالحؑ کو خدا نے وادی القریٰ (مدینہ اور شام کے علاقے) میں مبعوث فرمایا۔ البتہ اصحاب الرس کے بارے میں ہم آگے چل کر تفصیل سے بتائیں گے۔

"قرون" "قرن" کی جمع ہے جو اصل میں ایسی جماعت اور گروہ کے بارے میں بولا جاتا ہے، جس کے افراد ایک ہی زمانے میں باہم زندگی بسر کرتے ہوں۔ پھر ایک لمبے زمانے (مثلاً چالیس سال یا سو سال) پر بھی اس کا اطلاق ہونے لگا۔

البتہ ہم نے انھیں غافل کر کے سزا نہیں دی بلکہ "ہم نے ان میں سے ہر ایک کے لیے مثالیں بیان کیں" (و کلًا ضربنا له الامثال)۔

جس قسم کے اعتراضات یہ لوگ آپ پر کرتے ہیں اور ہم ان کا جواب دیتے ہیں، اسی طرح کے اعتراض لوگوں نے ان پر بھی کیے تھے۔ اور ہم نے ان کا جواب بھی دیا۔ ان کے لیے احکامِ الٰہی کو واضح طور پر پیش کیا اور دینی حقائق کو ان کے سامنے کھول کر بیان کیا۔

انھیں خبردار کیا، ڈرایا اور سابق لوگوں کی داستانیں بیان کیں۔

لیکن جب کوئی چیز بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تو "ہم نے ان میں سے ہر ایک کی شدت کے ساتھ سرکوبی کی اور انھیں تباہ و برباد کر کے رکھ دیا" (و کلًا تبرنا تتبیرًا)۔ [۲]

انجام کار اس سلسلے کی آخری آیت میں قوم لوط کے شہروں کے کھنڈرات اور ویرانوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جو حجاز سے شام جانے والے لوگوں کی راہ میں پائے جاتے ہیں اور شرک و گناہ سے آلودہ لوگوں کی دردناک تباہی و بربادی کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں، خدا فرماتا ہے: وہ لوگ اس شہر کے پاس سے گزرے جس پر برائی اور بدبختی (ہلاک کر دینے والے پتھروں) کی بارش ہوئی، تو کیا انھوں نے (اپنے سفرِ شام کے دوران میں) ایسی صورتِ حال کو نہیں دیکھا اور ان کے انجام سے درس حاصل نہیں کیا (و لقد اتوا علی القریة التی امطرت مطر السوء افلم یکونوا یرونها)۔

انھوں نے اس کیفیت کو دیکھا تو ضرور ہے لیکن اس سے درسِ عبرت حاصل نہیں کیا کیونکہ وہ روزِ قیامت پر نہ تو ایمان

---

[۱] "عاد اور ثمود" کے کلمہ کا عطف "دمرناهم" میں موجود "هم" کی ضمیر پر ہے بعض مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ "جعلناهم" میں "هم" کی ضمیر پر ہو سکتا ہے یا پھر "الظالمین" پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب ہے۔

[۲] "تتبیر" "تبر" (بر وزن "ضرر" "یا صبر") ہلاک ہونے یا تباہ و برباد ہونے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

رکھتے ہیں اور نہ ہی اس کی امید (بل کانوا لا یرجون نشورًا)۔
وہ لوگ موت کو زندگی کا خاتمہ سمجھتے ہیں اور اگر دوسرے جہان کی زندگی کے بارے میں ان کا کچھ عقیدہ ہے بھی تو نہایت ہی کمزور اور بے بنیاد۔ جس طرح یہ عقیدہ ان کی روح میں مؤثر اور کارگر ثابت نہیں ہو سکتا ان کی معمول کی زندگی میں تو بطریق اولیٰ غیر مؤثر ہے یہی وجہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر چیز کو بازیچۂ اطفال سمجھتے ہیں اور چند روزہ زندگی کی ہوا و ہوس کے سوا کچھ سوچتے نہیں۔

چند ایک نکات

۱۔ "اصحاب الرس" کون ہیں؟ "رس" کا لفظ دراصل مختصر اور تھوڑے سے اثر کے معنی میں ہے جیسے کہتے ہیں:
"رس الحدیث فی نفسی" (مجھے اس کی تھوڑی سی بات یاد ہے) یا کہا جاتا ہے "وجد رسًا من حمی" (اس نے اپنے اندر بخار کا تھوڑا سا اثر پایا) [1]
کچھ مفسرین کا نظریہ یہ ہے کہ "رس" کا معنیٰ "کنواں" ہے۔
معنی خواہ کچھ بھی ہو اس قوم کو اس نام سے موسوم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اب تھوڑا سا اثر یا بہت ہی کم نام اور نشان باقی رہ گیا ہے یا اس وجہ سے انھیں "اصحاب الرس" کہتے ہیں کہ وہ بہت سے کنوؤں کے مالک تھے یا کنوؤں کا پانی خشک ہو جانے کی وجہ سے ہلاک و برباد ہو گئے۔
یہ کون لوگ تھے؟ مؤرخین اور مفسرین کی اس بارے میں مختلف آراء ہیں۔
(۱) بہت سے لوگوں کا نظریہ تو یہ ہے کہ اصحاب الرس "یمامہ" کے علاقے میں ایک قبیلہ تھا جس کے لیے حضرت "حنظلہ" نامی پیغمبر کو مبعوث کیا گیا ان لوگوں نے خدا کے اس نبی کی تکذیب کی اور انھیں کنوئیں میں ڈال دیا بلکہ بعض نے تو یہ بھی لکھا ہے کہ انھوں نے اس کنوئیں کو نیزوں سے بھر دیا اور اس کا منہ پتھروں سے بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے اللہ کے نبی جناب حنظلہ وہیں پر شہید ہو گئے۔[2]
(۲) کچھ مؤرخین کا نظریہ ہے کہ "اصحاب الرس" حضرت شعیب علیہ السلام کے زمانے کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو بت پرست تھے ان کے بڑی تعداد میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہوتے تھے اور بہت سے کنوئیں بھی اور "رس" نامی کنواں بہت بڑا تھا اس کا پانی خشک ہو گیا اور اس علاقے کے لوگوں کو بھی تباہی نے آن لیا۔
(۳) بعض کہتے ہیں کہ سرزمین "یمامہ" میں "رس" نامی ایک گاؤں تھا، جہاں قوم ثمود کے بچے کھچے لوگ رہ رہے تھے اور اپنی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہو گئے۔
(۴) بعض کہتے ہیں کہ پرانے زمانے کے کچھ عرب تھے جو شام اور حجاز کے درمیان رہتے تھے[3]

---

[1] مفردات راغب۔

[2] اعلام القرآن ص ۱۴۹۔

[3] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۱۰ ص ۹۴۔

Marfat.com

(۵) بعض تفسیریں عاد وثمود کے بچے کھچے لوگوں کو "اصحاب الرس" کے نام سے موسوم کرتی ہیں اور سورۂ حج کی آیت ۴۵ "وبئر معطلة و قصر مشید" کا تعلق انھی لوگوں سے بتاتی ہیں اور "حضرموت" کا علاقہ ان کی جائے سکونت بتاتی ہیں چنانچہ "ثعلبی" نے "عرائس التیجان" میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

کچھ اور مفسرین جو "ارس" کے نام سے آشنا ہوئے ہیں انھوں نے "رس" کو "ارس" پر منطبق کیا ہے (جو آذربائیجان کے شمال کا علاقہ ہے)۔

(۶) مرحوم طبرسی نے مجمع البیان میں، فخرالدین رازی نے تفسیر کبیر میں اور آلوسی نے روح المعانی میں جو احتمالات نقل کیے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ لوگ شام کے علاقے انطاکیہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے نبی کا نام "حبیب نجار" تھا۔

(۷) عیون اخبار الرضا میں امام رضا علیہ السلام کے ذریعے امیرالمومنین علی علیہ السلام سے اصحاب الرس کے بارے میں ایک طویل گفتگو نقل ہوئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"وہ ایسے لوگ تھے جو صنوبر درخت کی پوجا کرتے تھے اور اسے "درختوں کا بادشاہ" کہتے تھے یہ وہ درخت تھا جسے جناب نوحؑ کے بیٹے "یافث" نے طوفانِ نوح کے بعد "روشن آب" کے کنارے کاشت کیا تھا "رس" نامی نہر کے کنارے انھوں نے بارہ شہر آباد کر رکھے تھے جن کے نام یہ ہیں: آبان، آذر، دی، بہمن، اسفندار، فروردین، اردیبہشت، خرداد، تیر، مرداد، شہریور اور مہر۔ ایرانیوں نے اپنے کیلنڈر کے بارہ مہینوں کے نام انھی شہروں کے نام پر رکھے ہوئے ہیں۔

چونکہ وہ درخت صنوبر کا احترام کرتے تھے لہٰذا انھوں نے اس کے بیج کو دوسرے علاقوں میں بھی کاشت کیا اور آبپاشی کے لیے ایک نہر کو مختص کر دیا انھوں نے اس نہر کا پانی لوگوں کے لیے پینا ممنوع قرار دے دیا تھا حتیٰ کہ اگر کوئی شخص اس سے پی لیتا تو اسے قتل کر دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کیونکہ یہ ہمارے خداؤں کا سرمایہ حیات ہے لہٰذا مناسب نہیں ہے کہ کوئی اس سے ایک گھونٹ پانی کم کر دے۔

وہ سال کے بارہ مہینوں میں سے ہر ماہ ایک ایک شہر میں ایک دن کے لیے عید منایا کرتے تھے اور شہر سے باہر صنوبر کے درخت کے پاس چلے جاتے اس کے لیے قربانی کرتے اور جانوروں کو ذبح کر کے آگ میں ڈال دیتے جب اس سے دھواں اٹھتا تو وہ درخت کے آگے سجدے میں گر پڑتے اور خوب گریہ کیا کرتے تھے۔

ہر مہینے ان کا یہی طریقہ کار تھا چنانچہ جب "اسفندار" کی باری آتی تو تمام بارہ شہروں کے لوگ یہاں جمع ہوتے اور مسلسل بارہ دن تک وہاں عید منایا کرتے کیونکہ یہ ان کے بادشاہوں کا دارالحکومت تھا یہیں پر وہ مقدور بھر قربانی بھی کیا کرتے اور درخت کے آگے سجدہ بھی کیا کرتے۔

جب وہ کفر اور بت پرستی کی انتہا کو پہنچ گئے تو خداوندِ عالم نے بنی اسرائیل میں سے ایک نبی

Marfat.com

ان کی طرف بھیجا تاکہ وہ انھیں شرک سے روکے اور خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کی دعوت دے لیکن وہ اس نبی پر ایمان نہ لائے اب اس نبی نے فساد اور بت پرستی کی اصل جڑ یعنی اس درخت کے قلع قمع کرنے کی خدا سے دعا کی اور بڑا درخت خشک ہو گیا جب ان لوگوں نے یہ صورت حال دیکھی تو سخت پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ اس شخص نے ہمارے خداؤں پر جادو کر دیا ہے کچھ کہنے لگے کہ ہمارے خدا اس شخص کی وجہ سے ہم پر ناراض ہو گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیں کفر کی دعوت دیتا ہے۔

اس بحث مباحثے کے بعد سب لوگوں نے اللہ کے اس نبی کو قتل کرنے کی ٹھان لی اور گہرا کنواں کھودا جس میں اسے ڈال دیا اور کنوئیں کا منہ بند کر کے اس کے اوپر بیٹھ گئے اور اس کے نالہ و فریاد کی آواز سنتے رہے یہاں تک کہ اس نے جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔ خداوندِ عالم نے انھیں ان برائیوں اور ظلم وستم کی وجہ سے سخت عذاب میں مبتلا کر کے نیست ونابود کر دیا۔[1]

بہت سے قرائن اس حدیث کی تائید کرتے ہیں کیونکہ عاد وثمود کے ذکر کے باوجود "اصحاب الرس" کا تذکرہ اس احتمال کی تردید کرتا ہے کہ یہ عاد اور ثمود کی قوم کے بچے کھچے لوگ تھے اور یہ بات بعید بھی معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح یہ احتمال بھی بعید معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ جزیرۃ العرب، شام اور ان علاقوں کے گرد ونواح میں رہتے تھے کیونکہ تاریخ عرب میں قاعدۃً ان کا ذکر بھی ہونا چاہیے جبکہ ایسا بہت کم دکھائی دیتا ہے۔

اس سے قطع نظر مندرجہ بالا حدیث بعض دوسری تفسیروں سے کسی حد تک مطابقت بھی رکھتی ہے۔ مثلاً "رس" ایک کنوئیں کا نام تھا (جس میں انھوں نے اللہ کے نبی کو ڈال دیا تھا) یا یہ کہ وہ زراعت پیشہ اور گلہ بان تھے وغیرہ۔

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث میں یہ جو ہے کہ "ان کی عورتیں بے راہ روی کا شکار تھیں اور ہم جنس بازی کیا کرتی تھیں" یہ بھی مندرجہ بالا حدیث کے منافی نہیں ہے۔[2]

البتہ نہج البلاغہ (کے خطبہ نمبر ۱۸۰) کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے پاس صرف ایک نبی نہیں آیا کیونکہ امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں :۔

این اصحاب مدائن الرس الذین قتلوا النبیین واطفأ واسنن المرسلین واحیوا سنن الجبارین

کہاں ہیں رس کے شہروں والے! جنھوں نے انبیاء کو قتل کر ڈالا، خدا کے رسولوں کی سنت کو مٹا کر جباروں کے رسم ورواج کو فروغ دیا۔

اس تعبیر سے بھی روایت بالا کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ ممکن ہے کہ روایت میں ان کی تاریخ کے صرف اس ایک حصے کی طرف

---

[1] "عیون اخبار الرضا" (منقول وملخص از تفسیر المیزان جلد ۱۵ ص ۲۲۷)۔

[2] کافی (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۹)۔

Marfat.com

اشارہ ہو جس میں پیغمبر بھیجا گیا تھا۔

۲۔ **کچھ لرزا دینے والے درس:** آیات بالا میں جن چھ گروہوں کا نام لیا گیا ہے یہ ہیں:

فرعونؔ کی قوم، نوحؑ کی متعصب قوم، عادؔ اور ثمودؑ کے زور آور لوگ، گناہوں سے آلودہ اصحاب الرّس اور قوم لوطؑ۔

ان میں سے ہر ایک قوم کسی نہ کسی فکری یا اخلاقی بے راہ روی کا شکار تھی جس کی وجہ سے اسے بدبختی کا سامنا کرنا پڑا۔

فرعونی لوگ ظالم، ستمگر، سامراجی، استعماری اور خود غرض تھے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں قوم نوح بھی سخت جھگڑالو، متکبر اور احساسِ برتری کا شکار تھی۔

قوم عاد و ثمود کو اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا۔

اصحاب الرس جنسی بے راہ روی کا شکار تھے خصوصاً ان کی عورتیں ہم جنس بازی کی مریض تھیں جبکہ قوم لوط لواطت ایسے فعل شنیع کی مرتکب تھی ان میں ہر ایک قوم جادۂ توحید سے منحرف اور بے راہروی میں سرگرداں تھی۔

قرآن مجید حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مشرکین بلکہ ہر عصر کے لوگوں کو خبردار کر رہا ہے کہ خواہ تم جس قدر بھی طاقت کے مالک بن جاؤ اور کتنا ہی اقتدار تمھارے ہاتھ میں کیوں نہ ہو جس قدر بھی مال و دولت اور خوشحال زندگی کے حامل کیوں نہ ہو جاؤ، تمھاری شرک، ظلم اور فساد و گناہ سے آلودگی آخر کار تمھاری زندگی کا خاتمہ کر کے رکھ دے گی تمھاری کامیابی کے اسباب درحقیقت تمھاری موت کے اسباب بن جائیں گے۔

فرعون کے ماننے والے اور حضرت نوحؑ کی قوم کے لوگ پانی کے ذریعے ہلاک ہوئے جو تمام ذی حیات چیزوں کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ قوم عاد بھی طوفان اور آندھی کے ذریعے ہلاک ہوئی جو خاص صورتوں میں سرمایۂ زندگی ہے۔ قوم ثمود کی تباہی بجلی گرانے والے بادل سے ہوئی اور قوم لوطؑ کی ہلاکت پتھروں سے ہوئی جو آسمان سے برسے یا بقول بعض مفسرین آتش فشاں پہاڑ ان پر گرے اور قوم رس، اسی مندرجہ بالا روایت کے مطابق اس آگ کے ذریعے لقمۂ اجل بنی جو زمین سے اٹھی اور آسمان سے ایک شعلہ زمین پر گرا تاکہ یہ مغرور انسان سنبھل کر خدا، عدالت اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہو جائے۔

Marfat.com

۴۱۔ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِیْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ○

۴۲۔ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَاۤ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○

۴۳۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ○

۴۴۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ○

ترجمہ

۴۱۔ جب بھی وہ آپ کو دیکھتے ہیں تو (کوئی منطقی بات کرنے کے بجائے) مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں (اور کہتے ہیں) آیا یہی وہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟

۴۲۔ اگر ہم اپنے خداؤں کی پرستش پر قائم نہ رہیں تو اس بات کا خدشہ ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کر ڈالے لیکن جب وہ عذابِ الٰہی کو دیکھیں گے تو پتہ چل جائے گا کہ کون گمراہ تھا؟

۴۳۔ آیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی نفسانی خواہشات کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟ تو کیا تو اسے ہدایت کر سکتا ہے یا اس کا دفاع کر سکتا ہے؟

۴۴۔ آیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں؟ وہ تو صرف چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی گمراہ تر ہیں۔

تفسیر

جانوروں سے بھی زیادہ گمراہ

یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید نے اس سورت میں مشرکین کی باتوں کو ایک جگہ بیان نہیں کیا بلکہ پہلے کچھ حصہ بیان کیا

Marfat.com

پھر اس کا جواب دیا اور وعظ و نصیحت کی پھر دوسرا حصہ بیان کیا اسی طرح یہ سلسلہ چل رہا ہے۔

زیر نظر آیات میں مشرکین کی منطق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے سلوک اور دعوتِ اسلام کے مقابلے میں ان کا ردِ عمل بیان کیا گیا ہے۔

پہلے فرمایا گیا ہے: جب بھی وہ تجھے دیکھتے ہیں تو سب سے پہلا کام یہ انجام دیتے ہیں کہ آپ کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں یہ وہی شخص ہے جسے خدا نے پیغمبر کے طور پر مبعوث کیا ہے (و اذا راوك ان يتخذونك الا هزوًا أهذا الذی بعث الله رسولا)[1]

کتنا بڑا دعویٰ کر رہا ہے؟ کیا عجیب باتیں کر رہا ہے؟ واقعاً مضحکہ خیز باتیں کر رہا ہے؟

یہ بات قطعاً فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہی تو ہیں جو قبل از اعلانِ رسالت چالیس سال تک ان میں رہ چکے ہیں، اس دوران میں آپؐ کی امانت، صداقت اور عقل و شعور کے ڈنکے بجتے تھے لیکن جب کفر کے سرداروں کے مفادات خطرے میں پڑ گئے تو انھوں نے آپؐ کی تمام خوبیاں بھلا دیں اور ٹھٹھا مذاق شروع کر دیا۔ آنحضرتؐ کی دعوتِ اسلامی کا شواہد اور دلائل کے باوجود ہنسی مذاق کے ذریعے انکار کرنے لگے یہاں تک کہ خود سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جنون کی تہمت سے متہم کرنے لگ گئے۔

قرآن مجید مشرکین کی بات کو ان کی اپنی زبانی آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے: اگر ہم اپنے خداؤں کی پرستش پر ڈٹے نہ رہیں تو اس بات کا خطرہ ہے کہ وہ ہمیں گمراہ کر ڈالے اور ہمارا رابطہ ان سے منقطع کر دے (ان كاد ليضلنا عن الهتنا لولا ان صبرنا عليها)[2]

لیکن قرآن اس بات کا کئی طریقوں سے جواب دیتا ہے پہلے تو اس غیر منطقی ٹولے کو یوں سر توڑ جواب دیتا ہے: جب وہ عذابِ الٰہی کو دیکھیں گے تو انھیں فوراً پتہ چل جائے گا کہ کون گمراہ تھا (و سوف يعلمون حين يرون العذاب من اضل سبيلا)۔

ہو سکتا ہے اس عذاب سے مراد قیامت کا عذاب ہو جیسا کہ طبرسی مرحوم کی مانند کئی مفسرین اسی بات کے قائل ہیں اور طبرسی نے مجمع البیان میں یہی لکھا ہے یا دنیاوی عذاب ہو جیسا کہ بدر وغیرہ کے دن کی عبرتناک اور دردناک شکست، جیسا کہ قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر میں بیان کیا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہر دو کی طرف اشارہ ہو۔

پھر مزے کی بات یہ ہے کہ یہ گمراہ لوگ اپنی گفتگو میں متضاد باتیں کر رہے ہیں ایک طرف تو پیغمبرِ اسلامؐ اور ان کی اسلامی دعوت کو حقیر سمجھ کر ان کا مذاق اڑا رہے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت

---

[1] "هزوًا" مصدر ہے اور یہاں مفعول کے معنیٰ میں آیا ہے نیز یہ احتمال بھی ہے کہ تقدیری طور پر مضاف کا مضاف الیہ ہو یعنی "موضع هزو" اور "هذا" کی تعبیر کفار کی طرف سے آنحضرتؐ کی حقارت اور توہین کی طرف اشارہ ہے۔

[2] "ان كاد ليضلنا" میں "ان" مخففہ اور تاکید کے لیے ہے اور تقدیر میں "انه كاد" تھا اور اس کی ضمیر شان ہے۔

Marfat.com

اور مشن کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے دوسری طرف وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اگر اپنے باپ دادا کے طریقے پر مضبوطی سے کاربند نہ رہیں تو ممکن ہے کہ رسول اللہؐ کی باتیں انھیں اس راہ سے بھٹکا دیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کی باتوں کو اہمیت دیتے تھے اور آپؐ کے کام کو نہایت ہی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اہم اقدام تصور کرتے تھے اور اس طرح کی پریشان خیالی اور تضاد گوئی اس سر پھرے اور ہٹ دھرم گروہ سے بعید بھی نہیں ہے۔

پھر عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ حق کے دشمنوں کو جب خدائی رہبروں کی منطق کا سامنا ہوتا ہے تو وہ ہنسی مذاق میں اس کو ٹال جاتے ہیں جو ان کی ایک قسم کی حکمت عملی ہوتی ہے تاکہ وہ اس طرح سے اسے حقیر اور ناقابل توجہ ظاہر کریں جبکہ در پردہ اس سے خائف ہوتے ہیں یا پھر اسے حقیقی خطرہ سمجھ کر کھلم کھلا اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔

ان کی گفتگو کا دوسرا جواب بعد والی آیت میں پیش کیا گیا ہے جس میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے ایک تو ان کی دلجوئی کی گئی ہے اور دوسرے مشرکین کی دعوتِ حق کو قبول نہ کرنے کی اصل وجہ بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

آیا تو نے اسے دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو اپنا معبود بنالیا ہے (ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ)۔

تو کیا ایسی حالت میں تو اسے ہدایت کرسکتا ہے یا اس کا دفاع کرسکتا ہے (افانت تکون علیہ وکیلاً)۔

یعنی اگر انھوں نے آپؐ کی دعوتِ اسلامی کے مقابلے میں استہزاء، انکار اور ہنسی مذاق کی پالیسی اپنا رکھی ہے تو اس لیے نہیں کہ آپؐ کی منطق کمزور اور دلائل قانع کنندہ نہیں یا آپؐ کے دین و آئین میں کسی قسم کا شک و شبہ ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ وہ عقلی اور منطقی بات کی پیروی نہیں کرتے ان کا معبود ان کی نفسانی خواہشات ہوتی ہیں تو کیا ایسے لوگوں سے اس بات کی امید کی جاسکتی ہے کہ وہ آپؐ کی دعوت کو قبول کریں یا آپؐ ان پر کوئی اثر و رسوخ استعمال کرسکیں۔

"ارأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ" کے بارے میں بعض بزرگ مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔

کچھ مفسرین تو یہ کہتے ہیں جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ان کا ایک بت ہے جسے خواہشاتِ نفسانی کہا جاتا ہے اور ان کے تمام کام اسی کے حکم سے انجام پاتے ہیں۔

جبکہ کچھ مفسرین کا نظریہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کافر لوگ پرستش کے لیے بت کے انتخاب تک میں بھی عقل و خرد سے کام نہیں لیتے اور کسی منطقی دلیل کو مدنظر نہیں رکھتے بلکہ جب بھی ان کی نگاہ کسی پتھر یا اچھے سے درخت پر جا پڑتی ہے یا کسی ایسی چیز کو دیکھ لیتے جو دل لبھانے والے ہوتی ہے تو اسے اپنا معبود بنالیتے ہیں ان کے آگے زانوئے ادب تہ کرتے ہیں، قربانیاں پیش کرتے ہیں اور ان سے اپنی مشکل کشائی کی درخواست کرتے ہیں۔

اتفاق سے اس آیت کی شانِ نزول کے بارے میں مفسرین نے ایک روایت بیان کی ہے جو ہمارے اس مدعا کی تائید کرتی ہے روایت یہ ہے:

ایک مرتبہ قریش مکہ پر سخت قحط سالی کا دور آیا اور وہ اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے کچھ لوگ ایسے تھے جو کسی خوبصورت پتھر یا کسی اچھے سے درخت کو دیکھ لیتے اس کی پوجا پاٹ شروع کردیتے اگر وہ پتھر ہوتا تو اسے "سعادت کی چٹان" کا نام دیتے اس کے لیے قربانی کرکے، قربانی کے خون سے اسے رنگین کردیتے حتیٰ کہ اپنے جانوروں کی بیماری کے لیے دوا بھی اسی سے طلب کرتے۔

Marfat.com

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ ایک عربی اپنے اونٹ اس پتھر کے ساتھ مس کرنے اور برکت حاصل کرنے کی غرض سے لے آیا لیکن اونٹ بھاگ کر جنگل کو چلے گئے اور اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے اس نے کچھ اشعار پڑھے جن کا مفہوم یہ تھا:

میں "سعادت کی چٹان" کے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ وہ ہمارے اندر موجود انتشار کو دور کرے۔

لیکن اس نے تو ہمارے اجتماع میں انتشار ڈال دیا ہے۔ سعادت کا یہ پتھر کیا ہے؟ زمین کی طرح کا پتھر کا ایک ٹکڑا ہی تو ہے جو نہ تو انسان کو گمراہی کی طرف لے جا سکتا ہے اور نہ ہی ہدایت کی جانب۔

ایک اور عرب نے دیکھا کہ اس پتھر پر لومڑی پیشاب کر رہی ہے تو اس نے یہ شعر پڑھا:

أرب يبول الثعلبان برأسه ٭ لقد ذل ما بالت عليه الثعالب

آیا وہ چیز بھی معبود ہو سکتی ہے جس پر لومڑی پیشاب کرے؟ یقیناً وہ چیز ذلیل ہے جس پر لومڑیاں پیشاب کریں۔[1]

اوپر والی دونوں تفسیروں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ بُت پرستی پیداوار ہی خرافات کی ہے جو خواہشاتِ نفسانی کی ایک قسم ہے کسی دلیل و منطق کے بغیر مختلف بتوں کا انتخاب بھی خواہشات کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔

"ہوا و ہوس" کے سلسلے میں نکات کی بحث میں تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ انشاء اللہ۔

آخر میں قرآن مجید اس گمراہ گروہ کے اعتراض کا تیسرا جواب یوں دے رہا ہے:

آیا تو سمجھتا ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے یا سمجھتے ہیں (ام تحسب ان اکثرھم یسمعون او یعقلون)۔

وہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں (ان ھم الا کالانعام بل ھم اضل سبیلا)۔

یعنی اے پیغمبرؐ! آپؐ ان کے ٹھٹھا، غیر منطقی اور ناگوار باتوں سے ہرگز پریشان نہ ہوں کیونکہ یا تو انسان کے پاس اپنی عقل ہونی چاہیے جس سے وہ سوچ سکے اور "یعقلون" کا مصداق بنے اگر اس کے پاس اپنی عقل نہیں تو دانشوروں اور صاحبانِ عقل کی باتوں کو سنے اور "یسمعون" کا مصداق قرار پائے۔ لیکن یہ لوگ نہ تو پہلے زمرے میں آتے ہیں اور نہ ہی دوسرے میں اسی لیے ان میں اور چوپایوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور چوپایوں سے سوائے چیخنے چلانے، لاتیں مارنے اور غیر معقول کام کے اور توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے؟

بلکہ یہ ان جانوروں سے بھی بدتر ہیں کیونکہ جانوروں سے عقل و اندیشہ کی تو توقع نہیں رکھی جا سکتی جبکہ ان میں عقل بھی ہے اور شعور بھی لیکن وہ اس سے کام نہیں لیتے لہٰذا انھیں یہ دن دیکھنا پڑے۔

پھر قابلِ غور یہ بات بھی ہے کہ قرآن نے یہاں پر "اکثرھم" کا لفظ استعمال کیا ہے اور حکم کو عمومیت نہیں دی، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان میں کچھ فریب خوردہ لوگ بھی ہوں جب حق ان کے سامنے آ جائے تو ان کی آنکھوں کے آگے سے غفلت اور

---

[1] تفسیر علی بن ابراہیم (منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۰)۔

Marfat.com

غلط فہمی کے پردے ہٹ جائیں اور وہ حق کو قبول کرلیں اور یہ بات قرآن کی بحثوں میں اصول عدل مدنظر رکھنے پر ایک واضح دلیل ہے۔

چند نکات

۱۔ ہوس پرستی اور اس کا دردناک انجام: اس میں شک نہیں کہ انسان کے اندر مختلف قسم کی خواہشات اور طرح طرح کی جبلتیں موجود ہیں جو سب اس کی زندگی کے لیے ضروری ہیں غیظ و غضب، اپنے آپ سے محبت، مال اور مادی زندگی سے پیار وغیرہ۔ اس میں بھی شک نہیں خلاقِ عالم نے ان سب چیزوں کو انسانی کمال کے لیے ودیعت فرمایا ہے۔

جو چیز زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات یہ چیزیں حد سے تجاوز کر جاتی ہیں اور عقل کے لیے ایک مطیع خدمتگار کی بجائے اسے قید و بند میں ڈال کر بغاوت اور سرکشی پر اتر آتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کے سارے وجود پر حاکم ہو کر زمام اختیار اپنے ہاتھوں میں لے لیتی ہیں۔

اسی صورتِ حال کو ہوس پرستی کہتے ہیں جو بُت پرستی کی تمام اقسام سے زیادہ خطرناک ہے بلکہ بُت پرستی بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کے عظیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "ہوا و ہوس کے بُت" کو سب سے بڑا اور سب سے بُرا بُت شمار کیا ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

ما تحت ظل السماء من الٰه یعبد من دون الله اعظم عند الله من هوی متبع

آسمان کے نیچے کوئی بُت اللہ کے نزدیک ہوا و ہوس کے بُت سے بڑا نہیں ہے جس کی پرستش کی جاتی ہو[1]

ایک اور حدیث میں کسی پیشوائے اسلام کا ارشاد گرامی ہے:

ابغض اله عبد علی وجه الارض الهوٰی

سب سے بڑھ کر قابلِ نفرت بُت جس کی روئے زمین پر پرستش کی جاتی ہے خواہشات کا بت ہے۔

اگر اس بارے میں مزید غور و فکر سے کام لیں تو اس حقیقت سے بخوبی واقف ہو جائیں گے کیونکہ ہوس پرستی غفلت اور بے خبری کا پیش خیمہ اور سرچشمہ ہے کیونکہ قرآن کہتا ہے:

ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذکرنا واتبع هواه

اس شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشات کے تابع ہے۔ (کہف — ۲۸)

ہوس پرستی کفر اور بے ایمانی کا سرچشمہ بھی ہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

---

[1] تفسیر المیزان جلد ۱۵ ص ۲۵۰ بحوالہ تفسیر درمنثور، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

”فلا یصدنك عنها من لا یؤمن بها واتبع هواه

تمھیں قیامت پر ایمان لانے سے وہ شخص نہ روکے جو خود اس پر ایمان نہیں رکھتا اور اپنی ہوا و ہوس کا پیروکار ہے۔ (طٰہٰ — ۱۶)

تیسری بات یہ ہے کہ ہوا و ہوس پرستی بدترین گمراہی بھی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

ومن اضل ممن اتبع هواه بغیر هدی من الله

اس شخص سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہو سکتا ہے جو اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرتا ہے اور خدا کا ہدایت یافتہ نہیں ہے۔ (قصص — ۵۰)

چوتھی بات یہ ہے کہ ہوس پرستی، حق طلبی کے مقابلے میں ہے اور انسان کو راہ راست سے ہٹا دیتی ہے جیسا کہ قرآن مجید کی سورۃ ص آیت ۲۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الهوی فیضلك عن سبیل الله

لوگوں کے درمیان حق اور انصاف کا فیصلہ کرو اور خواہشات کی پیروی مت کرو کیونکہ یہ تمھیں راہ خدا سے ہٹا دے گی۔

پانچویں بات یہ ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی اتباع عدل و انصاف سے روک دیتی ہے، قرآن فرماتا ہے:

فلا تتبعوا الهوٰی ان تعدلوا

خواہشاتِ نفسانی کی اتباع تمھیں عدل و انصاف سے نہ روک دے۔ (نساء — ۱۳۵)

چھٹی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر زمین و آسمان کا نظام انسانوں کی خواہشات کے محور پر گردش کرنے لگ جائے تو ساری کائنات فساد کی لپیٹ میں آجائے، ارشاد ہوتا ہے:

ولو اتبع الحق اهوائهم لفسدت السماوات والارض ومن فیهن

اگر حق ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی کرنے لگ جائے تو آسمان و زمین اور ان میں رہنے والے سب کے سب فاسد ہو جائیں —— (مؤمنون — ۷۱)

اسلامی روایات میں بھی اس سلسلے میں ہلا دینے والی تعبیرات ملتی ہیں۔ چنانچہ ایک روایت میں حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اشقی من انخدع لهواه و غروره

بدبخت ہے وہ انسان جو خواہشات اور غرور سے دھوکا کھا جائے [۱]

ایک اور روایت میں حضرت علیؑ ہی سے منقول ہے کہ:

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۸۶۔

Marfat.com

الهوىٰ عدو العقل

خواہشاتِ نفسانی عقل کی دشمن ہوتی ہیں۔ [1]

آپؑ ہی فرماتے ہیں :۔

الهوىٰ اس المحن

ہوا و ہوس تمام رنج و غم کی بنیاد ہیں [2]

حضرت امیر علیہ السلام ہی فرماتے ہیں :۔

لا دین مع هوىٰ [3]

اور

ولا عقل مع هوىٰ [4]

کبھی بھی دین اور خواہشاتِ نفسانی، اور عقل اور خواہشاتِ نفسانی اکٹھے نہیں ہو سکتے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جہاں خواہشاتِ نفسانی اور ہوا و ہوس ہیں وہاں پر دین ہے نہ عقل، وہاں پر بدبختی، رنج و غم اور بلائیں ہیں اور بس۔ وہاں پر یا بے چارگی ہے یا شقاوت اور فساد۔

ہماری اپنی اور دوسروں کی زندگی اور زندگی کے دوران جو تلخ تجربے حاصل ہوئے ہیں وہ ہوا و ہوس پرستی اور خواہشاتِ نفسانی کے بارے میں وارد ہونے والی آیات و روایات کے تمام نکات کا زندہ ثبوت ہیں۔

ہم ایسے افراد کو بھی جانتے ہیں جنھوں نے ایک گھڑی کے لیے ہوائے نفس کی اتباع کی اور ساری عمر اس کا خمیازہ بھگتتے رہے۔ ایسے نوجوانوں کو بھی دیکھا ہے جو ہوائے نفس کی پیروی میں ایسی خطرناک عادتوں اور جنسی اور اخلاقی بے راہروی کا شکار ہو گئے جن کی وجہ سے اب وہ معاشرے اور خاندان والوں کے لیے وبالِ جان بن گئے ہیں اور اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے ہیں۔ اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں گنوا چکے ہیں۔

معاصر اور گزشتہ زمانے کی تاریخ میں ہمیں ایسے لوگوں کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے نام کو ہمیشہ کے لیے داخلِ دشنام کر دیا۔

یہ ایک اٹل اصول ہے اس میں استثناء کی کوئی گنجائش نہیں حتیٰ کہ عابد اور زاہد لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ جیسا کہ "بلعم باعورا" جیسے لوگوں نے جب اپنی خواہشات کی اتباع کی تو عظمتِ انسانی کی بلندیوں سے یوں گرے کہ قرآن نے انھیں ہمیشہ

---

[1] غرر الحکم جملہ ۲۶۵۔

[2] غرر الحکم جملہ ۱۰۴۸۔

[3] غرر الحکم جملہ ۱۰۵۲۱۔

[4] غرر الحکم جملہ ۱۰۵۴۱۔

Marfat.com

بھونکنے والے نجس کتے کے ساتھ تشبیہ دی (ملاحظہ ہو اعراف ١٧٦)۔

بنا بریں باعثِ تعجب نہیں ہوگا کہ جب پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علیؑ ایسی بات فرمائیں کہ :

ان اخوف ما اخاف علیکم اثنان اتباع الھوٰی وطول الامل۔ اما اتباع الھوٰی فیصد عن الحق واما طول الامل فینسی الاٰخرۃ [1]

تمھاری سعادت کی راہ میں جو سب سے زیادہ خطرناک لغزش کا مقام ہے ، وہ ہوائے نفس کی اتباع اور لمبی لمبی آرزوئیں ہیں کیونکہ ہوائے نفس کی تکمیل تمھیں حق سے روک دے گی اور لمبی آرزوئیں تمھیں آخرت سے بے خبر کردیں گی ۔

ہوائے نفس کے مدمقابل یعنی ترکِ خواہشات کے بارے میں قرآن و حدیث میں جو تعبیرات وارد ہوئی ہیں اسلامی نقطہ نظر سے اس مسئلے کی گہرائی اور گیرائی کو بخوبی واضح کرتی ہیں، یہاں تک کہ خوفِ خدا اور نفس کی مخالفت کو جنت کی کنجی قرار دیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :

واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھوٰی فان الجنۃ ھی المأوٰی

جو شخص اپنے پروردگار کی عظمت سے ڈرے اور اپنے آپ کو خواہشاتِ نفسانی سے روکے یقیناً بہشت اس کا ٹھکانا ہے ۔ (نازعات ــــــ ٤٠، ٤١)

حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :۔

اشجع الناس من غلب ھواہ

شجاع ترین آدمی وہ ہے جو اپنی خواہشات پر غالب آجائے [2]

اللہ کے نیک بندوں ، خدا کے دوستوں ، علماء اور بزرگانِ دین کے بارے میں ایسے ایسے واقعات بیان ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس قدر عظیم اور بلند مرتبہ صرف خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت کی وجہ سے حاصل ہوا ہے جس کا حصول عام طریقوں سے ناممکن ہے ۔

٢۔ **جانوروں سے بڑھ کر گمراہ کیوں ؟** مندرجہ بالا آیات میں مطلب کی اہمیت کو بیان کرنے کے لیے پہلے ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

جن لوگوں کا معبود خواہشِ نفسانی ہیں وہ چوپایوں کی مانند ہیں ۔

پھر اس سے بھی بڑھ کر فرمایا گیا ہے :

بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں ۔

---

[1] سفینۃ البحار جلد ٢ ص ٢٨، (مادہ ہویٰ کے ذیل میں) اور نہج البلاغہ خطبہ ٢٨ ، ٤٢ ۔

[2] سفینۃ البحار جلد ١ ص ٦٠٩ (مادہ شجع)۔

Marfat.com

اس جیسی ایک تعبیر سورۂ اعراف کی آیت ۱۷۹ میں بھی آئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اہل جہنم آنکھ، کان اور عقل و خرد سے کام نہ لینے کی وجہ سے اس طرح کے انجام سے دوچار ہوں گے:

اولئك كالانعام بل هم اضل

وہ لوگ چوپایوں کی مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر گمراہ ہیں۔

اگرچہ اجمالی طور پر ان کا چوپایوں سے بھی بڑھ کر گمراہ ہونا واضح ہے لیکن اس بارے میں مفسرین نے دلچسپ وضاحت کی ہے جسے تجزیہ و تحلیل اور کچھ اضافوں کے ساتھ ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) اگر چوپائے کسی چیز کو نہیں سمجھ سکتے، گوش شنوا اور چشم بینا نہیں رکھتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں یہ استعداد نہیں ہے لیکن کتنا بدبخت ہے انسان کہ جس میں تمام سعادتوں کی صلاحیت مخفی ہے اور خدا نے اسے اس قدر استعداد بخشی ہے کہ وہ زمین میں خدا کا نمائندہ اور خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ خود کو اس قدر پست کر دیتا ہے کہ اپنے آپ کو ایک جانور کی حد تک گرا دیتا ہے اپنی تمام لیاقتوں کو ضائع کر دیتا ہے خود کو مسجود الملائکہ ہونے کی سربلندی سے گرا کر شیاطین کے ذلت آمیز گڑھوں میں ڈال دیتا ہے۔ کتنے درد کی بات ہے، اس سے بڑھ کر اور کیا گمراہی ہو سکتی ہے۔

(۲) جانوروں سے تقریباً حساب و کتاب نہیں لیا جائے گا نہ ہی وہ کسی سزا اور جزا کے مستحق ہوں گے لیکن انسانوں کا حساب و کتاب بھی ہوگا اور گمراہ لوگوں کو اپنے گناہوں کا بوجھ خود اپنے شانوں پر اٹھانا ہوگا اور بغیر کسی کمی بیشی کے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنا ہوگی۔

(۳) چوپائے، انسان کی بہت خدمت کرتے ہیں اور مختلف کام انجام دیتے ہیں لیکن سرکش اور باغی انسان نہ صرف کوئی کام نہیں کرتے بلکہ طرح طرح کے مصائب و آلام اور خطرات بھی پیدا کرتے رہتے ہیں۔

(۴) چوپایے کسی کے لیے خطرہ نہیں بنتے اگر بنیں بھی تو ان کا خطرہ محدود ہوتا ہے لیکن افسوس ہے بے ایمان، متکبر اور ہوس پرست انسان پر جو کبھی جنگ کی ایسی آگ بھڑکا دیتا ہے کہ جس میں ہزاروں، لاکھوں انسان جل کر خاکستر ہو جاتے ہیں۔

(۵) اگرچہ جانوروں کا کوئی آئین اور قانون نہیں ہے لیکن فطرت نے جبلت کی صورت میں ان کے لیے جو راستہ مقرر کر دیا ہے وہ اس پر گامزن ہیں، لیکن سرکش اور متکبر انسان نہ تو تکوینی قوانین کو کوئی اہمیت دیتا ہے اور نہ ہی تشریعی کو، بلکہ اپنی خواہشات کو سب چیزوں پر حاکم سمجھتا ہے۔

(۶) چوپایوں نے کبھی اپنے کاموں کی توجیہ پیش نہیں کی اگر خلاف قانون کرتے ہیں تو بھی اور اگر قانون کے مطابق کرتے ہیں تو بھی وہ اپنی مستی میں مست اور مگن چلے جا رہے ہیں لیکن خود پرست ہوائے نفسانی کا پیروکار اور خونخوار انسان اپنے جرائم کی یوں توجیہ کرتا ہے گویا اس نے خدائی فریضے کی تکمیل اور شرعی ذمہ داری پر عمل درآمد کیا ہے۔

اس لحاظ سے دنیا کی کوئی چیز ہوا و ہوس کے پیروکار، بے ایمان اور سرکش انسان سے بڑھ کر خطرناک اور نقصان دہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ایسے انسان کو سورۂ انفال کی آیت ۲۲ میں "شر الدواب" (ہر چلنے والی چیز سے بدتر) کے عنوان سے موسوم کیا گیا ہے اور یہ کیا ہی عمدہ تعبیر ہے۔

Marfat.com

۴۵۔ اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیۡفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَ لَوۡ شَآءَ لَجَعَلَہٗ سَاکِنًا ۚ ثُمَّ
جَعَلۡنَا الشَّمۡسَ عَلَیۡہِ دَلِیۡلًا ﴿ۙ﴾

۴۶۔ ثُمَّ قَبَضۡنٰہُ اِلَیۡنَا قَبۡضًا یَّسِیۡرًا ﴿﴾

۴۷۔ وَ ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّ النَّوۡمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّہَارَ
نُشُوۡرًا ﴿﴾

۴۸۔ وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ الرِّیٰحَ بُشۡرًۢا بَیۡنَ یَدَیۡ رَحۡمَتِہٖ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَہُوۡرًا ﴿ۙ﴾

۴۹۔ لِّنُحۡیِۦَ بِہٖ بَلۡدَۃً مَّیۡتًا وَّ نُسۡقِیَہٗ مِمَّا خَلَقۡنَاۤ اَنۡعَامًا
وَّ اَنَاسِیَّ کَثِیۡرًا ﴿﴾

۵۰۔ وَ لَقَدۡ صَرَّفۡنٰہُ بَیۡنَہُمۡ لِیَذَّکَّرُوۡا ۫ۖ فَاَبٰۤی اَکۡثَرُ النَّاسِ
اِلَّا کُفُوۡرًا ﴿﴾

ترجمہ

۴۵۔ آیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے کس طرح سایے کو پھیلایا ہے؟ اگر چاہتا تو اسے ساکن بنا دیتا۔
پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا ہے۔

۴۶۔ پھر ہم اسے آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں۔

۴۷۔ اور خدا تو وہ ہے جس نے رات کو تمھارے لیے لباس بنایا ہے اور دن کو تمھاری حرکت اور زندگی کا سبب۔

۴۸۔ اور وہ وہی ہے جس نے ہواؤں کو رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا اور ہم نے آسمان سے
پاک کرنے والا پانی نازل کیا۔

۴۹۔ تاکہ ہم اس کے ذریعے سے مُردہ زمینوں کو زندہ کریں اور اسے اپنی مخلوق جس میں بہت سے چوپائے اور

Marfat.com

اور انسان شامل ہیں کے اختیار میں دے دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے سیراب ہوں۔

۵۰۔ ہم نے ان آیات کو طرح طرح سے ان کے درمیان بیان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں لیکن اکثر لوگوں نے انکار اور کفر کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں کیا۔

تفسیر

سائے کی حرکت

ان آیات میں نعمتِ الٰہی کے بہت سے اہم حصوں کو توحید اور خدا شناسی کے اسرار کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ ایسے امور کا ذکر کیا گیا ہے جن میں غور و فکر ہمیں اپنے خالق سے بیشتر آشنا اور نزدیک سے نزدیک تر کر دیتا ہے۔ گزشتہ آیات میں زیادہ تر گفتگو مشرکین کے بارے میں رہی ہے لہٰذا ان آیات کا گزشتہ آیات سے تعلق واضح ہو جاتا ہے۔

ان آیات میں سایے کی نعمت، پھر رات کے اثرات اور برکات، نیند اور آرام، دن کی روشنی، ہواؤں کے چلنے، بارش کے نازل ہونے، مردہ زمینوں کے زندہ ہونے اور جانوروں اور انسانوں کے سیراب ہونے کی سی نعمتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: آیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے پروردگار نے سائے کو کیونکر پھیلایا ہے (الم تر الی ربك كيف مد الظل)۔

اگر چاہتا تو اسے روکے رکھتا (ہمیشہ سایہ ہی سایہ ہوتا) (ولو شاء لجعله ساكنا)۔

اس میں شک نہیں کہ آیت کا یہ حصہ متحرک اور پھیلنے والے سایے جیسی نعمت کی طرف اشارہ ہے۔ سایہ ہمیشہ ایک حالت پر باقی نہیں رہتا بلکہ متحرک رہتا ہے اور نقل مکانی کرتا رہتا ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے مراد کون سا سایہ ہے؟ مفسرین کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پھیلنے والے اس سایے سے مراد وہ سایہ ہے جو صبح صادق اور طلوعِ آفتاب کے درمیانی وقت میں ہوتا ہے کیونکہ سب سے زیادہ سرور اس سایے میں ہوتا ہے اور سب سے زیادہ کیف کی وہی گھڑی ہوتی ہے۔ پھیکے رنگ کا سایہ ڈالنے والا یہ نور صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور طلوعِ آفتاب تک چلا جاتا ہے پھر اس کے بعد دن کی روشنی اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد تمام رات کا سایہ ہے جو غروبِ آفتاب سے شروع ہو کر طلوعِ آفتاب پر جا ختم ہوتا ہے کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ رات درحقیقت زمین کے نصف کرّے کا سایہ ہوتی ہے جو آفتاب کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ سایہ مخروطی شکل کا ہوتا ہے جو فضا کو ڈھانپے رہتا ہے اور ہمیشہ چلتا پھرتا رہتا ہے جو طلوعِ آفتاب کے ساتھ اگر ایک علاقہ میں ختم ہوتا ہے تو دوسرے علاقہ میں جا ظاہر ہوتا ہے۔

Marfat.com

بعض مفسرین کہتے ہیں اس سے مراد وہ سایہ ہے جو زوالِ آفتاب کے بعد اشیاء کی طرف سے ظاہر ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتا رہتا ہے۔

البتہ اگر بعد والے جملے نہ ہوتے تو ہم اس کا وسیع مفہوم سمجھتے جو تمام معانی کا جامع ہوتا لیکن جو قرآن اس کے بعد ذکر ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تفسیر سب سے زیادہ مناسب ہے کیونکہ ارشاد ہوتا ہے:

پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل بنایا ہے (ثم جعلنا الشمس علیہ دلیلاً)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر سورج نہ ہوتا، سائے کا مفہوم کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اصولی طور پر سایہ، آفتاب کی پرچھائیں کا نام ہے کیونکہ عموماً پھیکی اور کم رنگ تاریکی کو "سایہ" کہتے ہیں جو اجسام سے پیدا ہوتا ہے یہ اس وقت ہوتا ہے جب روشنی ایسے اجسام پر پڑے جن سے عبور نہ کر سکتی ہو تو روشنی کی مقابل طرف کو سایہ کہتے ہیں بنا بریں نہ صرف "تعرف الاشیاء باضدادھا" (ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے) کے قاعدہ کے تحت سایے کو نور سے جدا کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کا وجود بھی درحقیقت نور کا مرہونِ منت ہے۔

آگے فرمایا گیا ہے: پھر ہم اسے آہستہ آہستہ سمیٹ لیتے ہیں (ثم قبضناہ الینا قبضاً یسیراً)۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو سایہ بھی آہستہ آہستہ سمٹنا شروع ہو جاتا ہے حتیٰ کہ دوپہر کے وقت بعض مقامات پر بالکل معدوم ہی ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت سورج ٹھیک ہر چیز کے سر پر ہوتا ہے اور دوسرے مقامات پر اپنی کم سے کم مقدار کو جا پہنچتا ہے اس طرح سے سایہ نہ تو ایک ہی مرتبہ ظاہر ہوتا ہے اور نہ ایک ہی دفعہ سمیٹ لیا جاتا ہے یہ کام بجائے خود پروردگارِ عالم کی ایک حکمت ہے کیونکہ اگر یکدم سائے سے روشنی پیدا ہوتی یا روشنی سے سایہ پیدا ہوتا تو موجوداتِ عالم کے لیے نقصان دہ ہوتا۔ لیکن حالتِ انتقالی کا یہ تدریجی نظام اس قدر حکمت پر مبنی ہے کہ کسی چیز کو ضرر پہنچائے بغیر زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہے۔

"یسیراً" کی تعبیر سایے کے آہستہ آہستہ سمٹنے کی طرف اشارہ ہے یا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نور اور ظلمت کا خصوصی نظام خداوندِ عالم کی قدرت کے لیے ایک سادہ اور آسان سی بات ہے "الینا" بھی اسی قدرتِ خداوندی کی تاکید ہے۔ بات خواہ جو بھی ہو یہ یقینی ہے کہ جس طرح انسان اپنی زندگی کے لیے "نور" کا محتاج ہے اسی طرح توازن کو برقرار رکھنے اور شدتِ نور کی مدت کے دوران اسے سایے کی بھی ضرورت ہے۔

نور کی یکساں تابندگی بھی زندگی کو اسی طرح درہم برہم کر دیتی ہے جس طرح سائے کی ہمیشگی موت کا پیغام بن جاتی ہے کیونکہ پہلی صورت میں تمام موجودات جل کر بھسم ہو جائیں جبکہ دوسری صورت میں کائنات کی ہر چیز منجمد ہو کر رہ جائے۔ "نور" اور "سایہ" کی باری باری آمد و رفت نے انسان کے لیے زندگی کو آسان اور خوشگوار بنایا ہوا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی دوسری آیات میں رات اور دن کو جو ایک دوسرے کے پیچھے آتے رہتے ہیں خدا کی عظیم نعمتوں میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ قصص آیہ ۷۱ میں فرمایا گیا ہے:

قل ارأیتم ان جعل اللہ علیکم اللیل سرمداً الی یوم القیامۃ من الہ

Marfat.com

غیر اللہ یأتیکم بضیاء افلا تسمعون

اے پیغمبرؐ! کہہ دیجیے کہ اگر خداوندِ عالم رات کو قیامت تک تمھارے لیے باقی رکھنا چاہتا تو سوائے خداوندِ عالم کے کوئی اور معبود ہے جو تمھارے لیے نور کی شعاع لے آتا؟ کیا سن نہیں رہے ہو؟

اور اس کے ساتھ ہی فوراً کہتا ہے:

قل ارأیتم ان جعل اللہ علیکم النہار سرمدًا الی یوم القیامۃ من الٰہ غیر اللہ یأتیکم بلیل تسکنون فیہ افلا تبصرون

کہہ دیجیے! کہ اگر خداوندِ عالم دن کو تمھارے لیے قیامت تک باقی رکھنا چاہتا تو سوائے خداوندِ متعال کے کوئی معبود ہے جو تمھارے لیے رات لے آتا جس میں تم آرام کر سکتے؟ کیا دیکھ نہیں رہے ہو؟
(قصص ـــــ ۷۲)

اس کے ساتھ ہی آیت ۷۳ میں نتیجے کے طور پر فرمایا گیا ہے:

ومن رحمتہ جعل لکم اللیل والنہار لتسکنوا فیہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون

یہ خدا کی رحمت ہی تو ہے کہ اس نے تمھارے لیے رات اور دن بنائے ہیں جن میں تم آرام بھی کر سکو اور حصولِ معاش کے لیے اس سے استفادہ بھی کر سکو شاید کہ اس کا شکر ادا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم نے "ظل ممدود" (پھیلے ہوئے سایے) کو بہشت کی نعمتوں میں شمار کیا ہے کیونکہ نہ تو اس قدر روشنی ہوتی ہے جس سے آنکھیں خیرہ ہو جائیں اور تھک جائیں اور نہ ہی تاریکی ہوتی ہے جس سے کسی کو وحشت محسوس ہو۔

سائے جیسی نعمت کا ذکر کرنے کے بعد قرآن دو اور نعمتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان فرماتا ہے جو اس کے ساتھ مکمل طور پر مناسبت رکھتی ہیں ان دو نعمتوں کے ذکر کے ساتھ نظامِ ہستی کے کچھ اور اسرار سے پردہ اٹھاتا ہے جو وجودِ خدا پر دلالت کر رہی ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

اور خدا تو وہ ہے جس نے رات کو تمھارے لیے لباس بنایا ہے (وھو الذی جعل لکم اللیل لباسًا)۔ "رات کو لباس بنایا ہے"...... کیسی دلچسپ تعبیر ہے یہ تاریک پردہ صرف انسانوں ہی کو نہیں بلکہ روئے زمین پر موجود تمام چیزوں کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے اور انھیں لباس کی مانند محفوظ کر لیتا ہے جیسا کہ انسان سوتے وقت تاریکی اور آرام و استراحت کے لیے پردے سے کام لیتا ہے اسی طرح یہ تمام چیزوں کے لیے تاریکی اور پردے کا کام دیتی ہے۔

پھر نیند جیسی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اس نے نیند کو تمھارے لیے آرام کا ذریعہ بنایا ہے (والنوم سباتًا)۔

"سباتا" "سبت" (بروزن "وقت") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "کاٹ دینا" پھر آرام کی غرض سے کام کاج کو روک دینے کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہفتہ کے دن کو عربی میں "یوم السبت" کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ

Marfat.com

اس نام کا انتخاب یہودیوں کے طرزِ عمل سے کیا گیا ہے کیونکہ ہفتے کا دن ان کی چھٹی اور آرام کا دن ہوتا ہے۔

درحقیقت یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب نیند آجاتی ہے تو تمام جسمانی سرگرمیاں معطل ہوجاتی ہیں کیونکہ اس وقت بدن کے ایک اہم حصے کی سرگرمیاں بالکل رُک جاتی ہیں اور دوسرے حصے کی سرگرمیاں کم ہوجاتی ہیں تاکہ تھکاوٹ دور ہوجائے اور اعضاء کو ازسرِنو تازگی مل جائے اس دوران میں دل کے دھڑکنے اور سانس لینے کا عمل جاری رہتا ہے۔

بروقت اور مناسب مقدار کی نیند سے بدن کی طاقتیں بحال ہوجاتی ہیں جسم کو تازگی مل جاتی ہے صرف شدہ قوت لوٹ آتی ہے نیند اعصاب کے سکون کا بہترین ذریعہ ہے اس کے برعکس نیند کا نہ آنا خاص طور پر ایک لمبے عرصے کی بے خوابی بہت ہی نقصان دہ اور موت کا سبب بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب کسی کو تشدّد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور سختی کی جاتی ہے تو جو اہم ترین حربے اختیار کیے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہی بے خوابی ہے جس سے انسان کی قوتِ مدافعت جواب دے جاتی ہے۔

آیت کے آخر میں "دن" جیسی نعمت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اور خداوندِ عالم نے دن کو تحرک اور زندگی کا سبب بنایا ہے (وجعل النھار نشورًا)۔

"نشور" "نشر" کے مادہ سے ہے اور کھولنے کے معنی میں ہے جو "لپیٹنے" کے مقابلے میں ہوتا ہے اس تعبیر سے ممکن ہے اس طرف اشارہ ہو کہ بیداری کے وقت روح، تمام بدن میں پھیل جاتی ہے جو تقریبًا مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کے مشابہ ہے یہ بھی ممکن ہے کہ انسانوں کے پھیل جانے کی طرف اشارہ ہو جب وہ اجتماعی اور انفرادی صورت میں پھیل جاتے ہیں اور زندگی کے مختلف کاموں کے لیے روئے زمین پر ادھر اُدھر چلنے لگ جاتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز صبح کے وقت یہ جملہ ادا فرمایا کرتے تھے:۔

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور

حمد اس خدا کے لیے مخصوص ہے جس نے ہمیں مرنے کے بعد زندہ کیا اور نئی زندگی بخشی اور انجام کار ہم نے اسی کی طرف محشور ہونا ہے [۱]

سچی بات تو یہ ہے کہ انسانی جسم اور روح کے لیے دن کی روشنی تحریک بخش ہے جبکہ تاریکی نیند لاتی ہے اور سکون عطا کرتی ہے۔

اس دنیا کی بھی یہی حالت ہے کہ جب سورج کی پہلی کرن زمین پر پڑتی ہے تو زندہ اور جاندار چیزوں میں عجیب جوش و خروش پیدا ہوجاتا ہے۔ انھیں ایک نئی زندگی مل جاتی ہے ہر چیز اپنے کام کاج میں مشغول ہوجاتی ہے یہاں تک کہ نباتات بھی سورج کی روشنی میں جلدی جلدی سانس لینا، غذا حاصل کرنا اور نشو ونما پانا شروع کردیتے ہیں جبکہ غروب آفتاب کے ساتھ گویا خاموشی کا ناقوس بج جاتا ہے جس سے پرندے تک اپنے گھونسلوں میں جا چھپتے ہیں اور ہر جاندار چیز آرام اور نیند کا رُخ کرتی ہے حتیٰ کہ

---

[۱] تفسیر قرطبی جلد، ص ۴۴۵۵۔

Marfat.com

نباتات بھی ایک طرح کی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

عظیم نعمتوں کے ذکر کے بعد جو تمام انسانوں کی سب سے بنیادی اور اہم ضرورت ہیں ایک اور اہم نعمت کو بیان فرماتے ہوئے قرآن کہتا ہے: خدا تو وہ ہے جس نے ہواؤں کو اپنی رحمت سے پہلے خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجا اور ہم نے آسمان سے پاک کرنے والا نازل پانی کیا (وھوالذی ارسل الریاح بشرًا بین یدی رحمتہ وانزلنا من السماء ماءً طھورًا)۔

رحمت الٰہی کے نزول سے پہلے ہواؤں کے "مقدمۃ الجیش" کی حیثیت سے ہر شخص آگاہ ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوں تو کسی خشک سرزمین پر بارش کا ایک بھی قطرہ نہ برسے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سورج کی گرمی سمندروں کے پانی کو بخارات میں تبدیل کر کے اوپر کو بھیجتی ہے اور یہی بخارات سرد فضا میں جا کر اکٹھا ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور بارش برسانے والے بادلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اگر یہ ہوائیں ان بھرے ہوئے بادلوں کو سمندروں سے خشک زمینوں کی طرف ہانک کر نہ لے جائیں تو وہی بادل سمندروں پر ہی برسنا شروع کر دیں۔

گویا رحمت کی خوشخبری دینے والی ہواؤں کا وجود جو ہمیشہ زمین کے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف چلتی رہتی ہیں زمین کی تشنگی دور کرنے کا سبب بن جاتا ہے کیونکہ انھی سے حیات بخش بارشوں کا نزول ہوتا ہے جس سے دریا اور چشمے وجود میں آتے ہیں، کنوئیں پانی سے بھر جاتے ہیں اور مختلف نباتات کی نشوونما ہوتی ہے۔

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ان ہواؤں کا ایک حصہ بادلوں کے آگے آگے چلتا رہتا ہے جن میں ملائم سی نمی کی آمیزش ہوتی ہے اسی حصے سے نسیم روح افزاء وجود میں آتی ہے، جس کے اندر سے بارش کی سوندھی سوندھی خوشبو مشام تک پہنچتی ہے۔ اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو کسی محبوب مسافر کے آنے کی خوشخبری لاتا ہے۔

"ریاح" (ہوائیں) کو جمع کی صورت میں بیان کرنے کا مقصد شاید ان کی مختلف انواع کی طرف اشارہ ہو کیونکہ کچھ شمالی ہوائیں ہوتی ہیں، کچھ جنوبی، کچھ مشرقی ہوتی ہیں اور کچھ مغربی اور طبیعی طور پر روئے زمین کے ہر حصے تک بادلوں کے پھیل جانے کا سبب بن جاتی ہیں [۱]

قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ یہاں پر "ماء" (پانی) کی صفت "طھور" بیان کی گئی ہے جو طہارت (یعنی پاکیزگی) کا مبالغے کا صیغہ ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے اس کا مفہوم پاک ہونا بھی ہے اور پاک کرنا بھی۔ یعنی پانی ذاتی طور پر بھی پاک ہے اور نجس چیزوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ جبکہ پانی کے علاوہ بہت سی چیزیں ذاتی طور پر تو پاک ہیں لیکن نجس چیزوں کو پاک نہیں کر سکتیں۔

بہر صورت پانی میں زندہ رکھنے کے علاوہ ایک اور اہم خاصیت پائی جاتی ہے اور وہ ہے پاک کرنے کی خاصیت۔ گویا پانی نہ ہوتا تو ہمارا جسم اور جان بلکہ تمام زندگی ایک ہی دن میں غلیظ اور متعفن ہو کر رہ جاتی اگرچہ وہ بذات خود جراثیم کش نہیں ہے

---

[۱] متوجہ رہنا چاہیئے کہ "بشْرًا" (شین کے سکون کے ساتھ) "بشُرًا" (شین کے ضمہ کے ساتھ) کا مخفف ہے اور "بشور" (بروزن "قبول") کی جمع ہے جو مبشر یعنی بشارت دینے والے کے معنی میں ہے۔

Marfat.com

لیکن چونکہ اس میں حل کرنے کی زبردست خاصیت پائی جاتی ہے لہٰذا انھیں اپنے اندر حل کرکے دھوڈالتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ختم کردیتا ہے اس لحاظ سے وہ انسان کی سلامتی اور مختلف بیماریوں کے خلاف نبرد آزمائی میں بہت مؤثر طریقے پر ہماری معاونت کرتا ہے۔

اس کے علاوہ روحانی اور باطنی طہارت جیسے غسل اور وضو وغیرہ میں بھی پانی ہی کام آتا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ پانی صرف ظاہری نجاستوں کو دور نہیں کرتا بلکہ باطنی نجاستوں کو بھی دُور کرتا ہے۔

اگرچہ پاک کرنے کی یہ خاصیت زبردست اہمیت کی حامل ہے لیکن اسے دوسرا درجہ حاصل ہے لہٰذا بعد والی آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ہمارے بارش برسانے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے مُردہ زمینوں کو زندہ کریں (لنحیی بہ بلدۃ میتًا)[1]

نیز ہم اس زندگی بخش پانی کو پینے کے لئے اپنی مخلوق یعنی بہت سے چوپایوں اور انسانوں کے اختیار میں دے دیتے ہیں (و نسقیہ مما خلقنا انعامًا و اناسی کثیرًا)۔

چند اہم نکات

۱۔ **بہت سے چوپائے اور انسان:** یہاں چوپایوں اور بہت سے انسانوں کا ذکر آیا ہے ہر چند کہ تمام حیوان اور انسان بارش کے پانی سے استفادہ کرتے ہیں۔

یہ اس لیے ہے کہ یہاں پر ان خانہ بدوش لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو جنگلوں اور بیابانوں میں رہتے ہیں جن کے پاس مطلقًا کوئی بھی پانی نہیں ہوتا اور وہ براہِ راست بارش کے پانی سے استفادہ کرتے ہیں۔ خدا کی یہ عظیم نعمت انھیں سب سے زیادہ محسوس ہوتی ہے جب کہ آسمان پر کوئی بادل ظاہر ہوتا ہے، موسلا دھار بارش برساتا ہے، گڑھے اور چشمے بارش کے آبِ زلال سے بھر جاتے ہیں ان کے جانور اور خود وہ اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں زندگی کی روانی اپنے اور اپنے جانوروں کے اندر بخوبی محسوس کرتے ہیں۔

۲۔ **"نسقیہ" کا مفہوم:** یہ "اسقاء" کے مادہ سے ہے "اسقاء" اور "سقی" میں فرق ہے جیسا کہ راغب نے مفردات میں اور کچھ دوسرے مفسرین نے لکھا ہے کہ "اسقاء" کا معنیٰ پانی تیار رکھنا اور اسے کسی کے اختیار میں دے دینا ہے کہ جب بھی انسان چاہے اس سے پی لے۔ جبکہ "سقی" کا معنیٰ یہ ہے کہ پانی کا برتن کسی کے ہاتھ میں دیا جائے تاکہ وہ اسے پیئے۔ دوسرے لفظوں میں "اسقاء" کا ایک وسیع اور عام معنی ہے۔

۳۔ **پہلے زمینوں کا ذکر:** اس آیت میں پہلے مُردہ زمینوں کا ذکر آیا ہے پھر جانوروں کا اور آخر میں انسانوں کا شاید یہ

---

[1] توجہ رہے کہ یہاں پر "بلدۃ" بیابان اور صحرا کے معنی میں ہے۔ اگرچہ مؤنث کا صیغہ ہے لیکن اس کی صفت مذکر کے صیغے "میتًا" کے ساتھ لائی گئی ہے۔ کیونکہ "بلدۃ" مکان کے معنیٰ میں ہے اور مکان مذکر ہے۔

Marfat.com

اس لیے ہے کہ جب تک زمینیں بارش کی وجہ سے زندہ نہ ہوں جانوروں کو خوراک نہیں ملے گی اور جب تک جانوروں میں جان نہیں آئے گی انسان اس سے خوراک حاصل نہیں کر سکے گا۔

۴۔ پانی کا پہلا فائدہ: پانی کے زندگی بخش ہونے کو اس کے پاک کرنے کے مسئلہ کے بعد ذکر کیا گیا ہے اور شاید یہ اس طرف اشارہ ہو کہ ان دونوں کا نزدیکی تعلق ہے (پانی کے زندگی بخش ہونے کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۱۳ میں سورۂ انبیاء کی آیت ۳۰ کے ذیل میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں)۔

زیرِ بحث آخری آیت میں قرآن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ہم نے ان آیات کو گوناگوں صورتوں میں ان سے بیان کیا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں لیکن اکثر لوگوں نے انکار اور کفر کے سوا کچھ نہیں کیا (و لقد صرفناہ بینھم لیذکروا فابی اکثر الناس الا کفورًا)۔

اگرچہ بہت سے مفسرین جیسے مرحوم طبرسی اور شیخ طوسی نے تفسیر تبیان میں، علامہ طباطبائی نے تفسیر المیزان میں اور بعض دوسرے مفسرین نے "صرفناہ" میں "ہ" کی ضمیر کو بارش کی طرف پلٹایا ہے جس کا مفہوم یہ ہوگا "ہم بارش کے قطروں کو زمین کی مختلف سمتوں اور علاقوں میں بھیجتے ہیں اور اسے لوگوں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں تاکہ وہ خدا کی اس عظیم نعمت کو یاد رکھیں"۔

لیکن حق یہ ہے کہ یہ ضمیر قرآن اور قرآنی آیات کی طرف لوٹ رہی ہے کیونکہ یہ تعبیر (فعل ماضی اور مضارع کی صورت میں) قرآن مجید کے دس مقامات پر آئی ہے جن میں سے نو جگہوں پر تو واضح طور پر قرآنی آیات اور بیانات کی طرف لوٹ رہی ہے اور بہت سے مقامات پر "لیذکروا" یا اس قسم کا لفظ اس کے فوراً بعد آیا ہے۔ بنابریں یہ بعید معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک مقام پر اس تعبیر کا دوسرا مفہوم ہو۔

اصولی طور پر "تصریف" کا مادہ تبدیل کرنے اور الٹ پھیر کرنے کے معنی میں آتا ہے جس کی بارش کے پانی سے چنداں مناسبت نہیں ہے جبکہ آیات قرآنی سے یہ زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ یہ مختلف انداز میں بیان ہوئی ہیں، کبھی وعدے کی صورت میں، کہیں وعید کی حالت میں، کہیں پر امر ہے کہیں پر نہی ہے اور کسی مقام پر گزشتہ دنوں کی سرگزشت کی صورت میں۔

Marfat.com

۵۱۔ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِي كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيرًا ○
۵۲۔ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○
۵۳۔ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○
۵۴۔ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ○
۵۵۔ وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ○

ترجمہ

۵۱۔ اگر ہم چاہتے تو ہر شہر اور بستی میں ایک پیغمبر بھیج دیتے۔

۵۲۔ بنابریں تو کافروں کی اطاعت نہ کر اور قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ بڑا جہاد کر۔

۵۳۔ وہ تو وہ ہے جس نے دو سمندروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہے اور ان میں سے ایک تو خوشگوار اور میٹھا ہے اور دوسرا شور اور کڑوا اور ان دونوں کے درمیان ایک آڑ بنائی ہے تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں (گویا وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں) دور رہو اور نزدیک نہ آؤ۔

۵۴۔ وہ تو وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو خلق فرمایا اور اس کو نسب اور سبب قرار دیا (اور ان دو طریقوں سے اس کی نسل کو عام کیا) اور تیرا پروردگار تو ہمیشہ قادر ہے۔

۵۵۔ وہ لوگ خدا کے بجائے ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ تو انھیں نفع پہنچا سکتی ہیں اور نہ ہی نقصان اور کافر لوگ خدا کے مقابلے میں (کفر کی راہ میں) ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

دو مختلف سمندر ساتھ ساتھ

پہلی آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مقام کی عظمت کے بارے میں ہے، ارشاد ہوتا ہے : اگر ہم چاہتے تو ہر شہر اور گاؤں میں پیغمبر بھیج دیتے (لیکن ایسا نہیں کیا اور تمام جہان والوں کی ہدایت کی ذمہ داری تیرے شانوں پر ڈال دی)
(ولو شئنا لبعثنا فی کل قریۃ نذیرًا) ۔

درحقیقت ــــــــ گزشتہ آیات کے مطابق ــــــــ جس طرح خدا اس بات پر قادر ہے کہ بارش کے حیات بخش قطرات کو مردہ زمینوں پر بھیج دیتا ہے ۔ وہ یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ ہر شہر و دیار میں کسی پیغمبر پر وحی و نبوت نازل کرے اور ہر گروہ کے لیے "بشیر و نذیر" بھیجے لیکن خداوند کریم بندوں کی بہتری کے لیے ہی سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک شخص کے اندر نبوت کا تمرکز دنیا کے لوگوں کی وحدت اور اتحاد کا سبب بنتا ہے اور اس سے ہر قسم کے اختلاف و انتشار کا سدباب ہو جاتا ہے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ بعض مشرکین دوسرے حیلے بہانوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ آیا بہتر نہیں تھا کہ خداوند عالم ہر شہر اور بستی میں علیحدہ علیحدہ پیغمبر بھیج دیتا ؟ قرآن نے ان کا جواب ان الفاظ میں دیا ہے : اگر خدا چاہتا تو ایسا کر سکتا تھا ، لیکن اقوام و ملل کی بہتری انتشار میں نہیں تھی ۔

بہرحال یہ آیت بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مقامِ معظم پر ایک بیّن دلیل ہے اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رہبر ایک ہی ہونا چاہیے اور اس کی ذمہ داری بھی بہت بڑی ہوتی ہے ۔

اسی بناء پر بعد والی آیت میں انبیاء کے دو اساسی فرائض کے پیشِ نظر خداوندِ عالم دو اہم احکام جاری فرماتا ہے اور سب سے پہلے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی طرف کر کے کہتا ہے : پس تو کافروں کی اطاعت نہ کر (فلا تطع الکافرین) ۔

کسی بھی صورت میں ان کی بے راہروی کے سلسلے میں ان سے سودے بازی نہ کر کیونکہ گمراہ لوگوں کے ساتھ سودے بازی تبلیغ راہ خدا اور دعوتِ حق کے لیے بہت بڑی آفت ہے بلکہ ان کے مقابلے میں ڈٹ جا اور ان کی اصلاح کر اور ان کی خواہشات کے سامنے ہرگز نہ جھکنا ۔

رہا دوسرا حکم تو وہ یہ ہے کہ قرآن کے ذریعے ان کے ساتھ عظیم جہاد کر (وجاھدھم بہ جھادًا کبیرًا) ۔

جس قدر تیری رسالت اور منصب عظیم ہے جہاد بھی اتنا عظیم ہونا چاہیے جیسے انبیاءِ ماسبق کا عظیم جہاد رہا ہے یعنی ایسا عظیم جہاد جو لوگوں کی تمام روحانی و فکری اور مادی و معنوی پہلوؤں پر محیط ہو ۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اس جہاد سے فکری ، ثقافتی اور تبلیغی جہاد مراد ہے مسلح جہاد مراد نہیں ہے کیونکہ یہ سورہ مکی ہے اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ مسلح جہاد کا حکم مکہ میں نازل نہیں ہوا تھا ۔

Marfat.com

مرحوم طبرسی نے "مجمع البیان" میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ آیت گمراہ لوگوں کے وسوسوں اور دشمنانِ حق کے مقابلے میں فکری اور تبلیغی جہاد کی عظمت کے لیے بہت بڑی دلیل ہے حتیٰ کہ پیغمبر اسلامؐ کی یہ مشہور و معروف حدیث:

رجعنا من الجهاد الاصغر الی الجهاد الاكبر

ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہیں

اسی جہاد اور تبلیغ دین میں علماء کے کارناموں کی عظمت کی طرف اشارہ ہو سکتی ہے۔

یہ تعبیر قرآن کے مقامِ عظمت کو بھی بیان کر رہی ہے کیونکہ وہ اسی "جہادِ کبیر" کا ایک ذریعہ اور نہایت ہی مؤثر ہتھیار ہے کہ جس کے بیان کی قدرت اور استدلال کی تاثیر اور جاذبیت انسانی قدرت اور تصوّر سے ماوراء ہے۔

یہ قرآن روزِ روشن کی طرح چمکتا، شبِ تاریک کی مانند تسکین دہ، ہواؤں کی مانند متحرک، ابر کی مانند عظیم، بارش کے قطروں کی مانند حیات بخش ہتھیار ہے جس کی طرف گزشتہ آیات میں اشارہ ہو چکا ہے۔

ایک مختصر سے فاصلے کے بعد قرآن مجید نے کائنات کے تخلیقی نظام میں خداوندِ عالم کی نعمتوں کا ایک بار پھر تذکرہ شروع کیا ہے اور گزشتہ آیات میں بارش کے حیات بخش قطرات کی مناسبت سے ان آیات میں پہلے دو مختلف سمندروں کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے: وہ خدا ایسا ہے جس نے دو مختلف سمندروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا دیا ہے ایک خوش گوار اور شیریں ہے جبکہ دوسرا شور اور کڑوا ہے اور ان کے درمیان ایک آڑ مقرر کر دی ہے (تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں گویا وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے ہیں) دُور رہو اور نزدیک نہ آؤ (وهو الذی مرج البحرين هٰذا عذب فرات و هٰذا ملح اجاج وجعل بينهما برزخًا وحجرًا محجورًا)۔

"مَرَجَ" "مرج" (بروزن "فلج") کے مادہ سے مخلوط کرنے اور ملا دینے کے معنی میں ہے یا کھلا چھوڑ دینے کے معنی میں اور اس جگہ پر دو سمندروں کا پہلو بہ پہلو اور ساتھ ساتھ رہنا مراد ہے۔

"عذب" کا معنی خوش گوار، پاک و پاکیزہ اور ٹھنڈا ہے۔ "فرات" کا معنی مزیدار اور میٹھا ہے۔ جبکہ "ملح" کا معنی نمکین اور شور اور "اجاج" کا معنی کڑوا اور گرم ہے (بنا بریں ملح اور اجاج، عذب اور فرات کے الٹ ہیں۔)

"برزخ" کا معنی "پردہ" ہے اور دو چیزوں کے درمیان حائل آڑ کو کہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے (اسی سورت کی آیت ۲۲ کے ضمن میں) بتا چکے ہیں کہ "حجرًا محجورًا" اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ جب عربوں میں دو شخص آپس میں روبرو ہوتے ہیں ایک کو دوسرے سے خوف ہوتا ہے تو وہ حصولِ امان کے طور پر "حجرًا محجورًا" کہتا یعنی ہمیں امان دے دیں اور معاف کر دیں اور ہم سے دُور رہیں۔

بہر حال یہ آیت کائنات میں قدرتِ خداوندی کے ایک عجیب و غریب شاہکار کی نقشہ کشی کر رہی ہے کہ کس طرح ایک ان دیکھا اور غیر مرئی حجاب دو میٹھے اور کڑوے سمندروں کے درمیان موجود ہے جو دونوں کو آپس میں مخلوط ہو جانے سے روک رہا ہوتا ہے۔

البتہ آج ہمیں یہی سمجھ آرہا ہے کہ یہ دکھائی نہ دینے والی آڑ درحقیقت میٹھے اور کڑوے پانی کا ہلکے اور بھاری پن کا تفاوت ہے

Marfat.com

اصطلاح میں جسے " وزن مخصوص کا فرق " کہتے ہیں جس کی وجہ سے دو مختلف نوعیتوں کے پانی ایک لمبے عرصے تک ایک دوسرے میں مخلوط نہیں ہو سکتے ۔

اگرچہ بہت سے مفسرین نے اس قسم کے سمندروں کی تلاش میں بڑی کاوش سے کام لیا ہے کہ دنیا کے کس خطے میں میٹھے اور کڑوے دونوں سمندر آپس میں مل رہے ہیں اور ایک دوسرے میں مخلوط بھی نہیں ہوتے لیکن آج کے دور میں یہ مشکل ہمارے لیے حل ہو چکی ہے کیونکہ جہاں پر میٹھے پانی کے بڑے بڑے دریا سمندر میں گر رہے ہوتے ہیں تو وہیں ساحل پر ہی میٹھے پانی کا ایک سمندر بن رہا ہوتا ہے اور سمندر کے کڑوے پانی کو دور دھکیل کر دُور دُور تک آگے چلا جاتا ہے اور اپنے ہلکے اور بھاری پن کی وجہ سے وہ ایک دوسرے میں گڈ مڈ نہیں ہو پاتے گویا ایک دوسرے کو " حجرًا محجورًا " کہہ رہے ہوتے ہیں ۔

پھر مزیدار بات یہ ہے کہ سمندر کا پانی مد و جزر کی وجہ سے چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ بڑی مقدار میں گھٹتا اور بڑھتا رہتا ہے، اسی مقدار سے میٹھے پانی کا یہ سمندر بھی جب بڑھتا ہے تو پیچھے کو ہٹتا ہے اور خشکی پر پھیل جاتا ہے چنانچہ قدیم زمانے سے انسان نے فطرت کے اس عمل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہاں سے بہت سی نہریں نکالی ہیں جن سے بہت سے رقبے کی آبپاشی کی جاتی ہے ۔

اب بھی جنوبی ایران میں ساحلِ سمندر پر کھجور کے لاکھوں درخت ایسے ہیں جو اس میٹھے پانی سے سیراب ہوتے ہیں جن میں سے بہت سے درختوں کو ہم نے بھی بچشم خود ملاحظہ کیا ہے اور ان درختوں کی صرف اسی طریقے سے آبپاشی کی جاتی ہے اور وہ ساحلِ سمندر سے بہت فاصلے پر ہیں ۔ جس سال بارش کم ہوتی ہے اور ان دریاؤں کا پانی کم ہو جاتا ہے تو بعض اوقات کڑوا اور نمکین پانی آبِ شیریں پر غالب آ جاتا ہے تو اس علاقے کے کسانوں کو پریشانی اور سخت خطرے کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے کیونکہ شور پانی ان کی زراعت کے لیے مضر ہوتا ہے ۔

لیکن عام طور پر ایسا نہیں ہوتا اور یہ " عذب و فرات پانی " جس کے پہلو میں " ملح و اجاج پانی " ہوتا ہے اور اس میں مخلوط نہیں ہوتا ان کے لیے ایک عظیم نعمت شمار ہوتا ہے ۔

یہ بات بھی واضح ہے کہ اس قسم کے مسائل میں فطری اسباب کا وجود ان کی عظمت کو کبھی نہیں گھٹا سکتا، کیونکہ آخر فطرت کیا چیز ہے؟ کیا خدا کے فعل، ارادے اور مشیت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ اور خدا کے علاوہ کسی اور نے اشیائے عالم کو یہ خاصیتیں عطا فرمائی ہیں۔

یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ جب انسان ہوائی جہاز کے ذریعے ایسے علاقوں کے اوپر سے گزرتا ہے تو آپس میں ملنے والے ان دونوں پانیوں کا منظر دلچسپ، دلکش اور عجیب ہوتا ہے جبکہ یہ دونوں اپنے مختلف رنگوں کے ساتھ شانہ بشانہ سمندر میں بہ رہے ہوتے ہیں تو انسان فوراً قرآن کے اس نکتے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ۔

ضمنی طور پر یہ بات بھی بیان کرتے جائیں کہ اس آیت کا " ایمان " اور " کفر " سے متعلق آیات کے درمیان واقع ہونا ممکن ہے اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ یہ ایک قسم کی تشبیہ ہے کفر اور ایمان کے لیے کہ بعض اوقات ایک معاشرے، ایک شہر حتیٰ کہ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد میں صاحبانِ ایمان لوگ " عذب و فرات " کی مانند " ملح و اجاج " جیسے بے ایمان اور کافر لوگوں کے ساتھ ساتھ رہ رہے ہوتے ہیں جن کی طرزِ فکر الگ، عقیدہ الگ، پاک اور ناپاک عمل کی نوعیت الگ ہوتی ہے اس کے باوجود وہ ایک دوسرے میں

Marfat.com

گڈمڈ نہیں ہو پاتے۔

بعد والی آیت میں بارش کے نزول اور اسی طرح میٹھے اور کڑوے پانی کی بحث کے پیش نظر انسان کی پانی سے تخلیق کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے، چنانچہ فرمایا گیا ہے: خدا تو وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا (وھو الذی خلق من الماء بشرًا)۔

سچ بات تو یہ ہے کہ پانی میں صورت کی تخلیق اور محیّر العقول نقش و نگاری پروردگار عالم کی بے انتہا قدرت کاملہ کی دلیل ہے گزشتہ آیات میں پانی سے نباتات کی آبپاشی کا تذکرہ تھا۔ اس آیت میں اس سے اعلیٰ ترین مرحلے یعنی پانی سے انسان کی تخلیق سے متعلق گفتگو ہے۔

اب یہاں پر پانی سے کون سا پانی مراد ہے اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔

بعض لوگوں کا نظریہ ہے کہ "بشر" سے مراد سب سے پہلا انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام ہیں کیونکہ ان کی آفرینش مٹی اور پانی کے مجموعہ سے ہوئی۔ اس کے علاوہ بعض اسلامی روایات کے مطابق اللہ کی سب سے پہلی مخلوق پانی ہے اور انسان کو اسی پانی سے خلق فرمایا گیا ہے اور "بشرًا" کا نکرہ ہونا اسی بات کی دلیل ہے۔

بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ "ماء" سے مراد نطفے کا پانی ہے۔ قدرت پروردگار کے مطابق تمام انسان جس سے معرض وجود میں آتے ہیں اور مرد کے نطفے (Sperm) اور عورت کے نطفے (Ovlim) کی باہمی آمیزش سے انسانی زندگی کے خاص خلیے وجود میں آتے ہیں۔

اگر کوئی شخص انعقاد نطفہ کے مراحل کو آغاز سے اختتام تک مدنظر رکھے اور اس پر غور و فکر کرے تو اسے عظمت حق کی آیات اور خالق اکبر کی قدرت اس قدر واضح طور پر نظر آئے گی جو اس کی ذات پاک کی معرفت کے لیے کافی ہوگی۔

اس بات کا گواہ وہ جملہ ہے جو آیت کے آخر میں آیا ہے اور جس کی تفصیل ہم آگے چل کر بیان کریں گے یعنی "فجعلہ نسبًا وصھرًا"۔

ان سب باتوں سے ہٹ کر سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسانی وجود کا بیشتر حصہ پانی سے تشکیل پاتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر انسان کے وجود کا اصلی جوہر آب ہی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان، پیاس کا زیادہ عرصے تک مقابلہ نہیں کر سکتا جبکہ بھوک کا مقابلہ کئی روز تو کیا کئی ہفتوں تک بھی کر سکتا ہے۔

البتہ یہ احتمال بھی ہے کہ یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہوں یعنی سب سے پہلا انسان بھی پانی سے پیدا کیا گیا ہے تمام انسان بھی پانی کے نطفہ سے خلق کیے گئے ہیں اور پانی ہی سے انسانی وجود کا بیشتر حصہ بھی تشکیل پاتا ہے۔

جو پانی کائنات کی سادہ ترین چیز شمار ہوتا ہے۔ وہ اس قدر حیرت انگیز مخلوق کا مبداء کیونکر بن گیا؟ یہ خدا کی قدرت کی ایک نہایت روشن دلیل ہے۔

انسان کی تخلیق کے فوراً بعد نسلِ انسانی کے بڑھنے، پھلنے اور پھولنے کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خداوند عالم نے اسی انسان کی دو طریقوں سے افزائش کی ایک نسب اور دوسرے صہر سے (فجعلہ نسبًا و صھرًا)۔

Marfat.com

"نسب" سے مراد وہ پیوند ہے جو اولاد کے ذریعہ لگتا ہے جیسے باپ اور اولاد کا یا بھائیوں کا باہمی رشتہ اور "صِھر" جو دراصل "داماد" کے معنی میں ہے وہ پیوند ہوتا ہے جو دامادی کے ذریعے دو قوموں یا دو قبیلوں کے درمیان وجود میں آتا ہے۔ یعنی کسی کا اپنے سسرال والوں سے رشتہ اور یہ دونوں (نسب اور صھر) وہی ہیں جنھیں فقہاءِ اسلام نکاح کی مباحث میں "نسب" اور "سبب" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی سورۂ نساء کے سات مقامات پر ان محارم کا ذکر ہے جو نسب کی وجہ سے معرضِ وجود میں آتے ہیں یعنی ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی۔ چار مقامات پر ان محارم کا تذکرہ ہے جو سبب اور صھر کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی بیوی کی بیٹی، ساس، بیٹے کی بیوی اور باپ کی بیوی۔

البتہ اس جملے کی تفسیر میں اور بھی بہت سے نظریات کا ذکر ملتا ہے جو دوسرے مفسرین کی طرف سے بیان کیے گئے ہیں لیکن زیادہ واضح اور قوی وہی نظریے ہیں جو ہم ابھی بیان کر چکے ہیں۔

منجملہ ان نظریات کے ایک یہ بھی ہے کہ بعض لوگوں نے "نسب" کا معنی بیٹے کی اولاد اور "صھر" کا معنی بیٹی کی اولاد کیا ہے کیونکہ نسبی رشتوں کا دارومدار باپ پر ہوتا ہے نہ کہ ماں پر۔

لیکن جیسا کہ ہم تفسیر نمونہ کی دوسری جلد سورہ آلِ عمران کی آیت ۶۱ کے ذیل میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے جو زمانۂ جاہلیت کی رسومات میں سے ہے کہ نسب کو صرف باپ کی طرف سے شمار کرتے تھے اور ماں کا اس میں کچھ بھی حصہ نہیں سمجھا جاتا تھا جبکہ اسلامی فقہ میں تمام مسلم دانشوروں کے درمیان مسلّم ہے کہ محرم نسبی باپ اور ماں دونوں کی طرف سے ہوتا ہے (مزید تشریح کے لیے تفسیر نمونہ کی دوسری جلد مذکورہ آیت کے ذیل میں دیکھیے)۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس مقام پر ہمیں ایک مشہور حدیث ملتی ہے جسے شیعہ اور سنی کتب میں نقل کیا گیا ہے کہ جس کے مطابق مندرجہ بالا آیت حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ آنحضرتؐ نے اپنی دختر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا عقد حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ کر دیا تھا اس طرح سے حضرت علیؑ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچازاد بھائی تو تھے ہی آپؐ کے داماد بھی بن گئے اور یہی معنی ہے "نسباً و صھراً" کا۔[1]

لیکن جیسا کہ ہم کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ اس قسم کی روایات، آیت کا روشن مصداق ہوا کرتی ہیں جو آیت کے عمومی مفہوم سے مانع نہیں ہوتیں۔ یہ آیت بھی ہر قسم کی اس رشتہ داری پر محیط ہو گی جو نسب اور دامادی کی وجہ سے وجود میں آتی ہے جس کا ایک روشن مصداق حضرت علیؑ کی دو طرح سے حضرت رسول پاکؐ سے رشتہ داری ہے۔

آیت کے آخر میں تاکید کے طور پر ارشاد فرمایا گیا ہے: تمھارا پروردگار تو ہمیشہ قادر ہی ہے (وکان ربک قدیرًا)۔

آخر کار آخری زیرِ بحث آیت میں مشرکین کے اصل توحید سے انکار اور انحراف کو بیان فرمایا گیا ہے اور بتوں کی قدرت کا

---

[1] تفسیر مجمع البیان اور تفسیر روح المعانی، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

خدا کی قدرت و طاقت سے موازنہ کیا گیا ہے جس کے کچھ نمونے گزشتہ آیات میں بیان ہو چکے ہیں فرماتا ہے: وہ لوگ خدا کے علاوہ دوسرے معبودوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ تو نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ ہی نقصان (و یعبدون من دون اللّٰہ ما لا ینفعھم ولا یضرھم)۔

یہ بات بھی مسلّم ہے کہ صرف نفع اور نقصان ہی عبادت کا معیار نہیں لیکن یہ کہہ کر قرآن مجید نے اس نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے پاس بتوں کی عبادت کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ بتوں میں قطعاً کسی کام کی کوئی خاصیت نہیں پائی جاتی اور ہر طرح کی مثبت یا منفی تاثیر سے خالی ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: اور کافر لوگ (اپنے کفر کی راہ میں) خدا سے مقابلے کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں (وکان الکافر علٰی ربہ ظھیرًا)۔

وہ اپنی گمراہی میں اکیلے نہیں ہیں بلکہ بڑے دھڑلے کے ساتھ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں جن طاقتوں کو راہِ خدا میں خرچ کرنا چاہیے تھا انھیں وہ خدا، پیغمبر اور سچے مؤمنین کے خلاف خرچ کرتے ہیں۔

اگر اس موقع پر کسی تفسیر میں ہمیں "کافر" کا لفظ صرف "ابوجہل" کے بارے میں دکھائی دیتا ہے تو یہ اس کا ایک واضح مصداق ہے ورنہ "کافر" کا ہر جگہ وسیع معنیٰ ہے جو تمام کفار کے لیے ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ صرف ایک قیادت: زیرِ نظر پہلی آیت میں خداوندِ عالم کا یہ فرمان ہے کہ "اگر ہم چاہتے تو ہر شہر اور دیار میں ڈرانے والا پیغمبر بھیج دیتے" لیکن ایسا نہیں کیا۔

یقیناً یہ صرف اس لیے ہے کہ انبیاء امتوں کے راہبر و راہنما ہوا کرتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ کسی قوم کے مسئلہ قیادت میں تفرقہ اور انتشار اس قوم کی کمزوری کا سبب بن جاتا ہے خاص کر جب مسئلہ ختم نبوت کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کی حیثیت اور اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ایسی قیادت کو تو تا قیام قیامت برقرار رہنا ہے۔

ایک قائد اور رہبر تمام منتشر طاقتوں کو یکجا کرتا ہے انھیں وحدت اور اتحاد کا سبق دیتا ہے درحقیقت قیادت اور رہبری کی وحدت انسانی معاشرے میں توحید کی حقیقت کو منعکس کرتی ہے، جو ایک طرح سے شرک، تفرقہ اور نفاق کے برعکس ہے۔

سورۂ فاطر کی آیت ۲۴ میں ہے:

وان من امۃ الا خلا فیھا نذیر

ہر امت میں ایک ڈرانے والا نبی گزرا ہے۔

یہ مندرجہ بالا بحث کے قطعاً متضاد نہیں ہے کیونکہ اس آیت میں ہر امت کی بات ہو رہی ہے ہر شہر اور دیار کی نہیں۔

اگر انبیاء کے بارے میں صرفِ نظر کر کے نچلے درجے کی طرف نگاہ کریں تو وہاں بھی یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے جو قومیں اپنے لیڈر کے لحاظ سے تشتت اور افتراق کا شکار ہوئی ہیں وہ اپنی طاقت اور توانائی کھو دینے کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں میں

Marfat.com

انتشار کا شکار ہو چکی ہیں۔

۲۔ قرآن ـــــ ذریعہ جہاد ہے

"جہاد کبیر" کا لفظ ایک الٰہی تعمیری جدوجہد اور نبرد آزمائی کے لیے واضح تعبیر ہے جو اس کی اہمیت کو اجاگر کر رہی ہے لائق توجہ بات یہ ہے کہ آیات بالا میں یہ عنوان قرآن مجید کو دیا گیا ہے یا دوسرے لفظوں میں ان لوگوں کو یہ عنوان دیا گیا ہے جو قرآن کے ذریعے ہر قسم کی لغزش، گمراہی، جرائم اور معاشرتی برائیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔

یہ تعبیر ایک طرف تو منطقی اور عقیدتی جدوجہد اور نبرد آزمائی کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور دوسری طرف قرآن کی عظمت کو۔

بعض روایتوں میں ہے کہ ایک شب ابوسفیان، ابوجہل اور مشرکین کے بہت سے دوسرے سردار جداگانہ طور پر اور ایک دوسرے سے چھپ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن سننے کے لیے آگئے آپؐ اس وقت نماز پڑھنے میں مشغول تھے اور ہر ایک، ایک دوسرے سے بالکل بے خبر علیحدہ علیحدہ مقامات پر چھپ کر بیٹھ گیا چنانچہ وہ رات گئے تک قرآن سنتے رہے اور جب واپس پلٹنے لگے تو اس وقت صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی۔ اتفاق سے سب نے واپسی کے لیے ایک ہی راستے کا انتخاب کیا اور ان کی اچانک ایک دوسرے سے ملاقات ہو گئی اور ان کا بھانڈا وہیں پر پھوٹ گیا انھوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی اور اس بات پر زور دیا کہ آئندہ ایسا کام نہیں کرنا چاہیے اگر ناسمجھ لوگوں کو پتہ چل گیا تو وہ شک و شبہ میں پڑ جائیں گے۔

دوسری اور تیسری رات بھی ایسا ہی اتفاق ہوا اور پھر وہی باتیں دہرائی گئیں اور آخری رات تو انھوں نے کہا جب تک اس بات پر پختہ عہد نہ کرلیں اپنی جگہ سے ہلیں نہیں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور پھر ہر ایک نے اپنی راہ لی۔

اسی رات کی صبح اخنس بن شریق نامی ایک مشرک اپنا عصا لے کر سیدھا ابوسفیان کے گھر پہنچا اور اسے کہا:

تم نے جو کچھ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے سنا ہے اس کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟

اس نے کہا:

خدا کی قسم! کچھ مطالب ایسے سنے ہیں جن کا معنیٰ بخوبی سمجھ سکا ہوں اور کچھ مسائل کے مراد اور معنیٰ کو نہیں سمجھ سکا۔

اخنس وہاں سے سیدھا ابوجہل کے پاس پہنچا اس سے بھی وہی سوال کیا کہ:

تم نے جو کچھ محمد (ص) سے سنا ہے اس کے بارے میں کیا کہتے ہو؟

ابوجہل نے کہا:

سنا کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہماری اور اولاد عبدمناف کی قدیم زمانے سے رقابت چلی آرہی ہے انھوں نے بھوکوں کو کھانا کھلایا، ہم نے بھی کھلایا، انھوں نے پیدل لوگوں کو سواریاں دیں ہم نے بھی دیں، انھوں نے لوگوں پر خرچ کیا سو ہم نے بھی کیا۔ گویا ہم دوش بدوش آگے بڑھتے رہے۔ اب جب انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کے پاس وحی آسمانی بھی آتی ہے تو اس بارے میں

Marfat.com

ہم ان کے ساتھ کس طرح برابری کر سکتے ہیں ؟ اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو خدا کی قسم! ہم نہ تو کبھی اس پر ایمان لائیں گے اور نہ ہی اس کی تصدیق کریں گے ۔

اخنس نے جب یہ بات سنی تو وہاں سے اٹھ کر چلا گیا[1]

جی ہاں! قرآن کی کشش نے ان پر اس قدر اثر کر دیا کہ وہ سپیدۂ صبح تک اس الٰہی کشش میں گم رہے لیکن خود خواہی، تعصب اور مادّی فوائد ان پر اس قدر غالب آچکے تھے کہ انھوں نے حق قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔

اس میں شک نہیں کہ اس نورِ الٰہی میں اس قدر طاقت ہے کہ ہر آمادہ دل کو وہ جہاں بھی ہو، اپنی طرف جذب کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس (قرآن) کا ان آیات میں " جہاد کبیر" کہہ کر تعارف کروایا گیا ہے ۔

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد اول ص ۳۳۷ اور تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۶ ص ۱۷۲ ۔

Marfat.com

۵۶۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ○
۵۷۔ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ○
۵۸۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ○
۵۹۔ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ○

ترجمہ

۵۶۔ ہم نے تو تجھے صرف خوشخبری دینے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔
۵۷۔ (ان سے) کہہ دے: میں اس (دین کی تبلیغ) کے بدلے میں تم سے کسی اُجرت کا مطالبہ نہیں کرتا میری اجرت تو صرف یہی ہے کہ جو لوگ چاہیں اپنے پروردگار کا راستہ اختیار کریں۔
۵۸۔ اس خدا پر بھروسہ رکھ کہ جو کبھی نہیں مرے گا اور اس کی تسبیح اور حمد بجالا اور یہ کافی ہے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہے۔
۵۹۔ وہ خدا تو وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (چھ مرحلوں) میں پیدا کیا اور پھر عرش قدرت پر جلوہ فرما ہوا (اور کائنات کا نظام چلانے لگا) وہ خدائے رحمان ہے اسی سے طلب کرو کیونکہ وہی ہر چیز سے آگاہ ہے۔

تفسیر

میری اُجرت تمھاری ہدایت ہے

جیسا کہ سابقہ آیات کے مطالعہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ بُت پرستوں کا ان بتوں کی پرستش پر اصرار رہا ہے جو نہ تو کسی قسم کا نفع پہنچا

Marfat.com

سکتے ہیں اور نہ نقصان ۔ لہٰذا زیر بحث آیات میں خداوند عالم ان ہٹ دھرم اور متعصب لوگوں کے مقابلے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدائی فریضے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے : ہم نے تو تجھے صرف خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے (وما ارسلناك الا مبشرًا و نذيرًا)[1]۔

اگر ان لوگوں نے تیری دعوتِ اسلام کو قبول نہ کیا تو تیرا کوئی قصور نہیں کیونکہ تو نے اپنا بشارت اور نذارت کا فریضہ انجام دے دیا ہے اور آمادہ دلوں کو خدا کی طرف دعوت دے دی ہے ۔

یہ فرمان ایک تو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدائی فریضے کو نمایاں کر رہا ہے اور دوسرے آنحضرتؐ کے دل کو تسلی دے رہا ہے اور ساتھ ہی گمراہ لوگوں کو ایک طرح کی تنبیہ بھی کی جا رہی ہے ۔

اس کے بعد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دے کہ میں اس قرآن اور تبلیغ دین کے بدلے میں کسی اجرت کا مطالبہ نہیں کرتا (قل ما اسئلکم علیه من اجر) ۔

قرآن مزید فرماتا ہے : جو اجرت میں ان سے چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ لوگ خدا کا راستہ اختیار کریں (الا من شاء ان يتخذ الى ربه سبيلاً) ۔

یعنی اگر تم ہدایت پا جاؤ تو بس میری یہی اجرت ہے اور یہ ہدایت بھی اپنے ارادے اور مرضی کے ساتھ نہ کہ کسی کے مجبور کرنے سے ۔ یہ ایک دلچسپ تعبیر ہے جو آنحضرتؐ کی اپنے پیروکاروں کے ساتھ دوستی اور محبت کی انتہا کو واضح کر رہی ہے کہ وہ اپنی اجرت اور مزدوری امت کی سعادت اور خوش بختی میں سمجھتے ہیں[2]

ظاہر ہے کہ امت کی ہدایت، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت بڑے معنوی اجر کا سبب بنتی ہے کیونکہ " الدال على الخير كفاعله " یعنی جو شخص نیکی کی ہدایت کرتا ہے گویا وہ خود نیکی کر رہا ہوتا ہے ۔

اس آیت کی تفسیر میں اور بھی بہت سے احتمال ذکر کیے گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ آیت کا معنیٰ یوں ہے :

" میں تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی کے مطابق اپنے اموال راہِ خدا میں ضرورت مندوں پر خرچ کرو "[3]

لیکن پہلی تفسیر آیت کے معنیٰ کے زیادہ نزدیک ہے ۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ " علیه " کی ضمیر قرآن اور دینِ اسلام کی تبلیغ کی طرف لوٹ رہی ہے

---

[1] بعض مفسرین کے نزدیک " نذیر " مبالغے کا صیغہ ہے جبکہ " مبشر " صرف اسم فاعل ہے ۔ تعبیر کے اختلاف کا مقصد شاید یہ ہو کہ پیغمبر اکرم کو ایسے لوگوں کا سامنا تھا جو اپنی گمراہی پر سخت ڈٹے ہوئے تھے فطری طور پر آپ کو انھیں ڈرانا ہی چاہیے تھا (تفسیر روح المعانی اسی آیت کے ذیل میں) ۔

[2] بنا بریں اس آیت میں " استثنائے متصل " ہے ہر چند کہ بادی النظر میں منقطع دکھائی دیتا ہے ۔

[3] ایسی صورت میں یہ " استثنائے منقطع " ہوگا ۔

Marfat.com

کیونکہ یہاں دعوت کی اُجرت و مزدوری کے بارے میں گفتگو ہو رہی ہے۔
یہ جملہ جہاں پر مشرکین کے بہانوں کا توڑ پیش کر رہا ہے وہاں پر یہ بھی واضح کر رہا ہے کہ اس دعوتِ الٰہی کی قبولیت نہایت سادہ و آسان اور ہر شخص کے لیے بغیر کسی تکلیف اور خرچ کے ممکن الحصول ہے۔
یہ بجائے خود آنحضرتؐ کی دعوت کی سچائی اور پاکیزگیٔ فکر کے لیے شاہد ناطق ہے۔ کیونکہ جھوٹے مدعی یہ کام براہ راست یا بالواسطہ اجر کے بغیر انجام نہیں دیتے۔
اس کے بعد والی آیت آنحضرتؐ کی حقیقی پناہ گاہ کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتی ہے: تو اس خدا پر توکل کیے رکھ جو زندہ ہے اور جسے کبھی موت نہیں آئے گی (و توکل علی الحی الذی لا یموت)۔
گویا جب آپ کی پناہ گاہ اور والی و سرپرست ایسی ذات ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور زندہ رہے گی تو پھر نہ تو آپ کو کسی قسم کی اُجرت کی ضرورت ہے اور نہ ہی دشمن کے نقصان پہنچانے اور ان کی چالوں سے خوف کھانے کی۔
اور جب صورت حال یہ ہے تو "اس کی تسبیح اور حمد بجا لا" اور اسے ہر قسم کے عیب و نقص سے مبرا اور منزہ سمجھ اور تمام کمالات پر اس کی حمد و ستائش کر (و سبح بحمدہ)۔
درحقیقت اس جملے کو پہلے کی علت سمجھنا چاہیے کیونکہ جب وہ ہر قسم کے عیب و نقص سے پاک اور ہر حسن و کمال سے آراستہ ہے تو وہی اس قابل ہے کہ اس پر توکل کیا جائے۔
پھر فرمایا گیا ہے: دشمنوں کی تخریب کاری اور سازشوں سے گھبرائیں نہیں کیونکہ یہ بات کوئی کم نہیں کہ خداوندِ عالم اپنے بندوں کے گناہوں سے آگاہ ہے اور جب بھی چاہے گا ان کی پکڑ کرے گا (وکفٰی بہٖ بذنوب عبادہ خبیرًا)۔
بعد والی آیت کائنات میں پروردگار عالم کی قدرت اور اس قابلِ اعتماد پناہ گاہ کی ایک اور صفت بیان کر رہی ہے: وہ خدا وہ ہے جس نے آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان موجود ہے ان سب کو چھ دنوں (مرحلوں) میں پیدا کیا ہے: (الذی خلق السماوات والارض وما بینھما فی ستۃ ایام)۔
پھر وہ عرشِ قدرت پر متمکن ہوا اور کائنات کا نظام چلانے لگا (ثم استوٰی علی العرش)۔
جو ذات اس وسیع قدرت کی مالک ہے وہ اپنے اوپر توکل کرنے والوں کو ہر خطرے اور ہر حادثے میں ہر طرح کی گزند سے محفوظ رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ کائنات کی ہر چیز اسی نے پیدا کی ہے اور کائنات کا ہر قسم کا نظام بھی اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔
ضمنی طور پر اس بات کی وضاحت بھی کرتے چلیں کہ کائنات کی مرحلہ وار تخلیق اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ خداوندِ عالم کسی بھی کام میں جلدی نہیں کرتا۔ اگر تیرے دشمنوں کو فوراً سزا نہیں دیتا تو اس کی وجہ یہی ہے کہ انھیں مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر لیں اور پھر یہ کہ عجلت تو وہ کرے جسے کسی چیز کے ضائع ہو جانے اور ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو اور یہ بات خدائے قادر و متعال کے لیے فرض بھی نہیں کی جا سکتی۔
کائنات کی چھ دنوں میں تخلیق اور یہ کہ ایسے مقامات پر "دن" سے مراد "مرحلہ" ہے اور ممکن ہے یہ مرحلہ لاکھوں اور کروڑوں سال پر مشتمل ہو، اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کی آیت ۵۴ کی تفسیر کے ذیل میں عربی اور دوسری زبانوں کے

Marfat.com

ادب کی رُو سے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور ان چھ مراحل کو بھی واضح کیا ہے ۔

نیز "عرش" کا معنیٰ اور "استوٰی علی العرش" کا مفہوم بھی وہاں بیان ہو چکا ہے ۔

آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے : وہ خدا رحمان ہے (الرحمٰن) ۔

وہ وہ خدا ہے جس کی رحمتِ عامہ تمام کائنات پر محیط ہے اور فرماں بردار اور نافرمان ، مومن اور کافر سب اس کے خوانِ نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں ۔

اب جبکہ تیرا خدا وہ ہے جو بخشنے والا ، قدرت مند اور توانا ہے " اگر مانگنا چاہتا ہے تو اسی سے مانگ کیونکہ وہ اپنے بندوں کی ضروریات کو جانتا ہے " (فاسئل بہ خبیرًا) ۔

درحقیقت یہ جملہ گزشتہ آیات کا ایک نتیجہ ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اے رسول ! تو انھیں بتا دے کہ میں تم سے اجرِ رسالت نہیں مانگتا اور اس خدا پر بھروسہ رکھ جو ان تمام صفات کا جامع ہے ، وہ قادر بھی ہے اور رحمان بھی ، علیم بھی ہے اور خبیر بھی اور جو خدا ان صفات کا مالک ہے اسی خدا سے سب کچھ طلب کر ۔

مفسّرین نے اس جملے کی کچھ اور تفسیریں بھی کی ہیں اور یہاں پر سوال کرنے کو پوچھنے کے معنیٰ میں لیا ہے نہ کہ مانگنے اور درخواست کرنے کے معنیٰ میں ۔ ان کے کہنے کے مطابق اس جملے کا مفہوم یہ ہوگا " اگر تخلیقِ کائنات اور قدرتِ پروردگار کے بارے میں سوال کرنا چاہتے ہو تو خود اسی سے پوچھو کیونکہ وہ ہر چیز سے باخبر ہے " ۔

بعض مفسّرین نے کہا ہے کہ سوال کا معنیٰ پوچھنا ہے اور " خبیر " سے مراد جبرائیل علیہ السلام ہیں یا حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں یعنی اگر خدا کی صفات کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو تو جبرئیل سے پوچھو یا حضرت رسالتمآبؐ سے ۔

البتہ یہ آخری تفسیر بہت ہی بعید معلوم ہوتی ہے اور اس سے پہلے والی تفسیر بھی گزشتہ آیات سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی ، سب سے پہلی تفسیر یعنی سوال سے مراد خدا سے مانگنے اور اس سے درخواست کرنے کے ہیں ، یہی زیادہ مناسب ہے [۱]

چند اہم نکات

۱۔ **اجرِ رسالت :** ہم قرآن مجید کی بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ خدا کے بھیجے ہوئے انبیاءِ کرام علیہم السلام نے بڑی صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ہم اپنی رسالت و نبوّت کا اجر کسی سے نہیں چاہتے بلکہ ہمارا اجر تو خدا کے پاس ہے چنانچہ سورۂ شعراء کی آیات ۱۰۹ ، ۱۲۷ ، ۱۴۵ ، ۱۶۴ اور ۱۸۰ اور اسی طرح سورۂ ہود کی آیات ۲۹ اور ۵۱ ، سورۂ یونس کی آیت ۷۲ ، اور سورۂ سبا کی آیت ۴۷ اس بات کی شاہد ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کا اس طرح کا مطالبہ نہ کرنا انھیں ہر قسم کے الزام اور اتہام سے بری قرار دیتا ہے اور پھر یہ کہ وہ مکمل آزادی کے ساتھ اپنے ہر قسم کے فرائضِ منصبی کو ادا کر سکتے ہیں کیونکہ مادی فوائد پیشِ نظر ممکن ہے کہ ان کی زبان نہ کھل سکتی ہو اس طرح سے یہ بات بھی ختم ہو جائے گی ۔

---

[۱] اس تفسیر کے مطابق "بہ" میں "ب" زائدہ ہے ، لیکن دوسری تفاسیر کے مطابق "ب" "عن" کے معنیٰ میں ہے ۔

Marfat.com

لیکن یہ بات لائق توجہ ہے کہ اس بارے میں حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق تین تعبیریں نظر آتی ہیں۔

پہلی تعبیر تو وہ ہے جو آیات بالا میں بیان ہوئی ہے کہ:

تمھاری ہدایت ہی میری اُجرت ہے۔

یہ نہایت ہی قیمتی بامعنی اور پرکشش تعبیر ہے۔

دوسری تعبیر وہ ہے جو سُورہ شوریٰ کی آیت ۲۳ میں بیان ہوئی ہے کہ:

قل لا اسئلکم علیہ اجرًا الا المودۃ فی القربٰی

میں تم سے کوئی اجر رسالت نہیں مانگتا مگر یہ کہ تم میرے قریبیوں سے محبت رکھو۔

تیسری تعبیر وہ ہے جو سورہ سبا کی آیت ۴۷ میں بیان ہوئی ہے:

قل ما سئلتکم من اجر فھو لکم ان اجری الا علی اللہ

آپ ان سے کہہ دیجیے! میں نے جو اجر رسالت طلب کیا ہے وہ تمھارے ہی فائدے میں ہے میرا اجر تو صرف خدا پر ہے۔

اگر ان تینوں تعبیروں کو باہم ملایا جائے تو اس سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ اگر رسالت مآبؐ کے بارے میں ذوی القربیٰ کی مؤدت اجر رسالت قرار پائی ہے تو ایک تو اس کا مفاد خود مؤمنین کو ہی پہنچتا ہے نہ کہ پیغمبر کو اور دوسرے یہ محبت ان کی ہدایت کا سبب بنتی ہے۔

بنا بریں یہ تمام آیات مجموعی طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ رسولِ خدا کے ذوی القربیٰ کی محبت درحقیقت آنحضرتؐ کی رسالت اور رہبری کا تسلسل ہے دوسرے لفظوں میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور آپؐ کی ہدایت اور راہبری کو دوام بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ آپؐ کے ذوی القربیٰ کا دامن مضبوطی سے پکڑا جائے اور ان کی راہبری سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور یہی وہ چیز ہے جس کی شیعہ حضرات مسئلہ امامت میں طرفداری کرتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ بعد از پیغمبر اکرمؐ رہبری کا سلسلہ تاقیامت جاری ہے البتہ نبوت کی شکل میں نہیں بلکہ امامت کے عنوان سے۔

اس نکتے کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اتباع اور پیروی کے لیے محبت ایک اہم اور مؤثر عامل ہے جیسا کہ سُورۂ آلِ عمران کی آیت ۳۱ میں ہے:

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی

"اے پیغمبرؐ! آپ کہہ دیجیے کہ اگر خدا کو دوست رکھنا چاہتے تو میری اتباع کرو۔"

اس لیے کہ میں اس کے فرمان تم تک پہنچاتا ہوں۔

اصولی طور پر کسی شخص کے ساتھ محبت، انسان کو اس کے محبوب کی طرف کھینچ کرلے جاتی ہے اور محبت کا رشتہ جتنا قوی ہوگا یہ کشش بھی اسی قدر محکم ہوگی۔ خاص کر جس محبت کا سبب محبوب یہ کمال اس بات کا باعث ہوگا کہ انسان کوشش کرکے خود کو کمال کے

Marfat.com

اس مبداء تک پہنچائے گا اور محبوب کی ہر تمنا پوری کر کے خود کو اس کے زیادہ سے زیادہ نزدیک کر دے گا۔[1]

۲۔ کس پر بھروسہ کرنا چاہیے ؟ آیاتِ بالا میں جہاں خدا تعالیٰ اپنے پیغمبرؐ کو دوسری تمام مخلوقات سے منہ پھیر کر صرف خدا کی ذات پر توکّل کرنے کا حکم دے رہا ہے وہاں پر اس پاک ذات کی صفات کا بھی ذکر فرما رہا ہے جو دراصل اس ذات کی بنیادی شرائط ہیں جو انسانوں کے لیے حقیقی اور قابلِ اطمینان پناہ گاہ بن سکتی ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ زندہ ہو، کیونکہ بتوں کی مانند مردہ چیز کسی کے لیے جائے پناہ نہیں ہو سکتی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کی یہ حیات جاودانی ہو تا کہ اس کی موت کا احتمال توکّل کرنے والوں کے ذہن میں تزلزل پیدا نہ کر دے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اس کا علم تمام چیزوں پر حاوی ہو تا کہ وہ توکّل کرنے والوں کی ضروریات سے باخبر رہے اور دشمنوں کی چالوں اور سازشوں سے بھی مطلع رہے۔

چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہو تا کہ اس طرح سے کسی قسم کے عجز اور ناتوانی کا امکان باقی نہ رہے کیونکہ اس سے توکّل کرنے والوں کے دل متزلزل ہو جاتے ہیں۔

پانچویں شرط یہ ہے کہ کائنات کی حاکمیت اور نظامِ امور اس کے قبضۂ قدرت میں ہو۔

ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ صفات صرف اور صرف خداوندِ عالم کی ذاتِ والاصفات ہی میں جمع ہیں یہی وجہ ہے کہ ہر طوفانِ حوادث کے مقابلے میں قابلِ اطمینان اور غیر متزلزل جائے پناہ اور تکیہ گاہ صرف اور صرف اس کی ذات ہے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد دوم ، سُورۂ آلِ عمران آیت ۳۱ کے ذیل میں رجوع کریں۔

Marfat.com

۶۰۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ
لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ۩ ع السجدة
۶۱۔ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّ
قَمَرًا مُّنِيْرًا ۝
۶۲۔ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ
اَرَادَ شُكُوْرًا ۝

ترجمہ

۶۰۔ اور جب انھیں کہا جاتا ہے کہ خداوند رحمٰن کے لیے سجدہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے؟ (ہم رحمان کو نہیں پہچانتے) کیا ہم اس چیز کو سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے (یہ بات کرتے ہیں) اور ان کی نفرت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۶۱۔ بابرکت اور جاوید ہے وہ خدا جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے ہیں اور ان کے درمیان روشن چراغ اور ضیا پاش چاند بنایا ہے۔

۶۲۔ اور وہ وہ ذات ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین قرار دیا ہے (یہ عجائبِ قدرت) ان لوگوں کے لیے ہیں جو خدا کو یاد کریں یا اس کا شکر ادا کریں۔

تفسیر

آسمانی بُرج

چونکہ گزشتہ آیات میں خداوندِ عالم کی عظمت، قدرت اور وسعتِ رحمت کے بارے میں گفتگو تھی لہٰذا زیرِ نظر آیات میں فرمایا گیا ہے: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس رحمٰن خدا کو سجدہ کرو جس کی رحمت نے تمھارے سارے وجود کو ڈھانپا ہوا ہے تو وہ تکبر اور غرور یا ٹھٹھا مذاق سے کہتے ہیں رحمٰن کیا چیز ہے؟ (و اذا قيل لهم اسجدوا للرحمٰن قالوا وما الرحمٰن)۔

Marfat.com

"رحمان"، کو قطعاً نہیں پہچانتے اس کلمہ کا مفہوم ہمارے لیے واضح نہیں ہے ۔
"کیا ہم ایسی چیز کو سجدہ کریں جس کا تو ہمیں حکم دیتا ہے" (انسجد لما تأمرنا) ۔
ہم کسی کا حکم نہیں مانیں گے اور کسی ایسے ویسے کی اطاعت نہیں کریں گے ۔
"وہ یہ بات کرتے ہیں اور خداوندِ عالم سے ان کی نفرت اور دُوری میں اضافہ ہو جاتا ہے" (وزادهم نفورًا) ۔

اس میں شک نہیں کہ خدا کے حضور خشوع و خضوع کے اظہار اور سجدہ کی ادائیگی کی دعوت کے لیے خدا کے ناموں میں سے بہترین اور پرکشش کام "رحمان" ہے ۔ جس میں رحمت کا معنیٰ اپنے جامع اور وسیع مفہوم کے ساتھ پایا جاتا ہے لیکن یہ دل کے اندھے اور متعصب بجائے اس کے کہ اس دعوت کا کوئی مثبت جواب دیتے الٹا اس دعوت کا مذاق اڑانے لگے اور حقارت کے ساتھ کہنے لگے کہ رحمان کیا چیز ہے ؟ جس طرح فرعون نے موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کے جواب میں کہا تھا " ومارب العالمین " کہ رب العالمین کیا چیز ہے ؟ (سورۂ شعراء آیت ۲۳) ایسے لوگ اتنا بھی نہیں کرتے کہ کہیں " وہ کون ہے ؟"

اگرچہ بعض مفسّرین کا نظریہ یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ "رحمان" بھی خدا کے ناموں میں سے ایک نام ہے چنانچہ جب انھوں نے یہ نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی زبان سے سنا تو تعجب سے کہنے لگے کہ " ہم کسی کو رحمٰن کے نام سے نہیں پہچانتے ہاں البتہ یمامہ میں ایک شخص رہتا ہے جس کا نام رحمان ہے ۔ (ان کی مراد نبوت کا جھوٹا مدعی مسیلمہ کذاب تھا جسے لوگ "رحمان" کہتے تھے) ۔

لیکن یہ بات بہت ہی بعید نظر آتی ہے کیونکہ اس نام کا مادہ اور صیغہ دونوں عربی ہیں اور حضرت رسالتمآبؐ ان کے سامنے ہر صورت کے آغاز میں " بسم الله الرحمٰن الرحیم " کہا کرتے تھے اور یہ کلمہ ان کے لیے کوئی اجنبی نہیں تھا لہٰذا ان کا مقصد بہانہ طرازی اور مذاق اڑانے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا ۔

بعد والا جملہ اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں : کیا ہم تیری اطاعت کریں اور تیرے کہنے کے مطابق سجدہ کریں (انسجد لما تأمرنا) ۔

لیکن چونکہ خدائی رہبروں کی تبلیغ صرف آمادہ دلوں پر ہی اثر کرتی ہے اور دل کے اندھے اور متعصب لوگ اس سے نہ صرف یہ کہ بہرہ اندوز نہیں ہوتے بلکہ ان کی نفرت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے کیونکہ آیات قرآنی بھی باران نعمت کی طرح ہوتی ہیں جو باغ میں تو سبزہ اور پھولوں کی افزائش کا سبب بنتی ہے اور شورہ زار زمین میں خس و خاشاک کی روئیدگی کا۔[1]

بعد والی آیت درحقیقت ان کے اس سوال کا جواب ہے جو وہ کہتے تھے " رحمان کیا چیز ہے ؟" اگرچہ انھوں نے یہ بات تمسخر کے طور پر کہی تھی لیکن قرآن اس کا سنجیدگی سے جواب دیتے ہوئے کہتا ہے : بابرکت اور صاحبِ عظمت ہے وہ خدا جس نے آسمانوں میں بُرج بنائے ہیں (تبارك الذی جعل فی السماء بروجًا) ۔

---

[1] بنابریں "زاد" کا فاعل وہی سجدے کا حکم دینا ہے جس نے دل کے ان بیماروں پر الٹا اثر کیا ہے ہر چند کہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اس کے بعد پیغمبر اکرمؐ اور مومنین نے سجدہ کیا اور یہ بات ان کی مزید دوری کا سبب بن گئی اس لیے "زاد" کا فاعل سجدہ ہے لیکن پہلا معنیٰ زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔

Marfat.com

"بروج" "برج" کی جمع ہے جو ظہور یعنی ظاہر ہونے کے معنی میں ہے لہٰذا شہر کی چاردیواری یا فوجی مرکز کے اطراف کی دیوار میں جو جگہ سب سے بلند اور نمایاں ہوتی ہے اسے "بُرج" کہتے ہیں اسی بنا پر جب عورت اپنی زینت اور آرائش کو نمایاں کرتی ہے تو اس وقت "تبرجت المرأة" کہتے ہیں۔

اور یہی کلمہ بلند و بالا محلات کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

بہرحال آسمانی بروج، فلک کی مخصوص صورتوں کی طرف اشارہ ہے کہ سال کے ہر موسم اور ہر موقع پر چاند اور سورج ان میں سے کسی نہ کسی کے مقابل ہوتے ہیں مثلاً جب کہا جاتا ہے کہ سورج بُرج حمل میں ہوتا ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ مذکورہ بُرج کی صُورت فلکی کے برابر میں واقع ہے یا جب کہتے ہیں کہ قمر در عقرب ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ کُرہ ماہ عقرب کی صورت فلکی کے سامنے ہے (فلکی صورتیں ستاروں کے ان مجموعوں کو کہتے ہیں جو ہمیں خاص صورتوں میں دکھائی دیتے ہیں)۔

اس طرح سے یہ آیت چاند اور سورج کی آسمانی منزلوں کی طرف اشارہ کررہی اور اس کے بعد کہتی ہے: اور ان برجوں میں روشن چراغ اور ضیا پاش چاند بنایا ہے (وجعل فیها سراجًا و قمرًا منیرًا)[1]۔

یہ آیت درحقیقت آسمان میں چاند اور سورج کی صحیح رفتار اور ان کے بچے تلے نظام کو واضح کررہی ہے (البتہ ہماری نگاہ میں یہ تبدیلیاں درحقیقت سورج کے گرد زمین کے چکر لگانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں) اور یہ نظام اس قدر صحیح اور منظم ہے جو لاکھوں کروڑوں سال سے کسی کم وکاست کے بغیر اس کائنات پر حکم فرما ہے حتیٰ کہ باخبر منجمین آج سے سینکڑوں سال بعد تک کی سورج اور چاند کی حرکت کے بارے میں ایک مقررہ دن اور مقررہ ساعت کی پیشین گوئی کرسکتے ہیں ان عظیم آسمانی کروں پر حکم فرما یہ نظام پروردگا عالم کے مدبر، عالم اور صاحب حکمت ہونے پر دلالت کررہا ہے۔

آیا ان واضح نشانیوں اور چاند اور سورج کی حیرت انگیز منازل کے باوجود بھی اسے نہیں پہچانتے اور کہتے ہو "وما الرحمان"۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورج کو "سراج" سے کیوں موسوم کیا گیا ہے اور چاند کو "منیر" کی صفت سے کیوں موصوف کیا گیا ہے؟ ممکن ہے کہ اس کی دلیل یہ ہو کہ "سراج" ایسے چراغ کے معنی میں ہوتا ہے جس کی روشنی خود اس کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور یہ تعریف سورج کی کیفیت سے مطابقت رکھتی ہے۔ کیونکہ سائنسی تحقیقات کے مطابق سورج کا نور اس کے اپنے وجود سے ہے، برخلاف چاند کے، کیونکہ اس کا نور سورج کی بدولت ہے۔ لہٰذا قمر کو منیر (روشنی دینے والا) کی صفت سے موصوف کیا گیا ہے ہرچند کہ اس کا نور دوسرے کا مرہون منت ہے۔ (اس بارے میں تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد میں سورۂ یونس کی پانچویں اور چھٹی آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی جاچکی ہے)۔

---

[1] تفسیر بالا کے مطابق "فیها" کی ضمیر "سماء" کی طرف لوٹ رہی ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کیونکہ اہم موضوع تو ایک مخصوص نظام کے تحت بروج میں سورج اور چاند کی گردش ہے نہ کہ صرف آسمان میں برجوں کی موجودگی۔

Marfat.com

زیرِ نظر آخری آیت میں ایک بار پھر خداوندِ عالم کی صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور نظامِ کائنات کے ایک اور حصّے کو بیان کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

"خدا تو وہ ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین مقرر فرمایا ہے یہ ان لوگوں کے لیے جو اللہ کو یاد کرنا چاہتے ہیں یا شکر بجالانا چاہتے ہیں" (و هو الذی جعل اللیل و النهار خلفة لمن اراد ان یذکر او اراد شکورًا)۔

شب و روز پر حاکم یہ عجیب اور حیرت انگیز نظام کہ ہمیشہ رات اور دن ایک دوسرے کے قائم مقام ہوتے رہتے ہیں لاکھوں کروڑوں سال سے چلا آرہا ہے اگر یہ نظم و نسق نہ ہوتا تو نور اور حرارت یا تاریکی اور ظلمت کی وجہ سے انسانی زندگی تباہ اور برباد ہو کر رہ جاتی، جو لوگ خدا کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ ایک اچھی اور عمدہ دلیل ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ سورج کے گرد زمین کی گردش کرنے کی وجہ سے رات اور دن پیدا ہوتے رہتے ہیں اور یہ تدریجی اور منظّم تبدیلی کہ جس سے دائماً ایک میں کمی اور دوسرے میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد اپنے مدار پر گھومتی رہتی ہے جس سے چار موسم پیدا ہوتے ہیں۔

اگر ہماری زمین کا کرّہ اپنی موجودہ حرکت سے زیادہ تیز یا آہستہ حرکت کرتا تو پہلی صورت میں راتیں لمبی ہوتیں جس سے دنیا کی ہر چیز منجمد ہو کر رہ جاتی اور دن اس قدر طویل ہوتے کہ سورج کی چمک تمام چیزوں کو جلا کر رکھ دیتی اور دوسری صورت میں شب و روز کا مختصر فاصلہ ان کی تمام تاثیر کو بے اثر بنا دیتا۔ اس کے علاوہ مرکز سے گریز کی طاقت میں اس قدر اضافہ ہو جاتا کہ وہ روئے زمین پر موجود تمام چیزوں کو کُرّہ ارضی سے باہر پھینک دیتی۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس نظام کا مطالعہ ایک تو انسان کے اندر خداشناسی کی فطرت کو بیدار کرتا ہے (شاید "یادِ خدا" کا اشارہ بھی اس حقیقت کی طرف ہے) دوسرے اس کے اندر شکرگزاری کی روح کو زندہ کرتا ہے جس کی طرف " اواراد شکورًا " کے جملے سے اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمۂ اطہار علیہم السّلام سے کچھ روایات ذکر ہوئی ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

رات اور دن کا ایک دوسرے کا جانشین ہونا، اس لیے ہے کہ اگر انسان ان میں سے کسی ایک میں اپنے عبادتِ الٰہی جیسے فریضے میں کوتاہی کرے تو دوسرے میں اس کی تلافی یا قضا کرلے۔

ممکن ہے کہ یہ آیت کی دوسری تفسیر ہو چونکہ قرآنی آیات کے کئی باطنی مفاہیم ہوتے ہیں لہٰذا اس کا پہلے معنیٰ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کی ایک حدیث میں ہے:

Marfat.com

" جو عبادت یا اطاعت تم سے رات کو چھوٹ جائے اس کی دن میں قضا کرلیا کرو، کیونکہ خداوندِ عالم فرماتا ہے : وھوالذی جعل الیل والنھار خلفۃ لمن اراد ان یذکر او اراد شکورًا یعنی انسان اپنے رات کے چھوٹے ہوئے فرائض کو دن میں اور دن کے چھوٹے ہوئے فرائض کو رات کے وقت بجالائے [1]

اسی طرح کی روایت فخرالدین رازی نے بھی حضرتِ رسول پاک صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے نقل کی ہے۔

---

[1] تفسیر نورالثقلین جلد ۲ اسی آیت کے ذیل میں بحوالہ "من لا یحضرہ الفقیہ"۔

Marfat.com

۶۳۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○

۶۴۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا ○

۶۵۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ○

۶۶۔ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّ مُقَامًا ○

۶۷۔ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○

ترجمہ

۶۳۔ خداوند رحمان کے خاص بندے وہ ہیں جو آرام سے اور بغیر تکبّر کے زمین پر چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ انھیں مخاطب کرتے ہیں تو وہ انھیں سلام کہتے ہیں (اور بے پرواہی اور بے نیازی کے ساتھ گزر جاتے ہیں)۔

۶۴۔ وہ، وہ لوگ ہیں جو رات کے وقت اپنے پروردگار کے حضور سجدہ اور قیام کرتے ہیں۔

۶۵۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں اے پروردگار! ہم سے عذابِ جہنم کو دور فرما، کیونکہ اس کا عذاب سخت اور دائمی ہے۔

۶۶۔ وہ بُرا ٹھکانا اور بُری قیام گاہ ہے۔

۶۷۔ (خدا کے خاص بندے) وہ ہیں کہ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی تنگ دلی بلکہ ان دونوں کے درمیان حدِ اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

خدا کے خاص بندوں کی صفات

ان آیات کے بعد "عباد الرحمٰن" کے عنوان کے تحت خداوند عالم کے خاص بندوں کی خاص خاص صفات کے بارے میں دلچسپ اور جامع گفتگو کی جارہی ہے۔ جو درحقیقت گزشتہ آیات کی تکمیل کررہی ہے کہ جب ہٹ دھرم مشرکین کے سامنے خداوند رحمان کا نام لیا جاتا تو وہ تمسخر اور استہزاء کے طور پر کہتے کہ "رحمان کیا چیز ہے"؟ اور ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآن مجید نے دو آیات میں انھیں خداوند رحمان کا تعارف کروایا ہے۔

اس مقام پر خداوند رحمان کے خاص بندوں کا ذکر ہے اور رحمان کے ان خاص بندوں کا تعارف کروایا جارہا ہے اور جب اس کے بندے اس قدر عالی اور باعظمت مقام کے مالک ہیں تو خدائے رحمٰن کس قدر عظمت کا مالک ہوگا؟ اس طرح سے اس کی عظمت کو بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔

یہ آیات ان کی بارہ صفات بیان کررہی ہیں جن میں سے کچھ کا تعلق تو عقائد سے ہے اور کچھ کا اخلاق سے۔ بعض کا تعلق معاشرتی صفات سے ہے اور بعض کا انفرادی سے۔ غرضیکہ مجموعی طور پر وہ اعلیٰ انسانی خصوصیات کا پیکر ہیں۔

پہلے فرمایا گیا ہے: خدا کے خاص بندے وہ ہیں جو آرام سے اور تکبر کے بغیر زمین پر چلتے ہیں (وعباد الرحمٰن الذین یمشون علی الارض ھونا)[1]۔

"عباد الرحمٰن" کی یہ جو سب سے پہلی صفت بیان کی گئی ہے درحقیقت وہ انسان کے تمام اعمال و کردار میں تکبر، غرور اور خود خواہی کی نفی ہے حتیٰ کہ زمین پر چلنے میں بھی یہ ناپسندیدہ صفات ان سے ظاہر نہیں ہوتیں۔ کیونکہ اخلاقی صفات خود بخود انسان کے اعمال، گفتار اور حرکات سے ظاہر ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ کسی شخص کی چال ڈھال سے اس کی بہت سی اخلاقی صفات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جی ہاں! وہ متواضع ہیں اور تواضع وانکساری ایمان کی چابی ہے جبکہ غرور اور تکبر کفر کی چابی ہوتی ہے ہم نے روزمرہ کی زندگی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قرآنی آیات میں متعدد بار پڑھا ہے کہ مغرور اور متکبر لوگ اس بات کے بھی روادار نہیں تھے کہ خدائی رہبروں کی باتوں کو سن ہی لیں وہ حقائق کا منہ چڑا کر ان کا تمسخر اڑاتے۔ جو لوگ صرف خود کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں ان کے لیے ایمان لانا ممکن نہیں۔

لیکن یہ خدائے رحمٰن کے مومن بندے ہی ہیں جن کی بندگی کی سب سے پہلی علامت تواضع اور فروتنی ہے وہ اس قدر متواضع ہیں

---

[1] "ھونا" مصدر ہے جس کا معنی ہے نرمی، آہستگی اور تکبر نہ کرنا اور یہاں پر مصدر کو اسم فاعل کے معنی میں تاکید کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی رحمٰن کے بندے ایسے ہیں گویا بذات خود وہ نرمی اور تکبر کی نفی ہیں۔

Marfat.com

کہ تواضع ان کے بدن کے ہر حصے میں رچ بس چکی ہے یہاں تک کہ ان کے چلنے پھرنے میں بھی انکساری پائی جاتی ہے۔

اگر ہم دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم ذیل کا اہم حکم اپنے پیغمبر کو دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ تواضع ایمان کی جان ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے:۔

ولا تمش فی الارض مرحًا انك لن تخرق الارض ولن تبلغ الجبال طولًا

زمین پر اکڑ کر اور غرور و تکبر کے ساتھ مت چلو کیونکہ نہ تو زمین کو تم شگافتہ کر سکتے ہو اور نہ ہی تمھارے قد کی لمبائی پہاڑوں تک پہنچ سکتی ہے۔ (بنی اسرائیل ——— ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان اپنے اور کائنات کے بارے میں تھوڑی سی بھی معلومات رکھتا ہو تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ اس قدر عظیم کائنات کے مقابلے میں کس قدر حقیر اور ناچیز ہے؟ حتیٰ کہ اگر اس کی گردن پہاڑوں جتنی اونچی ہو جائے پھر بھی وہ زمین کے برابر نہیں ہو سکتی کیونکہ دنیا کے اونچے سے اونچے پہاڑ بھی زمین کی عظمت کے سامنے ایسے ہیں جیسے مالٹے کی نسبت اس کا چھلکا ہوتا ہے جبکہ اس عظیم کہکشاں کے مقابلے میں زمین کی حیثیت ایک ناچیز ذرے کی سی ہے۔

تو کیا اس حالت میں انسان کا تکبر اور غرور اس کی مطلق جہالت اور نادانی کی دلیل نہیں؟

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک لائق توجہ حدیث ہے کہ آنحضرتؐ ایک کوچہ سے گزر رہے تھے آپؐ نے دیکھا کہ ایک جگہ کچھ لوگ اکٹھے ہیں آپؐ نے ان سے اس اجتماع کا سبب دریافت کیا تو لوگوں نے عرض کی جناب! یہاں ایک دیوانہ ہے جس نے اپنی دیوانگی اور مجنونانہ حرکات سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہوا ہے تو آپؐ نے سب لوگوں کو اپنی طرف بلا کر ارشاد فرمایا: "آیا چاہتے ہو کہ میں تمھیں حقیقی دیوانے سے متعارف کراؤں؟" سب لوگ خاموش ہو گئے اور ہمہ تن گوش ہو کر آپؐ کا ارشاد سننے لگے، آپؐ نے فرمایا:۔

المتبختر فی مشیه، الناظر فی عطفیه، المحرك جنبیه بمنکبیه الذی لا یرجی خیره و لا یؤمن شر، فذلك المجنون و هذا مبتلی

جو غرور کی بناء پر مٹک مٹک کر چلتا ہے بار بار دائیں بائیں دیکھتا ہے پہلو اور کولہوں کو مٹکا مٹکا کر قدم اٹھاتا ہے (اپنے علاوہ کسی پر اس کی نگاہ نہیں اٹھتی، اپنے سوا کسی کے بارے میں سوچتا نہیں) لوگوں کو جس سے خیر کی امید نہ ہو، اس کی برائی سے محفوظ نہ ہوں، وہ ہوتا ہے حقیقی دیوانہ۔ رہا یہ شخص تو یہ بیچارہ بیمار ہے (دیوانہ نہیں)۔

"عباد الرحمٰن" کی دوسری صفت حلم اور بردباری ہے جیسا کہ قرآن مجید اسی آیت میں آگے چل کر کہتا ہے: جب جاہل لوگ انھیں مخاطب کرتے ہیں اور اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے ناشائستہ باتیں کرتے ہیں تو وہ جواب میں انھیں "سلام" کہتے ہیں۔ (واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلامًا)۔

ایسا سلام جو بے پروائی اور بزرگواری پر مشتمل ہوتا ہے نہ کہ کمزوری پر۔

ایسا سلام جو جاہلوں اور نادانوں کے ساتھ عدم مقابلہ کی دلیل ہوتا ہے۔

Marfat.com

ایسا سلام جوان کی بے مقصد باتوں کے جواب میں خاموشی پر مبنی ہوتا ہے ۔
ایسا سلام نہیں جو محبت اور دوستی کی علامت ہوتا ہے ۔
المختصر ایسا سلام جو حلم و بردباری اور عظمت و بزرگواری کی علامت ہوتا ہے ۔
ہاں تو ان کی باعظمت روحانی صفات میں سے ایک صفت تحمل اور حوصلہ ہے جس کے بغیر کوئی بھی انسان خداوند عالم کی عبودیت اور بندگی کے نشیب و فراز پر مشتمل دشوار گزار راستہ طے نہیں کر سکتا۔ خاص کر ایسے معاشروں میں جہاں فاسد اور مفسد، جاہل اور نادان افراد کی فراوانی ہو ۔

دوسری آیت میں ان "عباد الرحمٰن" کی تیسری صفت بیان کی گئی ہے اور وہ ہے خداوند عالم کی خالص عبادت، ارشاد ہوتا ہے:
وہ ایسے لوگ ہیں جو رات کے وقت اپنے پروردگار کے حضور سجدہ اور قیام کرتے ہیں (والذین یبیتون لربھم سجدًا و قیامًا)۔
رات کی تاریکی میں جبکہ غافلوں کی آنکھیں سوئی ہوتی ہیں، ظاہرداری اور ریاکاری کا کوئی موقع نہیں ہوتا میٹھی نیند کو اپنے اوپر حرام کرکے اس سے بھی شیریں چیز یعنی ذکرِ خدا، قیام اور اس کی باعظمت بارگاہ میں سجدہ کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ رات کا کچھ حصہ اپنے محبوب کے ساتھ راز و نیاز اور مناجات میں گزار دیتے ہیں اور اپنے قلب و روح کو اس کی یاد اور نام سے منور کرتے ہیں۔
اگرچہ "یبیتون" کا لفظ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ساری رات سجدے اور قیام میں گزار دیتے ہیں لیکن واضح ہے کہ اس سے مراد رات کا ایک بڑا حصہ ہے اور اگر تمام رات مراد ہو تو ایسا اتفاق کبھی ہو جاتا ہے ۔
اس ضمن میں یہ بھی بتاتے چلیں کہ "سجود" کو "قیام" پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی اہمیت ہے اگرچہ نماز میں عملی طور پر قیام مقدم ہوتا ہے [1]
ان بندگانِ خدا کی چوتھی صفت عذابِ الٰہی سے خوف ہے "وہ ایسے لوگ ہیں جو ہمیشہ کہتے رہتے ہیں پروردگارا! ہم سے جہنم کا عذاب دُور رکھ کیونکہ اس کا عذاب سخت اور دائمی ہے" (والذین یقولون ربنا اصرف عنا عذاب جھنم ان عذابھا کان غرامًا)۔
"کیونکہ جہنم بُرا ٹھکانا اور بدترین اقامت گاہ ہے" (انھا ساءت مستقرًا و مقامًا)۔
باوجودیکہ وہ لوگ رات کو عبادتِ خدا میں مشغول ہوتے ہیں اور دن کے وقت اپنے فرائض انجام دیتے رہتے ہیں پھر بھی ان کے دل احساسِ ذمہ داری کی بناء پر خوفِ خدا سے معمور رہتے ہیں اور یہ خوف ایسا ہوتا ہے جس سے فریضے کی ادائیگی بہتر اور مؤثر انداز میں ہوتی ہے ۔
وہ ایسا خوف ہوتا ہے جو ایک طاقتور پولیس کی مانند باطن سے انسان کو کنٹرول کرتا ہے چنانچہ اس خوف کی وجہ سے انسان کسی نگران کے بغیر اپنے فرائض احسن طور پر انجام دیتا رہتا ہے اور پھر بھی اپنے آپ کو بارگاہِ رب العزت میں قصوروار سمجھتا ہے ۔
"غرام" دراصل ایسی مصیبت اور سخت پریشانی کے معنی میں آتا ہے جس سے چھٹکارا مشکل ہوتا ہے اگر قرض خواہ کو

---

[1] توجہ رہے کہ "سُجّد" "ساجد" کی جمع ہے اور "قیام" "قائم" کی۔

Marfat.com

"غریم" کہتے ہیں تو اس کی وجہ بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مقروض سے چمٹا رہتا ہے اس عشق اور قلبی تعلق کو بھی "غرام" کہتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کسی کام یا کسی چیز کے پیچھے لگا رہتا ہے اور جہنم کے لیے اس لفظ کا اطلاق اس لیے ہوتا ہے کہ اس کا عذاب سخت، مسلسل اور دائمی ہوتا ہے۔

"مستقر" اور "مقام" کا فرق شاید اس وجہ سے ہے کہ جہنم کفار کے لیے ہمیشہ کی اقامت گاہ (مقام) ہے اور مومنین کے لیے محدود عرصے کے لیے رہائش گاہ (مستقر) ہے۔ اس طرح سے دونوں قسم کے لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو جہنم میں وارد ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ دوزخ برا ٹھکانا اور بد ترین اقامت گاہ ہے، کہاں جلانے والی آگ اور کہاں آرام و اطمینان اور سکون؟ کہاں قاتل شعلے اور کہاں آرام و آسائش؟

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "مستقر" اور "مقام" دونوں کا ایک ہی معنی ہو جو دوزخ کے عذاب کے دوام اور ہمیشگی پر تاکیدی حیثیت رکھتا ہے ٹھیک بہشت کے مقابل جس کے بارے میں ہم انھی آیات میں پڑھیں گے کہ:

خالدین فیھا حسنت مستقرًا ومقامًا

مومنین ہمیشہ بہشتی محلات میں رہیں گے کیا بہترین ٹھکانا اور کیسی شاندار اقامت گاہ ہوگی۔

(فرقان ـــــ ۷۶)

زیر بحث آیات میں سے آخری آیت میں "عباد الرحمٰن" کی پانچویں صفت بتائی جا رہی ہے جو اعتدال پر مبنی اور ہر کام میں ہر قسم کے افراط و تفریط سے دُوری ہے خاص کر خرچ کرنے کے معاملے میں اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: خدا کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے وقت نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی سختی سے کام لیتے ہیں بلکہ ان دونوں حالتوں کے درمیان حدِ اعتدال قائم کرتے ہیں (والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذٰلک قوامًا)۔

قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن بذاتہٖ خرچ کرنے کو تسلیم کرتا ہے اور تسلیم بھی اس حد تک کہ اس کے ذکر کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتا کیونکہ انفاق ہر انسان کا حتمی فریضہ ہے لہٰذا گفتگو میں خدا کے بندوں کے انفاق کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان کا انفاق بھی اعتدال کی حد تک ہوتا ہے جس میں نہ تو فضول خرچی ہوتی ہے اور نہ سخت گیری۔ نہ تو اس قدر خرچ کر ڈالتے ہیں کہ خود ان کے بیوی بچے بھوکے رہ جانے ہوں اور نہ ہی اس قدر سختی سے کام لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی بخشش سے محروم رہ جاتے ہوں۔

"اسراف" اور "اقتار" جو ایک دوسرے کے متضاد ہیں کی تفسیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ان سب کی بحث کا نتیجہ نکلتا ہے کہ "اسراف" یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو حد سے زیادہ اور ناحق و بے جا خرچ کیا جائے اور "اقتار" یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کو اپنے حق اور ضروری مقدار سے کم خرچ کیا جائے۔

لے "غریم" قرض خواہ کو بھی کہتے ہیں اور مقروض کو بھی۔ (لسان العرب مادۂ غرم)۔

Marfat.com

ایک روایت میں اسراف، اقتار اور اعتدال کے لیے بہترین اور دلکش تشبیہ بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ :۔

ایک مرتبہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اس آیت کی تلاوت فرمائی اور زمین سے ایک مٹھی میں سنگریزے لیے اور پھر مٹھی کو خوب بند کر لیا اور فرمایا یہ "اقتار" ہے پھر ایک اور مٹھی میں سنگریزے لیے اور ہاتھ کو اس قدر کھول دیا کہ تمام سنگریزے ہاتھ سے جاتے رہے فرمایا: اسے اسراف کہتے ہیں اور تیسری مرتبہ مٹھی میں سنگریزے لیے اور تھوڑا سا اسے کھولا جس سے کچھ تو زمین پر آگرے اور کچھ ہاتھ میں باقی رہ گئے، فرمایا یہ "قوام" ہے[1]

"قوام" ("عوام" کے وزن پر) کا لفظ لغت میں عدالت، استقامت اور کسی چیز کی حد وسط کے معنی میں ہے اور "قوام" ("کتاب" کے وزن پر) کا لفظ اس چیز کے معنی میں ہے جو قیام اور استقرار کی وجہ بنتی ہے۔

چند ایک نکات

ا۔ مومنین کی رفتار: مندرجہ بالا آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ خدا کے خاص بندوں کی علامات میں سے ایک علامت "تواضع" بھی ہے ایسی تواضع جو ان کی روح پر بھی حکمران ہو حتیٰ کہ چلتے وقت ان کی رفتار سے بھی ظاہر ہو۔ ایسی تواضع جو انھیں حق کے سامنے سر جھکا دینے پر آمادہ کرے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر تواضع کو کمزوری، ناتوانی، سستی اور کاہلی سے تعبیر کریں جو یقیناً خطرناک طرز فکر ہو گی۔

چلنے میں تواضع کا مقصد یہ نہیں کہ قدم ڈھیلے اور سست اٹھائے جائیں بلکہ تواضع کے ساتھ اس انداز سے محکم قدم اٹھائے جائیں کہ جس سے مستقل مزاجی اور طاقت کا اظہار ہوتا ہو۔ حضرت رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح میں ہے کہ ایک صحابی کہتے ہیں :۔

ما رأیت احدا اسرع فی مشیته من رسول الله کانما الارض تطوی له وانا لنجهد انفسنا وانه لغیر مکترث

میں نے چلنے میں پیغمبر خدا سے زیادہ تیز رفتار نہیں دیکھا گویا زمین آپ کے قدموں میں لپٹی جاتی تھی اور ہم مشکل سے اپنے آپ کو آنحضرتؐ کے ساتھ چلاتے تھے حالانکہ آنجناب کو اس کی قطعاً پرواہ بھی نہیں ہوتی تھی[2]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام "الذین یمشون علی الارض هونا" کی تفسیر کے بارے میں فرماتے ہیں :۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۹ بحوالہ اصول کافی۔

[2] فی ظلال القرآن مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں۔ تفسیر قرطبی میں بھی اس بارے میں ایک اور روایت مذکور ہے جو اسی روایت کے مشابہ ہے۔

Marfat.com

والرجل یمشی بسجیته التی جبل علیها، لایتکلف ولا یتبختر

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان فطری طریقے پر قدم اٹھائے جس میں نہ تو تکلیف ہو اور نہ ہی تکبر۔[1]

سرکار رسالت مآبؐ کے حالات میں ہے کہ:

قد کان یتکفأ فی مشیه کانما یمشی فی صبب

جب آپ چلتے تھے تو جلد بازی کے اظہار کے بغیر تیز تیز قدم اٹھاتے اس طرح سے کہ گویا ڈھلوان کی طرف جارہے ہوں۔[2]

بہرحال جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ فقط چلنے کی کیفیت کے بارے میں بحث نہیں ہے بلکہ اس سے کسی انسان کے حالاتِ زندگی پر بہت حد تک روشنی پڑتی ہے اور یہ آیت درحقیقت عبادِ رحمٰن کی روح اور بدن میں تواضع اور فروتنی کی تاثیر کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ بخل اور فضول خرچی: اس میں شک نہیں کہ بخل اور فضول خرچی قرآن اور اسلام کی رُو سے ایک نہایت مذموم عمل ہے جس کی آیات اور روایات میں زبردست مذمت کی گئی ہے کیونکہ "اسراف" ایک فرعونی طرز عمل ہے، قرآن کہتا ہے:

وان فرعون لعال فی الارض و انه لمن المسرفین (یونس: ۸۳)

اسراف کرنے والے جہنمی ہیں، ملاحظہ ہو:

وان المسرفین هم اصحاب النار (مؤمن: ۴۳)

آجکل کی تحقیقات سے جو بات ثابت ہو چکی ہے اگر اسے مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ زمین کے وسائل انسانی آبادی کی نسبت اس قدر زیادہ نہیں ہیں کہ انھیں اللّوں تللّوں میں ضائع کر دیا جائے۔ کیونکہ اس کا اثر دوسرے بے گناہ لوگوں پر پڑتا ہے اور ساتھ ہی اسراف میں عموماً خود خواہی، خود پسندی اور خلقِ خدا سے بیگانگی کا عنصر بھی نمایاں ہوتا ہے۔

جبکہ بخل اور خسیس پن بھی اسی قدر بُری اور ناپسندیدہ عادت ہے۔ اصولی طور پر اگر توحیدی نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر چیز کا اصلی مالک خداوند متعال ہے اور ہم سب صرف اس کی دی ہوئی امانت کے امین ہیں اور اس کی اجازت کے بغیر ہمیں کسی قسم کے تصرف اور عمل دخل کا کوئی حق حاصل نہیں اور معلوم ہو کہ اس نے نہ تو فضول خرچی کی اجازت دی ہے اور نہ ہی بخل اور کنجوسی کی۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان، مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں۔

[2] تفسیر روح المعانی اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

۶۸۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ
يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝
۶۹ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝
۷۰۔ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝
۷۱۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۝

ترجمہ

۶۸۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے اور جس کا خون اللہ نے حرام کردیا ہے اس انسان کو ناحق قتل نہیں کرتے اور زنا نہیں کرتے اور جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا بھی دیکھ لے گا۔

۶۹۔ ایسے شخص کا عذاب قیامت میں دگنا ہوگا اور اس میں ذلت اور خواری کے ساتھ ہمیشہ رہے گا۔

۷۰۔ لیکن جو شخص توبہ کرے اور ایمان لے آئے اور عمل صالح انجام دے تو خداوند عالم ایسے لوگوں کے گناہوں کو نیکیوں میں بدل دے گا اور خداوند عالم بخشنے والا اور مہربان ہے۔

۷۱۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل بجالائے تو اس کی بازگشت خدا کی طرف ہوگی (اور وہ اپنی جزا اسی سے پائے گا)۔

تفسیر

"عباد الرحمٰن" کی کچھ اور صفات

"عباد الرحمٰن" کی چھٹی خصوصی صفت توحید پر ان کا خالص ایمان ہے جو انھیں دو یا کئی چیزوں کی پرستش پر مبنی شرک سے دُور رکھتا ہے، چنانچہ قرآن فرماتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو نہیں پکارتے (و الذین لا

Marfat.com

یدعون مع اللہ الھا آخر)۔

توحید نے ان کے قلب اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو روشن کر رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے روح و فکر کے آسمان عظمت سے شرک کی ہر قسم کی تاریکی کافور ہو چکی ہے۔

ساتویں صفت یہ ہے کہ عباد الرحمن بے گناہوں کے خون میں اپنے ہاتھ نہیں رنگتے اور کسی ایسے انسان کو ناحق قتل نہیں کرتے جس کا خون اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے (و لا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق)[1]

اس آیت سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر تمام انسانی نفوس قابلِ احترام ہیں اور ان کا خون بہانا ممنوع ہے مگر یہ کہ کچھ ایسے عوامل پیدا ہو جائیں جن سے یہ احترام ثانوی حیثیت اختیار کر جائے اور خون بہانا جائز ہو جائے۔

ان کی آٹھویں صفت یہ ہے کہ ان کا دامانِ عفت گناہ سے آلودہ نہیں ہوتا اور وہ زنا نہیں کرتے (و لا یزنون)۔

اگر وہ کفر و ایمان کے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں تو ایمان کا انتخاب کرتے ہیں اور اگر جانوں کے لیے امن اور بدامنی کا سوال درپیش ہو تو امن کا انتخاب کرتے ہیں اگر پاکیزگی اور آلودگی کی بات ہو تو پاکیزگی اختیار کرتے ہیں وہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیتے ہیں جو ہر قسم کے شرک، بدامنی، بے عفتی اور آلودگی سے صاف اور پاک ہوتا ہے۔

اسی آیت کے ذیل میں اس بات پر زور دے کر فرمایا گیا ہے: جو شخص ان امور میں سے کسی ایک کو انجام دے تو وہ اپنی سزا اور انجام دیکھ لے گا (و من یفعل ذلک یلق اثاما)۔

"اثم" اور "اثام" دراصل ان اعمال کو کہتے ہیں جو انسان کو ثواب تک پہنچنے نہیں دیتے۔ بعد ازاں اس لفظ کا ہر قسم کے گناہ پر اطلاق ہونے لگا لیکن اس مقام پر گناہ کی سزا کے معنی میں ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "اثم" کا معنی ہے "گناہ" اور "اثام" کا معنی ہے "گناہ کی سزا"۔[2]

اگر بعض مفسرین نے اس کا معنی جہنم میں بیابان یا پہاڑ یا کنوئیں کیا ہے تو یہ اس کا ایک واضح مصداق بیان کیا گیا ہے۔

زنا کی حرمت کے فلسفے میں تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ میں سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۲ کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں سب سے پہلے شرک، پھر قتلِ نفس اور اس کے بعد کے بارے میں گفتگو ہوئی ہے۔ بعض روایات کے مطابق ان تینوں گناہوں کی بالترتیب وہی اہمیت ہے جو آیت میں آئی ہے۔

ابن مسعود روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں عرض کیا:

ای الذنب اعظم؟ قال ان تجعل للہ ندا و ھو خلقک، قال قلت ثم ای؟

قال ان تقتل ولدک مخافۃ ان یطعم معک، قال قلت ثم ای؟ قال ان تزانی

---

[1] مندرجہ بالا جملے میں اصطلاحی طور پر "استثنائے مفرغ" ہے جس کی تقدیر یوں ہے: "و لا یقتلون النفس التی حرم اللہ بسبب من الاسباب الا بالحق"۔

[2] تفسیر فخر رازی اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

حلیلۃ جارک. فانزل اللہ تصدیقھا و الذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر۔ الیٰ اٰخر الآیۃ

سب گناہوں سے بڑھ کر کون سا گناہ ہے؟

آپؐ نے فرمایا:

یہ کہ تم خدا کا شریک ٹھہراؤ جبکہ اس نے تجھے پیدا کیا ہے۔

عرض کیا اس کے بعد؟

فرمایا یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس لیے قتل کر ڈالو کہ تمھارے کھانے میں شریک ہو جائے گی۔

عرض کیا اس کے بعد؟

فرمایا یہ کہ اپنے ہمسایے کی بیوی سے بدکاری کرو۔

اس موقع پر خدا نے اپنے پیغمبرؐ کی تصدیق کے طور پر یہ آیت نازل کر دی (والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اٰخر........)۔[1]

اگر چہ اس حدیث میں قتل اور زنا کی خاص قسموں کا ذکر آیا ہے لیکن اگر مفہوم کے اطلاق پر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ قتل اور زنا کی تمام اقسام کے بارے میں ہے اور روایت میں ان کا واضح مصداق بیان ہوا ہے۔

چونکہ یہ تینوں گناہ زبردست اہمیت کے حامل ہیں لہٰذا بعد والی آیت میں بھی انھیں کے بارے میں زور دیا گیا ہے کہ جو لوگ ان گناہوں کا ارتکاب کریں گے قیامت کے دن ان کا عذاب دگنا ہو گا اور بڑی ذلت اور خواری کے ساتھ عذاب میں ہمیشہ کے لیے گرفتار رہیں گے (یضاعف لہ العذاب یوم القیامۃ و یخلد فیہ مھانًا)۔

اس جگہ پر دو سوال پیش آتے ہیں ایک تو یہ کہ آخر ان لوگوں کا عذاب دگنا کیوں ہو گا اور گناہ کے برابر انھیں سزا کیوں نہیں ملے گی اور آیا یہ بات عدلِ الٰہی سے مطابقت رکھتی ہے؟

دوسرے یہ کہ یہاں پر ہمیشہ کے عذاب کی گفتگو ہو رہی ہے جبکہ ہمیشگی صرف کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور آیت میں جو تین گناہ ذکر ہوئے ہیں ان میں سے صرف ایک یعنی پہلا گناہ کفر ہے لیکن قتلِ نفس اور زنا تو خلود کا سبب نہیں بن سکتے۔

پہلے سوال کے جواب کے بارے میں مفسرین نے بہت بحث کی ہے اور جو جواب سب سے زیادہ صحیح نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ عذاب کے دگنا ہونے سے مراد یہ ہے کہ آیت میں مذکور ان تینوں گناہوں کی سزائیں علیحدہ علیحدہ ہوں گی جو مجموعی صورت میں دگنی بن جائیں گی۔

اس سے قطع نظر یہ بات بھی ہے کہ بسا اوقات ایک گناہ کئی دوسرے گناہوں کا سرچشمہ بن جاتا ہے مثلاً کفر ہی کو لے لیجیے کہ ایک گناہ ہے لیکن یہی گناہ واجبات کے ترک اور محرمات کے انجام دینے کا سبب بن جاتا ہے اور یہی چیز خداوندِ عالم کی سزا کے دوگنا ہونے کا سبب بن جاتی ہے۔

اسی لیے تو بعض مفسرین نے اس آیت کو اس مشہور مسئلے پر دلیل سمجھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "جس طرح کفار اصولِ دین کے لیے

---

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں، بحوالہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔

Marfat.com

مکلف ہیں اسی طرح فروعِ دین کے لیے بھی مکلف ہیں :

الکفار مکلفون بالفروع کما انھم مکلفون بالاصول

دوسرے سوال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ بعض گناہ اس قدر سخت ہوتے ہیں کہ اس دنیا سے بے ایمان ہو کر مرنے کا سبب بن جاتے ہیں جیسا کہ ہم قتلِ نفس کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۴ سورہ نساء کی آیت ۹۲ میں بیان کر چکے ہیں ۔

زنا خاص طور پر جب محصنہ (شوہردار عورت) کے ساتھ ہو تو ممکن ہے کہ وہ بے ایمان ہونے کا سبب بن جائے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ مندرجہ بالا آیت میں مذکور دائمی عذاب ان لوگوں کے لیے ہو جو مذکورہ تینوں گناہوں کا باہم ارتکاب کریں شرک کا بھی ، قتلِ نفس اور زنا کا بھی اور اس بات کی گواہ بعد والی آیت ہے جس میں کہا گیا ہے :۔

الا من تاب و اٰمن وعمل عملاً صالحًا

مگر وہ شخص جو توبہ کرے ، ایمان لے آئے اور عملِ صالح بجا لائے ۔

تو اس طرح سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا ۔

بعض مفسرین نے یہاں پر ہمیشگی کو ایک لمبی مدت کے معنی میں لیا ہے نہ کہ ہمیشہ کی مدت کے معنی میں ۔ لیکن پہلی اور دوسری تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ۔

یہاں پر ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ اس آیت میں معمول کی سزا کے علاوہ ایک دوسری سزا کا ذکر بھی ہے اور وہ ہے ان گناہ گاروں کی تحقیر اور توہین جو ایک طرح کی باطنی سزا ہے اور یہ سزا کے دگنا ہونے کی تفسیر بھی ہو سکتی ہے کیونکہ انھیں جسمانی عذاب بھی دیا جائے گا اور روحانی عذاب بھی ۔

چونکہ قرآن مجید نے مجرمین کے لیے واپس آجانے کا راستہ بند نہیں کیا اور گناہگاروں کو توبہ کی تشویق کرتا ہے اور دعوت دیتا ہے لہٰذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے : مگر جو شخص توبہ کرے ، ایمان لے آئے اور اعمالِ صالح بجا لائے تو خداوندِ عالم اس کے گناہوں کو بخش دے گا اور ان کے بُرے اعمال کو نیک اعمال میں تبدیل کر دے گا اور خداوندِ عالم بخشنے والا اور مہربان ہے (الا من تاب و اٰمن وعمل عملاً صالحًا فاولٰئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات وکان اللہ غفورًا رحیمًا) ۔

جیسا کہ ابھی گزشتہ آیت میں گناہانِ کبیرہ میں سے تین گناہوں کا ذکر ہوا ہے اور ان گناہوں کے مرتکب افراد کے لیے توبہ کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہر نادم اور پشیمان انسان ، توبہ کے دروازے سے اپنے خالق اور مالک کے حضور لوٹ سکتا ہے بشرطیکہ اس کی توبہ حقیقی ہو اور جیسا کہ آیت میں بیان ہوا ہے ، اس کی علامت عملِ صالح ہے جس سے گناہوں کی تلافی کی جا سکتی ہے ورنہ صرف زبان سے استغفار یا دل میں لمحہ بھر کی پشیمانی اور پھر وہی سابقہ حالت یہ توبہ کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتی ۔

اس بارے میں اہم اور قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم ان کے "سیئات" کو "حسنات" میں کیونکر تبدیل کرتا ہے ؟

Marfat.com

سیئات کی حسنات میں تبدیلی

اس کے بارے میں چند ایک تفسیریں ہیں جو سب کی سب ماننے کے قابل ہیں۔

۱۔ جب انسان توبہ کرتا ہے اور خدا پر ایمان لے آتا ہے تو اس کے پورے وجود میں ایک گہری تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور اس اندرونی انقلاب اور تبدیلی کی وجہ سے اس کے بُرے اعمال مستقبل میں نیک اعمال میں تبدیل ہو جاتے ہیں اگر اس نے ماضی میں کسی کو قتل کیا تھا تو اب (حقیقی توبہ کی وجہ سے) مظلوم کا دفاع اور ظالم سے جنگ اس کی جگہ لے لیتی ہے اگر سابق میں وہ زانی اور بدکار تھا تو اب وہ پاکدامن بن جائے گا اور یہ خدائی توفیق اسے ایمان اور توبہ کی بدولت حاصل ہو گی۔

۲۔ دوسری یہ کہ خداوندِ عالم اپنی مہربانی، فضل اور احسان کی وجہ سے توبہ کے بعد اس کے تمام بُرے اعمال کو مٹا کر نیک اعمال کو ان کی جگہ دے دے گا جیسا کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ:

بروزِ قیامت ایک شخص کو لایا جائے گا اور خداوندِ عالم حکم دے گا کہ اس کے صغیرہ گناہوں کو اس کے سامنے پیش کیا جائے اور کبیرہ کو چھپایا جائے اور پھر اس سے کہا جائے گا کہ تو نے فلاں فلاں دن فلاں فلاں صغیرہ گناہ کیا تھا اور وہ اس کا اعتراف کرے گا لیکن اس کا دل کبیرہ گناہوں کے خوف کی وجہ سے کانپ رہا ہو گا۔

اس مقام پر خداوندعالم اپنی مہربانی کی وجہ سے حکم دے گا کہ اسے ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی دی جائے۔ وہ شخص عرض کرے گا خداوندا! میں نے تو بڑے بڑے گناہ کیے تھے جنھیں یہاں پر میں نہیں دیکھ رہا ہوں۔

ابوذرؓ کہتے ہیں کہ اس موقع پر آنحضرتؐ یوں مسکرائے کہ آپ کے مبارک دانتوں کی سفیدی نمودار ہو گئی اور آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فاولئک یبدل اللہ سیئاتھم حسنات[1]۔

۳۔ تیسری تفسیر یہ ہے کہ "سیئات" سے مراد انسان کے خود اعمال نہیں ہیں جنھیں وہ انجام دیتا ہے بلکہ اس سے مراد ان اعمال کے بُرے اثرات ہیں جو انسان کے جسم اور روح پر چھا جاتے ہیں اور جب وہ توبہ کرتا ہے تو وہ بُرے اثرات دور ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ اچھے اثرات لے لیتے ہیں۔

البتہ ان تینوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں بلکہ ممکن ہے کہ تینوں کی تینوں ایک مفہوم میں جمع ہوں۔

بعد والی آیت صحیح توبہ کی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتی ہے جو شخص توبہ کر کے اعمالِ صالح بجا لاتا ہے وہ اپنے رب کی طرف لوٹ جائے گا (اور اسی سے اپنی جزا پائے گا) (ومن تاب وعمل صالحاً فانہ یتوب الی اللہ متاباً)[2]۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۲۲۔

[2] "متاب" مصدر میمی اور توبہ کے معنی میں ہے چونکہ یہاں مفعول مطلق ہے لہذا تاکید کے معنی دے رہا ہے۔

Marfat.com

یعنی توبہ اور گناہوں کا ترک کرنا صرف اس وجہ سے نہ ہو کہ گناہ بُری چیز ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کی نیت خلوص اور خوفِ خدا پر مبنی ہو۔

بنابریں (بطور مثال) شراب نوشی یا دروغ گوئی کو اس وجہ سے ترک کر دینا کہ یہ بُری چیزیں ہیں اگرچہ ایک اچھی بات ہے لیکن اس کی حقیقی قدر و قیمت اس وقت ہوگی جب یہ کام صرف اور صرف خدا کی خوشنودی کے لیے کیا جائے۔

بعض مفسّرین نے مذکورہ بالا آیت کی ایک اور تفسیر بیان کی ہے جو یہ ہے:

یہ آیت دراصل اس تعجب خیز سوال کا جواب ہے جو کبھی کبھار کچھ ذہنوں میں اٹھتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ خداوندعالم برائیوں کو نیکیوں میں تبدیل کر دے گا تو یہ آیت اس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ جب انسان اپنے رب کی طرف لوٹ جائے تو یہ امر باعثِ تعجب نہیں۔

اس سلسلے میں ایک تیسری تفسیر بھی ہے اور وہ یہ کہ جو شخص گناہوں سے توبہ کرتا ہے وہ خدا اور بے حد وحساب اجر کی طرف لوٹ جاتا ہے۔

اگرچہ ان تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے خاص طور پر وہ اس روایت سے زیادہ ہم آہنگ ہے جسے علی بن ابراہیم نے اسی آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے۔

Marfat.com

۷۲. وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ ۙ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ۝

۷۳. وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ۝

۷۴. وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ۝

۷۵. أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا ۙ ۝

۷۶. خَالِدِينَ فِيهَا ۚ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ۝

ترجمہ

۷۲. وہ ایسے لوگ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے (اور باطل کی محفلوں میں شرکت نہیں کرتے) اور جب لغو اور بے ہودہ باتوں سے ان کا گزر ہوتا ہے تو وہ بڑے وقار سے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔

۷۲. وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب پروردگار کی آیات سنتے ہیں تو بہرے اور اندھے بن کر ان پر گر نہیں پڑتے۔

۷۴. وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں پروردگارا! ہماری بیویوں اور اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا اور ہمیں متقی اور پرہیزگار لوگوں کا پیشوا بنا۔

۷۵. یہی وہ لوگ ہیں جنھیں صبر و شکیبائی کے بدلے بہشتِ بریں کے بلند درجات عطا ہوں گے اور انھیں وہاں پر تحیہ اور سلام پیش کیا جائے گا۔

۷۶. وہ بہشت میں ہمیشہ رہیں گے کیا خوب ٹھکانا اور کیسی عالی شان اقامت گاہ ہے۔

Marfat.com

تفسیر

عباد الرحمٰن کی جزا

گزشتہ آیات میں رحمان کے خاص بندوں کی کچھ خصوصیات بیان کی گئی تھیں زیر نظر آیات میں ان کی بقیہ خصوصیات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے۔

ان (عباد الرحمٰن) کی نویں اہم صفت دوسروں کے حقوق کا احترام اور ان حقوق کی حفاظت ہے" وہ ایسے لوگ ہیں جو کبھی بھی جھوٹی گواہی نہیں دیتے" (والذین لا یشھدون الزور)۔

بزرگ مفسرین نے اس آیت کی دو طرح سے تفسیر کی ہے۔

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں بعض مفسرین نے "شہادتِ زور" کو "جھوٹی گواہی" کے معنی میں لیا ہے۔ کیونکہ لغت میں "زور" کا معنی انحراف اور پھرنا ہے اور چونکہ جھوٹ، باطل اور ظلم کا تعلق بھی انحرافی امور سے ہوتا ہے لہٰذا انھیں "زور" کہتے ہیں۔

شہادتِ زور (یعنی جھوٹی گواہی) کی تعبیر ہماری فقہ کی کتاب شہادت میں اسی عنوان سے موجود ہے اور بہت سی روایات میں جھوٹی گواہی سے منع کیا گیا ہے لیکن ان روایات میں اس آیت سے استدلال کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "شہود" سے مراد حاضر اور موجود ہونا ہے لیکن خدا کے خاص بندے لغو، باطل اور بے ہودہ محفلوں میں حاضر اور موجود نہیں ہوتے۔

اہلِ بیت اطہار علیہم السلام سے منقول بعض روایات میں "زور" کو "غناء کی محفل" سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی ایسی محفل جہاں گانے گائے جائیں خواہ آلاتِ موسیقی کے ساتھ یا ان کے بغیر۔

اس میں بھی شک نہیں کہ اس قسم کی روایات کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ "زور" کے وسیع مفہوم کو صرف "غناء" تک محدود کر دیں بلکہ غناء بھی اس کے بہت سے مصادیق میں سے ایک ہے اور اس کے مفہوم میں لہو و لعب، شراب نوشی، جھوٹ اور غیبت وغیرہ کی محفلیں بھی شامل ہیں۔

یہ احتمال بھی بعید نہیں ہے کہ آیت کے معنی میں دونوں تفسیریں جمع ہوں اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ خدا کے خاص بندے نہ تو جھوٹی گواہی دیتے ہیں اور نہ ہی لہو و لعب، باطل اور گناہ کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں کیونکہ ایسی محافل میں شرکت گناہ کی تائید کرنے کے علاوہ قلب اور روح کی آلودگی کے اسباب بھی فراہم کرتی ہے۔

پھر اسی آیت کے ذیل میں خدا کے خاص بندوں کی دسویں اہم صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جب وہ لغو اور بے ہودہ کاموں کو دیکھتے ہیں تو وقار کے ساتھ وہاں سے گزر جاتے ہیں (واذا مروا باللغو مروا کراما)۔

درحقیقت نہ تو وہ کسی باطل اور لغو محفل میں شرکت کرتے ہیں اور نہ ہی لغو اور بے ہودہ چیزوں میں خود کو ملوث کرتے ہیں۔

Marfat.com

"لغو" کے معنیٰ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا اطلاق ہر اس کام پر ہوتا ہے جس کا کوئی معقول ہدف نہ ہو اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ خدا کے یہ خاص بندے اپنی زندگی میں ہمیشہ معقول، مفید اور تعمیری کام انجام دیتے ہیں۔ بیہودہ کاموں اور بے ہودہ لوگوں سے متنفر ہوتے ہیں اور اگر کبھی ایسا اتفاق ہوجائے کہ انھیں کسی قسم کی بے ہودہ باتوں کا سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ بڑی بے اعتنائی کے ساتھ وہاں سے گزر جاتے ہیں اور یہ بے نیازی اور بے اعتنائی اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ وہ باطنی طور پر ایسے کاموں سے متنفر ہیں وہ اس قدر باعظمت اور باکردار لوگ ہیں کہ ماحول کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ ماحول کے رنگ میں رنگے جا سکتے ہیں۔

اس میں بھی شک نہیں کہ ایسے غلیظ ماحول سے اس طرح کی بے اعتنائی اسی صورت میں ہوگی جب بدکاری سے مقابلے اور نہی عن المنکر کے لیے اس سے بہتر چارہ نہ رہ گیا ہو ورنہ کسی شک و شبہ کے بغیر وہ مردانہ وار ڈٹ جاتے ہیں اور اپنے شرعی فریضے کو آخری مرحلے تک سرانجام دیتے ہیں۔

خدا کے خاص بندوں کی ایک اور صفت یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور یاد کے موقع پر چشم بینا اور گوش شنوا کے مالک ہوتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب انھیں ان کے پروردگار کی آیات یاد دلائی جاتی ہیں تو وہ بہرے اور اندھے بن کر ان پر گر نہیں پڑتے (والذین اذا ذکروا بأیات ربهم لم یخروا علیها صمًّا وعمیانًا)۔

مسلّم بات یہ ہے کہ اس سے کفار کے عمل کی طرف اشارہ کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ وہ تو آیاتِ الٰہی کی قطعاً پرواہ ہی نہیں کرتے بلکہ یا تو منافق ٹولے کی طرف اشارہ مقصود ہے یا پھر سطحی مسلمانوں کی طرف جو کانوں اور آنکھوں کو بند کرکے آیاتِ الٰہی پر گر پڑتے ہیں یعنی ان کی حقیقت کو سمجھتے نہیں اور نہ ہی ان کی تہ تک پہنچتے ہیں اور خدا کے مقصود اور مطلوب کو جانے بغیر، ان آیات میں غور و فکر کیے بغیر اور اپنے اعمال میں ان آیات سے درس لیے بغیر ان پر گر پڑتے ہیں۔

راہِ خدا کو آنکھیں اور کان بند کرکے طے نہیں کیا جا سکتا سب سے پہلے اس راستے کو طے کرنے کے لیے سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ کی ضرورت ہے۔ ایسی آنکھ جو باطن کو دیکھ سکتی ہو اور گہرائیوں تک پہنچ سکتی ہو اور ایسا کان جو حساس اور نکتہ شناس ہو۔ اگر خوب غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آنکھ اور کان بند کرکے آیاتِ الٰہی پر گر پڑنے والے لوگوں کا نقصان ان دشمنوں سے کم نہیں جو جان بوجھ کر دینِ حق کی بنیادوں پر کاری ضربیں لگاتے ہیں بلکہ کئی درجے زیادہ ہوتا ہے۔

اصولی طور پر بات یہ ہے کہ مذہب سے سچی آشنائی کی وجہ سے ہی پائیداری، مستقل مزاجی کے ساتھ حوادثات کے مقابلے اور مذہب کے لیے ڈٹ جانے کا درس ملتا ہے کیونکہ جو لوگ آنکھ اور کان بند کیے دین یا مذہب کی باتوں کو قبول کر لیتے ہیں انھیں جلد ہی دھوکا دے کر ورغلایا جا سکتا ہے اور مذہب کی تحریف کرکے انھیں مذہب کے صحیح راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے اور آسانی سے کفر، بے ایمانی اور گمراہی کی طرف دھکیلا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے لوگ دشمن کے آلۂ کار اور شیطان کا بہترین شکار ہیں، صرف گہری نظر رکھنے والے، دوراندیش اور صاحبانِ بصیرت و بصارت مومنین ہی پہاڑ کی مانند ڈٹ جاتے ہیں اور ہر ایسے ویسے کو اہمیت نہیں دیتے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس آیت کی تفسیر کے بارے میں سوال کیا گیا تو امامؑ نے فرمایا:

Marfat.com

مستبصرين ليسوا بشكاك
اس سے مراد یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر اپنا قدم آگے بڑھاتے ہیں نہ کہ شک و شبہ کے ساتھ [1]

ان سچے مومنین کی بارہویں خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال اور افرادِ خاندان کی تربیت پر خاص توجہ رکھتے ہیں اور اس امر کے بارے میں اپنے آپ کو جوابدہ سمجھتے ہیں وہ ہمیشہ خدا سے یہی دعا کرتے ہیں کہ پروردگارا ! ہماری بیویوں اور اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا (والذین یقولون ربنا ھب لنا من ازواجنا و ذریاتنا قرة اعین)۔

ظاہر ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر دعا کرتے ہیں بلکہ یہ دعا تو ان کے اندرونی جذبوں کی دلیل اور سعی و کوشش کی علامت ہے۔

مسلّم ہے ایسے لوگ جتنا بھی ان کے بس میں ہوتا ہے اولاد اور ازواج کی تربیت، انھیں اسلام کے اصول و فروع سے مطلع کرنے اور حق و عدالت کی راہ دکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے اور جس چیز تک ان کی رسائی نہیں ہوسکتی، اس کا اپنے مالک سے سوال کرتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں بلکہ اصولی طور پر ہر صحیح دعا کو ایسا ہی ہونا چاہیے کہ پہلے تو تا حدِ امکان کوشش کرنا چاہیے اور جہاں بس نہ چل سکتا ہو اس کے لیے دعا کرنا چاہیے۔

" قرة عين " عربی کلمہ ہے جس کا متبادل لفظ فارسی میں " نور چشم " (آنکھوں کی ٹھنڈک) ہے اور یہ اس شخص کے لیے کنایہ ہے جو کسی کے لیے مسرت اور خوشی کا سبب بنتا ہے اور یہ تعبیر دراصل لفظ " قر " (بروزن "حُر") سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ سردی اور خنکی ہوتا ہے اور ایک مشہور و معروف محاورہ بھی ہے (جس کی بہت سے مفسرین نے صراحت بھی کی ہے) کہ محبت کے آنسو ہمیشہ ٹھنڈے اور رنج و غم کے اشک ہمیشہ گرم ہوا کرتے ہیں لہٰذا " قرة العین " ایسی چیز کو کہیں گے جس سے انسان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، یہ جو محاورہ ہے کہ " محبت کے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں " تو یہ خوشی اور سرور کے لیے ایک بہترین کنایہ ہے [2]

اولاد کی تربیت، ازواج کی ہدایت و راہنمائی اور بچوں کے لیے ماں باپ کا فریضہ ایسے اہم ترین مسائل ہیں قرآن نے جن پر بہت زیادہ زور دیا ہے ہم ان مسائل کو انشاءاللہ العزیز سورۂ تحریم کی آیت ۶ کی تشریح میں بیان کریں گے۔

آخر میں خدا کے ان خالص بندوں کی تیرہویں نمایاں صفت کو بیان فرمایا گیا ہے جو درحقیقت ایک لحاظ سے مذکورہ تمام اوصاف میں سے اہم تر ہے اور وہ یہ کہ وہ صرف اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ خود ہی حق کی راہ پر گامزن رہیں بلکہ ان کی ہمت اس قدر والا اور بالا ہے کہ وہ خدا سے خود کو مومنین کی جماعت کا امام اور پیشوا بنانے کی درخواست کر رہے ہیں تاکہ اس طرح سے وہ دوسرے

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۴۲۔

[2] اس بات کا شاہد عرب کے ایک شاعر کا شعر ہے جسے قرطبی نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کیا ہے :

فکم سخنت بالامس عین قریرة   وقرت عیون دمعها الیوم ساکب

کل ٹھنڈی آنکھیں گرم ہو گئیں لیکن آج پھر وہی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں کہ جن سے آنسو جاری ہیں۔

Marfat.com

لوگوں کو بھی راہِ حق و حقیقت کی طرف بلا سکیں۔
وہ ایک گوشہ نشین عابد اور زاہد کی مانند نہیں ہیں جو صرف اپنی پاکیٔ داماں کے لیے کوشاں رہتا ہے بلکہ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی راہِ نجات پر لے آئیں۔
لہٰذا اسی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خداوندا! تو ہمیں پرہیزگار لوگوں کا امام اور پیشوا بنا (واجعلنا للمتقین اماماً)۔
ایک بار پھر توجہ مبذول فرمائیں اور اس نکتے پر غور کریں کہ وہ صرف دعا پر اکتفا نہیں کرتے کہ اپنے اسلاف پر نازاں ہو کر باتیں ہی بناتے رہیں نہیں بلکہ اپنے لیے بزرگواری، عظمت اور امامت کے ایسے اسباب فراہم کرتے ہیں کہ ایک سچے اور برحق پیشوا کی عمدہ صفات ان میں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ کام بہت مشکل اور نہایت ہی سنگین ہوتا ہے۔
آپ یقیناً نہیں بھولے ہوں گے کہ یہ آیات تمام مومنین کی صفات بیان نہیں کر رہیں بلکہ مومنین کے ایک ممتاز گروہ کے اوصاف بیان کر رہی ہیں جو مومنین کی اگلی صفوں میں ہوتے ہیں جنھیں "عباد الرحمٰن" کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے۔
یقیناً وہ خدا کے خاص بندے ہوتے ہیں جس طرح خدا کی عمومی رحمت تمام بندگانِ خدا کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوتی ہے خدا کے ان خاص بندوں کی مہربانی اور رحمدلی ایک لحاظ سے عمومی ہوتی ہے، ان کا علم و فکر، بیان و قلم، مال و قدرت ہمیشہ خلقِ خدا کی ہدایت کے کام آتی ہے۔
وہ انسانی معاشرے کے لیے اسوہ اور نمونۂ عمل ہوتے ہیں۔
وہ پرہیزگاروں کے سرخیل شمار ہوتے ہیں۔
وہ سمندروں اور صحراؤں میں چراغ کی مانند ہوتے ہیں جن سے بھٹکی ہوئی انسانیت ہدایت پا جاتی ہے اور گرداب بلا میں پھنس جانے والے چھٹکارا حاصل کر جاتے ہیں۔
متعدد روایات میں ہے کہ یہ آیت حضرت علی اور اہلبیت اطہار علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ایک روایت میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
اس آیت سے مراد ہم ہیں[1]
اس میں شک نہیں کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام اس آیت کے روشن مصداق ہیں اور یہ مصداق آیت کے مفہوم کی اس وسعت میں مانع نہیں ہے کہ دوسرے مومن بھی مختلف مراتب کے تحت دوسرے لوگوں کے پیشوا ہوں۔
بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ استفادہ کیا ہے کہ معنوی، روحانی اور خدائی رہبری اور پیشوائی کی درخواست نہ صرف مذموم نہیں بلکہ ممدوح اور پسندیدہ بھی ہے[2]

---

[1] ان روایات کو علی بن ابراہیم اور صاحب "نور الثقلین" نے اپنی اپنی تفسیروں میں اسی آیت کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو تفسیر قرطبی اور تفسیر فخر رازی۔

Marfat.com

یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ لفظ "امام" اگرچہ مفرد ہے لیکن بعض اوقات جمع کے معنیٰ میں بھی آتا ہے اور اس آیت میں بھی ایسا ہی ہے۔

ان تیرہ صفات کو مکمل کرنے کے بعد اللہ کے ان خاص بندوں کی مجموعی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مختصر لفظوں میں ان کا اجر بیان فرمایا گیا ہے: یہی وہ لوگ ہیں جنھیں صبر و استقامت کے بدلے میں بہشت کے بلند درجات جزا کے طور پر دیئے جائیں گے (اولئك یجزون الغرفة بما صبروا)۔

"غرفة" "غرف" (بروزن "حرف") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کا اٹھانا اور حاصل کرنا ہوتا ہے اور غرفة اس چیز کو کہتے ہیں جسے اٹھائیں اور حاصل کریں (جیسے انسان پینے کے لیے چشمہ سے پانی حاصل کرتا ہے)۔ بعدازاں اس کا اطلاق عمارت کے بالائی حصے پر ہونے لگا اور اس آیت میں بہشت بریں کے بلند و بالا درجات کے لیے کنایہ ہے۔

چونکہ "عباد الرحمٰن" دنیا میں ان صفات کے حامل ہونے کی بنا پر مومنین کی اگلی صفوں میں اور ان کے پیش پیش ہوتے ہیں لہٰذا آخرت میں بھی بہشت میں ان کے درجات دیگر مومنین سے بلند و بالا ہونے چاہئیں۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ انھیں یہ بلند درجات اس لیے عطا ہوں گے کہ وہ راہ خدا میں صبر و استقامت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ممکن ہے اس جگہ یہ سوال پیدا ہو کہ آیا صفت مذکورہ تیرہ صفات کے علاوہ ہے؟ لیکن حقیقت میں یہ کوئی نئی صفت نہیں بلکہ مذکورہ صفات کے نفاذ اور اجراء کی محافظ ہے آیا خدا کی بندگی، خواہشات نفس سے نبرد آزمائی، جھوٹی شہادت کے نزدیک نہ جانا، تواضع اور فروتنی کو اپنانا اور اس قسم کی دیگر صفات، صبر اور استقامت کے بغیر امکان پذیر ہیں؟

جب ہم یہاں پر پہنچتے ہیں تو ہمیں حضرت امیرالمومنین علی علیہ السلام کا یہ مشہور فرمان یاد آجاتا ہے کہ:

الصبر من الایمان کالرأس من الجسد

صبر و استقامت کو ایمان میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو سَر کو بدن میں ہوتا ہے۔

بدن کی بقا سر کی بقا پر منحصر ہے کیونکہ تمام اعضائے انسانی کا مرکزی نقطہ اس کا مغز ہوتا ہے جو سر میں واقع ہے۔

بنا بریں یہاں پر صبر کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔

مشکلات کے مقابلے میں استقامت اور شکیبائی،

پروردگارِ عالم کی اطاعت کی راہ،

سرکش اور منہ زور ہوا و ہوس اور خواہشات نفسانی کے ساتھ جہاد اور نبرد آزمائی،

گناہ کے اسباب و عوامل کے سامنے ڈٹ جانا،

غرض اس قسم کے تمام امور اس میں جمع ہیں۔

اگر بعض روایات میں صبر کا اطلاق صرف فقر و فاقہ پر ہوا ہے اور مالی محرومی سے اس کی تفسیر کی گئی ہے تو یقیناً اس کا ایک یہ مصداق بیان ہوا ہے۔

پھر اضافہ فرمایا گیا ہے: بہشت کے ان بلند مقامات پر انھیں تحیہ اور سلام پیش کیا جائیگا (و یلقون فیھا تحیة و سلامًا)۔

Marfat.com

اہل بہشت، وہاں پر ایک دوسرے کو سلام اور تحیہ پیش کریں گے اور فرشتے بھی ان کا سلام و تحیہ سے استقبال کریں گے اور ان سے بڑھ کر خود خدا انھیں سلام اور تحیہ کہے گا۔ جیسا کہ سورۂ یٰسٓ کی آیت ۵۸ میں ہے:

سلام قولا من رب رحیم

ان کے لیے ان کے رحیم پروردگار کی طرف سے سلام ہے۔

سورۂ رعد کی آیت ۲۲، ۲۴ میں ہے:

والملائکة یدخلون علیهم من کل باب سلام علیکم

فرشتے ان کے پاس ہر در سے داخل ہوں گے اور انھیں "سلام علیکم" کہیں گے۔

آیا اس مقام پر "تحیت" اور "سلام" کا ایک معنیٰ ہے یا مختلف معانی؛ مفسرین نے اس بارے میں مختلف آراء کا اظہار کیا ہے لیکن اگر ان میں ذرا سی توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ "تحیت" کسی کو زندگی کی دعا دینے کے معنیٰ میں ہوتا ہے اور "سلام" کسی کو سلامتی کی دعا دینے کے معنیٰ میں ہوتا ہے۔ بنا بریں اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں گے کہ پہلا لفظ "تحیت" زندگی کی دعا کے عنوان سے ہے اور دوسرا لفظ "سلام" زندگی کے ساتھ سلامتی کے لیے ہے ہر چند کہ یہ دونوں کبھی ایک معنیٰ میں بھی آتے ہیں۔

البتہ عرف میں "تحیت" نے زیادہ وسیع معنیٰ پیدا کر لیا ہے اور وہ ہے ہر ایسی گفتگو جو کسی جگہ پر کسی کے داخل ہوتے ہی خوشی، احترام اور اس کے اظہارِ محبت کے طور پر کی جاتی ہے۔

پھر اس بات کی مزید تاکید کے طور پر فرمایا گیا ہے: وہ بہشت میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ کیا ہی خوب ٹھکانا اور کیسی ہی بہترین اقامت گاہ ہے (خالدین فیها حسنت مستقرا و مقاما)۔

Marfat.com

،، قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُونُ لِزَامًا ۝

ترجمہ

،، کہہ دو: اگر تمھاری دعا نہ ہوتی تو میرا پروردگار تمھیں کوئی اہمیت نہ دیتا، تم نے (خدا اور انبیاء کی) تکذیب کی اور یہ (تکذیب) تمھارا دامن پکڑے گی اور تمھیں ہرگز نہ چھوڑے گی۔

تفسیر

دُعا کی اہمیت

یہ آیت سورۂ فرقان کی آخری آیت ہے جو درحقیقت تمام سورت کا خلاصہ اور نتیجہ ہے، ساتھ ہی "عبادالرحمٰن" کی صفات کا خلاصہ بھی ہے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: ان سے کہہ دے کہ میرا پروردگار تمھیں کوئی وزن اور اہمیت نہ دیتا اگر تم دعا نہیں کرتے (قل مایعبؤا بکم ربی لولا دعاؤکم)۔

"یعبؤا" کا صیغہ "عبأ" (بروزن "عبد") سے مشتق ہے جس کا معنیٰ وزن اور بوجھ ہے بنا بریں "لا یعبؤا" کا معنی بنے گا "کسی قسم کا وزن نہیں دیتا" جسے دوسرے لفظوں میں کہیں گے "پرواہ نہیں کرتا، اہمیت نہیں دیتا"۔ اگرچہ دعا کے معنیٰ کے سلسلے میں یہاں پر بہت سے احتمالات پائے جاتے ہیں لیکن ان کی بنیاد ایک ہی بنتی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ دعا کا معنیٰ وہی مشہور دُعا ہے جو مانگی جاتی ہے بعض نے اسے ایمان کے معنیٰ میں لیا ہے اور بعض نے عبادت، بعض نے توحید، بعض نے شکر اور بعض نے مشکلات میں خدا کو پکارنے کے معنیٰ میں لیا ہے لیکن ان سب کی بنیاد وہی خدا پر ایمان اور اس کی طرف توجہ ہے۔

بنا بریں آیت کا مفہوم کچھ یوں ہوگا کہ جو چیز تمھیں وزن دے رہی ہے اور اللہ رب العزت کی بارگاہ میں تمھاری قدر و قیمت بنا رہی ہے وہ خدا پر ایمان، اس کی ذات کی طرف توجہ اور اس کی بندگی ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے: تم نے خدا کی آیات اور اس کے پیغمبروں کی تکذیب کی یہی تکذیب تمھارا دامن پکڑے گی اور تمھیں کبھی نہیں چھوڑے گی (فقد کذبتم فسوف یکون لزامًا)۔

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ اس آیت کے آغاز اور اختتام میں تضاد پایا جاتا ہے یا کم از کم ابتداء اور انتہا میں کوئی باہمی رابطہ دکھائی نہیں دیتا لیکن اگر ذرا سا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل مقصد یہ ہے تم گزشتہ زمانے میں آیات الٰہی کی تکذیب کر چکے ہو اور انبیاء کو جھٹلا چکے ہو۔ اگر اب تم خدا کی طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے اور ایمان اور بندگی کا راستہ اختیار نہیں کرو گے تو خدا کے

Marfat.com

نزدیک تمھاری کوئی وقعت اور حیثیت نہیں ہوگی اور تمھارے جھٹلانے کی سزا تمھیں دامن گیر ہوگی[۱]

ان واضح شواہد میں سے ایک شاہد جو اس تفسیر کی تائید کر رہا ہے حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی ایک حدیث ہے کہ جب آنجناب سے سوال کیا گیا کہ:

كثرة القرائة افضل او كثرة الدعاء

قرآن مجید کی کثرت سے تلاوت افضل ہے یا کثرت سے دعا مانگنا؟

تو آپ نے ارشاد فرمایا:

كثرة الدعاء افضل

کثرت سے دعا مانگنا فضیلت زیادہ رکھتا ہے۔

پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی[۲]

ایک نکتہ

دعا، خودسازی اور خداشناسی کا راستہ

ہر کوئی جانتا ہے کہ مسئلہ دعا کو قرآنی آیات اور اسلامی روایات میں بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے جس کا ایک نمونہ یہی مندرجہ بالا آیت ہے۔ ہو سکتا ہے ابتداء میں یہ بات بعض لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہو اور وہ کہیں کہ دعا کرنا تو آسان سی بات ہے اور اسے ہر شخص

---

[۱] مندرجہ بالا آیت ان آیات میں شمار ہوتی ہے جن کے بارے میں مفسرین نے بہت کچھ گفتگو کی ہے اور ہم نے جو تفسیر اوپر بیان کی ہے وہ واضح ترین تفسیر ہے لیکن کچھ دوسرے مشہور مفسرین نے اس کی اور بھی تفسیریں بیان کی ہیں جن کا خلاصہ کچھ اس طرح بنتا ہے:۔

خدا کو تمھاری کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ تم نے اس کی آیات کو جھٹلایا ہے مگر یہ کہ وہ انھیں ایمان کی طرف بلاتا ہے (اس تفسیر کے مطابق مصدر کو مفعول کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور اس کا فاعل ایک ضمیر ہے جو "ربی" کی طرف لوٹ رہی ہے لیکن جس تفسیر کو ہم نے منتخب کیا ہے اس کے مطابق مصدر کو فاعل کی طرف مضاف کیا گیا ہے اور مصدر کو سہل کی ضمیر کی طرف بظاہر مضاف کیا جاتا ہے مگر یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ پایا جائے)۔

یہاں پر ایک تیسری تفسیر بھی بیان کی گئی ہے اور وہ یہ کہ اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ تم بنی نوعِ انسان نے غالب طور پر تکذیب کا راستہ اختیار کر رکھا ہے لہٰذا خدا کے نزدیک تمھاری کوئی قدر و قیمت نہیں ہے سوائے عباد الرحمٰن کی ایک مخصوص اقلیت کے جو خدا کی طرف متوجہ ہیں اور اسے خلوصِ دل سے پکارتے ہیں (اگرچہ یہ تفسیر معنی اور مطلب کے لحاظ سے تو صحیح ہے لیکن آیت کے ظاہر کے ساتھ قطعاً ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ "دعاؤکم و کذبتم" میں ضمیر ظاہراً ایک گروہ کی طرف لوٹتی ہے نہ کہ دو گروہوں کی طرف۔ غور کیجیے گا)

[۲] "تفسیر صافی" اسی آیت کے ذیل میں۔ اس روایت کو تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ دوسری تفسیروں نے بھی نقل کیا ہے اس کے علاوہ اور روایات بھی ملتی ہیں جن میں سے بعض کو شیخ نے امالی میں اور بعض کو علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے۔

Marfat.com

انجام دے سکتا ہے یا اس سے بھی آگے بڑھ جائیں اور کہیں کہ دعا تو بے بس اور بیکار لوگوں کا کام ہے اس کی کیا اہمیت ہے۔

لیکن یہ غلط فہمی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دعا کو اس کی شرائط سے ہٹ کر دیکھیں لیکن اگر اس کی شرائط کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ دعا انسان کی خود سازی کا ایک مؤثر ذریعہ اور انسان اور خدا کے درمیان ایک مضبوط رابطہ ہے۔

سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ انسان جس کو پکار رہا ہے اور جس سے دعا مانگ رہا ہے اس کی معرفت رکھتا ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک صاف کرے اور اس سے مانگنے کے لیے اپنی روح کو آمادہ کرے کیونکہ جب انسان کسی کو ملنے جاتا ہے تو اس کی ملاقات کے لیے تیار بھی ہونا چاہیے۔

دعا کی تیسری شرط یہ ہے کہ انسان جس سے مانگ رہا ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے کیونکہ اس کے بغیر دعا کی قبولیت کے آثار بہت کم نظر آتے ہیں۔

دعا کی قبولیت کی چوتھی اور آخری شرط یہ ہے کہ اس کام کے لیے انسان اپنی تمام توانائیاں صرف کر دے اور اس کے لیے تاحدِ امکان سعی و کوشش کرے اور اس کے ماوراء کے لیے ہاتھوں کو دعا کے واسطے اٹھائے اور اپنی تمام قلبی توجہ اپنے خالق کی طرف مبذول کر دے۔

اسلامی روایات میں بڑی صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ جو کام انسان خود انجام دے سکتا ہے اسے انجام دینے میں کوتاہی کرے اور دعا کے ذریعے اسے پورا ہونے کی خواہش کرے تو اس کی دعا قبول نہیں ہوگی۔

اس لحاظ سے دعا، خداوندِ عالم کی معرفت اور اس کی صفات جلال و جمال کی پہچان کا ایک ذریعہ ہے اسی طرح گناہوں سے توبہ اور روح کی پاکیزگی کا بھی ایک ذریعہ ہے اور نیکیوں کی بجا آوری کے لیے ایک اہم اور مؤثر عامل ہے اور آخری حد تک تلاش و کوشش اور جدوجہد کا ایک سبب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دعا کے بارے میں ایسی اہم تعبیرات وارد ہوئی ہیں جو مندرجہ بالا تصریحات کو مدنظر رکھ کر ہی سمجھ میں آسکتی ہیں مثلاً حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

الدعاء سلاح المؤمن، وعمود الدين، و نور السمٰوٰت و الارض

دعا مومن کا ہتھیار، دین کا ستون اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے [1]

ایک اور مقام پر حضرت امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:

الدعاء مفاتيح النجاح ، و مقاليد الفلاح و خير الدعاء ما صدر عن صدر نقي وقلب تقي

دعا کامیابیوں کی دلیل ہے، فلاح اور کامرانیوں کی چابی ہے اور بہترین دعا وہ ہے جو پاک سینے

---

[1] اصول کافی جلد ۲ ابواب الدعا (باب ان الدعاء سلاح المؤمن)۔

Marfat.com

اور پرہیزگاروں سے بلند ہوئے[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں :

الدعاء انفذ من السنان

دعا نوکِ نیسنرہ سے بھی زیادہ تیز ہے[2]

ان سب باتوں سے ہٹ کر اصولی طور پر ہر انسان کی زندگی میں حوادث رونما ہوتے رہتے ہیں اور ظاہری اسباب کے لحاظ سے اسے نا امیدی کی گہرائیوں میں لے جاتے ہیں لیکن یہ دعا ہی ہے جو اس کی کامیابی کی امید کا دریچہ کھول سکتی ہے اور نا امیدی اور مایوسی سے نبرد آزمائی کا موثر ذریعہ بن سکتی ہے ۔

اسی وجہ سے سخت ترین اور طاقت فرسا حوادث کے درمیان دعا ہی انسان کی ڈھارس بندھا سکتی ہے اور اسے قلبی تسکین مہیا کر سکتی ہے اور نفسیاتی اعتبار سے ناقابلِ تردید اثر رکھتی ہے ۔

مسئلہ دعا ، اس کے فلسفہ ، اس کی شرائط اور نتائج کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل سُورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی ہے مزید تشریح اور وضاحت کے لیے وہاں رجوع فرمائیں ۔

پروردگارا ! ہمیں اپنے خاص بندوں میں سے قرار دے اور توفیق عنایت فرما کہ ہم " عباد الرحمٰن " کی صفات کو اپنا سکیں ۔

خداوندا ! دعا کے دروازے ہم پر کھول دے اور اسے ہمارے وجود کی قدر و قیمت کا سبب بنا دے ۔

خدایا ! ہمیں ایسی دعا کی توفیق عطا فرما جو تیری پاک ذات کو مطلوب ہے اور اس کی قبولیت سے ہمیں محروم نہ فرما ۔

انك على كل شيء قدير ، و بالاجابة جدير ۔

سُورۂ فرقان کی تفسیر اختتام کو پہنچی

۲۰ جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ

---

[1]، [2] اصولِ کافی جلد ۲ ، ابواب الدعاء (باب ان الدعاء سلاح المؤمن) ۔

Marfat.com

سورۂ شعراء

مکّہ میں نازل ہوئی (آخری چار آیتوں کے سوا)

اس کی ۲۲۷ آیتیں ہیں

Marfat.com

سُورۂ شعراء کے مندرجات

مفسرین کے درمیان یہ مشہور ہے کہ سُورۂ شعراء کی آخری چار آیات کے علاوہ باقی تمام سورت مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی کل ۲۲۷ آیتیں ہیں [۱]

اس سورت کا انداز گفتگو مکمل طور پر دوسری مکی سورتوں سے ہم آہنگ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ مکی سورتیں آغاز اسلام میں نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان کے مندرجات میں بیشتر اصولِ عقائد، توحید، معاد اور انبیاء خدا کی دعوت اور قرآن کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے سورہ شعراء کی تمام گفتگو بھی انھی مسائل پر مشتمل ہے۔

درحقیقت اس سورۃ کی تمام مباحث کو چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا حصہ، سورت کا مطلع ہے جس کا حروفِ مقطعات سے آغاز ہوتا ہے اس میں قرآن کی عظمت کا بیان ہوتا ہے اور پھر مشرکین کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی استقامت کی بناء پر آپؐ کو تسلی دی جا رہی ہے اس کے بعد توحید کی کچھ نشانیوں اور خدا کی کچھ صفات کے بارے میں گفتگو ہے۔

دوسرے حصے میں سات عظیم انبیاء کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات، اپنی قوم کے ساتھ ان کی نبرد آزمائی، مشرک لوگوں کی کج بحثی اور انبیاء علیہم السّلام کے مقابلے میں ان کی بے تکی باتوں کا تذکرہ شامل ہے۔ جن میں سے کچھ کا تذکرہ زیادہ تفصیل کے ساتھ ہے جیسے موسیٰؑ کی داستان ہے اور کچھ کا تذکرہ نہایت مختصر ہے جیسے حضرت ابراہیم، حضرت ہود، حضرت نوح، حضرت صالح حضرت لوطؑ اور شعیب علیہم السلام کے حالات ہیں۔

اس حصے میں خاص طور پر ان مشرکین کی کمزور اور تعصب آمیز منطق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا سلسلہ ہر نبی کے دور میں چلتا رہا ہے جس کا زیادہ تر حصہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دور کے مشرکین کی منطق سے ملتا جلتا ہے جو درحقیقت ابتدائی دور کے تھوڑے سے مسلمانوں کے لیے باعث تسلی ہے کہ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تاریخ اس قسم کے افراد اور اس طرح کی بودی منطق سے بھری پڑی ہے لہٰذا وہ اپنے عزائم میں کمزوری کو ہرگز پیدا نہ ہونے دیں۔

مذکورہ اقوام پر نازل ہونے والے عذاب کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے اور ان پر جو وحشت ناک بلائیں نازل ہوئی ہیں، ان کو بھی خصوصی طور پر ذکر کیا گیا ہے جو اس دور کے دشمنانِ رسول کے لیے ایک مؤثر تنبیہ ہے۔

تیسرے حصے میں درحقیقت گزشتہ دونوں حصوں میں بیان شدہ مطالب کو نتیجہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دعوت اسلامی کیسی ہے؟ قرآن کس قدر عظیم ہے؟ مشرکین نے آپؐ کی کیونکر تکذیب کی؟ دعوتِ اسلامی کے

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، تفسیر فخر رازی، تفسیر قرطبی اور تفسیر تبیان، تفسیر روح المعانی نے پانچ آیات کا استثناء کیا ہے لیکن علامہ طباطبائی جیسے مفسرین نے ان آیات کے استثناء کو قبول نہیں کیا۔ انشاء اللہ ہم انھی آیات کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

Marfat.com

سلسلے میں رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو کیسے احکام ملے اور مومنین سے کس طرح ملا جاتا ہے اور آخر میں صالح مومنین کو خوشخبری اور ظالم اور ستمگر لوگوں کو سخت تنبیہ کی گئی ہے اور اسی پر سُورہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس سورت کا نام اسی کی آخری چند آیات سے لیا گیا جن میں بے مقصد شعراء کے بارے میں گفتگو کی گئی۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورہ آیات کے لحاظ سے سُورۂ بقرہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے اگرچہ کلمات کی تعداد کے لحاظ سے ایسا نہیں ہے بلکہ بہت سی سورتوں سے چھوٹی ہے۔

سُورۂ شعراء کی فضیلت

اس سورت کی اہمیت کے بارے میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ایک حدیث ہے جس میں آپؐ فرماتے ہیں:

من قرء سورة شعراء كان له من الاجر عشر حسنات، بعدد كل من صدق بنوح و كذب به وهود وشعيب وصالح وابراهيم، وبعدد كل من كذب بعيسى وصدق بمحمد صلى الله عليه واله وسلم

جو شخص سُورۂ شعراء کو پڑھے اسے نوح (علیہ السّلام) کی تصدیق اور تکذیب کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں ملیں گی۔ اسی طرح ہود، شعیب، صالح اور ابراہیم (علیہم السلام) کی تصدیق یا تکذیب کرنے والوں کی تعداد سے دس گنا نیکیاں ملیں گی اور جتنی تعداد نے عیسیٰ (علیہ السلام) کی تکذیب اور محمد (مصطفیٰ) صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) کی تصدیق کی ہے[1] برابر نیکیاں ملیں گی۔

یہ تو صاف سی بات ہے کہ اتنا بڑا اجر اور ثواب فکر و عمل سے خالی تلاوت کا نہیں ہوگا بلکہ سورتوں کے فضائل پر مشتمل روایات کے قرائن بتاتے ہیں کہ اس سے ایسی تلاوت مراد ہے جو ایسے غور و فکر کا مقدمہ بنے جو ارادے اور عمل تک لے جائے سابقہ سورتوں کے فضائل کے سلسلے میں اس بات کو کئی مرتبہ بیان کیا گیا ہے۔

اتفاق سے مندرجہ بالا حدیث کی تعبیر بھی ہمارے اس مدعا کی موید ہے کیونکہ انبیاء کی تصدیق کرنے اور تکذیب کرنے والوں کی تعداد کے مطابق ثواب اور حسنات کا استحقاق اس لیے ہے تاکہ انسان ان لوگوں کی صف میں آجائے جنھوں نے انبیاء علیہم السّلام کی تصدیق کی اور ان لوگوں سے دوری اختیار کرے جنھوں نے تکذیب کی۔

---

[1] مجمع البیان، سُورۂ شعراء کا آغاز۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۱۔ طٰسٓمّٓ ○

۲۔ تِلۡكَ اٰیٰتُ الۡكِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ○

۳۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفۡسَكَ اَلَّا یَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ○

۴۔ اِنۡ نَّشَاۡ نُنَزِّلۡ عَلَیۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ اٰیَةً فَظَلَّتۡ اَعۡنَاقُهُمۡ لَهَا خٰضِعِیۡنَ ○

۵۔ وَ مَا یَاۡتِیۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ مُحۡدَثٍ اِلَّا كَانُوۡا عَنۡهُ مُعۡرِضِیۡنَ ○

۶۔ فَقَدۡ كَذَّبُوۡا فَسَیَاۡتِیۡهِمۡ اَنۡۢبٰٓؤُا مَا كَانُوۡا بِهٖ یَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ○

ترجمہ

۱۔ طسم

۲۔ یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں۔

۳۔ شاید اس غم میں تو اپنے آپ کو مار ڈالے گا کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔

۴۔ اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے آیت نازل کر دیں جس کے سامنے ان کی گردنیں جھک جائیں۔

۵۔ جو بھی نیا ذکر ان کے پاس، ان کے رب کی طرف سے آتا ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

۶۔ انھوں نے جھٹلایا لیکن بہت جلد اس چیز کی خبر بھی انھیں مل جائے گی جس کا وہ مذاق اڑاتے رہے ہیں (اس کی سزا پالیں گے)۔

Marfat.com

تفسیر

وہ ہر نئی چیز سے خوف کھاتے ہیں

ہم ایک دفعہ پھر قرآن کے ایک اور قسم کے حروفِ مقطعات کو ملاحظہ کر رہے ہیں وہ ہیں (طٰسٓمٓ)۔

اس قسم کے حروفِ مقطعات کی تفسیر میں ہم سورۂ بقرہ، سورۂ آلِ عمران اور سورۂ اعراف کے آغاز میں بالتفصیل اور جدا گانہ گفتگو کر چکے ہیں جسے یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہاں پر جس چیز کا اضافہ کیا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ "طٰسٓمٓ" کے بارے میں پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب سے متعدد روایات نقل ہوئی ہیں جو سب کی سب یہ بتا رہی ہیں کہ یہ خداوند تبارک و تعالیٰ یا قرآن مجید کے اسماء یا مقدس مقامات یا بہشت کے درخت وغیرہ کے ناموں کی علامتیں ہیں۔

یہ روایات اس تفسیر کی تائید کرتی ہیں جو ہم نے تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں سورۂ اعراف کے آغاز میں درج کی ہے اور اس تفسیر کے منافی بھی نہیں ہیں جو سورۂ بقرہ کے آغاز میں ذکر کی گئی ہے کہ ان حروف سے مراد قرآن کی عظمت اور اس کا اعجاز ہے کہ اس قدر عظیم کلام اس قدر سادہ اور چھوٹے سے حروف سے مرکب ہے۔

بعد والی آیت قرآنِ پاک کی عظمت کو ان الفاظ میں بیان کرتی ہے: یہ کتابِ مبین کی آیتیں ہیں (تلک اٰیات الکتاب المبین)۔

البتہ ادبیاتِ عرب کی رُو سے "تلک" کا اشارہ دُور کے لیے آتا ہے جس کا معنیٰ "وہ" ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں کہ کلامِ عرب اور بعض اوقات فارسی زبان میں بھی کسی چیز کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے دور کے اسم اشارہ سے استفادہ کرتے ہیں یعنی موضوع اس قدر اہم اور بلند مرتبہ ہے گویا ہماری دسترس سے باہر اور آسمان کی بلندیوں پر واقع ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہی آیت بعینہٖ اسی صورت میں سورۂ یوسف اور سورۂ قصص کے آغاز میں بھی آچکی ہے اور ہر جگہ حروفِ مقطعہ کے بعد آئی ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان حروف کا قرآن کی عظمت کے ساتھ گہرا ربط ہے۔

"قرآن" کی توصیف "مبین" کے ساتھ کی گئی ہے "مبین"، "بیان" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے "روشن" اور یہ قرآن مجید کی عظمت اور اعجاز کے واضح اور آشکار ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جتنا اس کے مطالب میں غور و فکر کرے گا اتنا ہی قرآن کے معجزہ ہونے سے آشنا ہوتا جائے گا۔

اس کے علاوہ قرآنِ مجید "حق" اور "باطل" میں تمیز کرنے والا اور سعادت، کامیابی اور نجات کے رستے کو گمراہی کے رستے سے جدا کرنے والا بھی ہے۔

اس کے بعد رسولِ پاکؐ کی دلجوئی اور تسلّی کے لیے قرآن فرماتا ہے: گویا تو شدتِ غم کی وجہ سے جان دے دے گا کہ وہ لوگ ایمان نہیں لاتے (لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین)۔

Marfat.com

"باخع" کا صیغہ "بخع" (بروزن "بخش") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے شدتِ غم کی وجہ سے اپنے آپ کو مار ڈالنا۔
اس بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کس حد تک لوگوں کے لیے دلسوز ہیں اور اپنی رسالت کے فریضے کی ادائیگی کے لیے کس قدر کوشاں ہیں؟ جب آپؐ دیکھتے تھے کہ وہ قرآن اور اسلام جیسے چشمۂ آبِ زلال کے کنارے پر پیاسے کھڑے ہوئے ہیں اور اس سے اپنی پیاس نہیں بجھاتے تو اس سے آپؐ کو کتنا دکھ ہوتا تھا؟
وہ اس بات سے مغموم تھے کہ قرآن و اسلام جیسے روشن چراغ کی موجودگی میں صاحبانِ عقل کیوں بے راہ روی کا شکار ہیں اور کیوں گمراہی کی گہرائیوں میں گر کر اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں۔
ویسے تو تمام انبیاء الٰہی اسی طرح غم خوار، ہمدرد اور دلسوز تھے لیکن اسلام کے عظیم پیغمبر تو ایسے واقعات پر بہت ہی غمگین تھے۔ چنانچہ آپؐ کے بارے میں کئی مقامات پر قرآن میں اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔
بعض مفسرین یہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا آیت کے نزول کا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار اہلِ مکہ کو دعوتِ اسلام دی لیکن انھوں نے آپؐ کی ایک نہ سنی اور ایمان نہیں لائے تو ایک مرتبہ آپؐ اس قدر غمگین اور پریشان ہو گئے کہ اس کے آثار آپؐ کے چہرہ مبارک پر ظاہر ہو گئے چنانچہ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی جس نے آپؐ کو تسلی دی اور آپؐ کی دلجوئی کی [1]
بعد والی آیت اس حقیقت کے ثابت کرنے کے لیے کہ خداوند عالم ہر چیز پر قادر ہے حتیٰ کہ وہ مجبور کر کے بھی لوگوں کو ایمان لانے پر آمادہ کر سکتا ہے فرمایا گیا ہے: اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی آیت نازل کر دیں جس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جائیں
(ان نشأ ننزل علیھم من السماء اٰیة فظلت اعناقھم لھا خاضعین)۔
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم اس قدر قدرت رکھتے ہیں کہ ان پر ایسا خیرہ کر دینے والا معجزہ یا زبردست اور وحشتناک عذاب نازل کر دیں کہ سب کے سب بے ساختہ اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں اور ایمان لے آئیں لیکن اس طرح کے ایمان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی بلکہ اس بات کو اہمیت حاصل ہے کہ وہ شعوری طور پر سوچ سمجھ کر اپنے ارادے اور اختیار سے ایمان لے آئیں اور حق کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں۔
اس بات کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ گردنوں کے جھکنے سے مراد گردن والوں کا جھکنا ہوتا ہے کیونکہ فارسی میں "گردن"، عربی میں "رقبہ" اور "عنق" کا اطلاق انسان کے ایک اہم ترین عضو پر ہوتا ہے جو کنایہ کی صورت میں خود انسان پر بھی بولا جاتا ہے جیسے باغی اور سرکش انسان کو فارسی میں "گردن کش"، جابر ظالم انسان کو "گردن کلفت" اور کمزور شخص کو "گردن شکستہ" کہتے ہیں۔
البتہ اس مقام پر "اعناق" کی تفسیر میں اور بھی کئی احتمال پیدا ہوتے ہیں جو سب کے سب ضعیف ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "اعناق" کا معنیٰ یا تو "سربراہ اور رؤساء" ہے اور یا لوگوں کا ایک گروہ ہے۔
آگے چل کر قرآن مجید کے مقابلے میں کفار اور مشرکین کے ردِ عمل کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: جو بھی نیا ذکر خداوند رحمان کی طرف سے ان کے پاس آتا ہے وہ اس سے منہ پھیر لیتے ہیں (وما یأتیھم من ذکر من الرحمان محدث الا کانوا

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۸، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

عنه معرضين) ۔

قرآن کو "ذکر" سے تعبیر کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مقدس کتاب اپنی تمام آیات اور سورتوں کے ساتھ بیدار اور آگاہ کرنے والی ہے لیکن یہ گروہ بیداری اور آگاہی سے دُور بھاگتا ہے ۔

" رحمان " کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیات اس خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں جس کی رحمت عام ہے اور کسی استثناء کے بغیر وہ تمام بنی نوعِ انسان کو سعادت اور کمال کی طرف دعوت دیتا ہے ۔

یہ بھی ممکن ہے کہ یہ انسانوں کی شکر گزاری کی حس بیدار کرنے کے لیے ہو کہ یہ آیات اس خدا کی طرف سے آئی ہیں جس کی نعمتیں تمھیں سر سے پاؤں تک ڈھانپے ہوئے ہیں تم کیوں اپنے ولی نعمت سے منہ موڑ رہے ہو ۔ اگر وہ تمھیں عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا تو یہ بھی اس کی رحمت کے باعث ہے ۔

" محدث " (نیا تازہ) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ آیات ایک دوسرے کے بعد نازل ہوتی رہتی ہیں اور ہر ایک کا کوئی نہ کوئی نیا مضمون ہی ہوتا ہے ۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ ان نئے حقائق سے موافقت نہیں کرتے گویا وہ اپنے بڑوں کی خرافات پر ڈٹے ہوئے ہیں اور جہالت ، گمراہی اور خرافات کو الوداع کہنے پر کسی قیمت پر راضی نہیں ۔ اصولاً ہوتا بھی یہی ہے کہ نئی بات خواہ کتنی ہی ہدایت کی موجب کیوں نہ ہو بے سمجھ ، متعصب اور ہٹ دھرم لوگ اس کی مخالفت ہی کرتے ہیں ۔

سورۂ مؤمنون کی آیت ۶۸ میں ہے :

افلم يدبروا القول ام جاءهم ما لم يأت اٰباءهم الاوّلين

آیا انھوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا یہ کہ آیات نئی ہیں جو ان کے بزرگوں کے پاس کبھی نہیں آئیں (اور نئی بات کہہ کر اس کے مقابلے کی تیاری شروع کر دیتے ہیں) ۔

قرآن آگے چل کر فرماتا ہے کہ وہ فقط روگردانی پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ " تکذیب " اور اس سے بڑھ کر " استہزاء " کی حد تک جا پہنچتے ہیں ارشاد ہوتا ہے : انھوں نے تکذیب کی ہے لیکن جو وہ استہزاء کرتے ہیں بہت جلد اس کی خبریں ان کے پاس آجائیں گی اور وہ اپنے کاموں کی دردناک جزا سے باخبر ہو جائیں گے (فقد كذبوا فسيأتيهم انبٰؤا ما كانوا به يستهزءون) ۔

" انباء " " نبأ " کی جمع ہے جس کا معنیٰ اہم خبر ہے یہاں پر ایسی سخت سزا مراد ہے جو انھیں اس دنیا میں اور آئندہ جہان میں ملے گی اگرچہ بعض مفسرین مثلاً شیخ طوسی نے اپنی تفسیر تبیان میں اس سزا کو آخرت کی سزا میں منحصر کیا ہے لیکن زیادہ تر مفسرین اسے مطلق سزا سمجھتے ہیں جس میں دونوں شامل ہیں ۔

درحقیقت ہے بھی ایسا ہی کیونکہ آیت میں اطلاق ہے اس کے علاوہ کفر اور آیاتِ الٰہی کے انکار کا انسان کی تمام زندگی میں عظیم اور وحشت ناک ردعمل ہوتا ہے لہٰذا اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا ۔

اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں غور و فکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان انحراف اور گمراہی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو دن بدن اس کا فاصلہ بڑھتا جاتا ہے اور وہ روز بروز حق و حقیقت سے دور ہوتا جاتا ہے ۔

Marfat.com

پہلے تو حق سے بے پروائی اور روگردانی کا مرحلہ آتا ہے، پھر تکذیب اور انکار کی نوبت آتی ہے آخر میں حق کے مذاق اڑانے کا مرحلہ آجاتا ہے جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان کو عذاب الٰہی گھیر لیتا ہے اس طرح سے وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ جاتا ہے (اس طرح کی تعبیر سورہ انعام کے آغاز میں آیت نمبر ۴ اور نمبر ۵ کی تفسیر میں بھی گذر چکی ہے)۔

چند ایک نکات

۱۔ ایمان آزادی کے ساتھ ہی سودمند ہوتا ہے

حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ کے ایک مشہور و معروف خطبہ میں اس حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ خداوند عالم نے انبیاء کرام کو اس طرح مبعوث فرمایا ہے کہ لوگ ایمان لانے کے لیے آزاد ہو کر فیصلہ کریں، وگرنہ ان کا ایمان مجبوری کی وجہ سے ہوگا جس کا ہرگز کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ ارشاد ہوتا ہے:

> انبیاء کو مبعوث کرتے وقت اگر خدا چاہتا تو خزانوں اور سونے کی کانوں کے منہ ان کے لیے کھول دیتا۔ سرسبز و شاداب باغات کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے جاتے۔ اگر چاہتا تو آسمانی پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ اور زمین کے وحشی جانوروں کے دل کے دل ان کے ہمراہ کر دیتا لیکن اس طرح سے ایک تو امتحان اور آزمائش کی بات ختم ہو جاتی اور دوسرے سزا اور جزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا۔[1]

کافی میں اسی آیت کے ضمن میں یوں درج ہے:

> اگر خدا چاہتا تو آسمان سے کوئی نشانی نازل کر دیتا جس کی وجہ سے ان کی گردنیں جھک جاتیں لیکن اگر ایسا ہوتا تو لوگوں کی آزمائش اور امتحان کا تصور بالکل ختم ہو کر رہ جاتا۔[2]

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ کتاب ارشاد از شیخ مفید، روضۃ الکافی، کمال الدین شیخ صدوق" اور تفسیر قمی جیسی مشہور و معروف کتابوں میں درج ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیت" ان نشأ ننزل .... کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے:[3]

> اس سے مراد بنی اُمیہ کے سرکش لوگ ہیں جب وہ امام مہدی آخرالزماں کے ظہور کے وقت آسمانی نشانیاں ملاحظہ کریں گے تو مجبوراً سر تسلیم خم کر دیں گے۔[3]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ (نمبر ۱۹۲)۔

[2] تفسیر نورالثقلین اسی آیت کے ذیل میں بحوالہ کافی۔

[3] تفسیر المیزان اور تفسیر نورالثقلین، انہی آیات کے ضمن میں۔

Marfat.com

واضح ہے کہ اس طرح کی روایت سے مراد آیت کے وسیع مفہوم کی وجہ سے اس کے کسی نہ کسی مصداق کا بیان ہوتا ہے کہ آخر کار عالمی حکومت کے سربراہ حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے وقت ظلم وجور پر مبنی ان تمام حکومتوں کا خاتمہ ہوجائے گا جو بنی امیہ کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے ، حضرت امام مہدیؑ کی طاقت اور انھیں حاصل تائید ایزدی کی وجہ سے مجبوراً ان کے آگے سر تسلیم خم کریں گے۔

۲۔ **کلام اللہ حادث ہے یا قدیم :** ہم جانتے ہیں کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں "کلام اللہ" کے حادث یا قدیم ہونے کے بارے میں لمبی چوڑی بحث عرصہ دراز تک چلتی رہی اور اس کی صدائے بازگشت کتب تفاسیر میں بھی سنائی دینے لگی اور کئی ایک مفسرین نے مندرجہ بالا آیت میں موجود لفظ "محدث" کے ذریعے اس کے حادث ہونے پر استدلال قائم کیا ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کرچکے ہیں کہ اس بحث کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہے بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے بنی امیہ اور بنی عباس کے خودسر زمامداران حکومت نے اپنی مطلق العنان حکومتوں کو دوام بخشنے کے لیے اس قسم کی بحثوں کا ڈھونگ رچایا تھا تاکہ اس طرح سے وہ مسلمان لوگوں کے افکار کو اہم ترین اسلامی مسائل پر غور وخوض کرنے سے منحرف کردیں اور لوگوں کو حکومت کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہ ملے انھوں نے یہ مسائل چھیڑے ہی اس لیے تھے تاکہ علمائے اسلام ایسے مسائل میں الجھے رہیں اور ان کی خودسر اور مطلق العنان حکومت چار دن اور چل جائے۔

اگر "کلام الٰہی" سے مراد اس کے موضوع اور مطالب ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ ازل ہی سے علم الٰہی میں تھے اور خدا ان سب سے واقف تھا اس لحاظ سے قدیم ہے اور اگر اس سے مراد وحی کا نزول اور قرآن کے حروف اور کلمات ہیں تو مسلّم ہے کہ حادث ہیں۔ بنا بریں کلام الٰہی پہلی صورت میں قدیم اور دوسری صورت میں حادث ہے اور اس میں نہ تو کسی کو شک وشبہ ہے اور نہ ہی مقام بحث ہے۔

اسی لیے عالم اسلام خاص کر علماء اور دانشور طبقہ اس سے خبردار اور ہوشیار رہیں اور جابر وآمر حکمرانوں کے ذریعے چھیڑی جانے والی کج بحثیوں میں ہرگز نہ الجھیں۔

Marfat.com

۷۔ اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَی الْاَرْضِ کَمْ اَنْبَتْنَا فِیْهَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ کَرِیْمٍ ○
۸۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ○
۹۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ○ ؏

ترجمہ

۷۔ آیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں اس میں مختلف قسم کی نباتات پیدا کی ہیں۔
۸۔ اس بات میں (خدا کے وجود پر) روشن نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ہرگز مومن نہیں۔
۹۔ تمھارا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

نباتات میں زوجیت

گزشتہ آیات میں تشریعی آیات یعنی قرآن مجید سے کفار کی روگردانی کا تذکرہ تھا ان آیات میں ان کے تکوینی آیات (کائنات میں موجود خدا کی نشانیوں) سے اعراض کا ذکر ہے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلام سننے سے صرف کانوں ہی کو بند نہیں کر رکھا تھا بلکہ اپنے اطراف میں موجود حق کی نشانیوں کو دیکھنے سے بھی آنکھوں کو محروم رکھا ہوا تھا۔

فرمایا گیا ہے : کیا انھوں نے زمین کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے کتنی کثیر مقدار میں اس میں مختلف قسم کی نباتات پیدا کی ہیں کہ جن میں نر بھی ہیں اور مادہ بھی، خوبصورت و زیبا بھی ہیں اور فائدہ مند بھی (اولم یروا الی الارض کم انبتنا فیها من کل زوج کریم)[1]۔

---

[1] عموماً ایسا ہوتا ہے "رؤیت" کا مادہ "الیٰ" کے ساتھ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے۔ بلکہ بعض اوقات دو مفعولوں کی طرف بھی متعدی ہوتا ہے اور اگر یہاں پر "الیٰ" کے ساتھ متعدی ہوا ہے تو اس وجہ سے ہے کہ یہ نگاہ کرنے کے معنیٰ میں ہے جو غور و فکر کے ساتھ دیکھنے کی طرف اشارہ ہے۔

Marfat.com

یہاں پر نباتات کے بارے میں لفظ " زوج " لایا گیا ہے اور یہی چیز غور طلب ہے اگرچہ اکثر مفسرین نے زوج کو نوع اور صنف کے معنیٰ میں لیا ہے اور ازواج کا معنیٰ انواع اور اصناف کیا ہے لیکن اگر ہم اسے اس کے مشہور معنیٰ میں لیں یعنی ہر چیز کا جوڑا جوڑا تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس سے عالمِ نباتات میں زوجیت اور جوڑا ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

گزشتہ زمانے میں لوگوں نے کم و بیش اس حد تک سمجھ رکھا تھا کہ نباتات کی بعض قسمیں نر اور مادہ پر مشتمل ہیں اور نباتات کو ثمرآور بنانے کے لیے تلقیح کے عمل سے استفادہ کرتے تھے اور کم از کم کھجور کے درخت کی حد تک تو یہ بات مسلم تھی۔

لیکن باقاعدہ طور پر سب سے پہلے سویڈن کا مشہور و معروف ماہر نباتات "سٹر لینے" اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ نباتات کی دنیا میں تقریباً یہ ایک عام قانون ہے اور عام حیوانات کی طرح نباتات بھی نر اور مادہ کے نطفے کی آمیزش سے ثمرآور ہوتے ہیں اور ان کی نسل بڑھتی ہے۔

لیکن اس سائنس دان کی دریافت سے صدیوں پہلے قرآن نے مختلف آیات میں کئی مرتبہ نباتات کے جوڑا جوڑا ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے (زیرِ نظر آیات، سورہ رعد کی آیت ۴، سورۂ لقمان کی آیت ۱۰ اور سورہ ق کی آیت، اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں) اور یہ قرآن کا ایک علمی معجزہ ہے۔

" کریم " کا لفظ دراصل ہر قیمتی اور قابلِ قدر چیز کے معنیٰ میں آتا ہے جو کبھی تو انسانوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور کبھی نباتات کے لیے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات " خط " کو بھی " کریم " کے لفظ کے ساتھ موصوف کیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط کے بارے میں ملکہ سبا نے کہا تھا " انی القی الیّ کتاب کریم " (نمل / ۲۹)

کریم نباتات سے مراد مفید نباتات ہیں۔ اگرچہ تمام نباتات مفید ہیں اور یہ افادیت علم اور سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ مزید اجاگر ہوتی جائے گی۔

بعد والی آیت میں مزید تاکید اور بیشتر وضاحت کے طور پر قرآن فرماتا ہے: ان قیمتی نباتات کی تخلیق میں خدا کے وجود پر واضح نشانی موجود ہے (ان فی ذلک لاٰیة)۔

اس حقیقت کی طرف توجہ کی جائے کہ یہ مٹی جو بظاہر ایک بے قیمت سی چیز ہے لیکن اگر اسے ایک مقررہ ترکیب حاصل ہو جائے تو یہ قدرتِ الٰہی کا ایک عظیم شاہکار بن جاتی ہے جس سے رنگارنگ خوب صورت پودے، پھول، ثمرآور درخت اور مختلف خواص کے حامل انواع و اقسام کے میوے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

لیکن یہ دل کے اندھے اس قدر غافل اور بے خبر ہیں کہ اس قدر عظیم آیات کو دیکھنے کے باوجود غفلت کا شکار ہیں کیونکہ کفر اور ہٹ دھرمی ان کے دل میں راسخ ہو چکے ہیں۔ بنابریں آیت کے اختتام پر فرمایا گیا ہے: ان میں سے اکثر لوگ تو کبھی بھی مومن نہیں تھے (وما کان اکثرھم مؤمنین)۔

یعنی یہ بے ایمانی ان کی ایک راسخ صفت بن چکی ہے لہٰذا اگر وہ ان آیات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ فعل کی اہلیت اور لیاقت بھی تو تاثیر کی اصل شرط ہے جیسا کہ قرآن مجید کے بارے میں ہم پڑھتے ہیں کہ وہ " ھدًی للمتقین " (یعنی متقیوں کے لیے سببِ ہدایت) ہے۔ (بقرہ / ۲)

Marfat.com

زیر بحث آیات کے سلسلے میں آخری کڑی میں تنبیہ اور تشویق کے ساتھ امید اور خوف کا منظر پایا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:
تیرا پروردگار عزیز اور رحیم ہے (و ان ربك لهو العزيز الرحيم)۔
"عزیز" اس طاقت ور کو کہتے ہیں جو ناقابل شکست ہوتا ہے۔ خدا اس لیے عزیز ہے کہ وہ اپنی عظیم نشانیاں دکھانے پر بھی قادر ہے اور جھٹلانے والوں کی سرکوبی بھی بڑی آسانی کے ساتھ کر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ رحیم ہے اور اس کی وسیع رحمت ہر جگہ کو گھیرے ہوئے ہے کہ اگر ایک مختصر سے لمحہ میں بھی تہ دل کے ساتھ اس کی بارگاہ کی طرف رجوع کیا جائے تو یہی کافی ہے کہ انسان پر اس کی نظر کرم ہو جائے اور وہ اس کے تمام گزشتہ گناہوں پر بخشش کا قلم پھیر دے۔
"عزیز" کو "رحیم" پر شاید اس لیے مقدم کیا گیا ہے کہ اگر رحیم کو عزیز پر مقدم کرتا تو شاید اس سے کمزوری کا احساس ہوتا لیکن عزیز کے مقدم کرنے سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ وہ انتہائی قدرت کے باوجود رحیم اور نہایت ہی مہربان ہے۔

Marfat.com

۱۰۔ وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓی اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○
۱۱۔ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ؕ اَلَا یَتَّقُوْنَ ○
۱۲۔ قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ○
۱۳۔ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ○
۱۴۔ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ○
۱۵۔ قَالَ كَلَّا ۚ فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ○

ترجمہ

۱۰۔ اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے موسیٰ کو ندا دی کہ اس ظالم قوم کے پاس جا۔
۱۱۔ قوم فرعون (کے پاس)، آیا وہ (خدا کے فرمان کی مخالفت سے) پرہیز نہیں کرتے؟
۱۲۔ (موسیٰ نے) عرض کی پروردگارا! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے۔
۱۳۔ اور میرا سینہ تنگ ہو جاتا ہے اور میری زبان کافی حد تک گویا بھی نہیں (میرے بھائی) ہارون کو بھی رسالت عطا فرما (تاکہ وہ میری امداد کرے)۔
۱۴۔ اور ان لوگوں کی طرف سے (ان کے اپنے نظریئے کے مطابق) مجھ پر جرم کا الزام ہے، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے (اور رسالت کا یہ فریضہ انجام نہ پا سکے گا)۔
۱۵۔ (خدا نے) فرمایا کہ ایسا نہیں ہے (وہ تمھارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے) تم دونوں (ان کی ہدایت کے لیے) ہماری آیات لے کر جاؤ، ہم تمھارے ساتھ ہیں اور (تمھاری باتوں کو) سُن رہے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

حضرت موسیٰؑ کی رسالت کا آغاز

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سورت میں خدا کے سات عظیم انبیاء کا تذکرہ ہے جو تمام مسلمانوں خصوصاً اوائلِ اسلام کے مسلمانوں کے لیے ایک درس ہے۔

سب سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی داستان شروع ہوتی ہے اس داستان میں ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں، فرعون اور فرعونیوں کے ساتھ ان کی لڑائی اور فرعون کی غرقابی تک کے واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اب تک (سورۂ بقرہ، مائدہ، اعراف، یونس، بنی اسرائیل اور سورۂ طٰہٰ جیسی) قرآن مجید کی سورتوں میں بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے اور بعض سورتوں میں آئندہ بھی یہی ذکر آئے گا۔

اگرچہ یہ مباحث مکرر ہیں اور انھیں بار بار دہرایا گیا ہے لیکن اگر ان میں ذرا سا غور و فکر کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہر بحث میں اس داستان کے کسی خاص حصے پر زور دیا گیا ہے اور کسی مخصوص مقصد کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

مثال کے طور پر مندرجہ بالا آیات اس وقت نازل ہوئیں جب مسلمان بہت اقلیت میں تھے اور ان کے مخالف اور دشمن نہایت طاقتور اور زور آور تھے اور کسی صورت میں بھی ان کی طاقت کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ تو یہاں پر لازم تھا کہ خداوندِ عالم گزشتہ اقوام کے ایسے واقعات پیش کرے جن سے ان کی ڈھارس بندھ جائے اور انھیں معلوم ہو جائے کہ دشمن کی عظیم طاقت اور ان کی ظاہری کمزوری کسی بھی صورت میں ان کی شکست کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس طرح سے ان کے حوصلے بلند اور قوتِ مدافعت اور استقامت میں اضافہ ہو جاتا اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ مذکورہ ساتوں انبیاء میں سے ہر ایک کی سرگزشت کے بعد" و ماکان اکثرھم مؤمنین و ان ربك لھو العزیز الرحیم" (ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے اور تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے) کو دہرایا گیا ہے یہ بعینہٖ وہی عبارت ہے جو ہم نے پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے اس سورۃ کے آغاز میں پڑھی ہے اس طرح کی ہم آہنگی اس حقیقت پر زندہ گواہ ہے کہ انبیاء کی داستانوں کا یہ حصہ اس خاص زمانے میں مسلمانوں کی اجتماعی اور نفسیاتی کیفیات کے پیشِ نظر تھا اور ان کا یہ دور ان انبیاء کے مذکورہ ادوار سے ملتا جلتا تھا۔

پہلے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کر جب تیرے پروردگار نے موسیٰ کو ندا دی کہ اس ظالم قوم کے پاس جاؤ (واذ نادٰی ربك موسٰی ان ائت القوم الظالمین)۔

اسی قوم فرعون کے پاس آیا وہ ظلم و ستم اور پروردگارِ عالم کے حکم کی نافرمانی سے پرہیز نہیں کرتے (قوم فرعون الا یتقون)۔

یہ نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ قومِ فرعون کی جس بُری خصلت کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے وہ ظلم ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ظلم کا ایک وسیع مفہوم ہے اور شرک اس کے ظاہری مصداقوں میں سے ایک ہے۔

Marfat.com

ان الشرك لظلم عظیم (لقمان ، ۱۳)

اسی طرح بنی اسرائیل کا لوٹ کھسوٹ کا شکار ہونا ، انھیں غلام بنانا ، انھیں انواع واقسام کے شکنجوں میں جکڑنا اور تشدد کا نشانہ بنانا بھی ایک اور مصداق ہے اس کے علاوہ وہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی کر کے دوسرے لوگوں سے پہلے خود اپنے آپ پر ظلم کیا کرتے تھے۔

اس لحاظ سے انبیاء کرام کی دعوت وتبلیغ کے مقصد کو ظلم کے خلاف نبرد آزمائی میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے ۔

اس دوران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی عظیم مشکلات خدا کی بارگاہ میں پیش کر کے اس سے قوت اور طاقت کی درخواست کی تاکہ اس طرح سے وہ رسالت کے عظیم بوجھ کو اٹھانے کے قابل ہوجائیں ۔ عرض کیا خداوندا ! مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ مجھے جھٹلائیں گے (قال رب انی اخاف ان یکذبون) ۔

قبل اس کے کہ میں تبلیغ رسالت کا فریضہ انجام دوں ، شور وغوغا برپا کر کے اور مجھے جھٹلا کر میری راہ کو مسدود کر دیں گے اور یہ مقصد حاصل نہ ہو سکے گا ۔

یہ بات کرنے میں موسیٰ علیہ السلام یقیناً حق بجانب تھے کیونکہ فرعون اور اس کے چیلے چانٹے سرزمین مصر پر اس قدر مسلّط تھے کہ کوئی بھی ان کی مخالفت کی جرأت نہیں کر سکتا تھا اور جہاں کہیں سے بھی کوئی مخالفت کی آواز بلند ہوتی اسے سختی کے ساتھ دبا یا جاتا اور افراد کو بے رحمی سے کچل دیا جاتا ۔

اس کے علاوہ "میرا سینہ کار رسالت کی ادائیگی کے لیے اس قدر وسعت بھی نہیں رکھتا" (و یضیق صدری)

اور پھر یہ کہ "میری زبان بھی کوئی ایسی گویا نہیں ہے" (و لاینطلق لسانی) ۔

اس لیے میری درخواست یہ ہے کہ "(میرے بھائی) ہارون کو بھی منصب رسالت عطا کر دے تاکہ وہ میرے ساتھ مل کر اس فریضے کو ادا کرے" (فارسل الی ھارون)[۱]

تاکہ ہم ایک دوسرے کی معاونت سے ان خود سر ظالموں تک تیرے اس عظیم فرمان کو پہنچا سکیں ۔

ان سب باتوں کے علاوہ (ان کے اپنے نظریئے کے مطابق) ان لوگوں کا مجھ پر ایک جرم کا الزام ہے (ولھم علی ذنب) ۔ میں نے ایک ظالم فرعونی کو اس وقت مکا مار کر ہلاک کر دیا تھا جب وہ ایک مظلوم بنی اسرائیلی سے لڑ رہا تھا ۔

لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ قصاص کے طور پر وہ مجھے قتل کر ڈالیں گے اور پھر یہ عظیم فریضہ ادا نہ ہو سکے گا (فاخاف ان یقتلون) ۔

درحقیقت موسیٰ علیہ السّلام کو اس عظیم فریضے کی ادائیگی کے لیے چار بڑی مشکلات آڑے آرہی تھیں جن کے حل کے لیے انھوں نے اپنے خدا سے دعا مانگی (تکذیب کی مشکل ، تنگی سینہ کی مشکل ، عدم فصاحت کی مشکل اور انتقام کی مشکل) ۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی ذات کا خوف نہیں تھا بلکہ انھیں یہ خوف درپیش تھا کہ منزل مقصو

---

[۱] درحقیقت اس جملے کی ایک تقدیر ہے اور وہ یہ ہے "فارسل جبرئیل الی ھارون" ۔

Marfat.com

تک پہنچنے سے پہلے ہی یہ مقصد فوت نہ ہو جائے۔ لہٰذا انھوں نے اس معرکے کے لیے خدا سے زیادہ سے زیادہ طاقت اور قوت کی درخواست کی۔

جس قسم کے وسیلے کی انھوں نے خداوندِ عالم سے درخواست کی اس حقیقت پر" شاہد ناطق" کی درخواست تھی۔ اس نے " شرح صدر" (وسیع اور کشادہ روح) کی درخواست کی۔ اسی طرح زبان کی ہر قسم کی گرہوں کے کھولنے کی درخواست کی اور اپنے بھائی جناب ہارون علیہ السلام کو منصبِ رسالت عطا کرنے کی درخواست کی تاکہ وہ اس کام میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں چنانچہ اس آخری درخواست کا ماجرا سورۂ طٰہٰ میں زیادہ تفصیل سے درج ہے، موسیٰ عرض کرتے ہیں :۔

رب اشرح لی صدری ویسرلی امری واحلل عقدة من لسانی یفقھوا قولی، واجعل لی وزیرًا من اھلی ھرون اخی اشدد بہ ازری واشرکہ فی امری کی نسبحک کثیرًا و نذکرك کثیرًا

پروردگارا! میرا سینہ کشادہ کردے، میرے کام کو مجھ پر آسان فرما، میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ وہ میری بات سمجھ سکیں اور میرے خاندان سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر بنا، اس کے ذریعے میری کمر مضبوط کردے، اسے میرے کاموں میں میرا شریک بنا تاکہ ہم تیری بہت تسبیح کرسکیں اور تجھے بہت یاد کرسکیں۔ (طٰہٰ / ۲۵ تا ۳۴)

خداوندعالم نے موسیٰ علیہ السلام کی صدقِ دل پر مبنی اس درخواست کو منظور فرمالیا اور" فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا" کہ وہ تمھیں قتل کردیں یا تیرا سینہ تنگ ہو یا تیری زبان میں کوئی گرہ ہو اور تو بول نہ سکے (قال کلا)۔

تمھارے بھائی کے بارے میں تمھاری دعا کو مستجاب کیا اور اسے بھی حکم دیا ہے" تم دونوں ہماری آیات لے کر جاؤ" (اور اس کی گمراہ قوم کو میری طرف دعوت دو) (فاذھبا بأیاتنا)۔

اور یہ نہ سمجھنا کہ میں تم سے دور رہوں اور تمھارا ماجرا مجھے معلوم نہیں ہے، بلکہ" ہم تمھارے ساتھ ہیں اور تمھاری باتوں کو اچھی طرح سن رہے ہیں (انّا معکم مستمعون)۔

ہم کبھی بھی تمھیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے اور سخت حوادث میں بھی تمھاری مدد کریں گے۔ تم بالکل مطمئن ہو کر آگے بڑھو اور بڑھتے چلے جاؤ۔

تو اس طرح سے خداوندعالم نے تین جملوں کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو کافی اطمینان دلا دیا اور ان کی درخواست کو عملی جامہ پہنایا۔" کلا" کے لفظ کے ساتھ انھیں اطمینان دلادیا کہ وہ لوگ انھیں ہرگز قتل نہیں کرسکیں گے، نیز سینے کی تنگی اور زبان کی مشکل بھی پیدا نہیں ہوگی اور" فاذھبا بأیاتنا" کے جملے کے ساتھ ان کے بھائی (ہارون) کو ان کی کمک کے لیے بھیجا اسی طرح" انّا معکم مستمعون" کے ساتھ انھیں اپنی مکمل حمایت کا یقین دلادیا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آخری جملے میں ضمیر کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے اور خدا نے فرمایا ہے:" انّا معکم" (ہم تمھارے ساتھ ہیں) ممکن ہے یہ تعبیر اس لیے ہو کہ تم دونوں بھائی جہاں جہاں اور جس جس میدان میں بھی اس ظالم و جابر

Marfat.com

گروہ کا سامنا کرو گے، ہم وہیں وہیں موجود ہوں گے اور تم سب لوگوں کی باتوں کو سنیں گے، تم دو بھائیوں کی امداد کر کے ان پر کامیاب کریں گے۔

اس مقام پر بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ چونکہ " مع " کا کلمہ حمایت اور امداد پر دلالت کرتا ہے لہذا یہاں یہ فرعون اور فرعون والوں کے لیے نہیں ہوگا، یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ کیونکہ " مع " کا معنیٰ ہے خداوندِ عالم کا ہر موقع و محل پر حاضر اور ناظر ہونا لہذا وہ گناہ گاروں کے لیے بھی ہوگا بلکہ اس میں بے جان چیزیں بھی شامل ہوں گی کیونکہ وہ تو ہر جگہ موجود ہے اور کوئی جگہ اس سے خالی نہیں ہے۔

" استماع " کا معنیٰ ہے کسی چیز کو غور سے سننا اور یہ کلمہ بھی اسی واقعیت کی تاکید ہے۔

Marfat.com

۱۶۔ فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۱۷۔ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ۝
۱۸۔ قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ
سِنِيْنَ ۝
۱۹۔ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝
۲۰۔ قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝
۲۱۔ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّجَعَلَنِيْ
مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
۲۲۔ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ۝

ترجمہ

۱۶۔ پس تم فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم رب العالمین کے رسول ہیں۔
۱۷۔ بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔
۱۸۔ (فرعون نے) کہا: آیا ہم نے تجھے بچپن میں اپنے درمیان نہیں پالا اور کیا تو اپنی عمر کے کئی سال ہم میں نہیں رہا؟
۱۹۔ اور تو نے (آخر کار جو) کام (تجھے انجام نہیں دینا چاہیے تھا اسے) انجام دیا، (اور ہم میں سے ایک شخص کو
موت کے گھاٹ اتار دیا) اور تو کافروں میں سے تھا۔
۲۰۔ (موسیٰ نے) کہا: میں نے وہ کام انجام دیا جبکہ میں بے خبر لوگوں میں سے تھا۔
۲۱۔ پھر جب مجھے تم لوگوں سے خوف دہ ہوا تو تم سے بھاگ نکلا اور میرے پروردگار نے مجھے علم و دانش عطا فرمائی
اور مجھے رسولوں میں سے قرار دیا۔

Marfat.com

۲۲۔ کیا یہ احسان ہے جو تو مجھے جتلا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کو تو نے اپنا غلام بنا رکھا ہے ؟

تفسیر

فرعون سے معرکۃ الآرا مقابلہ

گزشتہ آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماموریت کا پہلا مرحلہ ختم ہوا جس میں بتایا گیا ہے کہ انھیں وحی و رسالت ملی اور انھوں نے اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وسائل کے حصول کی درخواست کی۔

اس کے ساتھ ہی زیر نظر آیات میں دوسرے مرحلے" کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے یعنی فرعون کے پاس جانا اور اس کے ساتھ گفتگو کرنا چنانچہ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اسے یہاں پر بیان کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے مقدمے کے طور پر فرمایا گیا ہے : اب جبکہ تمام حالات سازگار ہیں تو تم فرعون کے پاس جاؤ اور اسے کہو کہ ہم عالمین کے پروردگار کے رسول ہیں (فأتیا فرعون فقولا انا رسول رب العالمین)۔

" فأتیا" کا لفظ بتا رہا ہے کہ تم ہر قیمت پر اس کے ساتھ رابطہ قائم کرو اور" رسول" کے لفظ کو مفرد کے صیغے کے ساتھ بیان کرنا جب کہ وہ دونوں رسول تھے، ان کی دعوت کی یگانگت کی دلیل ہے۔ گویا وہ یک جان دو قالب کے مصداق ایک پروگرام ایک منصوبے اور ایک ہدف کے ماتحت کام کر رہے ہیں[1]

اور اپنی رسالت کا ذکر کرنے کے بعد بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیجیے اور کہیے کہ ہمیں حکم ملا ہے کہ تجھ سے مطالبہ کریں کہ تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے (ان ارسل معنا بنی اسرائیل)۔

ظاہر ہے کہ اس مطالبے کا مقصد ان کو غلامی سے آزاد کروانا تھا تاکہ وہ فرعون کی قید سے نکل کر ان کے ساتھ چلے جائیں۔

اس مقام پر فرعون نے زبان کھولی اور شیطنت پر مبنی چند ایک نپے تلے جملے کہے جس سے ان کی رسالت کی تکذیب کرنا مقصود تھا۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منہ کر کے کہنے لگا : آیا بچپن میں ہم نے تجھے اپنے دامنِ محبت میں پروان نہیں چڑھایا

---

[1] "راغب" نے " مفردات" میں لکھا ہے کہ "رسول" کا لفظ ان کلمات میں سے ہے جن کا اطلاق مفرد اور جمع پر یکساں ہوتا ہے۔ اگرچہ کبھی اس کی جمع " رسل" بھی لائی جاتی ہے اور بعض لوگوں نے اسے مصدر اور" رسالت" کے معنیٰ میں لیا ہے اور معلوم ہے کہ مصدر کے تثنیہ اور جمع کے صیغے نہیں ہوتے ("لسان العرب" میں ہے" الرسول بمعنی الرسالۃ") لیکن حقیقتاً یہ لفظ وصفی معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع پر اس کا استعمال تثنیہ اور جمع کی صورت میں ہوتا ہے چنانچہ موسیٰ اور فرعون کی اسی داستان میں آیا ہے:

انا رسولا ربک

ہم دونوں تیرے رب کے بھیجے ہوئے ہیں۔ (سورۂ طٰہٰ / ۴۷)

Marfat.com

غرض سے نہیں بلکہ مظلوم کی حمایت کے طور پر تھا میں تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس طرح سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔

بنا بریں یہاں پر" ضال" بمعنی" غافل" کے ہے اور غفلت سے مراد انجام سے لاعلمی ہے۔

کچھ اور مفسرین کہتے ہیں کہ اس ظالم شخص کے قتل کے سلسلے میں کوئی خطا واقع نہیں ہوئی کیونکہ وہ اسی بات کا مستحق تھا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ میں نہیں جانتا تھا کہ اس قتل کا انجام یہ ہو گا کہ میں مصر میں نہیں رہ سکوں گا اور ایک عرصہ تک جلاوطن رہوں گا جس سے میرے بہت سے منصوبے التوا میں پڑ جائیں گے۔

لیکن ظاہراً یہ جواب ایسا نہیں تھا جو موسیٰ علیہ السلام فرعون کو دیتے اور وہ اسے قبول بھی کر لیتا۔ بلکہ یہ ایک ایسا مطلب تھا جو حضرت موسیٰ اپنے دوستوں کو بیان کرتے تھے۔

تیسری تفسیر جو کئی لحاظ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شایانِ شان اور ان کے مقامِ عظمت کے لائق ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہاں پر" توریہ" سے کام لیا ہے انھوں نے ایسی بات کہی ہے جس کا ظاہری معنیٰ تو یہ بنتا ہے کہ میں اس وقت راہِ حق سے ناآشنا تھا پھر خداوندِ عالم نے مجھے حق کا راستہ دکھایا اور رسالت کا عہدہ تفویض کیا۔ لیکن اس کا باطن میں کچھ اور معنیٰ بنتا ہے۔

وہ یہ کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ یہ چیز اس قدر دردِ سر بن جائے گی۔ ورنہ اصل کام تو بالکل ٹھیک ہی تھا اور قانونِ عدالت کے بھی عین مطابق تھا (یا یہ کہ جس دن یہ حادثہ رونما ہوا تھا اس دن میں راستہ بھول کر وہاں پر پہنچ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ واقعہ ہو گیا)۔

معلوم ہے کہ" توریہ" سے مراد یہ ہے کہ انسان ایسی بات کرے جس کا باطن حق پر مبنی ہو لیکن مخاطب اس کے ظاہر سے کچھ اور سمجھے اور اس قسم کی گفتگو وہاں پر جائز ہو جاتی ہے جہاں انسان کسی الجھن میں پڑ جائے اور جھوٹ بھی نہ بولنا چاہے ساتھ ہی ظاہر بھی محفوظ رہے۔[1]

پھر موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں: اس حادثے کی وجہ سے جب میں نے تم سے خوف کیا تو تم سے بھاگ گیا اور میرے پروردگار نے مجھے دانش عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے قرار دیا (ففررت منکم لما خفتکم فوھب لی ربی حکما وجعلنی من المرسلین)۔

اس آیت میں" حکم" سے کیا مراد ہے؟ اور کیا اس سے مراد مقامِ نبوت ہے یا علم، دانش اور آگاہی؟ تو اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے لیکن خود آیت میں غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ" رسالت" کو" حکم" کے مقابلے میں بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ رسالت اور نبوت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔

اس موضوع کا ایک اور شاہد سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷۹ ہے جس میں فرمایا گیا ہے:۔

---

[1] یہ گفتگو حضرت امام علی بن موسیٰ رضا علیہ السلام کی حدیث کے مطابق ہے جسے صاحب تفسیر" نور الثقلین" نے اسی آیت کی تفسیر کے ضمن میں جلد ۴ ص ۴۰ پر بیان کیا ہے۔

Marfat.com

(قال الم نربك فينا وليدًا)۔

ہم نے تجھے دریائے نیل کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی خشمگیں موجوں سے نجات دلائی وگرنہ تیری زندگی خطرے میں تھی۔ تیرے بے آباؤں کو بلایا اور ہم نے اولادِ بنی اسرائیل کے قتل کر دینے کا جو قانون مقرر کر رکھا تھا اس سے تجھے معاف کر دیا اور امن وسکون اور نازونعمت میں تجھے پروان چڑھایا۔

اور اس کے بعد بھی "تو نے اپنی زندگی کے کئی سال ہم میں گزارے" (و لبثت فينا من عمرك سنين)۔

پھر وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایک اور اعتراض کرتے ہوئے کہتا ہے: تو نے وہ اہم کام کیا ہے (فرعون کے حامی ایک قبطی کو قتل کیا ہے) (و فعلت فعلتك التى فعلت)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسا کام کرنے کے بعد تم کیونکر رسول بن سکتے ہو؟

ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے "تو ہماری نعمتوں کا انکار کر رہا ہے" (و انت من الكافرين)۔

تو کئی سالوں تک ہمارے دسترخوان پر پلتا رہا ہے ہمارا نمک کھانے کے بعد نمک حلالی کا حق اس طرح ادا کر رہا ہے؟ اس قدر کفرانِ نعمت کے بعد تو کس منہ سے نبوت کا دعویٰ کر رہا ہے؟

درحقیقت وہ بزعمِ خود اس طرح کی منطق سے ان کی کردار کشی کر کے موسیٰ علیہ السلام کو خاموش کرنا چاہتا تھا۔

یہاں اس واقعے کو بیان کرنا مقصود تھا جو سورۂ قصص آیہ ۱۵ میں بیان ہوا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے دو آدمیوں کو دیکھا کہ آپس میں لڑ رہے ہیں جن میں سے ایک تو فرعونی تھا اور دوسرا بنی اسرائیلی۔ چنانچہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم بنی اسرائیلی کی حمایت میں فرعونی کو ایک زوردار مکّا رسید کیا جس سے اس کی موت واقع ہوگئی۔

جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی شیطنت آمیز باتیں سن کر اس کے تینوں اعتراضات کے جواب دینا شروع کیے۔ لیکن اہمیت کے لحاظ سے فرعون کے دوسرے اعتراض کا سب سے پہلے جواب دیا (یا پہلے اعتراض کو بالکل جواب کے لائق ہی نہیں سمجھا کیونکہ کسی کا کسی کی پرورش کرنا اس بات کی دلیل نہیں بن جاتا کہ اگر وہ گمراہ ہو تو اسے راہِ راست کی بھی ہدایت نہ کی جائے)۔

بہرحال جناب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں نے یہ کام اس وقت انجام دیا جب کہ میں بے خبر لوگوں میں سے تھا۔ (قال فعلتها اذًا وانا من الضالين)۔

اس مقام پر "ضالین" کی تعبیر کے بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کیونکہ ایک طرف تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر کا ماضی بالکل بے داغ ہونا چاہیے حتیٰ کہ مقامِ نبوت تک پہنچنے سے پہلے کے زمانہ میں بھی اسے معصوم ہونا چاہیے وگرنہ اس کی عظمت اور شخصیت لوگوں کے درمیان مشکوک ہو جائے گی اور وہ تزلزل کا شکار ہو جائیں گے جس کے نتیجے میں بعثت کا مقصد تشنۂ تکمیل ہو کر رہ جائے گا۔ بنابریں عصمتِ انبیاء کا دامن قبل از نبوت بھی بے داغ ہونا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کا جواب اس قدر ناطق اور مسکت ہونا چاہیے کہ فرعون کو دوبارہ اس کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ ہو سکے۔

لہٰذا کچھ مفسرین تو کہتے ہیں کہ یہاں پر "ضال" سے مراد خطا در موضوع ہے یعنی میں نے اسے جو مکّا مارا تھا وہ اسے جان سے مار دینے کی

Marfat.com

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتاب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللہ

کسی انسان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ خداوندِ عالم اسے کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کے علاوہ میری عبادت کرو اور میرے بندے بن جاؤ۔

دراصل "حکم" کا لغوی معنیٰ "اصلاح کی غرض سے روکنا" ہوتا ہے۔ اسی لیے جانور کی لگام کو "حکمۃ" (بروزن "صدقۃ") کہا جاتا ہے پھر یہ لفظ حکمت کے مطابق چیز پر بولا جانے لگا۔ اسی طرح علم اور عقل کو بھی "حکم" کہتے ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہاں پر یہ سوال در پیش آئے کہ سورۂ قصص کی آیت ۱۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس واقعے کے رونما ہونے سے قبل ہی "حکم" اور "علم" کے منصب پر فائز ہو چکے تھے چنانچہ ارشادِ باری ہوتا ہے:

ولما بلغ اشدہ واستوٰی اٰتینٰہ حکمًا وعلمًا

جب موسیٰ اپنے رُشد کی حدوں کو پہنچ گئے تو ہم نے انھیں حکم اور علم عطا کیا۔

اس کے بعد قبطی کے ساتھ جناب موسیٰ علیہ السلام کی لڑائی کا ذکر آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ علم اور حکمت کے مختلف مراحل ہوتے ہیں۔ چنانچہ جناب موسیٰؑ ایک مرحلے تک تو نبوت و رسالت سے قبل پہنچ چکے تھے لیکن جب نبوت و رسالت کے عہدے پر فائز ہوئے تو کمال کے بقیہ مراحل کو بھی پا لیا۔

پھر موسیٰ علیہ السلام اس احسان کا جواب دیتے ہیں جو فرعون نے بچپن اور لڑکپن میں پرورش کی صورت میں ان پر کیا تھا دو ٹوک انداز میں اعتراض کی صورت میں فرماتے ہیں: تو کیا جو احسان تو نے مجھ پر کیا ہے یہی ہے کہ تو بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا لے (وتلک نعمۃ تمنہا علیّ ان عبدت بنی اسرائیل)۔

یہ ٹھیک ہے کہ حوادثِ زمانہ نے مجھے تیرے محل تک پہنچا دیا اور مجھے مجبوراً تمھارے گھر میں پرورش پانا پڑی اور اس میں بھی خدا کی قدرت نمائی کار فرما تھی لیکن ذرا یہ تو سوچو کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ کیا وجہ ہے کہ میں نے اپنے باپ کے گھر میں اور ماں کی آغوش میں تربیت نہیں پائی؟ آخر کس لیے؟

کیا تو نے بنی اسرائیل کو غلامی کی زنجیروں میں نہیں جکڑ رکھا؟ یہاں تک کہ تو نے اپنے خود ساختہ قوانین کے تحت ان کے لڑکوں کو غلام اور ان کی لڑکیوں کو کنیز بنا لیا۔

تیرے بے حد و حساب مظالم اس بات کا سبب بن گئے کہ میری ماں اپنے نو مولود بچے کی جان بچانے کی غرض سے مجھے ایک صندوق میں رکھ کر دریائے نیل کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دے اور پھر منشائے ایزدی یہی تھا کہ میری چھوٹی سی کشتی تمھارے محل کے نزدیک لنگر ڈال دے۔ ہاں تو یہ تمھارے بے انداز مظالم ہی تھے جن کی وجہ سے مجھے تمھارا مرہونِ منت ہونا پڑا اور جنھوں نے مجھے اپنے باپ کے مقدس اور پاکیزہ گھر سے محروم کر کے تمھارے آلودہ محل تک پہنچا دیا۔

اس تفسیر کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کا جواب فرعون کے سوال کے سلسلے میں مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے۔

آیت کی تفسیر میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اگر میری پرورش تمھاری طرف سے کوئی نعمت

Marfat.com

ہو بھی سہی تب بھی ان تمام مظالم کے مقابلے میں ایسے ہے جیسے سمندر کے سامنے قطرہ ۔ جو چیز تو نعمت کی صورت میں بیان کر رہا ہے کیسی نعمت ہے جبکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام مظالم بھی ہیں ۔

ایک تیسری تفسیر بھی ہے جو فرعون کے سوال میں موسیٰ کے جواب کی صورت میں بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر میں نے تیرے محل میں پرورش پائی ہے اور رنگ برنگی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوا ہوں تو یہ بات بھی تجھے فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس محل کے اصل تعمیر کار میری قوم کے افراد ہی تھے جنھیں تو نے غلام بنایا ہوا ہے یہ تمام نعمتیں مہیا کرنے والے بنی اسرائیل کے قیدی ہی تھے میری قوم کے افراد کی کمائی پر تو مجھ پر کس طرح احسان جتا رہا ہے ۔

باوجودیکہ ان تینوں تفسیروں میں کوئی باہمی تضاد نہیں ہے لیکن کئی لحاظ سے پہلی تفسیر زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے ۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ " من المرسلین " کی تعبیر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ صرف ایک میں ہی رسول اور خدا کا بھیجا ہوا انسان نہیں ہوں بلکہ مجھ سے پہلے بھی بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں، میں ان میں سے ایک ہوں اور تو نے سب کو فراموش کر دیا ہے ۔

Marfat.com

۲۳۔ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ
۲۴۔ قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝
۲۵۔ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ ۝
۲۶۔ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝
۲۷۔ قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ ۝
۲۸۔ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝
۲۹۔ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَيْرِيْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِيْنَ ۝

ترجمہ

۲۳۔ فرعون نے کہا: یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟
۲۴۔ (موسیٰ نے) کہا: آسمانوں، زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم صاحبانِ یقین ہو۔
۲۵۔ (فرعون نے) اپنے اطراف والوں سے کہا کیا سُن نہیں رہے (کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے)؟
۲۶۔ (موسیٰ نے) کہا: تمھارا اور تمھارے آباؤ اجداد کا رب ہے۔
۲۷۔ (فرعون) بولا: تمھاری طرف بھیجا جانے والا یہ رسول تو پاگل ہے۔
۲۸۔ (موسیٰ نے) کہا: وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا خدا ہے، اگر تم عقل و خرد سے کام لو۔
۲۹۔ (فرعون نے غصے میں آکر کہا: اگر تو نے میرے علاوہ کسی کو معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں شامل کروں گا۔

Marfat.com

تفسیر

دیوانگی کی تہمت اور قید کی دھمکی

جب موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون کو دو ٹوک اور قاطع جواب دے دیا جس سے وہ لاجواب اور عاجز ہو گیا تو اس نے کلام کا رُخ بدلا اور موسیٰ علیہ السّلام نے جو یہ کہا تھا کہ "میں رب العالمین کا رسول ہوں" تو اس نے اسی بات کو اپنے سوال کا محور بنایا اور کہا یہ رب العالمین کیا چیز ہے؟ (قال فرعون و ما رب العالمین)۔

بہت بعید ہے کہ فرعون نے واقعاً یہ بات مطلب سمجھنے کے لیے کی ہو بلکہ زیادہ تر یہی لگتا ہے کہ اس نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیا تھا اور تحقیر کے طور پر یہ بات کہی تھی۔

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے بیدار اور سمجھ دار افراد کی طرح اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ دیکھا کہ گفتگو کو سنجیدگی پر محمول کریں اور سنجیدہ ہو کر اس کا جواب دیں اور چونکہ ذاتِ پروردگارِ عالم انسانی افکار کی دسترس سے باہر ہے لہٰذا انھوں نے مناسب سمجھا کہ اس کے آثار کے ذریعے استدلال قائم کریں لہٰذا انھوں نے آیاتِ آفاقی کا سہارا لیتے ہوئے فرمایا: وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم یقین کا راستہ اختیار کرو (قال رب السماوات و الارض و ما بینهما ان کنتم موقنین)۔

اتنے وسیع و عریض اور باعظمت آسمان و زمین اور کائنات کی رنگ برنگی مخلوق جس کے سامنے تو اور تیرے چاہنے اور ماننے والے ایک ذرۂ ناچیز سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے، میرے پروردگار کی آفرینش ہے اور ان اشیاء کا خالق و مدبّر اور ناظم ہی عبادت کے لائق ہے نہ کہ تیرے جیسی کمزور اور ناچیز سی مخلوق۔

اس حقیقت کی طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ بُت پرستوں کا عقیدہ تھا کہ موجوداتِ عالم میں سے ہر ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ رب ہے اور وہ کائنات کو مختلف نظاموں کا مجموعہ سمجھتے تھے لیکن موسیٰ علیہ السّلام کی گفتگو اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ پوری کائنات پر حکم فرما ایک ہی نظام اس بات کی دلیل ہے کہ تمام کائنات کا صرف اور صرف ایک رب ہے۔

"ان کنتم موقنین" کا جملہ شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ موسیٰ علیہ السّلام فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمجھانا چاہتے ہوں کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس سوال سے تمھارا مقصد درکِ حقیقت نہیں ہے لیکن اگر تمھیں حقیقت کی تلاش ہو اور تمھارے اندر عقل اور شعور بھی ہو تو جو استدلال میں نے کیا ہے وہی کافی ہے۔ ذرا اپنی آنکھوں کو کھولو اور ایک لحظہ ان آسمانوں، زمین اور ان کے آثار کو غور سے دیکھو تاکہ تمھیں حقیقت کا پتہ چلے اور کائنات کے بارے میں اپنے نظریئے کی اصلاح کر لو۔

لیکن عظیم آسمانی معلم کے اس قدر محکم بیان اور پختہ گفتگو کے بعد بھی فرعون خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوا اس نے اپنے ٹھٹھے مذاق اور استہزاء کو جاری رکھا اور مغرور مستکبرین کے پرانے طریقۂ کار کو اپناتے ہوئے اپنے اطراف میں بیٹھنے والوں کی طرف منہ کر کے کہا: کیا سُن نہیں رہے ہو (کہ یہ شخص کیا کہہ رہا ہے) (قال لمن حوله الا تستمعون)۔

Marfat.com

معلوم ہے کہ فرعون کے گرد کون لوگ بیٹھے ہیں اسی قماش کے لوگ تو ہیں۔ صاحبانِ زور اور زر ہیں یا پھر ظالم اور جابر کے معاون۔

عبداللہ بن عباس کہتے ہیں:

وہاں پر فرعون کے اطراف میں پانچ سو آدمی موجود تھے، جن کا شمار فرعون کے خواص میں ہوتا تھا[1]

اس طرح کی گفتگو سے فرعون یہ چاہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی منطقی اور دلنشیں گفتگو اس گروہ کے تاریک دلوں میں ذرہ بھر بھی اثر نہ کرے اور لوگوں کو یہ باور کروائے کہ ان کی باتیں بے ڈھنگی اور ناقابلِ فہم ہیں۔

مگر جناب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی منطقی اور جچی تلی گفتگو کو بغیر کسی خوف وخطر کے جاری رکھتے ہوئے فرمایا: وہ تمھارا بھی رب ہے اور تمھارے آباؤاجداد کا بھی رب ہے (قال ربکم و رب اٰبائکم الاولین)۔

درحقیقت بات یہ ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو آفاقی آیات کے حوالے سے استدلال کیا اب یہاں پر "آیات انفس" اور خود انسان کے اپنے وجود میں تخلیق خالق کے اسرار اور انسانی روح اور جسم میں خداوندِ عالم کی ربوبیت کے آثار کی طرف اشارہ کر رہے ہیں تاکہ یہ عاقبت نااندیش مغرور کم از کم اپنے بارے میں تو کچھ سوچ سکیں خود کو اور پھر ——— اپنے خدا کو پہچان سکیں۔

لیکن فرعون اپنی ہٹ دھرمی سے پھر بھی باز نہ آیا اب استہزاء اور مسخرہ پن سے چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے اور موسیٰ کو جنون اور دیوانگی کا الزام دیتا ہے چنانچہ اس نے کہا: جو پیغمبر تمھاری طرف آیا ہے بالکل دیوانہ ہے (قال ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون)۔

وہی تہمت جو تاریخ کے ظالم اور جابر لوگ خدا کے بھیجے ہوئے مصلحین پر لگاتے رہتے تھے۔

یہ بھی لائق توجہ ہے کہ یہ مغرور فریبی اس حد تک بھی روادار نہ تھا کہ کہے "ہمارا رسول" اور "ہماری طرف بھیجا ہوا" بلکہ کہتا ہے "تمھارا پیغمبر" اور "تمھاری طرف بھیجا ہوا" کیونکہ "تمھارا پیغمبر" میں طنز اور استہزاء پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی اس میں غرور اور تکبر کا پہلو بھی نمایاں ہے کہ میں اس بات سے بالاتر ہوں کہ کوئی پیغمبر مجھے دعوت دینے کے لیے آئے اور موسیٰ پر جنون کی تہمت لگانے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ جناب موسیٰ کے جاندار دلائل کو حاضرین کے اذہان میں بے اثر بنایا جائے۔

لیکن یہ ناروا تہمت موسیٰ کے بلند حوصلوں کو پست نہیں کر سکی اور انھوں نے تخلیقاتِ عالم میں آثارِ الٰہی اور آفاق و انفس کے حوالے سے اپنے دلائل کو برابر جاری رکھا اور کہا، وہ مشرق و مغرب اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے سب کا پروردگار ہے اگر تم عقل و شعور سے کام لو (قال رب المشرق والمغرب و ما بینهما ان کنتم تعقلون)۔

اگر تمھارے پاس مصر نامی محدود سے علاقے میں چھوٹی سی ظاہری حکومت ہے تو کیا ہوا؟ میرے پروردگار کی حقیقی حکومت

---

[1] تفسیر ابوالفتوح رازی، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

تو مشرق و مغرب اور اس کے تمام درمیانی علاقے پر محیط ہے اور اس کے آثار ہر جگہ موجودات عالم کی پیشانی پر چمک رہے ہیں اصولی طور پر خود مشرق و مغرب میں آفتاب کا طلوع و غروب اور کائنات عالم پر حاکم نظام شمسی ہی اس کی عظمت کی نشانیاں ہیں لیکن عیب خود تمہارے اندر ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ تمہارے اندر سوچنے کی عادت ہی نہیں ہے (یاد رہے کہ " ان کنتم تعقلون " کا جملہ بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تمہاری گزشتہ اور موجودہ زندگی میں سوچ بچار کا طریقہ ہوتا اور تم کچھ سوچ بچار سے کام لیتے تو یقیناً اس حقیقت کو بھی پا لیتے)۔

درحقیقت یہاں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی طرف جنون کی نسبت کا بڑے اچھے انداز میں جواب دیا ہے۔ دراصل وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دیوانہ میں نہیں ہوں بلکہ دیوانہ اور بے عقل وہ شخص ہے جو اپنے پروردگار کے ان تمام آثار اور نشانات کو نہیں دیکھتا۔

عالم وجود کے ہر در و دیوار پر ذات پروردگار کے اس قدر عجیب و غریب نقوش موجود ہیں پھر بھی
جو شخص ذات پروردگار کے بارے میں نہ سوچے اسے خود نقش دیوار ہو جانا چاہیے۔

یہ ٹھیک ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلی بار ہی آسمانوں اور زمین کے نظام کی طرف اشارہ کیا ہے چونکہ آسمان بہت بلند اور زمین نہایت اسرار آمیز ہے لیکن آخر میں آکر ایک ایسے نقطے پر انگلی رکھی جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا تھا اور ہر شخص کا روزانہ اس سے واسطہ رہتا ہے اور وہ ہے سورج کا روزمرہ طلوع و غروب کا منظم پروگرام جس کے متعلق کوئی شخص بھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ میں ہی اسے منظم کرنے والا ہوں۔

" ما بینهما " (جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے) کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے درمیان وحدت اور ارتباط باہم پایا جاتا ہے جس طرح آسمان اور زمین کے باہمی ارتباط کی طرف اشارہ گزر چکا ہے اور " ربکم و رب اٰبائکم الاولین " کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ موجودہ اور سابقہ نسلوں کے درمیان ایک وحدت و ہم آہنگی برقرار ہے۔

ان طاقتور دلائل نے فرعون کو سخت بوکھلا دیا، اب اس نے اسی حربے کا سہارا لیا جس کا سہارا ہر بے منطق اور طاقتور لیتا ہے اور جب وہ دلائل سے عاجز آجاتا ہے تو اسے آزمانے کی کوشش کرتا ہے، فرعون نے کہا اگر تم نے میرے علاوہ کسی اور کو معبود بنایا تو تمہیں قیدیوں میں شامل کر دوں گا (قال لئن اتخذت الٰهاً غیری لاجعلنك من المسجونین)۔

میں تمہاری اور کوئی بات نہیں سننا چاہتا میں تو صرف ایک ہی عظیم اللہ اور معبود کو جانتا ہوں اور وہ میں خود ہوں اگر کوئی شخص اس کے علاوہ کہتا ہے تو بس سمجھ لے کہ اس کی سزا یا تو موت ہے یا عمر قید جس میں زندگی ہی ختم ہو جائے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ " المسجونین " میں الف لام عہد کے لیے ہے جو ایک مخصوص زندان کی طرف اشارہ ہے جس میں جو شخص بھی گیا زندہ سلامت واپس نہیں آیا۔[1]

درحقیقت فرعون چاہتا تھا کہ اس قسم کی تیز و تند گفتگو کر کے موسیٰ علیہ السلام کو ہراساں کرے تاکہ وہ ڈر کر چپ ہو جائیں کیونکہ اگر بحث جاری رہے گی تو لوگ اس سے بیدار ہوں گے اور ظالم و جابر لوگوں کے لیے عوام کی بیداری اور شعور سے بڑھ کر کوئی اور چیز خطرناک نہیں ہوتی۔

---

[1] " تفسیر المیزان "، " تفسیر رازی " اور " تفسیر روح المعانی " اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

۳۰۔ قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ ۝ۚ
۳۱۔ قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ۝
۳۲۔ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ۝ۚۖ
۳۳۔ وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ ۝ع
۳۴۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِیْمٌ ۝ۙ
۳۵۔ یُّرِیْدُ اَنْ یُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖۗ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۝
۳۶۔ قَالُوْۤا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ۝ۙ
۳۷۔ یَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِیْمٍ ۝

ترجمہ

۳۰۔ (موسیٰ نے) کہا: اگر میں تمھارے پاس اپنی رسالت کی واضح نشانی لے آؤں تو کیا پھر بھی؟
۳۱۔ (فرعون نے) کہا، اگر سچ کہتے ہو تو لے آؤ۔
۳۲۔ اسی اثنا میں موسیٰ نے اپنا عصا پھینک دیا تو وہ بہت بڑا اور واضح سانپ بن گیا۔
۳۳۔ پھر اپنے ہاتھ کو گریبان میں لے گئے اور واپس نکالا تو وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید اور چمک دار تھا۔
۳۴۔ (فرعون نے) اپنے اطرافیوں سے کہا یہ تو ماہر اور سمجھ دار جادوگر ہے۔
۳۵۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے ذریعے تمھیں تمھاری سرزمین سے نکال دے تمھارا کیا حکم ہے؟
۳۶۔ انھوں نے کہا کہ اسے اور اس کے بھائی کو مہلت دے اور تمام شہروں کی طرف ہرکارے بھیج دے۔
۳۷۔ تاکہ وہ ہر ماہر جادوگر کو تیرے پاس لے آئیں۔

Marfat.com

تفسیر

تمھارا ملک خطرے میں ہے

گزشتہ آیات میں ہم نے دیکھ لیا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے منطق اور استدلال کی رُو سے فرعون پر کیونکر اپنی فوقیت اور برتری کا سکہ منوالیا اور حاضرین پر ثابت کر دیا کہ ان کا خدائی دین کس قدر عقلی و منطقی ہے اور یہ بھی واضح کر دیا کہ فرعون کے خدائی دعوے کس قدر پوچ اور عقل و خرد سے عاری ہیں کبھی تو وہ استہزاء کرتا ہے کبھی جنون اور دیوانگی کی تہمت لگاتا ہے اور آخر کار طاقت کے نشے میں آکر قید و بند اور موت کی دھمکی دیتا ہے۔

اس موقع پر گفتگو کا رخ تبدیل ہو جاتا ہے اب جناب موسیٰؑ کو ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس سے فرعون کا عجز ظاہر ہو جائے۔

موسیٰؑ کو بھی کسی طاقت کے سہارے کی ضرورت تھی ایسی خدائی طاقت جس کے معجزانہ انداز ہوں، چنانچہ آپؑ فرعون کی طرف منہ کرکے فرماتے ہیں: آیا اگر میں اپنی رسالت کے لیے واضح نشانی لے آؤں پھر بھی تو مجھے زندان میں ڈالے گا (قال اولو جئتك بشیء مبین)۔

اس موقع پر فرعون سخت مخمصے میں پڑ گیا، کیونکہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے ایک نہایت ہی اہم اور عجیب و غریب منصوبے کی طرف اشارہ کرکے حاضرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی۔ اگر فرعون ان کی باتوں کو ان سنا کرکے ٹال دیتا تو سب حاضرین اس پر اعتراض کرتے اور کہتے کہ موسیٰ کو وہ کام کرنے کی اجازت دی جائے اگر وہ ایسا کر سکتا ہے تو معلوم ہو جائے گا اور اس سے مقابلہ نہیں کیا جاسکے گا اور اگر ایسا نہیں کر سکتا تو بھی اس کی شیخی آشکارا ہو جائے گی۔ بہرحال موسیٰؑ کے اس دعوے کو آسانی سے مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آخر کار فرعون نے مجبور ہو کر کہا: "اگر سچ کہتے ہو تو اسے لے آؤ" (قال فأت به ان کنت من الصادقین)۔

اسی دوران میں موسیٰ نے جو عصا ہاتھ میں لیا ہوا تھا زمین پر پھینک دیا اور وہ (خُدا کے حکم سے) بہت بڑا اور واضح سانپ بن گیا" (فالقٰی عصاه فاذا هی ثعبان مبین)۔

پھر اپنا ہاتھ آستین میں لے گئے اور باہر نکالا تو اچانک وہ دیکھنے والوں کے لیے سفید اور چمک دار بن چکا تھا (و نزع یده فاذا هی بیضاء للناظرین)۔

درحقیقت یہ دو عظیم معجزے تھے۔ ایک خوف کا مظہر تھا تو دوسرا امید کا مظہر۔ پہلے میں انذار کا پہلو تھا تو دوسرے میں بشارت کا۔ ایک خدائی عذاب کی علامت تھی تو دوسرا نور اور رحمت کی نشانی۔ کیونکہ معجزے کو پیغمبر خدا کی دعوت کے مطابق ہونا چاہیے۔

"ثعبان" بہت بڑے سانپ کا نام ہے جسے فارسی میں "اژدہا" کہتے ہیں۔

"راغب" نے اپنی کتاب "مفردات" میں لکھا ہے کہ "ثعبان"، "ثعب" کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے پانی کا چلنا

Marfat.com

کیونکہ سانپ کی حرکت بھی پانی کی طرح ہوتی ہے جو بل کھا کر چلتا ہے۔

"مبین" کی تعبیر سے ممکن ہے کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو کہ عصا سچ مچ سانپ بن گیا۔ اس میں ہاتھ کی صفائی فریبِ نظر اور جادو کارفرما نہ تھا۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر "ثعبان" کا لفظ آیا ہے اور سورۂ نمل کی آیت ۱۰ اور سورۂ قصص کی آیت ۳۱ میں "جان" کا لفظ استعمال ہوا ہے (جس کا معنیٰ ہے چھوٹے چھوٹے اور تیز رفتار سانپ) سورۂ طٰہٰ کی آیت ۲۰ میں "حیۃ" کا لفظ ذکر ہوا ہے (جس کا معنیٰ ہے سانپ، اور "حیات" کے مادہ سے لیا گیا ہے)۔

بادی النظر میں یہ تعبیریں مختلف نظر آتی ہیں جن سے ذہن میں مختلف سوال بھی اٹھ سکتے ہیں لیکن حقیقت میں مندرجہ ذیل دو مطالب میں سے کسی ایک کے بیان کرنے کے لیے ہیں:

ایک تو یہ ممکن ہے یہ اس سانپ کی مختلف حالتوں کی طرف اشارہ ہو کہ پہلے تو وہ "عصا" چھوٹا سا ایک سانپ بن جاتا ہو، پھر آہستہ آہستہ بڑا ہوتے ہوتے اژدہا بن جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ممکن ہے کہ یہ تینوں الفاظ اس سانپ کی مختلف خاصیتوں کی طرف اشارہ ہوں "ثعبان" اس کے بڑا ہونے کی طرف اشارہ ہو اور "جان" اس کی تیز رفتاری کی طرف اور "حیۃ" اس کے زندہ سلامت ہونے کی طرف اشارہ ہو۔

فرعون نے جب یہ صورت حال دیکھی تو سخت بوکھلا گیا اور وحشت کی گہری کھائی میں جا گرا لیکن اپنے شیطانی اقتدار کو بچانے کے لیے جو موسیٰؑ کے ظہور کے ساتھ متزلزل ہو چکا تھا اس نے ان معجزات کی توجیہ کرنا شروع کر دی تاکہ اس طرح سے اطراف میں بیٹھنے والوں کے عقائد محفوظ اور ان کے حوصلے بلند کرکے اس نے پہلے تو اپنے حواری سرداروں سے کہا: یہ شخص ماہر اور سمجھ دار جادوگر ہے (قال للملاِ حولہ ان ھذا لساحر علیم)۔

جس شخص کو تھوڑی دیر پہلے تک دیوانہ کہہ رہا تھا اب اسے "علیم" کے نام سے یاد کر رہا ہے۔ ظالم اور جابر لوگوں کا طریقہ کار ایسا ہی ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی محفل میں کئی روپ تبدیل کر لیتے ہیں اور اپنی انا کی تسکین کے لیے نت نئے حیلے تراشتے رہتے ہیں۔

اس نے سوچا چونکہ اس زمانے میں جادو کا دور دورہ ہے لہٰذا موسیٰؑ کے معجزات پر جادو کا لیبل لگا دیا جائے تاکہ لوگ اس کی حقانیت کو تسلیم نہ کریں۔

پھر اس نے لوگوں کے جذبات بھڑکانے اور موسیٰؑ کے خلاف ان کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لیے کہا: وہ اپنے جادو کے ذریعے تمھیں تمھارے ملک سے نکالنا چاہتا ہے (یرید ان یخرجکم من ارضکم بسحرہ)۔

تم لوگ اس بارے میں کیا سوچ رہے ہو اور کیا حکم دیتے ہو (فماذا تامرون)۔

یہ وہی فرعون ہے جو کچھ دیر پہلے تک تمام سرزمین مصر کو اپنی ملکیت سمجھ رہا تھا "الیس لی ملک مصر" (کیا سرزمین مصر پر میری حکومت اور ملکیت نہیں ہے) اب جبکہ اسے اپنا راج سنگھاسن ڈولتا نظر آ رہا ہے تو اپنی حکومتِ مطلقہ کو مکمل طور پر فراموش کر کے اسے عوامی ملکیت کے طور پر یاد کر کے کہتا ہے "تمھارا ملک خطرات میں گھر چکا ہے اسے بچانے کی سوچو"۔

Marfat.com

وہی فرعون جو ایک لحظہ قبل کسی کی بات سننے پر تیار نہیں تھا بلکہ ایک مطلق العنان آمر کی حیثیت سے تختِ حکومت پر براجمان تھا اب اس حد تک عاجز اور درماندہ ہو چکا ہے کہ اپنے اطرافیوں سے درخواست کر رہا ہے کہ تمھارا کیا حکم ہے نہایت ہی عاجز اور کمزور ہو کر التجا کر رہا ہے۔

سورۂ اعراف کی آیت ۱۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے درباری باہمی طور پر مشورے کرنے لگ گئے وہ اس قدر حواس باختہ ہو چکے تھے کہ سوچنے کی طاقت بھی ان سے سلب ہو گئی تھی۔ ہر کوئی دوسرے کی طرف منہ کر کے کہتا: ۔

"تمھاری کیا رائے ہے؟"

جی ہاں! پوری تاریخ انسانی میں ظالم حکمرانوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ جب وہ ملکی حالات پر مکمل طور پر مسلّط ہوتے ہیں تو ہر چیز کو اپنی ملکیت اور ہر ایک کو اپنا غلام سمجھتے ہیں اور جبر واستبداد ان کی منطق ہوتی ہے۔

لیکن جب اپنی ظالمانہ حکومت کی چولیں ہلتی نظر آتی ہیں تو وقتی طور پر سخت استبداد سے اُتر کر عوام کا دامن تھامنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی آراء وافکار کو اہمیت دینے لگ جاتے ہیں، عوامی حکومت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں "ملک کے اصلی مالک عوام ہیں" کا شور مچاتے ہیں ان کی رائے کا احترام کرتے ہیں لیکن جب بحرانی لمحات ٹل جاتے ہیں تو پھر وہی چال بے ڈھنگی ....

ہمیں بھی ایک ایسے بادشاہ سے پالا پڑا ہے کہ جب سلطنت کے حالات اس کے لیے ساز گار تھے تو اس نے تمام مملکت کو اپنی ذاتی ملکیت بنا رکھا تھا حتیٰ کہ جو لوگ اس کی پارٹی کا رکن نہیں بننا چاہتے تھے انھیں ملک سے چلے جانے کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ خدا کی زمین وسیع ہے جہاں چاہو چلے جاؤ اس ملک میں تمھارے رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی ہوگا اور بس!

لیکن جب انقلاب کی آندھی چلی تو یہی آمر مطلق عوام کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا۔ اپنے گناہوں کی معافی کا طلب گار ہوا، گناہوں سے توبہ کی لیکن عوام نے اسے سالہا سال سے پہچانا ہوا تھا کہ سب دھوکا اور فریب ہے لہٰذا عوام کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔

بہرحال کافی صلاح مشورے کے بعد درباریوں نے فرعون سے کہا: موسیٰ اور اس کے بھائی کو مہلت دو اور اس بارے میں جلدی نہ کرو اور تمام شہروں میں ہرکارے روانہ کر دو" (قالوا ارجه واخاه وابعث فی المدائن حاشرین)[1]

تاکہ ہر ماہر اور منجھے ہوئے جادوگر کو تمھارے پاس لے آئیں (یأتوك بكل سحار عليم)۔

دراصل فرعون کے درباری یا تو غفلت کا شکار ہو گئے یا موسیٰ علیہ السلام پر فرعون کی تہمت کو جان بوجھ کر قبول کر لیا اور موسیٰ کو "ساحر" (جادوگر) سمجھ کر پروگرام مرتب کیا کہ ساحر کے مقابلے میں "سحار" یعنی ماہر اور منجھے ہوئے جادوگر لا

---

[1] "ارجه" کا کلمہ "ارجاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے فیصلے میں تاخیر سے کام لینا اور جلدی نہ کرنا اور اس کی آخری ضمیر موسیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہ صیغہ دراصل "ارجئه" تھا۔ ہمزہ کو تخفیف کے لیے حذف کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

کو بلایا جائے ۔

چنانچہ انھوں نے کہا : خوش قسمتی سے ہمارے وسیع وعریض ملک (مصر) میں فنِ جادو کے بہت سے ماہر استاد موجود ہیں اگر موسیٰ ساحر ہے تو ہم اس کے مقابلے میں سحار لا کھڑا کریں گے اور فنِ سحر کے ایسے ایسے ماہرین کو لے آئیں گے جو ایک لمحہ میں موسیٰ کا بھرم کھول کر رکھ دیں گے ۔

"حاشرین" "حشر" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے میدان جنگ یا اسی قسم کے مقام پر کچھ لوگوں کو تیار کر کے لے آنا یعنی فرعون کے ہرکاروں کو حکم ہوا کہ موسیٰ کے مقابلے کے لیے ہر قیمت پر ماہر جادوگروں کو جمع کر کے لائیں ۔

Marfat.com

۳۸۔ فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ۙ○

۳۹۔ وَّقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ۙ○

۴۰۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ إِن كَانُوا هُمُ الْغَالِبِينَ ○

۴۱۔ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالُوا لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِينَ ○

۴۲۔ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ○

ترجمہ

۳۸۔ آخر کار ایک دن مقررہ وقت پر جادوگر اکٹھے ہو گئے۔

۳۹۔ اور لوگوں سے کہا گیا کہ تم بھی (اس میدان میں) جمع ہو جاؤ۔

۴۰۔ تاکہ اگر جادوگر کامیاب ہو جائیں تو ہم ان کی پیروی کریں۔

۴۱۔ جب تمام جادوگر آ گئے، تو انھوں نے فرعون سے کہا: اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لیے کوئی خاص اجر بھی ہو گا؟

۴۲۔ اس نے کہا ہاں! اور تم اس صورت میں (ہمارے) مقربین میں سے قرار پاؤ گے۔

تفسیر

ہر طرف سے جادوگر پہنچ گئے

ان آیات میں اس دلچسپ داستان کا ایک اور پہلو بیان کیا گیا ہے:

فرعون کے درباریوں کی تجویز کے بعد مصر کے مختلف شہروں کی طرف ملازمین روانہ کر دیئے گئے اور انھوں نے ہر جگہ پر ماہر جادوگروں کی تلاش شروع کر دی "آخر کار ایک مقررہ دن کی میعاد کے مطابق جادوگروں کی ایک جماعت اکٹھا کر لی گئی" (فجمع السحرة لميقات يوم معلوم)۔

دوسرے لفظوں میں انھوں نے جادوگروں کو اس روز کے لیے پہلے ہی سے تیار کر لیا تاکہ ایک مقرر دن مقابلے کے

Marfat.com

لیے پہنچ جائیں ۔

"یوم معلوم" سے کیا مراد ہے ؟ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیات سے معلوم ہوتا ہے مصریوں کی کسی مشہور عید کا دن تھا جسے موسیٰ علیہ السلام نے مقابلے کے لیے مقرر کیا تھا اور اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس دن لوگوں کو فرصت ہوگی اور وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں گے کیونکہ انھیں اپنی کامیابی کا مکمل یقین تھا اور وہ چاہتے تھے کہ آیاتِ خداوندی کی طاقت اور فرعون اور اس کے ساتھیوں کی کمزوری اور پستی سب دنیا پر آشکار ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں شمعِ ایمان روشن ہو جائے ۔

اس میدان مقابلہ میں عوام الناس کو بھی دعوت دی گئی "اور لوگوں سے کہا گیا کہ آیا تم بھی اس میدان میں اکٹھے ہو گے ؟"

(و قیل للناس هل انتم مجتمعون) ۔

اس طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کے کارندے اس سلسلے میں سوچی سمجھی سکیم کے تحت کام کر رہے تھے انھیں معلوم تھا کہ لوگوں کو زبردستی میدان میں لانے کی کوشش کی جائے تو ممکن ہے کہ اس کا منفی ردعمل ہو کیونکہ ہر شخص فطری طور پر زبردستی کو قبول نہیں کرتا لہٰذا انھوں نے کہا اگر تمھارا جی چاہے تو اس اجتماع میں شرکت کرو اس طرح سے بہت سے لوگ اس اجتماع میں شریک ہوئے ۔

لوگوں کو بتایا گیا " مقصد یہ ہے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے کہ جن کی کامیابی ہمارے خداؤں کی کامیابی ہے تو ہم ان کی پیروی کریں گے "اور میدان کو اس قدر گرم کر دیں گے کہ ہمارے خداؤں کا دشمن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میدان چھوڑ جائے گا (لعلنا نتبع السحرة ان كانوا هم الغالبين) ۔

واضح ہے کہ تماشائیوں کا زیادہ سے زیادہ اجتماع جو مقابلے کے ایک فریق کے ہمنوا بھی ہوں ایک طرف تو ان کی دلچسپی کا سبب ہو گا اور ان کے حوصلے بلند ہوں گے اور ساتھ ہی وہ کامیابی کے لیے زبردست کوشش بھی کریں گے اور کامیابی کے موقع پر ایسا شور مچائیں گے کہ حریف ہمیشہ کے لیے گوشۂ گمنامی میں چلا جائے گا اور اپنی عددی کثرت کی وجہ سے مقابلے کے آغاز میں فریق مخالف کے دل میں خوف و ہراس اور رعب و وحشت بھی پیدا کر سکیں گے ۔

یہی وجہ ہے کہ فرعون کے کارندے کوشش کر رہے تھے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کریں ، موسیٰ علیہ السلام بھی ایسے کثیر اجتماع کی خدا سے دعا کر رہے تھے تاکہ اپنا مدعا اور مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں ۔

یہ سب کچھ ایک طرف ، ادھر "جب جادوگر فرعون کے پاس پہنچے اور اسے مشکل میں پھنسا ہوا دیکھا تو موقع مناسب سمجھتے ہوئے اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے اور بھاری انعام وصول کرنے کی غرض سے اسے کہا : اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا ہمارے لیے کوئی اہم صلہ بھی ہو گا ؟" (فلما جاء السحرة قالوا لفرعون ائن لنا لاجرًا ان كنا نحن الغالبين) ۔

فرعون جو بری طرح پھنس چکا تھا اور اپنے لیے کوئی راہ نہیں پاتا تھا انھیں زیادہ سے زیادہ مراعات اور اعزاز دینے پر تیار ہو گیا اس نے فوراً کہا : ہاں ہاں جو کچھ تم چاہتے ہو میں دوں گا اس کے علاوہ اس صورت میں تم میرے مقربین بھی بن جاؤ گے (قال نعم و انكم اذًا لمن المقربين) ۔

درحقیقت فرعون نے انھیں کہا : تم کیا چاہتے ہو مال ہے یا عہدہ : میں یہ دونوں تمھیں دوں گا ۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول اور زمانے میں فرعون کا قرب کس حد تک اہم تھا کہ وہ ایک عظیم انعام کے طور پر اس کی پیش کش کر رہا تھا در حقیقت اس سے بڑھ کر اور کوئی صلہ نہیں ہو سکتا کہ انسان اپنے مطلوب کے زیادہ نزدیک ہو۔

اگر گمراہ لوگ فرعون کے قرب کو اپنی بہت بڑی عزت سمجھتے تھے تو باخبر اور آگاہ خدا پرست بھی اپنی سب سے عظیم سعادت قربِ الٰہی کو جانتے تھے اور اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتی۔ حتیٰ کہ بہشت کی تمام نعمتوں کے باوجود خداوندِ عالم کی ذات پاک کے جلوے کے مقابلے میں اسے کچھ اہمیت نہیں دیتے۔

اسی بناء پر اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کا عظیم ترین اجر جو انھیں ان کے عظیم ایثار کے بدلے میں ملے گا وہ قرآن کی گواہی کے مطابق "قرب خداوندی" ہو گا چنانچہ "عند ربھم" کی تعبیر اس حقیقت کی شاہد ناطق ہے۔

اسی وجہ سے پاک دل مومن اپنی عبادت کی ادائیگی کے وقت جو چیز خدا سے مانگتا ہے وہ صرف اور صرف "قربة الی اللہ" ہے۔

Marfat.com

۴۳۔ قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ○
۴۴۔ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ
الْغٰلِبُوْنَ ○
۴۵۔ فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ○
۴۶۔ فَاُلْقِیَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ○
۴۷۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○
۴۸۔ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ○
۴۹۔ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِیْ عَلَّمَكُمُ
السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۥ لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ ○
۵۰۔ قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۖ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ○
۵۱۔ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

ترجمہ

۴۳۔ (وعدے کا دن آن پہنچا اور سب لوگ جمع گئے) موسٰی نے (جادوگروں کی طرف منہ کرکے) کہا: تم جو کچھ پھینکنا چاہتے ہو پھینکو۔
۴۴۔ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں اور کہا فرعون کی عزت کی قسم ہم کامیاب ہیں۔
۴۵۔ پھر موسٰی نے اپنا عصا پھینکا تو اس نے اچانک ان کے جھوٹے کرشموں کو نگلنا شروع کردیا۔
۴۶۔ سب کے سب جادوگر فوراً سجدے میں گر پڑے۔

Marfat.com

۴۷۔ اور کہنے لگے ہم عالمین کے رب پر ایمان لے آئے۔
۴۸۔ جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے۔
۴۹۔ (فرعون نے) کہا: میری اجازت کے بغیر ہی تم اس پر ایمان لے آئے ہو؟ یقیناً وہ تمھارا بڑا اور استاد ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے لیکن بہت جلد جان لوگے کہ میں تمھارے ہاتھوں اور پاؤں کو مختلف سمت میں کاٹ دوں گا اور تم سب کو سولی پر لٹکاؤں گا۔
۵۰۔ تو سب نے کہا: کوئی بڑی بات نہیں (تم جو کچھ کر سکتے ہو کرو) ہم تو اپنے رب کی طرف لوٹ جائیں گے۔
۵۱۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہماری خطاؤں کو معاف کر دے گا، کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں۔

تفسیر

جادوگروں کے دل میں نورِ ایمان چمک اُٹھا

جب جادوگروں نے فرعون کے ساتھ اپنی بات پکی کر لی اور اس نے بھی انعام، اُجرت اور اپنی بارگاہ کے مقرب ہونے کا وعدہ کر کے انھیں خوش کر دیا اور وہ بھی مطمئن ہو گئے تو اپنے فن کے مظاہرے اور اس کے اسباب کی فراہمی کے لیے تگ و دو کرنی شروع کر دی، فرصت کے ان لمحات میں انھوں نے بہت سی رسیاں اور لاٹھیاں اکٹھی کر لیں اور بظاہر ان کے اندر کو کھوکھلا کر کے ان میں ایسا کوئی کیمیکل مواد (پارہ وغیرہ کی مانند) بھر دیا جس سے وہ سورج کی تپش میں ہلکی ہو کر بھاگنے لگ جاتی ہیں۔

آخر کار وعدے کا دن پہنچ گیا اور لوگوں کا انبوہ کثیر میدان میں جمع ہو گیا۔ تاکہ وہ اس تاریخی مقابلے کو دیکھ سکیں فرعون اور اس کے درباری، جادوگر اور موسیٰؑ اور ان کے بھائی ہارونؑ سب میدان میں پہنچ گئے۔

لیکن حسب معمول قرآن مجید اس بحث کو حذف کر کے اصل بات کو بیان کرتا ہے۔

یہاں پر بھی اس تاریخ ساز منظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتا ہے: موسیٰؑ نے جادوگروں کی طرف منہ کر کے کہا جو کچھ پھینکنا چاہتے ہو پھینکو اور جو کچھ تمھارے پاس ہے میدان میں لے آؤ (قال لهم موسٰى القوا ما انتم ملقون)۔

سورۂ اعراف کی آیت ۱۱۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام نے یہ بات اس وقت کی جب جادوگروں نے انھیں کہا: آپ پیش قدم ہو کر اپنی چیز ڈالیں گے یا ہم؟

موسیٰ علیہ السلام کی یہ پیش کش درحقیقت انھیں اپنی کامیابی پر یقین کی وجہ سے تھی اور اس بات کی مظہر تھی کہ فرعون کے

Marfat.com

زبردست حامیوں اور دشمن کے انبوہ کثیر سے وہ ذرہ بھر بھی خائف نہیں چنانچہ یہ پیش کش کر کے آپ نے جادوگروں پر سب سے پہلا کامیاب وار کیا جس سے جادوگروں کو بھی معلوم ہو گیا کہ موسیٰ ایک خاص نفسیاتی سکون سے بہرہ مند ہیں اور وہ کسی ذات خاص سے لو لگائے ہوئے ہیں کہ جوان کا حوصلہ بڑھا رہی ہے۔

جادوگر تو غرور و نخوت کے سمندر میں غرق تھے انھوں نے اپنی انتہائی کوششیں اس کام کے لیے صرف کر دی تھیں اور انھیں اپنی کامیابی کا بھی یقین تھا لہٰذا انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں اور کہا فرعون کی عزت کی قسم ہم یقیناً کامیاب ہیں (فالقوا حبالھم وعصیھم و قالوا بعزۃ فرعون انا لنحن الغالبون)[1]

جی ہاں! انھوں نے دوسرے تمام چاپلوس خوشامدیوں کی مانند فرعون کے نام سے شروع کیا اور اس کے کھوکھلے اقتدار کا سہارا لیا۔

جیسا کہ قرآن مجید ایک اور مقام پر کہتا ہے: اس موقع پر انھوں نے جب رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینکیں تو وہ چھوٹے بڑے سانپوں کی طرح زمین پر حرکت کرنے لگیں (طٰہٰ ۶۶) انھوں نے اپنے جادو کے ذرائع میں سے لاٹھیوں کا انتخاب کیا ہوا تھا تاکہ وہ بزعم خود موسیٰ کی عصا کی برابری کر سکیں اور مزید برتری کے لیے رسیوں کو بھی ساتھ شامل کر لیا تھا۔

اسی دوران میں حاضرین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور فرعون اور اس کے درباریوں کی آنکھیں خوشی کے مارے چمک اٹھیں اور وہ مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے تھے یہ منظر دیکھ کر ان کے اندر وجد و سرور کی کیفیت پیدا ہو گئی اور وہ جھوم رہے تھے۔

لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اس کیفیت کو زیادہ دیر نہیں پنپنے دیا وہ آگے بڑھے اور اپنے عصا کو زمین پر دے مارا تو وہ اچانک ایک اژدہے کی شکل میں تبدیل ہو کر جادوگروں کے ان کرشموں کو جلدی جلدی نگلنے لگا اور انھیں ایک ایک کر کے کھا گیا۔

(فالقیٰ موسیٰ عصاہ فاذا ھی تلقف ما یأفکون)[2]

اس موقع پر لوگوں پر یکدم سکوت طاری ہو گیا حاضرین پر سناٹا چھا گیا تعجب کی وجہ سے ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے، آنکھیں پتھرا گئیں گویا ان میں جان ہی نہیں رہی لیکن بہت جلد تعجب کی بجائے وحشت ناک چیخ و پکار شروع ہو گئی، کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے کچھ لوگ نتیجے کے انتظار میں رک گئے اور کچھ لوگ بے مقصد نعرے لگا رہے تھے لیکن جادوگروں کے منہ تعجب کی وجہ سے کھلے ہوئے تھے۔

اس مرحلے پر سب کچھ تبدیل ہو گیا جو جادوگر اس وقت تک شیطانی رستے پر گامزن، فرعون کے ہم رکاب اور موسیٰ کے مخالف تھے یک دم اپنے آپے میں آ گئے اور کیونکہ جادو کے ہر قسم کے ٹونے ٹوٹکے اور مہارت اور فن سے واقف تھے اس لیے انھیں یقین آ گیا کہ ایسا کام ہرگز جادو نہیں ہو سکتا بلکہ یہ خدا کا ایک عظیم معجزہ ہے لہٰذا اچانک وہ سارے کے سارے سجدے میں

---

[1] "حبال" "حبل" (بروزن طبل) کی جمع ہے جس کا معنی ہے رسی اور "عصی" "عصا" کی جمع ہے۔

[2] "تلقف" "لقف" (بروزن سقف) کسی چیز کا جلدی جلدی پکڑنا کے معنی میں ہے خواہ وہ ہاتھ سے ہو یا منہ سے اور ظاہر ہے کہ یہاں پر منہ سے پکڑنے کے معنی ہیں اور "یأفکون" "افک" (بروزن کذب) کا معنی جھوٹ ہے یہاں پر جھوٹے کرشموں اور ذرائع کی طرف اشارہ ہے۔

Marfat.com

گر پڑے (فالقی السحرۃ ساجدین)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے یہاں پر " القی " کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا معنیٰ ہے گرا دیئے گئے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ جناب موسیٰ علیہ السّلام کے معجزے سے اس قدر متاثر ہو چکے تھے کہ بے اختیار زمین پر سجدے میں جا پڑے۔

اس عمل کے ساتھ ساتھ جو ان کے ایمان کی روشن دلیل تھا انھوں تے زبان سے بھی کہا: ہم عالمین کے پروردگار پر ایمان لے آئے (قالوا آمنا برب العالمین)۔ اور ہر قسم کا ابہام و شک دور کرنے کے لیے انھوں نے ایک اور جملے کا بھی اضافہ کیا تاکہ فرعون کے لیے کسی قسم کی تاویل باقی نہ رہے، انھوں نے کہا: موسیٰ اور ہارون کے رب پر ؛ (رب موسیٰ وھارون)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عصا زمین پر مارنے اور ساحرین کے ساتھ گفتگو کرنے کا کام اگرچہ موسیٰؑ نے انجام دیا لیکن ان کے بھائی ہارونؑ بھی ان کے ساتھ ساتھ ان کی حمایت اور مدد کر رہے تھے۔

یہ عجیب و غریب تبدیلی جادوگروں کے دل میں پیدا ہو گئی اور انھوں نے ایک مختصر سے عرصے میں مطلق تاریکی سے نکل کر روشنی اور نور میں قدم رکھ دیا اور جن جن مفادات کا فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا ان سب کو ٹھکرا دیا۔ یہ بات تو آسان تھی۔ انھوں نے اس اقدام سے اپنی جانوں کو بھی خطرے میں ڈال دیا۔ یہ صرف اس وجہ سے تھا کہ ان کے پاس علم و دانش تھا جس کے باعث وہ حق اور باطل میں تمیز کرنے میں کامیاب ہو گئے اور حق کا دامن تھام لیا۔

انھوں نے باقی ماندہ راہ کو "عقل کے پاؤں سے" طے نہیں کیا بلکہ "عشق کے راہوار" پر سوار ہو کر آگے بڑھے اور بوئے گل نے انھیں ایسا مست کیا کہ وہ خود سے بے گانہ ہو گئے اور ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اسی بناء پر انھوں نے فرعون کی زبردست دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اس کے ہر ظلم و ستم کا شجاعانہ اور مردانہ وار مقابلہ کیا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث ہے :۔

ما من قلب الا بین اصبعین من اصابع الرحمان ان شاء اقامہ و ان شاء ازاغہ

ہر ایک دل خداوند رحمان کے پنجۂ قدرت میں ہے اگر چاہے تو اسے راہِ راست پر لگا دے اور اگر چاہے تو اسے پھیر دے [1]

(ظاہر ہے کہ ان دونوں مراحل میں منشائے ایزدی خود انسان کی آمادگی پر منحصر ہے اور اس قسم کی توفیق یا سلبِ توفیق دلوں کی مختلف آمادگی کی بدولت حاصل ہوتی ہے اور کسی حساب و کتاب کے بغیر حاصل نہیں ہوتی)۔

اس موقع پر ایک طرف تو فرعون کے اوسان خطا ہو چکے تھے اور دوسرے اسے اپنا اقتدار بلکہ اپنا وجود خطرے میں دکھائی دے رہا تھا خاص طور پر وہ جانتا تھا کہ جادوگروں کا ایمان لانا حاضرین کے دلوں پر کس قدر مؤثر ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کافی سارے

---

[1] تفسیر فی ظلال القرآن جلد ۶ ص ۲۰۸۔

Marfat.com

لوگ جادوگروں کی دیکھا دیکھی سجدے میں گر جائیں لہٰذا اس نے بزعم خود ایک نئی اپج نکالی اور جادوگروں کی طرف منہ کر کے کہا: تم میری اجازت کے بغیر ہی اس پر ایمان لے آئے ہو (قال اٰمنتم لہ قبل ان اٰذن لکم)[ل]

چونکہ وہ سالہا سال سے تحت استبداد پر براجمان چلا آرہا تھا لہٰذا اسے قطعاً یہ اُمید نہیں تھی کہ لوگ اس کی اجازت کے بغیر کوئی کام انجام دیں گے بلکہ اسے تو یہ توقع تھی کہ لوگوں کے قلب و عقل اور فکر و اختیار اس کے قبضۂ قدرت میں ہیں جب تک وہ اجازت نہ دے وہ نہ تو کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ فیصلہ کر سکتے ہیں، جابر حکمرانوں کے طریقے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔

یہ مغرور سرکش تو اس بات کا روادار بھی نہ تھا کہ خدا یا موسیٰ علیہ السلام کا نام ہی زبان پر لے آئے بلکہ اس نے حقارت اور نفرت کے اظہار کی صورت میں صرف " لہ " پر ہی اکتفا کیا۔

لیکن اس نے اسی بات کو کافی نہیں سمجھا بلکہ دو جملے اور بھی کہے تاکہ اپنے زعم باطل میں اپنی حیثیت اور شخصیت کو برقرار رکھ سکے اور ساتھ ہی عوام کے بیدار شدہ افکار کے آگے بند باندھ سکے اور انھیں دوبارہ خواب غفلت میں سلا دے۔

اس نے پہلے جادوگروں سے کہا: تمھاری موسیٰ سے یہ پہلے سے لگی بندھی سازش ہے بلکہ مصری عوام کے خلاف ایک خطرناک منصوبہ ہے اس نے کہا وہ تمھارا بزرگ اور استاد ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے اور تم سب نے جادوگری کی تعلیم اسی سے حاصل کی ہے (انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر)۔

تم نے پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت یہ ڈرامہ رچایا ہے تاکہ مصر کی عظیم قوم کو گمراہ کر کے اس پر اپنی حکومت چلاؤ اور اس ملک کے اصلی مالکوں کو ان کے گھروں سے بے گھر کر دو اور ان کی جگہ غلاموں اور کنیزوں کو ٹھہراؤ۔

لیکن میں تمھیں کبھی اس بات کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم اپنی سازش میں کامیاب ہو جاؤ، میں اس سازش کو پنپنے سے پہلے ہی ناکام کر دوں گا، تم بہت جلد جان لوگے کہ تمھیں ایسی سزا دوں گا جس سے دوسرے لوگ عبرت حاصل کریں گے تمھارے ہاتھ اور پاؤں کو ایک دوسرے کی مخالف سمت میں کاٹ ڈالوں گا (دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں یا بایاں ہاتھ اور دایاں پاؤں) اور تم سب کو (کسی استثناء کے بغیر) سولی پر لٹکا دوں گا۔ (فلسوف تعلمون لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ولاصلبنکم اجمعین)۔

یعنی صرف یہی نہیں کہ تم سب کو قتل کر دوں گا بلکہ ایسا قتل کروں گا جس میں دکھ، درد، تکلیف اور شکنجہ بھی ہوگا اور وہ بھی سرعام کھجور کے بلند درختوں پر۔ کیونکہ ہاتھ پاؤں کے مخالف سمت کے کاٹنے سے احتمالاً انسان کی دیر سے موت واقع ہوتی ہے اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے۔

ہر دور کے ظالم اور جابر حکمرانوں کا یہی شیوہ رہا ہے کہ پہلے تو وہ خدا کے مصلح لوگوں پر عوام کے خلاف سازش کا الزام لگاتے ہیں

[ل] یہاں پر اور سورہ طٰہٰ کی آیت ۷۱ میں " اٰمنتم لہ " آیا ہے جبکہ سورۂ اعراف کی آیت ۱۲۳ میں " اٰمنتم بہ " آیا ہے چنانچہ بعض اربابِ لغت کے مطابق اگر " ایمان " " لام " کے ساتھ متعدی ہو تو خضوع و خشوع کا معنی دیتا ہے اور اگر " با " کے ساتھ متعدی ہو تو تصدیق کا معنی دیتا ہے۔

Marfat.com

پھر تہمتوں اور الزام تراشیوں کے حربے آزماتے ہیں آخر میں تلوار کا حربہ ہوتا ہے تاکہ اس طرح حق کے طلب گار افراد کی پہلے تو پوزیشن کمزور ہو اور پھر انھیں وہ اپنی راہ سے آسانی کے ساتھ ہٹادیں۔

لیکن فرعون یہاں پر سخت غلط فہمی میں مبتلا تھا کیونکہ کچھ دیر قبل کے جادوگر اور اس وقت کے مومن افراد کے دل نور ایمان سے اس قدر منور ہو چکے تھے اور خدائی عشق کی آگ ان کے دل میں اس قدر بھڑک چکی تھی کہ انھوں نے فرعون کی دھمکیوں کو ہرگز ہرگز کوئی وقعت نہ دی بلکہ بھرے مجمع میں اسے دو ٹوک جواب دے کر اس کے تمام شیطانی منصوبوں کو خاک میں ملادیا۔

انھوں نے کہا: کوئی بڑی بات نہیں اس سے ہمیں ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچے گا تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرلو ہم اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جائیں گے (قالوا لا ضير انا الی ربنا منقلبون)۔

اس کام سے نہ صرف یہ کہ تم ہمارا کچھ بگاڑ ہی نہیں سکو گے بلکہ ہمیں اپنے حقیقی معشوق اور معبود تک بھی پہنچا دو گے، تمھاری یہ دھمکیاں ہمارے لیے اس وقت مؤثر تھیں جب ہم نے خود کو نہیں پہچانا تھا، اپنے خدا سے ناآشنا تھے اور راہ حق کو بھلا کے زندگی کے بیابان میں سرگرداں تھے لیکن آج ہم نے اپنی گمشدہ گراں بہا چیز کو پالیا ہے جو کرنا چاہو کرلو۔

انھوں نے سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہم ماضی میں گناہوں کا ارتکاب کر چکے ہیں اور اس میدان میں بھی اللہ کے سچے رسول جناب موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مقابلے میں پیش پیش تھے اور حق کے ساتھ لڑنے میں ہم پیش قدم تھے لیکن "ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا پروردگار ہمارے گناہ معاف کردے گا کیونکہ ہم سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں" (انا نطمع ان یغفر لنا ربنا خطایانا ان کنا اول المؤمنین)۔

ہم آج کسی چیز سے نہیں گھبراتے نہ تو تمھاری دھمکیوں سے اور نہ ہی بلند و بالا کھجور کے درختوں کے تنوں پر سولی پر لٹک جانے کے بعد ہاتھ پاؤں مارنے سے۔

اگر ہمیں خوف ہے تو اپنے گزشتہ گناہوں کا اور امید ہے کہ وہ بھی ایمان کے سائے اور حق تعالیٰ کی مہربانی سے معاف ہوجائیں گے۔

یہ کیسی طاقت ہے کہ جب کسی انسان کے دل میں پیدا ہوجاتی ہے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کی نگاہوں میں حقیر ہوجاتی ہے اور وہ سخت سے سخت شکنجوں سے بھی نہیں گھبراتا اور اپنی جان دے دینا اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں رہتی۔

یقیناً یہ ایمانی طاقت ہوتی ہے۔

یہ عشق کے روشن و درخشاں چراغ کا شعلہ ہوتا ہے جو شہادت کے شربت کو انسان کے حلق میں شہد سے بھی زیادہ شیریں بنا دیتا ہے اور محبوب کے وصال کو انسان کا ارفع و اعلیٰ مقصد بنا دیتا ہے۔

یہ وہی طاقت ہے جس سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استفادہ کیا اور صدر اسلام کے مسلمانوں کی اسی سے تربیت کی جس کی وجہ سے ایک پسماندہ قوم بہت جلد اعزاز و افتخار کی بلندیوں کو چھونے لگی، ایسے مسلمان جن پر تاریخ بشریت تا ابد ناز کرتی رہے گی۔

Marfat.com

بہر حال یہ منظر فرعون اور اس کے ارکان سلطنت کے لیے بہت ہی مہنگا ثابت ہوا ہر چند کہ بعض روایات کے مطابق اس نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا اور تازہ ایمان لانے والے جادوگروں کو شہید کر دیا لیکن عوام کے جو جذبات موسیٰ کے حق میں اور فرعون کے خلاف بھڑک اُٹھے تھے وہ انھیں نہ صرف دبا نہ سکا بلکہ اور بھی برانگیختہ کر دیا۔

اب جگہ جگہ اس خدائی پیغمبر کے تذکرے ہونے لگے اور ہر جگہ ان با ایمان شہداء کے چرچے تھے بہت سے لوگ اس وجہ سے ایمان لے آئے جن میں فرعون کے کچھ نزدیکی لوگ بھی تھے حتیٰ کہ خود اس کی زوجہ ان ایمان لانے والوں میں شامل ہو گئی۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ کرنے والے تازہ مومن جادوگروں نے اپنے آپ کو پہلے مومن کیوں کہا؟ آیا ان کی مراد یہ تھی کہ وہ اس میدان میں سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں؟

یا فرعون کے حامیوں میں سے سب سے پہلے مومن ہیں؟

یا شربتِ شہادت نوش کرنے والے سب سے پہلے مومن ہیں؟

ان سب امور کا احتمال ہو سکتا ہے اور ان کا آپس میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔

یہ تمام تفسیریں اس صورت میں ممکن نہیں جب ہم اس بات کو تسلیم کریں کہ ان سے پہلے بنی اسرائیل یا غیر بنی اسرائیل میں سے کچھ اور لوگ بھی موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے ہوں گے لیکن اگر یہ کہیں کہ موسیٰ اور ہارون کو بعثت کے فوراً بعد حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ براہِ راست فرعون سے بات چیت کریں اور سب سے پہلی ضرب اس کے پیکر پر لگائیں تو ایسی صورت میں بعید نہیں ہے کہ وہ واقعاً پہلے مومنین ہوں اور پھر کسی دوسری تفسیر کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی۔

Marfat.com

۵۲۔ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ○
۵۳۔ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ○
۵۴۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ○
۵۵۔ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ ○
۵۶۔ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ○
۵۷۔ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ○
۵۸۔ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ○
۵۹۔ كَذٰلِكَ ۭ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ○

ترجمہ

۵۲۔ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ میرے بندوں کو راتوں رات مصر سے لے جاؤ کیونکہ وہ تمھارا پیچھا کرنے والے ہیں۔

۵۳۔ فرعون (کو اس پروگرام کا پتہ چل گیا اور اس) نے شہروں میں کارندے بھیج دیئے تاکہ طاقت جمع کریں۔

۵۴۔ (اور اس نے کہا) یہ تھوڑے سے لوگ ہیں۔

۵۵۔ اور انھوں نے ہمیں غصہ دلایا ہے۔

۵۶۔ اور ہم سب آمادۂ پیکار ہیں۔

۵۷۔ لیکن ہم نے (فرعون اور فرعون والوں غرض) ان سب کو باغوں اور چشموں سے باہر نکال دیا۔

۵۸۔ اور خزانوں اور عالیشان محلّوں سے (بھی)۔

۵۹۔ جی ہاں! ہم نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دیا۔

Marfat.com

تفسیر

ہم نے انھیں باہر نکال دیا

ہم گزشتہ آیات میں دیکھ چکے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام میدانِ مقابلہ میں فرعون پر غالب آگئے اور سرخرو اور سرفراز ہو کر میدان سے باہر آئے اگرچہ فرعون اور اس کے تمام درباری ان پر ایمان نہیں لائے لیکن اس کے چند اہم نتائج ضرور برآمد ہوئے، جن میں سے ہر ایک اہم کامیابی شمار ہوتا ہے۔

۱۔ بنی اسرائیل کا اپنے رہبر اور پیشوا پر عقیدہ مزید پختہ ہو گیا اور انھیں مزید تقویت مل گئی چنانچہ ایک دل اور ایک جان ہو کر ان کے گرد جمع ہو گئے کیونکہ انھوں نے سالہا سال کی بدبختی اور دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد اب اپنے اندر کسی آسمانی پیغمبر کو دیکھا تھا جو کہ ان کی ہدایت کا بھی ضامن تھا اور ان کے انقلاب، آزادی اور کامیابی کا بھی رہبر تھا۔

۲۔ موسیٰ علیہ السلام نے مصریوں اور قبطیوں کے درمیان ایک اہم مقام حاصل کر لیا۔ کچھ لوگ ان کی طرف مائل ہو گئے اور جو مائل نہیں ہوئے تھے وہ کم از کم ان کی مخالفت سے ضرور گھبراتے تھے اور جناب موسیٰؑ کی صدائے دعوت تمام مصر میں گونجنے لگی۔

۳۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ فرعون عوامی افکار اور اپنی جان کو لاحق خطرے سے بچاؤ کے لیے اپنے اندر ایسے شخص کے ساتھ مقابلے کی طاقت کھو چکا تھا جس کے ہاتھ میں اس قسم کا عصا اور منہ میں اس طرح کی گویا زبان تھی۔

مجموعی طور پر یہ امور موسیٰ علیہ السلام کے لیے اس حد تک زمین ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوئے کہ مصریوں کے اندر ان کے پاؤں جم گئے اور انھوں نے کھل کر اپنا تبلیغی فریضہ انجام دیا اور اتمام حجت کی۔

اس روش کو کئی سال گزر گئے اور اس دوران میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے منطقی دلائل کے ساتھ ساتھ انھیں کئی معجزے بھی دکھائے جن کی طرف ہم سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ سے ۱۳۵ تک کے ذیل میں اشارہ کر چکے ہیں یعنی کہ خداوند عالم نے اہلِ مصر کو کئی سال تک قحط اور خشک سالی میں مبتلا رکھا تاکہ جو لوگ بیدار ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ بیدار ہو جائیں۔

(اس بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی چھٹی جلد میں مذکورہ آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو)۔

جب موسیٰ علیہ السلام ان لوگوں پر اتمام حجت کر چکے اور مومنین و منکرین کی صفیں ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں تو موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کے کوچ کرنے کا حکم دے دیا گیا چنانچہ یہی آیات اس منظر کی تصویرکشی کر رہی ہیں۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ راتوں رات میرے بندوں کو (مصر سے باہر) نکال کر لے جاؤ، کیونکہ وہ تمھارا پیچھا کرنے والے ہیں (و اوحینا الی موسٰی ان اسر بعبادی انکم متبعون)۔

یہ ایک خدائی منصوبہ ہے کہ تم رات کو سفر کرو اور وہ بھی باخبر ہو جائیں اور تمھارے پیچھے چل پڑیں پھر کیا ہوگا؟ یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔

Marfat.com

"عبادی" (میرے بندے) کی تعبیر (باوجودیکہ اس سے پہلے "اوحینا" یعنی "ہم نے وحی بھیجی" جمع کی صورت میں آیا ہے)، خدا کی اپنے مومن بندوں سے نہایت محبت پر دلالت کرتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل کی اور دشمن کی نگاہوں سے بچ کر بنی اسرائیل کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کے بعد کوچ کا حکم دیا اور حکمِ خدا کے مطابق رات کو خصوصی طور پر منتخب کیا تاکہ یہ منصوبہ صحیح صورت میں تکمیل کو پہنچے۔

لیکن ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تعداد کی روانگی ایسی چیز نہیں تھی جو زیادہ دیر تک چھپی رہ جاتی۔ جاسوسوں نے جلد ہی اس کی رپورٹ فرعون کو دے دی اور جیسا کہ قرآن کہتا ہے: فرعون نے اپنے کارندے مختلف شہروں میں روانہ کر دیئے تاکہ فوج جمع کریں (فارسل فرعون فی المدائن حاشرین)۔

البتہ اس زمانے کے حالات کے مطابق فرعون کا پیغام تمام شہروں میں پہنچانے کے لیے کافی وقت کی ضرورت تھی لیکن نزدیک کے شہروں میں یہ اطلاع بہت جلد پہنچ گئی اور پہلے سے تیار شدہ لشکر فوراً حرکت میں آ گئے اور مقدمۃ الجیش اور حملہ آور لشکر کی تشکیل کی گئی اور دوسرے لشکر بھی آہستہ آہستہ ان سے آ ملتے رہے۔

ساتھ ہی لوگوں کے حوصلے بلند رکھنے اور نفسیاتی اثر قائم رکھنے کے لیے اس نے حکم دیا کہ اس بات کا اعلان کر دیا جائے کہ "وہ تو ایک چھوٹا سا گروہ ہے (تعداد کے لحاظ سے بھی کم اور طاقت کے لحاظ سے بھی کم) (ان ھٰؤلاء لشرذمۃ قلیلون)۔

لہٰذا اس چھوٹے سے کمزور گروہ کے مقابلے میں ہم کامیاب ہو جائیں گے گھبرانے کی کوئی بات نہیں، کیونکہ طاقت اور قوت ہمارے پاس زیادہ ہے لہٰذا فتح بھی ہماری ہی ہوگی۔

"شرذمۃ" دراصل چھوٹے سے گروہ اور کسی چیز سے کچھ بچ رہنے کو کہتے ہیں۔ کٹے پھٹے لباس کو "شراذم" کہتے ہیں بنا بریں اس کلمہ میں کم ہونے کے معنیٰ کے علاوہ پراگندگی اور انتشار کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے گویا اس طرح سے فرعون یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ لوگ صرف تعداد ہی میں ہم سے کم نہیں بلکہ ان میں انتشار اور افتراق بھی پایا جاتا ہے۔

فرعون نے یہ بھی کہا آخر ہم کس حد تک برداشت کریں اور کب تک ان سرکش غلاموں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرتے رہیں؟ "انھوں نے تو ہمیں غصہ دلایا ہے" (وانھم لنا لغائظون)۔

آخر کل مصر کے کھیتوں کی کون آبپاشی کرے گا؟ ہمارے گھر کون بنائے گا؟ اس وسیع و عریض مملکت کا کون لوگ بوجھ اٹھائیں گے؟ اور ہماری نوکری کون کرے گا؟

اس کے علاوہ "ہمیں ان لوگوں کی سازشوں سے خطرہ ہے (خواہ وہ یہاں رہیں یا کہیں اور چلے جائیں) اور ہم ان سے مقابلہ کے لیے مکمل طور پر آمادہ اور اچھی طرح ہوشیار ہیں" (وانا لجمیع حاذرون)۔

بعض مفسرین کے مطابق "حاذرون" "حذر" سے ہے جس کا مطلب ہے ان کی سازشوں سے خطرہ اور بعض "حذر" کو افرادی قوت اور اسلحہ کے لحاظ سے مکمل ہوشیاری، بیداری اور تیاری کے معنیٰ میں سمجھتے ہیں۔

لیکن ان دونوں تفسیروں کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے کہ فرعون والے خائف بھی ہوں اور ان سے مقابلے کے لیے مکمل طور پر تیار بھی ہوں۔

Marfat.com

پھر قرآن پاک فرعونیوں کے انجام کا ذکر کرتا ہے اور اجمالی طور پر ان کی حکومت کے زوال اور بنی اسرائیل کے اقتدار کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: ہم نے انھیں سرسبز باغات اور پانی سے لبریز چشموں سے باہر نکال دیا: (فاخرجناهم من جنات و عيون)۔

اور خزانوں، خوبصورت محلات اور آرام و آسائش کے مقامات سے بھی نکال دیا (و کنوز و مقام کریم)۔

ہاں ہاں!! ہم نے ایسا ہی کیا اور بنی اسرائیل کو بغیر کسی مشقت کے یہ سب کچھ دے دیا اور انھیں فرعون والوں کا وارث بنا دیا (کذلك و اورثنا ها بنی اسرائیل)۔

"مقام کریم" کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے کچھ لوگوں کے نزدیک اس سے بلند و بالا محلات اور قیمتی عمارتیں مراد ہیں اور بعض لوگوں نے اس سے عیش و نشاط کی محفلیں مراد لی ہیں کچھ مفسرین اس سے حکمرانوں اور اہل اقتدار کی مجالس مراد لیتے ہیں کہ جن کے آگے لوگ جا کر سر تسلیم خم کیے منتظر فرمان ہوتے ہیں اور بعض لوگ اس سے وہ منبر مراد لیتے ہیں جن پر بیٹھ کر خطباء تقریریں کرتے ہیں (یعنی وہ منبر جن پر بیٹھ کر فرعون اور اس کی حکومت کے حق میں پروپیگنڈا کیا جاتا تھا)۔

البتہ پہلا معنیٰ سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے اگرچہ ان تمام معانی کا آپس میں کوئی تضاد نہیں ہے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام معانی آیت کے مفہوم میں جمع ہوں یعنی ان سے محلات بھی لے لیے گئے ہیں، قدرت و طاقت، حکومت و دولت اور شان و شوکت بھی چھین لیے گئے اور محافل سرور و نشاط کی بساط بھی لپیٹ لی گئی۔

چند ایک نکات

۱۔ آیا بنی اسرائیل نے مصر میں حکومت کی ہے؟ آیات بالا میں خداوند عالم فرماتا ہے کہ ہم نے بنی اسرائیل کو فرعون والوں کا وارث بنایا۔ اسی تعبیر کی بناء پر بعض مفسرین کی یہ رائے ہے کہ بنی اسرائیل کے افراد مصر کی طرف واپس لوٹ آئے اور زمام حکومت و اقتدار اپنے قبضے میں لے کر مدتوں وہاں حکومت کرتے رہے [1]

آیات بالا کا ظاہری مفہوم بھی اسی تفسیر سے مناسبت رکھتا ہے۔

جبکہ بعض مفسرین کی رائے یہ ہے کہ وہ لوگ فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد مقدس سرزمینوں کی طرف چلے گئے البتہ کچھ عرصے کے بعد مصر واپس آگئے اور وہاں پر اپنی حکومت تشکیل دی [2]

تفسیر کے اسی حصے کے ساتھ موجودہ تورات کی فصول بھی مطابقت رکھتی ہیں۔

بعض دوسرے مفسرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ مصر میں رہ گیا اور وہیں پر حکومت کی

۱۔ "تفسیر مجمع البیان" اور "تفسیر قرطبی" انھی آیات کے ذیل میں۔ نیز "آلوسی" نے اپنی تفسیر "روح المعانی" میں اس موضوع پر ایک قابل قدر تفسیر نقل کی ہے۔

۲۔ "تفسیر روح المعانی" انھی آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

اور ایک گروہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرزمین مقدس کی طرف روانہ ہو گیا ۔

یہ احتمال بھی ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل کے وارث ہونے سے مراد یہ ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور جناب حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں مصر کی وسیع وعریض سرزمین پر حکومت کی ۔

لیکن اگر اس بات پر غور کیا جائے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ ایک عظیم انقلابی پیغمبر تھے لہٰذا یہ بات بالکل بعید نظر آتی ہے کہ وہ ایسی سرزمین کو کلی طور پر خیرباد کہہ کر چلے جائیں جس کی حکومت مکمل طور پر انھیں کے قبضے اور اختیار میں آچکی ہو اور وہ وہاں کے بارے میں کسی قسم کا فیصلہ کیے بغیر بیابانوں کی طرف چل دیں خصوصاً جب کہ لاکھوں بنی اسرائیلی عرصہ دراز سے وہاں پر مقیم بھی تھے اور وہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف بھی تھے ۔

بنابریں یہ کیفیت دو حال سے خالی نہیں یا تو تمام بنی اسرائیلی مصر میں واپس لوٹ آئے اور حکومت تشکیل دی ۔ یا کچھ لوگ جناب موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق وہیں رہ گئے تھے اور حکومت چلاتے رہے اس کے علاوہ فرعون اور فرعون والوں کے باہر نکال دینے اور بنی اسرائیل کو ان کا وارث بنا دینے کا اور کوئی واضح مفہوم نہیں ہوگا ۔

۲۔ **آیات کی ترتیب :** قرآن مجید بعد والی آیات میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کے غرق ہونے کو تفصیل کے ساتھ بیان کر رہا ہے یہ بات اس سوال کا سبب بن جاتی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید فرعونیوں کے اپنے محلات اور جائیداد سے باہر نکال دینے اور بنی اسرائیل کے ان کے وارث ہونے کو تو پہلے بیان کر رہا ہے اور فرعون وغیرہ کے غرق ہونے کو بعد میں ؟ جبکہ اس کی طبیعی ترتیب اس کے برعکس ہے ۔

اس سلسلے میں ممکن ہے کہ یہاں اجمال بیان کرنے کے بعد تفصیل بیان کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا ہو ۔
یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے نتیجہ اور پھر اس کی تفصیل کے ذکر کا انداز ہو ۔ (غور کیجیے گا)

Marfat.com

٦٠۔ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ○

٦١۔ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ○ۚ

٦٢۔ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ سَيَهْدِيْنِ ○

٦٣۔ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ
فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ○ۚ

٦٤۔ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ○ۚ

٦٥۔ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ○ۚ

٦٦۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ○ؕ

٦٧۔ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

٦٨۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○ع

ترجمہ

٦٠۔ وہ (فرعون والے) بنی اسرائیل کے تعاقب میں چل پڑے اور طلوعِ آفتاب کے وقت انھیں جا لیا۔

٦١۔ جب دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے ہم تو فرعونیوں کے چنگل میں پھنس گئے۔

٦٢۔ (موسیٰ نے) کہا ایسی کوئی بات نہیں بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے جو جلد ہی میری راہنمائی کرے گا۔

٦٣۔ اس کے بعد ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ تم اپنا عصا دریا پر مارو، دریا پھٹ گیا اور اس کا ہر ایک حصہ ایک عظیم پہاڑ کی مانند تھا۔

٦٤۔ اور وہاں پر ہم نے دوسرے لوگوں کو بھی دریا کے نزدیک کر دیا۔

٦٥۔ ہم نے موسیٰ اور جو لوگ ان کے ساتھ تھے (سب کو) نجات بخشی۔

٦٦۔ پھر دوسروں کو ہم نے غرق کر دیا۔

Marfat.com

۶۷۔ اس واقعے میں (حق طلب افراد کے لیے) واضح نشانی ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لاتے۔

۶۸۔ اور تیرا پروردگار عزیز اور رحیم ہے۔

تفسیر

فرعون والوں کا دردناک انجام

ان آخری آیات میں حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی داستان کا آخری حصّہ پیش کیا گیا ہے کہ فرعون اور فرعون والے کیونکر غرق ہوئے اور بنی اسرائیل نے کس طرح نجات پائی؟

جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ فرعون نے اپنے کارندوں کو مصر کے مختلف شہروں میں بھیج دیا تاکہ وہ بڑی تعداد میں لشکر اور افرادی قوت جمع کرسکیں چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا اور بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق فرعون نے چھ لاکھ کا لشکر مقدمۃ الجیش کی صورت میں بھیج دیا اور خود دس لاکھ کے لشکر کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

ساری رات بڑی تیزی کے ساتھ چلتے رہے اور طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی انھوں نے موسیٰؑ کے لشکر کو جالیا چنانچہ اس سلسلے کی پہلی آیت میں فرمایا گیا ہے: فرعون والوں نے ان کا تعاقب کیا اور طلوعِ آفتاب کے وقت انھیں جالیا (فاتبعوھم مشرقین)[1]

جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی کہنے لگے اب تو ہم فرعون والوں کے نرغے میں آگئے ہیں اور بچ نکلنے کی کوئی راہ نظر نہیں آتی (فلما تراء الجمعان قال اصحاب موسٰی انا لمدرکون)۔

ہمارے سامنے دریا اور اس کی ٹھاٹھیں مارتی موجیں ہیں، ہمارے پیچھے خونخوار مسلح لشکر کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے لشکر بھی ایسے لوگوں کا ہے جو ہم سے سخت ناراض اور غصے سے بھرے ہوئے ہیں جنھوں نے اپنی خونخواری کا ثبوت ایک طویل عرصے تک ہمارے معصوم بچوں کو قتل کرکے دیا ہے اور خود فرعون بھی بہت بڑا مغرور، ظالم اور خونخوار شخص ہے لہٰذا وہ فوراً ہمارا محاصرہ کرکے ہمیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے یا قیدی بنا کر تشدّد کے ذریعے ہمیں واپس لے جائیں گے۔ قرائن سے بھی ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا۔

اس مقام پر بنی اسرائیل پر کرب کی حالت طاری ہوگئی اور ان کا ایک ایک لمحہ کرب و اضطراب میں گزرنے لگا یہ لمحات ان کے لیے زبردست تلخ تھے شاید بہت سے لوگوں کا ایمان بھی متزلزل ہوچکا تھا اور بڑی حد تک ان کے حوصلے پست ہوچکے تھے۔

---

[1] بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "مشرقین" سے مراد بنی اسرائیل کا مشرق کی جانب سفر تھا اور فرعون کا لشکر بھی اسی سمت چلتا رہا کیونکہ "بیت المقدس" کی سرزمین مصر سے مشرق کی طرف ہے۔

Marfat.com

لیکن جناب موسیٰ علیہ السلام حسب سابق نہایت ہی مطمئن اور پرسکون تھے انھیں یقین تھا کہ بنی اسرائیل کی نجات اور سرکش فرعونیوں کی تباہی کے بارے میں خدا کا فیصلہ اٹل ہے اور وعدہ یقینی ہے۔

لہٰذا انھوں نے مکمل اطمینان اور بھرپور اعتماد کے ساتھ بنی اسرائیل کی وحشت زدہ قوم کی طرف منہ کر کے کہا: ایسی کوئی بات نہیں وہ ہم پر کبھی غالب نہیں آسکیں گے کیونکہ میرا خدا میرے ساتھ ہے اور وہ بہت جلدی مجھے ہدایت کرے گا (قال کلا ان معی ربی سیھدین)۔

ممکن ہے اس طرح کی تعبیر اس وعدہ کی طرف اشارہ ہو جو خداوند عالم نے موسیٰؑ اور ہارونؑ سے حکم تبلیغ دیتے ہوئے کیا تھا:

انني معكما اسمع و ارٰی

میں ہر جگہ پر تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں (طٰہٰ — ۴۶)۔

موسیٰ علیہ السلام کو علم تھا کہ خدا ہر جگہ ان کے ساتھ ہے خاص کر "رب" (یعنی خداوند مالک و مصلح) کے نام پر بھروسہ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ جو بھی راستہ طے کر رہے ہیں اپنے پاؤں کے ساتھ چل کر نہیں بلکہ خداوند قادر و مہرباں کے لطف و کرم کے ساتھ طے کر رہے ہیں۔

اسی موقع پر شاید بعض لوگوں نے موسیٰؑ کی باتوں کو سن تو لیا لیکن انھیں پھر بھی یقین نہیں آرہا تھا اور وہ اسی طرح زندگی کے آخری لمحات کے انتظار میں تھے کہ خدا کا آخری حکم صادر ہوا، قرآن کہتا ہے: ہم نے فوراً موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ اپنے عصا کو دریا پر مارو (فاوحینا الی موسٰی ان اضرب بعصاك البحر)۔

وہی عصا جو ایک دن توڑ ڈرانے کی علامت تھا اور آج رحمت اور نجات کی نشانی۔

موسیٰؑ نے تعمیل حکم کی اور عصا فوراً دریا پر دے مارا تو اچانک ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا جس سے بنی اسرائیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ان کے دلوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، ناگہانی طور پر دریا پھٹ گیا، پانی کے کئی ٹکڑے بن گئے اور ہر ٹکڑا ایک عظیم پہاڑ کی مانند بن گیا اور ان کے درمیان میں راستے بن گئے (فانفلق فکان کل فرق کالطود العظیم)۔

"انفلق" "فلق" (بروزن "فرق") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے پھٹ جانا اور "فِرق" (بروزن "رزق") کے مادہ سے "فرق" (بروزن "حلق") جدا ہونے کے معنیٰ میں ہے۔

دوسرے لفظوں میں (جیسا کہ "راغب" اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں) "فلق" اور "فرق" کے درمیان یہ فرق ہے کہ پہلا لفظ پھٹ جانے کی طرف اشارہ ہے اور دوسرا جدا ہونے کی طرف۔ لہٰذا فرقہ اور فرق اس ٹولے یا گروہ کو کہتے ہیں جو باقیوں سے جدا ہو جائے۔

"طود" کا معنیٰ بہت بڑا پہاڑ ہے اور آیت زیر بحث میں "طود" کی صفت کا "عظیم" ہونا اس معنی کی تاکید پر دلالت کرتا ہے۔

بہرحال جس کا فرمان ہر چیز پر جاری اور نافذ ہے کہ اگر پانی میں طغیانی آتی ہے تو اس کے حکم سے اور اگر طوفانوں میں حرکت آتی ہے تو اس کے امر سے، وہ خدا کہ .....

Marfat.com

نقش ہستی نقشی از ایوان اوست آب و باد و خاک سرگردان اوست

اسی نے دریا کی موجوں کو حکم دیا اور امواجِ دریا نے اس حکم کو فوراً قبول کیا اور ایک دوسرے پر جمع ہوگئیں اور ان کے درمیان کئی راستے بن گئے اور بنی اسرائیل کے ہر گروہ نے ایک ایک راستہ اختیار کرلیا۔

فرعون اور اس کے ساتھی یہ منظر دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے، اس قدر واضح اور آشکار معجزہ دیکھنے کے باوجود تکبّر اور غرور کی سواری سے نہیں اُترے انھوں نے موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کا تعاقب جاری رکھا اور اپنے آخری انجام کی طرف آگے بڑھتے رہے جیسا کہ قرآن فرماتا ہے: اور وہاں پر دوسرے لوگوں کو بھی ہم نے دریا کے نزدیک کردیا (وازلفنا ثم الأخرين)۔

اس طرح سے فرعونی لشکر بھی دریائی راستوں پر چل پڑے اور وہ لوگ اپنے ان پُرانے غلاموں کے پیچھے دوڑتے رہے جنھوں نے اب اس غلامی کی زنجیریں توڑ دی تھیں لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ ان کی زندگی کے آخری لمحات ہیں اور ابھی ابھی عذاب کا حکم جاری ہونے والا ہے۔

بعد والی آیت کہتی ہے: ہم نے موسیٰ اور ان تمام لوگوں کو نجات دی جو ان کے ساتھ تھے (وانجينا موسٰى ومن معه اجمعين)۔

ٹھیک اس وقت جبکہ بنی اسرائیل کا آخری فرد دریا سے نکل رہا تھا اور فرعونی لشکر کا آخری فرد اس میں داخل ہو رہا تھا ہم نے پانی کو حکم دیا کہ اپنی پہلی حالت پر لوٹ آ۔ اچانک موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں اور فرعون اور اس کے لشکر کو گھاس پھونس اور تنکوں کی طرح بہا کرلے گئیں اور صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

قرآن نے ایک مختصر سی عبارت کے ساتھ یہ ماجرا یوں بیان کیا ہے: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کردیا (ثم اغرقنا الأخرين)۔

تو اس طرح سے سب کچھ ایک لمحے میں ختم ہوگیا قیدی غلام آزاد ہوگئے، مغرور ظالم لوگ پھنس کر تباہ و برباد ہوگئے۔ تاریخ کا ورق اُلٹ گیا۔ چکا چوند کرنے والا تمدن صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا وہی تمدن جس کی بنیاد مستضعف لوگوں کے گھروں کو اجاڑ کر رکھی گئی تھی، مستکبرین کا دور ختم ہوگیا اور مستضعفینِ عالم ان کی املاک اور حکومت کے وارث بن گئے۔

تو جناب "اس واقعے میں روشن نشانی اور عبرت کا درسِ عظیم ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے" گویا ان کی آنکھیں بند، کان بہرے اور دل خوابِ غفلت میں سوئے ہوئے ہیں (ان فی ذلك لاٰية وما كان اكثرهم مؤمنين)۔

جہاں فرعون اور فرعون کے ساتھی یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر ایمان نہیں لائے تو آپ بھی (اے پیغمبر!) اس مشرک قوم پر تعجب نہ کریں اور ان کے ایمان نہ لانے پر پریشان نہ ہوں کیونکہ اس قسم کے بہت سے مناظر تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں۔

"اکثر" کی تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ فرعون کی قوم سے کچھ لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کا دین قبول کرلیا تھا اور ان کے ساتھیوں میں شامل ہوگئے تھے، نہ صرف فرعون کی بیوی آسیہ اور موسیٰؑ کے باوفا دوست جسے قرآن نے "مومن آلِ فرعون" کے عنوان سے یاد کیا ہے بلکہ جادوگروں کی طرح بہت سے دوسرے لوگ بھی توبہ کرکے حضرت موسیٰؑ سے آملے تھے۔

اس سلسلے کی آخری آیت ایک مختصر لیکن معنی سے بھرپور جملے میں خدا کی بے پناہ قدرت اور رحمت کی طرف اشارہ کرکے کہتی ہے:

Marfat.com

تمھارا پروردگار عزیز بھی ہے اور رحیم بھی (و ان ربك لھو العزیز الرحیم)۔
یہ اس کی "عزت" (غلبے) کا کرشمہ ہی تو ہے کہ جب چاہے باغی اور مغرور قوموں کی نابودی کا حکم صادر کر دیتا ہے اور کسی ظالم وجابر قوم کی تباہی کے لیے اسے اس بات کی ضرورت نہیں کہ آسمان سے فرشتوں کے لشکر نازل کرے بلکہ جو پانی اس قوم کی زندگی کا سرمایہ ہوتا ہے اسے انھی لوگوں کی موت کا حکم دیتا ہے اور جو دریائے نیل فرعون اور اس کی قوم کا سرمایۂ قدرت اور سبب ثروت ہو وہی ان کا قبرستان بن جاتا ہے۔
اس کی رحمت یہ ہے کہ وہ ایسے کام میں ہرگز جلدی نہیں کرتا بلکہ کئی کئی سال تک ڈھیل دیتا ہے معجزے دکھاتا اور اتمام حجت کرتا ہے اور یہ بھی اس کی رحمت ہے کہ اس قسم کی ستم رسیدہ قوم کو اس طرح کے خودسر اور سرکش حکمرانوں کی غلامی سے نجات بخشتا ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ بنی اسرائیل کی گذرگاہ:

قرآن مجید میں بارہا اس بات کو دہرایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم سے بنی اسرائیل کو "بحر" عبور کروایا[1] اور چند مقامات پر "یم" کا لفظ بھی آیا ہے[2]
اب سوال یہ ہے کہ یہاں پر "بحر" اور "یم" سے کیا مراد ہے آیا یہ نیل (Nile River) جیسے وسیع وعریض دریا کی طرف اشارہ ہے کہ سرزمین مصر کی تمام آبادی جس سے سیراب ہوتی تھی یا بحیرہ احمر یعنی بحر قلزم Red Sea کی طرف اشارہ ہے۔
موجودہ تورات اور بعض مفسرین کے انداز گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بحیرہ احمر کی طرف اشارہ ہے لیکن ایسے قرائن موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد نیل کا عظیم و وسیع دریا ہے کیونکہ لغت میں ..... جیسا کہ راغب مفردات میں کہتے ہیں:
"بحر" دراصل بہت زیادہ اور وسیع پانی کو کہتے ہیں اور "یم" بھی اسی معنیٰ میں آتا ہے بنابریں ان دونوں کلمات کا دریائے نیل پر اطلاق بالکل صحیح ہے۔
رہے وہ قرائن جو اس نظریے کی تائید کرتے ہیں تو وہ مندرجہ ذیل ہیں:
۱۔ فراعنہ مصر کا محل سکونت جو مصر کے آباد شہروں کا مرکز تھا یقیناً ایسے مرکزی مقام پر ہوگا جو دریائے نیل سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔ اگر موجودہ اہرام اور اس کے اطراف کو معیار قرار دیں تو بنی اسرائیل مجبور تھے کہ سرزمین مقدس تک پہنچنے کے لیے پہلے دریائے نیل کو عبور کریں کیونکہ یہ علاقہ دریائے نیل کے مغرب میں واقع ہے اور انھیں مقدس سرزمین تک پہنچنے کے لیے

---

[1] سورۂ یونس ۹۰، سورۂ طٰہٰ ۷۷، سورۂ شعراء ۶۳ (یہی آیت) اور سورۂ دخان ۲۴۔
[2] سورۂ طٰہٰ ۷۸، سورۂ قصص ۴۰ اور سورۂ ذاریات ۴۰۔

Marfat.com

مشرق کی طرف جانا چاہیے تھا۔ (غور کیجیے گا)

۲۔ دریائے نیل کے نزدیک آباد علاقے بحیرہ احمر سے اس قدر دُور ہیں کہ بنی اسرائیل اسے ایک شب یا نصف شب میں طے نہیں کر سکتے تھے (جبکہ گزشتہ آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بنی اسرائیل نے فراعنۂ مصر کی سرزمین کو راتوں رات ترک کیا اور قاعدۃً رات کے وقت ہی یہ کام انجام پانا چاہیے تھا اور فرعونی لشکر بھی ان کے پاس صبح صبح طلوعِ آفتاب کے وقت پہنچ گیا)۔

۳۔ سرزمین مصر کو عبور کرنے اور سرزمین مقدس تک پہنچنے کے لیے ضروری نہیں ہے کہ وہ بحیرہ احمر کو عبور کریں کیونکہ نہر سویز کی کھدائی سے پہلے وہاں پر خشکی کا ایک راستہ موجود تھا مگر یہ کہ اس مفروضے کو تسلیم کر لیں کہ ہزار ہا سال قبل بحیرۂ احمر Red Sea کا بحیرہ روم (Mediterranean) سے براہِ راست اتصال تھا اور خشکی کا کوئی راستہ موجود نہیں تھا لیکن اس طرح کا کوئی مفروضہ کسی بھی صورت میں ثابت نہیں ہے۔

۴۔ قرآن نے عصائے موسیٰ کے پانی میں ڈالنے کی داستان میں "یم" کا لفظ استعمال کیا ہے (سورۂ طٰہٰ آ ۳۹) اور جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں فرعون والوں کی غرقابی کے موقع پر بھی لفظ "یم" استعمال کیا گیا ہے اور پھر یہ کہ دونوں واقعات ایک ہی داستان بلکہ ایک ہی سورہ (طٰہٰ) میں ہیں اور دونوں مطلق طور پر منقول ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ دونوں کا معنیٰ ایک ہے اور پھر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے بھی کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انھیں سمندر میں نہیں ڈالا تھا بلکہ تاریخی شواہد اور قرائن کے مطابق انھیں دریائے نیل کی موجوں کے سپرد کیا تھا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کا لشکر دریائے نیل میں غرق ہوئے تھے (غور کیجیے گا)۔

۲۔ بنی اسرائیل کی نجات اور فرعونیوں کی غرقابی

بعض مفسرین جو معجزات کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے اور اس بات پر مُصر ہیں کہ گزشتہ آیات میں مذکور فرعون والوں کی غرقابی اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعے کی اس طرح توجیہ کریں جو عام طبیعی اسباب سے ہم آہنگ ہو۔

لہٰذا کبھی تو وہ کہتے ہیں کہ اس واقعے کو چلتے پھرتے اور متحرک پل سے مطابقت دی جائے جس کا آج بھی رواج ہے[1] (کہ ہنگامی طور پر عبور کرنے کے لیے متحرک پل سے استفادہ کرتے ہیں)۔

بعض دوسروں نے کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام راستوں سے واقف تھے اور دریائے "سوف" (خلیج سویز) میں موجود درمیانی راستوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا وہاں سے گزر کر "جزیرہ سینا" پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور آیات "انفلاق بحر" سے اسی چیز کی طرف اشارہ ہے[2]۔

کچھ اور مفسرین نے شاید اس احتمال کو تقویت دی ہے اور کہا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سمندر کے کنارے اس وقت پہنچے جب سمندر کا "جزر" ختم ہو گیا تھا اور خشکی ظاہر ہو چکی تھی اور وہاں سے بآسانی گزرنے میں کامیاب ہو گئے جونہی وہ گزر گئے اور

---

[1] و [2] علام القرآن ص ۶۲۲۔

Marfat.com

فرعونی قافلہ اس میں اُترا تو "مد" شروع ہوگیا جس کی وجہ سے وہ سمندر کی موجوں میں گھر کر ہلاک ہوگیا۔
لیکن حق بات یہ ہے کہ ان احتمالات میں سے کوئی بھی قرآنی آیات کے ظاہری مفہوم (اگر صریحی نہ بھی کہیں) سے ہم آہنگ نہیں ہے لیکن اگر معجزے کے مسئلہ کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس قسم کی توجیہات کی ضرورت بھی پیش نہ آئے معجزے کا مسئلہ انبیاء کے تفصیلی حالات میں بارہا آچکا ہے خاص کر اس داستان میں بھی عصا کے معجزے کا تذکرہ موجود ہے۔
اگر ہم یہ بات مان لیں تو کیا حرج ہے کہ عصا کے لگنے سے خدا کے حکم کے مطابق دریائے نیل کا پانی کئی حصوں میں بٹ گیا اور پھر اکٹھا ہوگیا کیونکہ کائنات میں خداوند عالم ہی تو قانونِ علت و معلول پر حاکم ہے۔ ہو سکتا ہے پانی کی یہ تقسیم کسی مخفی کشش کے تحت ہوئی ہو اور تھوڑے ہی عرصے کے بعد یہ کشش ختم ہوگئی ہو اور تمام پانی اپنی طبعی حالت پر واپس آگیا ہو اس قسم کا استثناء قانونِ علت و معلول میں نہیں ہے بلکہ غیر معمولی علتوں کی تاثیر کا اعتراف کرنا پڑے گا جو ...... ہماری محدود معلومات کی وجہ سے ہماری پہچان سے باہر ہے۔

۲۔ قدرت کے باوجود رحیم ہے

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس سلسلے کی آخری آیت جو موسیٰ اور فرعون کے مجموعی کاموں اور لشکرِ حق کی فتح اور لشکرِ باطل کی شکست اور تباہی کے نتیجے کے طور پر ہے، خداوند عالم کی دو صفات بیان کر رہی ہے ایک "عزت" اور دوسری "رحمت" پہلی صفت اس کی قدرت کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری اپنے بندوں پر اس کی رحمت کی وسعت کا پتہ دیتی ہے اور پھر "عزیز"، "کو" رحیم" پر مقدم کر کے یہ بتایا جا رہا ہے کہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ یہ رحمت اس کی کمزوری کی وجہ سے ہے، نہ! نہ!! بلکہ وہ قدرت رکھنے کے باوجود رحیم ہے۔
البتہ بعض مفسرین کا یہ نظریہ ہے کہ اس کی عزت سے توصیف اس کے دشمنوں کی شکست کی طرف اور رحمت سے توصیف اس کے دوستوں کی فتح کی جانب اشارہ ہے اور اگر دونوں صفات دونوں گروہوں کے لیے ہوں تو بھی کوئی ہرج کی بات نہیں کیونکہ گنا ہگاروں سمیت سب اس کی رحمت سے بہرہ در ہو رہے ہیں اور نیک لوگوں سمیت سب اس کے جاہ و جلال اور سطوت اور دبدبے سے خوف کھاتے نظر آتے ہیں۔

Marfat.com

۶۹۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝
۷۰۔ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَ قَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝
۷۱۔ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ ۝
۷۲۔ قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝
۷۳۔ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ۝
۷۴۔ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝
۷۵۔ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝
۷۶۔ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝
۷۷۔ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۷۸۔ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝
۷۹۔ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝
۸۰۔ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝
۸۱۔ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝
۸۲۔ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـــَٔتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ ۝

ترجمہ

۶۹۔ اور ان کے سامنے ابراہیم کی خبر پڑھو۔
۷۰۔ جبکہ انھوں نے اپنے (منہ بولے) باپ اور اپنی قوم سے کہا: تم کس چیز کی پرستش کرتے ہو؟
۷۱۔ انھوں نے کہا کہ ہم بتوں کی پرستش کرتے ہیں اور سارا سارا دن انھی کی پوجا میں لگے رہتے ہیں۔

Marfat.com

۷۲۔ ابراہیم نے کہا: جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمھاری آواز بھی سنتے ہیں ؟
۷۳۔ یا تمھیں کوئی نفع یا نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں ؟
۷۴۔ انھوں نے کہا: ہم نے تو اپنے آباؤ اجداد کو ایسے ہی کرتا ہوا پایا ہے ۔
۷۵۔ ابراہیم بولے: آیا تم نے دیکھا ہے کہ جس کی تم عبادت کرتے تھے ۔
۷۶۔ تم اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد ؟
۷۷۔ وہ سب میرے دشمن ہیں سوائے عالمین کے پروردگار کے ۔
۷۸۔ جس (خدا) نے مجھے پیدا کیا پس وہی میری ہدایت کرتا ہے ۔
۷۹۔ وہی تو ہے جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ۔
۸۰۔ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفاء بھی دیتا ہے ۔
۸۱۔ جو مجھے مارے گا بھی اور پھر زندہ بھی کرے گا ۔
۸۲۔ اسی کے بارے میں مجھے اُمید ہے کہ قیامت کے دن میرے گناہ بھی معاف کر دے گا ۔

تفسیر

میں ایسے خدا کی عبادت کرتا ہوں

جیسا کہ ہم سورت کی ابتداء میں بتا چکے ہیں کہ خداوندِ عالم نے اس سورۃ میں سات عظیم الشان پیغمبروں کے تفصیلی حالات اور گمراہ لوگوں کی ہدایت کے لیے ان کی معرکہ آرائی کا تذکرہ فرمایا ہے تاکہ اس طرح سے ایک تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس دور کے معدودے چند مومنین کے لیے تسلی خاطر ہو، نیز حق کے تمام دشمنوں اور مستکبرین کے لیے تنبیہ کا کام دے ۔
لہٰذا موسیٰؑ اور فرعون کی عبرت آموز داستان کے فوراً بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہدایت بخش سرگزشت اور مشرکین سے ان کی محاذ آرائی کے واقعات کو بیان کرتا ہے اور داستان کا آغاز ابراہیم کی اپنے چچا اور گمراہ قوم سے گفتگو کے ساتھ کرتا ہے [1]

---

[1] ہم بارہا کہہ چکے ہیں کہ لفظ "اب" لغتِ عرب اور قرآنِ مجید میں کبھی باپ پر اور کبھی چچا پر بولا جاتا ہے اور یہاں پر دوسرا معنیٰ مراد ہے (مزید وضاحت کے لیے جلد پنجم اردو ترجمہ ص ۲۴۰ کی طرف رجوع فرمائیں) ۔

Marfat.com

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ان کے سامنے ابراہیم کی خبر پڑھو (واتل علیھم نبأ ابراھیم)۔

اس عظیم الشان پیغمبر سے متعلق تمام واقعات میں سے اس حصّے کو زور دے کر بیان کیا گیا ہے: جبکہ انھوں نے اپنے باپ (جیسے چچا) اور اپنی قوم سے کہا: تم کس چیز کی پرستش کرتے ہو: (اذ قال لابیہ و قومہ ما تعبدون)۔

یقیناً ابراہیم علیہ السلام جانتے تھے کہ وہ کس چیز کی پوجا پاٹ کرتے ہیں لیکن اس سوال سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ کوئی بات کریں اور اپنے منہ سے خود اعتراف کریں اور ساتھ ہی "ما" (کیا چیز؟) کی تعبیر ایک طرح کی حقارت کا اظہار بھی ہے۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے سوال کے جواب میں وہ فوراً بولے: ہم بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور سارا دن ان پر توجہ رکھتے ہیں اور نہایت ہی ادب اور احترام کے ساتھ ان کی عبادت میں لگے رہتے ہیں (قالوا نعبد اصناما فنظل لھا عاکفین)۔

اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ فقط اپنے اس عمل پر شرمندہ نہیں تھے بلکہ اس پر فخر بھی کیا کرتے تھے کیونکہ "نعبد اصناما" (ہم بتوں کی عبادت و پرستش کرتے ہیں) کا جملہ ان کے مقصود اور مدّعا کے بیان کے لیے کافی تھا ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا "فنظل لھا عاکفین" (ہم سارا سارا دن ان کے آستان پر جبہ سائی کرتے رہتے ہیں)۔

لفظ "نظل" عموماً ایسے کاموں کے لیے بولا جاتا ہے جو دن کو انجام پاتے ہیں اور اسے مضارع کی صورت میں بیان کرنا اس کے استمرار اور دوام کی طرف اشارہ ہے۔

"عاکف" "عکوف" کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کی طرف توجّہ کرنا اور اس کی ادب و احترام کے ساتھ معیّت اختیار کرنا ہے اور یہاں پر گزشتہ معنیٰ کی تاکید مزید کے لیے ہے۔

"اصنام" "صنم" کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے مجسمہ، جسے سونے یا چاندی یا لکڑی وغیرہ سے بناتے ہیں اور اس کی عبادت کرتے ہیں اور اسے مقدس مردوں اور مقدس عورتوں کا مظہر جانتے ہیں۔

بہرحال ابراہیم علیہ السلام نے ان کی یہ باتیں سن کر ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور دو زبردست منطقی اور معتدل جملوں کے ذریعہ انھیں ایسی جگہ لا کھڑا کیا جہاں نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کے مصداق ان سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا۔

آپؑ نے ان سے فرمایا: "جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمھاری فریاد سنتے بھی ہیں؟" (قال ھل یسمعونکم اذ تدعون)۔

"یا کیا وہ تمھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں" (او ینفعونکم او یضرون)۔

کم از کم جو چیز کسی معبود کے لیے ضروری ہے وہ یہی کہ اپنے عابد کی آواز سنے اور مصیبت میں اس کی مدد کو پہنچے یا کم از کم اس کے فرمان کی مخالفت کا خطرہ ہو لیکن ان بتوں میں ذرہ بھر بھی درک و شعور نہیں پایا جاتا اور نہ ہی انسان کی زندگی کے بارے میں وہ کچھ بھی مؤثر ذرائع ہو سکتے ہیں۔ یہ بت تو بیکار سی دھاتیں، پتھر یا لکڑی ہی ہیں جنھیں خرافات اور اوہام و خیالات نے اس حد تک پہنچا دیا ہے۔

Marfat.com

لیکن متعصب لوگ بجائے اس کے کہ اس منطقی سوال کا کوئی ٹھوس جواب دیتے وہی پرانا اور بار بار کا دہرایا ہوا جواب پیش کرتے ہیں: انھوں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے (قالوا بل وجدنا اٰبائنا کذلک یفعلون)۔

ان کا یہ جواب اپنے جاہل اور نادان بزرگوں کی اندھی تقلید کو بیان کر رہا ہے وہ جو جواب ابراہیم کو دے سکتے تھے یہی تھا اور بس۔ یہ ایسا جواب ہے جس کے بطلان کی دلیل خود اسی میں موجود ہے اور کوئی بھی عقل مند انسان اپنے آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ آنکھیں بند کرکے دوسروں کے پیچھے لگ جائے خاص کر جبکہ آنے والے لوگوں کے تجربے گزشتہ لوگوں سے کہیں زیادہ ہوتے ہیں اور ان کی اندھی تقلید کا نہ تو کوئی جواز رہتا ہے اور نہ ہی کوئی دلیل۔

"کذلک یفعلون" (وہ اس طرح کیا کرتے تھے) کی تعبیر ان کی اندھی تقلید پر تاکید مزید ہے یعنی جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ہم بھی کرتے ہیں، خواہ وہ بتوں کی عبادت ہو یا کسی اور چیز کی۔

اب جناب ابراہیم علیہ السلام اپنے تیز حملوں کا رخ بتوں کی طرف موڑ دیتے ہیں اور "فرماتے ہیں آیا تم نے ان چیزوں کا مشاہدہ بھی کیا ہے جن کی تم عبادت کرتے ہو" (قال افرأیتم ما کنتم تعبدون)۔

"تم بھی اور تمھارے گزشتہ آباؤ اجداد بھی" (انتم و اٰباؤکم الاقدمون)۔

"وہ سب کے سب میرے دشمن ہیں سوائے رب العالمین کے" (فانھم عدو لی الا رب العالمین)۔

جی ہاں! وہ سب میرے دشمن ہیں اور میں بھی ان سے صلح نہ کرنے والا ان کا دشمن ہوں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ جناب ابراہیمؑ فرماتے ہیں "وہ میرے دشمن ہیں" ہر چند کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ میں بھی ان کا دشمن ہوں لیکن ممکن ہے کہ ان کا یوں فرمانا اس لیے ہو کہ بتوں کی عبادت انسان کی بدبختی، گمراہی اور دنیا و آخرت کے عذاب کا سبب بن جاتی ہے اور یہ چیز ان کی عداوت میں شمار ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن بت اپنے عبادت گزاروں سے اظہارِ برأت کریں گے اور ان کی دشمنی پر کمربستہ ہو جائیں گے حکم خداوندی کے مطابق وہ گویا ہو کر ان سے اظہارِ نفرت کریں گے [1]

"رب العالمین" کا استثناء، باوجودیکہ وہ ان کے معبودوں میں شامل نہیں (اصطلاح کے مطابق استثنائے منقطع ہے) توحید خالص کی تاکید کے لیے ہے اور یہ احتمال بھی ہے کہ ان مشرکین میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو بتوں کے ساتھ ساتھ خداوندِ عالم کی عبادت بھی کیا کرتے تھے اس لیے انھوں نے پروردگارِ عالم کا استثناء کیا ہے۔

"ھُم" کی ضمیر کا ذکر جو عام طور پر صاحبانِ عقل کی جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے بتوں کے لیے اس کا استعمال مندرجہ بالا موضوع کی مناسبت سے ہے۔

پھر ابراہیم علیہ السلام پروردگارِ عالم کی صفات اور اس کی مادی اور روحانی نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ ان بتوں سے موازنہ کیا جا سکے جو نہ تو اپنے عبادت کرنے والوں کی آواز سنتے ہیں اور نہ ہی انھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

سب سے پہلے وہ آفرینش اور ہدایت جیسی نعمتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں: وہ خدا تو وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۱۳، سورہ مریم آیت ۸۲۔

Marfat.com

اور وہی مجھے ہدایت بھی کرتا ہے (الذی خلقنی فھو یھدین)۔
اس نے عالمِ تکوین میں بھی مجھے ہدایت کی ہے اور اس زندگی میں بھی مادی اور روحانی وسائل میرے اختیار میں دے دیئے ہیں اور عالمِ تشریع میں بھی ہدایت کی ہے اور وحی اور آسمانی کتابیں مجھ پر نازل کی ہیں۔
تخلیق کے ذکر کے بعد کلمہ "فاء" کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہدایت، خلقت سے جُدا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ہے اور ہر جگہ پیش قدم ہے "یھدین" جو فعل مضارع کی صورت میں ہے اس بات کی روشن دلیل ہے کہ ہدایت ہمیشہ اور مستمر ہے اور انسان کو ساری عمر اس کی ضرورت رہتی ہے۔
گویا ابراہیم علیہ السلام یہ کہہ کر اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ میں جب سے پیدا ہوا ہوں اسی کے ساتھ ہوں اور کسی بھی لمحے اس سے جدا نہیں ہوا ہوں اس کی موجودگی کو اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہوں میں نے اس کی محبّت کا طوق اپنے گلے میں ڈالا ہوا ہے وہ جدھر چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے۔
ربوبیّت کے پہلے مرحلے یعنی تخلیق و ہدایت کے بیان کے بعد مادّی نعمتوں کا تذکرہ فرماتے ہوئے کہتے ہیں "وہ وہی تو ہے جو مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی" (والذی ھو یطعمنی و یسقین)۔
جی ہاں! میں اپنی ساری نعمتیں اسی کی طرف سے سمجھتا ہوں۔ میرا گوشت پوست اور میرا دانہ پانی سب اسی کی طرف سے ہے۔
نہ صرف صحت اور تندرستی کی حالت میں اس کی نعمتیں میرے شاملِ حال ہیں بلکہ "جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہ مجھے شفاء عنایت فرماتا ہے" (واذا مرضت فھو یشفین)۔
باوجودیکہ کبھی کبھی بیماری بھی خدا کی طرف سے ہوتی ہے لیکن گفتگو میں آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے بھی اپنی طرف نسبت دی ہے۔
دنیاوی زندگی کے مراحل کے بعد قدم کو اور آگے بڑھاتے ہوئے جہانِ آخرت کی حیاتِ جاوید کا تذکرہ فرماتے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ ہر جگہ پر میں اس کے خوانِ نعمت سے پرورش پا رہا ہوں نہ صرف دنیاوی زندگی میں بلکہ آخرت کے عالم میں بھی۔
چنانچہ فرماتے ہیں: وہ خدا ایسا ہے جو مجھے مارے گا بھی اور پھر دوبارہ زندہ بھی کرے گا (والذی یمیتنی ثم یحیین)۔
جی ہاں! میری موت بھی اسی کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد پھر نئی زندگی بھی اسی کی جانب سے ہے۔
اور جب میں عرصۂ محشر میں قدم رکھوں گا تو میری چشمِ امید پھر بھی اسی پر ہوگی کیونکہ "وہ وہی تو ہے جس کے بارے میں مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن میرے گناہ معاف کردے گا" (والذی اطمع ان یغفر لی خطیئتی یوم الدین)۔
اس میں شک نہیں کہ انبیاء معصوم ہوتے ہیں اور ان کا کوئی گناہ ہی نہیں ہوتا کہ جس کے بخشے جانے کی ضرورت ہو لیکن جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ بعض اوقات "حسنات الابرار سیئات المقربین" کے مصداق نیک لوگوں کی کئی اچھائیاں، مقربینِ بارگاہ کے لیے گناہ شمار کی جاتی ہیں اور ان کے مقامِ عظمت کے پیشِ نظر ان کا ایک اچھا کام بھی قابلِ مواخذہ

Marfat.com

ہوتا ہے کیونکہ اس اچھے کام نے اس سے بہتر کے انجام دینے سے روک دیا ہے اسی لیے اسے ترکِ اولیٰ کا نام دیا جاتا ہے۔
وہ کسی بھی صورت میں اپنے نیک اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے کیونکہ یہ اعمال خدا کے لطف و کرم کے مقابلے میں بالکل ناچیز ہیں اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کے سامنے ان کا کوئی شمار نہیں بلکہ ان کی ساری توقعات ذاتِ خدا کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور یہی انقطاع الی اللہ کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔
قصہ مختصر جناب ابراہیم علیہ السلام نے معبودِ حقیقی کی شناخت کے لیے پہلے پروردگار کی خالقیت کا تذکرہ فرمایا پھر اس کی ربوبیت کے تمام مراحل واضح کیے۔
ربوبیت کا پہلا مرحلہ ہدایت ہے پھر "مادی نعمتوں" کا مرحلہ ہے خواہ وہ نعمتیں حالات کی سازگاری کی صورت میں ہوں یا رکاوٹوں کے دور کرنے کی وجہ سے اور آخر میں ایک دوسرے جہان میں "حیاتِ جاوید" کا مرحلہ ہے سو ہاں پر بھی اس کی ربوبیت نعمتوں کی عطا اور گناہوں کی بخشش کی صورت میں جلوہ گر ہو گی اس طرح سے خرافات کی پیداوار متعدد خداؤں اور مختلف ارباب کی خدائی پر خطِ تنسیخ کھنچ جاتا ہے اور صرف ایک اور حقیقی خدا کی بارگاہ میں سرِ تعظیم جھک جاتا ہے۔

Marfat.com

٨٣۔ رَبِّ هَبْ لِي حُكْمًا وَّأَلْحِقْنِي بِالصّٰلِحِينَ ۙ
٨٤۔ وَاجْعَلْ لِّي لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِينَ ۙ
٨٥۔ وَاجْعَلْنِي مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيمِ ۙ
٨٦۔ وَاغْفِرْ لِأَبِيْ إِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّينَ ۙ
٨٧۔ وَلَا تُخْزِنِي يَوْمَ يُبْعَثُونَ ۙ

ترجمہ

٨٣۔ پروردگارا! مجھے علم و دانش عطا فرما اور مجھے صالحین سے ملحق کر دے۔
٨٤۔ اور میرے لیے آنے والی امتوں میں سچی زبان (اور ذکر خیر) قرار دے۔
٨٥۔ اور مجھے نعمتوں سے بھرپور بہشت کے وارثوں سے بنا دے۔
٨٦۔ اور میرے باپ (کی مانند چچا) کو بخش دے کیونکہ وہ گمراہوں میں سے ہے۔
٨٧۔ اور جس دن لوگ دوبارہ اٹھائے جائیں گے (اس دن) مجھے شرمندہ اور رسوا نہ کر۔

تفسیر

حضرت ابراہیمؑ کی اہم دعائیں

اس مقام پر جناب ابراہیم علیہ السلام کی اپنے اللہ سے دعاؤں اور اس کی بارگاہ میں درخواستوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گویا اس گمراہ قوم کو خدا کی طرف دعوت دینے اور کائنات میں اس کی ربوبیت کے جلووں کو بیان کرنے کے بعد یک لخت ان سے اپنا تعلق منقطع کر کے ذات خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جو کچھ مانگنا چاہتے ہیں اسی سے مانگتے ہیں اس طرح سے وہ بت پرستوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا اور آخرت کے لیے جو کچھ بھی چاہتے ہو اسی سے طلب کرو ضمنی طور پر یہ اس کی ربوبیت مطلقہ پر ایک اور تاکید بھی ہے۔

بارگاہ رب العزت میں جناب ابراہیم علیہ السلام کی سب سے پہلی درخواست یہ ہے: پروردگارا! مجھے علم و دانش (اور حق بینی کی نعمت) عطا فرما اور صالح افراد کے ساتھ ملحق فرما دے (رب هب لی حکمًا و الحقنی بالصالحین)۔

Marfat.com

اس مقام پر سب سے پہلے "حکم" کے منصب کی درخواست کرتے ہیں اور پھر "صالحین سے ملحق ہونے" کی دعا۔

"حکم" اور "حکمت" کی بنیاد ایک ہی ہے اور جیسا کہ راغب نے مفردات میں لکھا ہے حکمت، علم اور معرفت کے ذریعہ حق تک پہنچنے اور موجوداتِ عالم اور نیک افعال کی معرفت کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان اقدار اور معیاروں کو حکمت کہتے ہیں جن کے ذریعے انسان حق کی معرفت حاصل کر سکے چاہے وہ جہاں بھی ہو اور باطل کو پہچان سکے چاہے وہ جس لباس میں بھی ہو یہی وہ چیز ہے جسے بعض فلاسفر "قوۂ نظریہ کے کمال" کا نام دیتے ہیں۔

یہ وہی حقیقت ہے جو جناب لقمان کو خدا کی طرف سے حاصل ہوئی تھی ارشاد ہوتا ہے:

ولقد اتینا لقمان الحکمۃ

ہم نے لقمان کو حکمت عطا کی۔ (لقمان / ۱۲)

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۹ میں اسے "خیراً کثیراً" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرًا کثیرًا

نیز معلوم ہوتا ہے کہ "حکم" کا مفہوم "حکمت" سے بالاتر ہے یعنی ایسا علم اور ایسی آگاہی جس میں اجراء اور نفاذ کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہو۔ بالفاظ دیگر صحیح فیصلے کی قوت جس میں خواہشاتِ نفسانی اور غلطی کا قطعی عمل دخل نہ ہو۔

اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام سب سے پہلے خداوندِ عالم سے اسی گہری اور صحیح معرفت کی درخواست کرتے ہیں جس میں صحیح فیصلہ کرنے کی قدرت بھی موجود ہو کیونکہ کوئی بھی عملی منصوبہ اس وقت تک پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی بنیاد اسی چیز پر نہ رکھی جائے۔

اس درخواست کے بعد خدا سے صالحین کے ساتھ ملحق ہونے کی درخواست کرتے ہیں جو عملی پہلو کی جانب اشارہ ہے جسے اصطلاح میں "حکمتِ عملی" کہتے ہیں اور یہ سابقہ درخواست کا نقطہ مقابل ہے جسے اصطلاح میں "حکمت نظری" کہتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ جناب ابراہیمؑ "حکم" کی منزلت پر بھی فائز تھے اور "صالحین" کے زُمرے میں بھی شامل تھے تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اس طرح کی درخواست کر رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو حکمت کی کوئی حد مقرر ہے اور نہ ہی صالح ہونے کی حد معین ہے ان کی درخواست کا مقصد یہ ہے کہ روز بروز علم و عمل کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند مرتبے تک پہنچتے رہیں حتیٰ کہ وہ تو ایک اولوالعزم نبی کے مرتبہ پر فائز ہونے پر بھی قانع نہیں ہیں۔

پھر یہ کہ انھیں معلوم ہے کہ یہ سب کچھ خداوندِ عالم کی طرف سے ہے اور کسی بھی لمحے کسی بھی لغزش کے سرزد ہونے اور ان نعمتوں کے سلب ہو جانے کا اندیشہ ہے لہٰذا وہ خدا سے ارتقاء کی علاوہ ان کی پائیداری کی بھی درخواست کر رہے ہیں جیسا کہ ہم روزانہ ہر نماز میں خداوندِ عالم سے "صراطِ مستقیم" کی ہدایت کی درخواست کرتے ہیں اور اس راہ پر ثابت قدم رہنے اور ارتقاء کی منزلوں کو طے کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔

Marfat.com

ان دو درخواستوں کے بعد ایک اور اہم درخواست ان لفظوں میں کرتے ہیں : ۔ خداوندا! آنیوالی امتوں میں میرے لیے لسانِ صدق اور ذکرِ خیر مقرر فرما (واجعل لی لسان صدق فی الأخرین)۔

اس طرح کر دے کہ میری یاد دلوں میں باقی رہ جائے اور میرا مقرر کردہ طریقہ کار آنے والی نسلوں میں دائم و برقرار رہے۔ میں ایک اسوہ اور نمونہ عمل قرار پاؤں کہ لوگ میری اقتداء کریں میرے ہاتھوں ایسے مکتب کی بنیاد رکھ جس سے لوگ تیرے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں۔

چنانچہ خداوندعالم نے آپؑ کی یہ درخواست بھی منظور فرمائی جیسا کہ قرآن کہتا ہے :

وجعلنا لہم لسان صدق علیا

ہم نے ابراہیم ، اسحاق ، اور یعقوب کے لیے ذکرِ خیر اور بلند مرتبہ زبان مقرر کر دی ۔

(مریم / ۵۰)

بعید نہیں ہے کہ یہ درخواست بھی اسی درخواست میں شامل ہو جو جناب ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد ان لفظوں میں کی تھی ۔

وابعث فیہم رسولاً منہم یتلوا علیہم اٰیاتک ویعلمہم الکتاب والحکمۃ ویزکیہم

پروردگارا! ہماری (میری اور اسماعیل کی) اولاد میں ایک پیغمبر مبعوث فرما جو ان لوگوں پر تیری آیات کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور رشد وہدایت کے ذریعے انھیں پاک کرے۔

(بقرہ / ۱۲۹)

چنانچہ معلوم ہے کہ آنجنابؑ کی اس دعا نے بھی پیغمبر اسلامؐ کی بعثت کے ساتھ عملی صورت اختیار کر لی اور اس طرح سے اس عظیم اُمت میں ان کا ذکرِ خیر دوام کی صورت اختیار کر گیا۔

اس کے بعد آپؑ اپنی نگاہوں کے افق کو تبدیل کرکے آخرت کی جاودانی زندگی کی جانب متوجہ ہو جاتے ہیں اور چوتھی دعا کے لیے عرض کرتے ہیں :

خداوندا ! مجھے بہشت بریں کے وارثوں میں سے قرار دے (واجعلنی من ورثۃ جنۃ النعیم)۔

ایسی بہشت جس میں روحانی اور مادی نعمتیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں جن کو نہ تو کسی قسم کا زوال ہے اور نہ ہی وہاں پر کسی طرح کا رنج وملال ہے ایسی نعمتیں جو ہم جیسے اس پست جہان کے قیدیوں کے لیے ذرہ برابر بھی قابل ادراک نہیں نہ تو انھیں عقل سوچ سکتی ہے نہ کسی آنکھ نے انھیں دیکھا ہے اور نہ ہی کسی کان نے سنا ہے ۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ بہشت کے بارے میں " ارث " کی تعبیر یا تو اس لیے ہے کہ ارث بمعنی کسی نعمت کو بغیر کسی قسم کی تکلیف اور محنت ومشقت کے حاصل کرنے کے ہے اور یقیناً ہم جتنی تکلیفیں بھی اٹھائیں اور محنت ومشقت کریں پھر بھی وہ بہشت کی نعمتوں کے مقابلے میں ناچیز ہیں ۔

Marfat.com

یا پھر اس لیے کہ ہر انسان کا ایک گھر بہشت میں ہوتا ہے اور ایک جہنم میں اور جب وہ جہنم میں چلا جاتا ہے تو اس کا بہشت والا گھر دوسروں کو دے دیا جاتا ہے۔

پانچویں دعا میں ان کی نظر اپنے گمراہ چچا (آزر) کی طرف اٹھتی ہے چنانچہ اس وعدے کی بناء پر جو آپؑ نے ان سے دعائے مغفرت کے لیے پہلے سے کیا ہوا تھا بارگاہِ ایزدی میں عرض کرتے ہیں: خداوندا! میرے باپ (کی مانند چچا) کو بخش دے کیونکہ وہ گمراہوں میں سے ہے (واغفر لابی انه کان من الضآلین)۔

اس قسم کا وعدہ جناب ابراہیم علیہ السلام نے پہلے سے اس سے کیا ہوا تھا جیسا کہ قرآن مجید کی صریح آیت اس بارے میں کہتی ہے:

وما کان استغفار ابراهیم لابیه الا عن موعدة وعدها ایاه۔ (توبہ ۱۱۴)

اس سے ابراہیم علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ اس کی تالیفِ قلب کر کے اسے ایمان کی طرف لے آئیں لہٰذا انھوں نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا اور اس پر عمل بھی کیا۔

جناب عبداللہ بن عباس کی روایت کے مطابق جناب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آزر کے لیے دعائے مغفرت کی لیکن جب کفر کی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی اور دینِ برحق کے مقابلے میں اس کی دشمنی مسلّم ہوگئی تو آپ نے اس کے لیے استغفار کرنا بھی چھوڑ دی جیسا کہ مندرجہ بالا آیت کے ذیل میں ہم پڑھتے ہیں" فلما تبین له انه عدو لله تبرء منه" یعنی جب یہ بات واضح ہوگئی کہ وہ دشمنِ خدا ہے تو انھوں نے اس سے بیزاری اختیار کرلی۔[1]

آخرکار روزِ محشر کے بارے میں اپنے رب سے ان الفاظ میں چھٹی اور آخری دعا مانگتے ہیں: خداوندا! مجھے اس دن شرمسار اور رسوا نہ کرنا جس دن سب لوگ (قبروں سے) اٹھائے جائیں گے (ولا تخزنی یوم یبعثون)۔

"لاتخزنی" " خزی " (بروزنِ "حزب") کے مادہ سے ہے۔ مفردات میں راغب کی تصریحات کے مطابق "روح کی شکست" (شرمساری) کے معنیٰ میں ہے جو یا تو خود انسان کی اپنی وجہ سے ہوتی ہے جو زبردست حیاء کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے یا پھر کسی اور کی طرف سے اس پر مسلّط کی جاتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ تعبیر ایک طرف تو دوسروں کے لیے درسِ عمل اور اسوۂ حسنہ ہے اور دوسری طرف اپنی ذمہ داری کا زبردست احساس اور خداوندِ عالم کے لطف و کرم پر صد درجہ بھروسے کی دلیل ہے۔

---

[1] مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی آٹھویں جلد سورہ توبہ کی آیت ۱۱۴ کے ذیل میں مطالعہ فرمائیں۔

Marfat.com

۸۸۔ یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوۡنَ ۙ﴿﴾

۸۹۔ اِلَّا مَنۡ اَتَی اللّٰہَ بِقَلۡبٍ سَلِیۡمٍ ﴿ؕ﴾

۹۰۔ وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿﴾

۹۱۔ وَ بُرِّزَتِ الۡجَحِیۡمُ لِلۡغٰوِیۡنَ ۙ﴿﴾

۹۲۔ وَ قِیۡلَ لَہُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ تَعۡبُدُوۡنَ ۙ﴿﴾

۹۳۔ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ ؕ ہَلۡ یَنۡصُرُوۡنَکُمۡ اَوۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ ﴿ؕ﴾

۹۴۔ فَکُبۡکِبُوۡا فِیۡہَا ہُمۡ وَ الۡغَاوٗنَ ۙ﴿﴾

۹۵۔ وَ جُنُوۡدُ اِبۡلِیۡسَ اَجۡمَعُوۡنَ ﴿ؕ﴾

۹۶۔ قَالُوۡا وَ ہُمۡ فِیۡہَا یَخۡتَصِمُوۡنَ ۙ﴿﴾

۹۷۔ تَاللّٰہِ اِنۡ کُنَّا لَفِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ۙ﴿﴾

۹۸۔ اِذۡ نُسَوِّیۡکُمۡ بِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿﴾

۹۹۔ وَ مَاۤ اَضَلَّنَاۤ اِلَّا الۡمُجۡرِمُوۡنَ ﴿﴾

۱۰۰۔ فَمَا لَنَا مِنۡ شَافِعِیۡنَ ۙ﴿﴾

۱۰۱۔ وَ لَا صَدِیۡقٍ حَمِیۡمٍ ﴿﴾

۱۰۲۔ فَلَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَکُوۡنَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿﴾

۱۰۳۔ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿﴾

۱۰۴۔ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿ع﴾

Marfat.com

ترجمہ

۸۸۔ جس دن مال اور اولاد کوئی فائدہ نہیں پہنچائیں گے۔
۸۹۔ مگر جو شخص قلب سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو۔
۹۰۔ (اس دن) بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک کردی جائے گی۔
۹۱۔ اور جہنم، گمراہ لوگوں کے لیے ظاہر ہو جائے گی۔
۹۲۔ اور ان سے کہا جائے گا کہاں ہیں وہ معبود کہ تم جن کی پرستش کیا کرتے تھے۔
۹۳۔ خدا کے علاوہ (دوسرے) معبود آیا وہ تمھاری مدد کریں گے یا کوئی ان کی مدد کو آئے گا؟
۹۴۔ تو اس وقت تمام معبود (گمراہ) عابدوں کے ساتھ جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے۔
۹۵۔ اور اسی طرح ابلیس کے سارے کے سارے لشکر۔
۹۶۔ وہ وہاں پر جھگڑے پر کمربستہ ہو کر کہیں گے:
۹۷۔ خدا کی قسم ہم تو واضح گمراہی میں تھے۔
۹۸۔ کیونکہ تمھیں عالمین کے رب کے برابر سمجھتے تھے۔
۹۹۔ لیکن ہمیں تو سوائے مجرمین کے کسی اور نے گمراہ نہیں کیا۔
۱۰۰۔ (افسوس کہ آج) ہماری شفاعت کرنے والے موجود نہیں۔
۱۰۱۔ اور نہ ہی کوئی گرمجوش اور محبت بھرا دوست۔
۱۰۲۔ اگر ہم دوبارہ دنیا کی طرف پلٹ جائیں تو مومنین میں سے ہو جائیں گے۔
۱۰۳۔ اس ماجرے میں (عبرت اور) نشانی ہے، لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے۔
۱۰۴۔ اور تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے۔

Marfat.com

تفسیر

معبودوں اور گمراہ عابدوں کا جھگڑا

گزشتہ گفتگو کی آخری آیت میں روزِ قیامت اور معاد کے مسئلے کی طرف ایک مختصر سا اشارہ تھا لیکن زیرِ نظر کئی آیات میں قیامت کے منظر کی جامع تصویر کشی کی گئی ہے اور اس بازار میں جس اہم ترین سودے کے خریدار پائے جاتے ہیں اس کا بھی ذکر موجود ہے اور مومن، کافر، گمراہ اور شیطانی ٹولے کے افراد کا بھی ذکر ہے آیات کے ظاہر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ توصیف اور تشریح حضرت ابراہیمؑ کی دعا کا تمہ اور ضمیمہ ہے اور اکثر مفسرین بھی یہی کہتے ہیں لیکن بعض مفسرین کا احتمال یہ ہے کہ زیرِ نظر تمام آیات خدا کی گفتگو کا حصہ ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی دعا کے فوراً بعد ان کی گفتگو کی وضاحت اور تکمیل کے طور پر آئی ہیں لیکن یہ احتمال ضعیف ہے۔

صورتِ حال خواہ کچھ ہو قرآن سب سے پہلے کہتا ہے: قیامت کا دن وہ دن ہے، جس میں کوئی بھی مال اور اولاد کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچائیں گے (یوم لا ینفع مال و لا بنون)۔

درحقیقت حبِ دنیاوی زندگی کے دو اہم سرمائے، یعنی مال اور افرادی قوت اپنے صاحب کے لیے ذرہ بھر بھی مفید ثابت نہیں ہوں گے تو صاف ظاہر ہے کہ باقی دنیاوی سرمایہ جس کا شمار ان کے بعد ہوتا ہے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہاں پر مال اور اولاد سے مراد ایسا مال اور اولاد نہیں ہے جس سے رضائے الٰہی کے حصول کا کام لیا جائے، بلکہ ان کے مادی پہلو پر گفتگو کی جارہی ہے یعنی اس دن مادی سرمایہ کسی مشکل کو حل نہیں کر سکے گا، لیکن اگر یہ چیزیں، یعنی مال اور اولاد راہِ الٰہی میں کام آجائیں تو وہ مادی سرمایہ نہیں کہلائیں گی بلکہ وہ رنگِ الٰہی اور "صبغۃ اللہ" میں رنگ جائیں گی اور "الباقیات الصالحات" میں ان کا شمار ہونے لگے گا۔

پھر استثناء کے عنوان سے بات کو آگے بڑھاتا ہے: مگر جو شخص قلبِ سلیم لے کر اللہ کی بارگاہ میں پیش ہو (اس کا دل ہر قسم کے شرک و کفر اور گناہوں کی آلائش سے پاک صاف اور صحیح و سالم ہو) (الا من اتی اللہ بقلب سلیم)۔

تو معلوم ہوا کہ قیامت کے دن جو سرمایہ نجات دے گا وہ قلبِ سلیم ہے اور بس۔ کیا ہی جامع اور عمدہ تعبیر ہے۔ یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس میں خالص ایمان بھی پایا جاتا ہے اور پاک نیت اور ہر قسم کا نیک عمل بھی۔ کیونکہ اس طرح کے پاک و پاکیزہ دل کا ثمرہ بھی پاک اور پاکیزہ ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں جس طرح انسان کا دل اور روح اس کے اعمال میں مؤثر ہوتے ہیں اس کے اعمال کا بھی اس کے دل و جان پر وسیع ردِ عمل ہوتا ہے اور انھیں اپنے رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔ اعمال خواہ رحمانی ہوں یا شیطانی ان کا دل و جان پر ضرور اثر ہوتا ہے۔

پھر جنت اور جہنم کی تشریح کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے: اس وقت بہشت پرہیزگاروں کے نزدیک کردی جائے گی (و ازلفت الجنۃ للمتقین)[1]۔

[1] (حاشیہ اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

اور جہنم گمراہ لوگوں کے لیے ظاہر ہوگی (وبرزت الجحیم للغاوین)۔
درحقیقت یہ سب کچھ ان لوگوں کے جنت یا جہنم میں داخل ہونے سے پہلے ہوگا اور ان دونوں گروہوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے ٹھکانے کا منظر نزدیک سے دیکھ لے گا۔ مومن مسرور و شادمان اور گمراہ مبہوت و وحشت زدہ ہوجائیں گے اور یہ ان کی پاداش اور جزا و سزا کا پہلا مرحلہ ہوگا۔

پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ پرہیزگاروں کو بہشت کے نزدیک کر دیا جائے گا بلکہ فرماتا ہے بہشت کو ان کے قریب کر دیا جائے گا اور یہ ان متقین کی عظمت اور بلندئ درجات کی طرف اشارہ ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ "غاوین" (گمراہ لوگ) کی تعبیر وہی تعبیر ہے جو شیطان کی داستان میں آچکی ہے کہ جب شیطان بارگاہِ الٰہی سے دھتکار دیا گیا اور خدا نے فرمایا:

"ان عبادی لیس لك علیھم سلطان الا من اتبعك من الغاوین"

تجھے میرے بندوں پر تسلط حاصل نہیں ہوگا، مگر جو لوگ گمراہ ہیں وہ تیری پیروی کریں گے۔

(حجر / ۴۲)

پھر اس گفتگو کا تذکرہ کرتا ہے جس کے ذریعے اس گمراہ گروہ کو سرزنش اور عتاب کیا جائے گا۔ فرماتا ہے انھیں کہا جائے گا کہاں ہیں تمھارے وہ معبود کہ جن کی تم عبادت کیا کرتے تھے (وقیل لھم این ما کنتم تعبدون)۔

وہی معبود جو خدا کے علاوہ تھے (من دون اللہ)۔

اب جبکہ ان شدید مصائب اور سختیوں میں تم گھرے ہوئے ہو تو کیا وہ تمھاری مدد کر رہے ہیں (ھل ینصرونکم)۔

کسی کو تمھاری امداد کے لیے بلا رہے ہیں یا کوئی ان کی امداد کو آرہا ہے (او ینتصرون)[1]

لیکن وہ اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکیں گے اور نہ ہی کسی کو ان سے اس قسم کی توقع ہے۔

اس موقع پر تمام معبودوں کو اکٹھا کر کے ان کے گمراہ عابدوں کے سامنے انھیں جہنم میں ڈال دیا جائے گا (فکبکبوا فیھا ھم والغاوون)۔

بعض مفسرین کے بقول ان میں سے ہر ایک کو دوسرے پر اوندھے منہ ڈالا جائے گا۔

اور اسی طرح ابلیس کے لشکری تمام کے تمام (وجنود ابلیس اجمعون)۔

درحقیقت یہ تینوں گروہ یعنی بُت، بتوں کے پجاری اور شیطان کے لشکری جو کہ ان گناہوں کے دلال ہیں سب کے سب دوزخ میں جمع کیے جائیں گے لیکن اس طرح کہ انھیں یکے بعد دیگرے جہنم میں ڈالا جائے گا۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) "ازلفت" "زلفی" (بروزن کبریٰ) قرب اور نزدیکی کے معنیٰ میں ہے۔

[1] ممکن ہے کہ "ینتصرون" اپنے لیے مدد طلب کرنے کی طرف یا دوسروں کے لیے مدد طلب کرنے کی طرف یا ہر دو کے لیے مدد کی درخواست کی طرف اشارہ ہو کیونکہ بعد والی آیات میں ہے کہ معبود اور عابد دونوں جہنم میں ڈالے جائیں گے۔

Marfat.com

چونکہ " کبکبوا " دراصل " کب " کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے کسی چیز کو گڑھے میں منہ کے بل ڈالنا اور " کب " کو مکرر صورت (کبکب) میں لانا ان کو جہنم میں لڑھکانے کا معنیٰ بیان کرتا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو دوزخ میں ایسے ڈالا جائے گا جس طرح کسی پتھر کو ڈالا جاتا ہے کہ اسے ایک بلند مقام سے گرایا جائے تو پہلے وہ درے میں آگرے گا پھر ایک اور جگہ پھر وہاں سے کسی اور جگہ اسی طرح گرتے گرتے وہ گہرے کھڈ میں جا پڑے گا۔[1]

لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد ان جہنمیوں کی باہمی تلخ کلامی اور جھگڑے فساد کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے : وہ جہنم میں آپس میں لڑائی جھگڑا کریں گے اور کہیں گے (قالوا و هم فیها یختصمون)۔

جی ہاں وہ گمراہ عابد کہیں گے : خدا کی قسم ہم تو کھلم کھلا گمراہی میں تھے (تالله ان کنا لفی ضلال مبین)۔[2]

کیونکہ تم جھوٹے معبودوں کو رب العالمین کے برابر سمجھتے تھے (اذ نسویکم برب العالمین)۔[3]

لیکن سوائے مجرمین کے ہمیں کسی نے بھی گمراہ نہیں کیا (وما اضلنا الا المجرمون)۔

وہی مجرمین جو ہمارے معاشرہ کے سرغنے تھے اور جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر ہمیں قربانی کا بکرا بنایا اور بدبختی کے اس مقام پر لے آئے۔

لیکن افسوس کہ ہماری شفاعت کرنے والے موجود نہیں (فما لنا من شافعین)۔

اور نہ ہی کوئی گرم جوش اور محبت کرنے والا دوست ہے جو ہماری مدد کر سکے (ولا صدیق حمیم)۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح ہم دنیا میں سمجھتے تھے کہ ہمارے معبود ہماری مدد کریں گے لیکن ایسا نہیں ہے اور وہ ہماری مدد نہیں کر رہے اور نہ ہی ہمارے دوستوں میں مدد کا یارا ہے۔

قابل غور بات یہ بھی ہے کہ گزشتہ آیت میں " شافعین " جمع اور " صدیق " مفرد کی صورت میں آیا ہے ممکن ہے کہ یہ تفاوت اس لیے ہو کہ گمراہوں کا یہ گروہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ جو مومنین دنیا میں لغزشوں کا شکار تھے آج انھیں انبیاء، اوصیاء، ملائکہ اور دوسرے شفاعت کرنے والے دوستوں کی شفاعت نصیب ہو رہی ہے، تو وہ بھی یہی آرزو کریں گے کہ اے کاش!

۱۔ موجودہ فارسی میں " کبکبہ " سواروں کی جماعت یا گھوڑوں اور انسانوں کے اکٹھا چلنے کی صدا کو کہا جاتا ہے اور یہ شان و شوکت اور عظمت و جلال کے لیے کنایہ ہے (فرہنگ معین)۔
بعید نہیں کہ اس کلمہ کو " کبکوبہ " (دونوں کاف پر پیش کے ساتھ) سے لیا گیا ہو جو عربی میں انسانوں کی جماعت یا گھوڑوں کے ٹولے کے معنی میں ہے اور کبھی اسے فارسی میں " دبدبہ " بھی استعمال کرتے ہیں جس کا معنیٰ بھی لوگوں کے پاؤں کی یا ڈھول باجے وغیرہ کی صدا ہے۔

۲۔ " ان کنا " میں " ان " مثقلہ سے مخففہ بن کر استعمال ہوا ہے جو دراصل " اننا کنا " تھا۔

۳۔ ہو سکتا ہے کہ یہاں پر " اذ " ظرفیت کے معنیٰ میں ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ تعلیلیہ ہو۔

Marfat.com

کہ ان کا بھی کوئی شفاعت کرنے والا اور دوست ہوتا۔

رہا "صدیق"، تو بعض مفسرین کی تصریح کے مطابق "صدیق" اور "عدو" کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے اور جمع پر بھی۔

لیکن بہت جلد ان کو اس حقیقت کا پتہ چل جائے گا کہ اب افسوس کا کوئی فائدہ نہیں اور نہ ہی وہاں پر کوئی نیک عمل کر کے اپنی کوتاہیوں کی تلافی کی جاسکتی ہے لہٰذا وہ دنیا میں واپس آنے کی آرزو کریں گے اور کہیں گے: اگر ہم دوبارہ دنیا میں پلٹ جائیں تو مومنوں میں سے ہوں گے (فلو ان لنا کرۃ فنکون من المؤمنین)۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ وہاں پر اور اس دن ایمان لے آئیں گے، لیکن ان کا یہ ایمان ایک طرح سے مجبوری والا ایمان ہوگا۔ ایمان وہ مؤثر، تعمیری اور قابلِ قبول ہوتا ہے جو اختیاری ہو اور اسی جہان میں ہو۔ جس سے ہدایت بھی حاصل ہو اور اعمالِ صالحہ بھی سرزد ہوں۔

لیکن یہ آرزو بھی کسی صورت میں کوئی مشکل حل نہیں کرے گی اور طریقۂ الٰہیہ کسی کو واپس پلٹنے کی اجازت نہیں دے گا اور وہ خود بھی اس حقیقت کو سمجھتے ہوں گے اور کلمہ "لو" اسی بات کی دلیل ہے[۱]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گمراہ قوم کے ساتھ گفتگو، بارگاہِ ربُّ العزت میں ان کی دعا اور روزِ قیامت کی کیفیت بیان کرنے کے بعد خداوندِ عالم نے تمام لوگوں کے لیے نتیجہ کے طور پر آخر میں وہی دو آیات ذکر کی ہیں جو موسیٰؑ اور فرعون کی داستان کے آخر میں ذکر کی ہیں اور اسی سورہ میں دوسرے انبیاء کی داستانوں میں بھی آئی ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: اس ماجرے میں خدا کی عظمت و قدرت اور گمراہ لوگوں کے دردناک انجام اور مومنین کی کامیابی میں بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے (ان فی ذالک لاٰیۃ و ما کان اکثرھم مؤمنین)۔

اور تمہارا پروردگار ناقابلِ تسخیر اور بے حد مہربان ہے (و ان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

اس قسم کے جملوں کو بار بار اس لیے دہرایا جاتا ہے تاکہ اس طرح سے پیغمبرِ اسلامؐ اور اس زمانے کے تھوڑے سے مسلمانوں کی تسلی خاطر کے اسباب فراہم کیے جاسکیں، نیز اس لیے بھی کہ کسی دور میں بھی مومن اقلیت گمراہ اکثریت سے وحشت نہ کرے اور خدا کی عزت و رحمت کے ذریعے اپنے آپ کو مشغول اور سرگرم رکھے۔ نیز یہ گمراہ لوگوں کے لیے ایک قسم کی تنبیہ اور اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ اگر انھیں کچھ ڈھیل دی جارہی ہے تو اس لیے نہیں کہ خداوندِ عالم کمزور ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ رحیم ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ "قلبِ سلیم" ہی نجات کا سرمایہ ہے: آیاتِ بالا میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گفتگو کے دوران قیامت کی کیفیت کے بارے میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ سوائے "قلبِ سلیم" کے اور کچھ کام نہیں آئے گا۔

"سلیم" "سلامت" کے مادہ سے ہے جس کا مفہوم واضح ہے یعنی وہ دل جو ہر قسم کی بیماری اور اخلاقی و اعتقادی بے راہروی سے

---

[۱] "لو" حرفِ شرط ہے اور عام طور پر وہاں بولا جاتا ہے جہاں پر شرط محال ہو۔

Marfat.com

پاک ہو۔

قرآن مجید منافق لوگوں کے بارے میں یہ فرماتا ہے:

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضًا

ان کے دلوں میں ایک طرح کی بیماری ہے اور ان کی ہٹ دھرمی کی بنا پر خداوند عالم ان کی بیماری میں اضافہ کر دیتا ہے۔

(بقرہ / ۱۰)

چند ایک احادیث میں قلب سلیم کا بخوبی تعارف کروایا گیا ہے:

۱۔ اسی آیت کے ذیل میں ہم حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں پڑھتے ہیں:

وکل قلب فیہ شرك او شك فھو ساقط

ہر وہ دل جس میں شرک اور شک ہو اور جو ساقط اور بے قدر و قیمت ہوتا ہے[1]

۲۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان کا مادی چیزوں سے شدید تعلق ہے اور دنیا پرستی اسے ہر گناہ پر آمادہ اور ہر قسم کی بے راہروی کا شکار بنا دیتی ہے کیونکہ:

حب الدنیا رأس کل خطیئة

دنیا سے محبت ہر برائی کا سرچشمہ ہے[2]

لہٰذا "قلب سلیم" وہ دل ہوتا ہے جو "حبّ دنیا" سے خالی ہو، جیسا کہ اسی آیت کے ضمن میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے:

ھو القلب الذی سلم من حب الدنیا

یہ وہ قلب ہوتا ہے جو دنیا کی محبت سے محفوظ ہو[3]

اگر سورۂ بقرہ کی آیت ۱۹۷ کو مدنظر رکھا جائے، جس میں خدا فرماتا ہے:

وتزوّدوا فان خیر الزاد التقوٰی

اپنے لیے زادِ راہ تیار کرو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔

تو معلوم ہوگا کہ قلب سلیم وہ قلب ہوتا ہے جس میں تقوائے الٰہی جاگزیں ہو۔

۳۔ آخری بات یہ ہے کہ قلب سلیم وہ قلب ہوتا ہے جس میں خدا کے علاوہ اور کوئی چیز نہ ہو۔ جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اسی آیت کے سلسلے میں کیے جانے والے ایک سوال کے جواب میں

---

[1] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] بحار الانوار جلد ۷۰، ص ۲۳۹۔

[3] تفسیر صافی اسی آیت کے ضمن میں۔

Marfat.com

ارشاد فرماتے ہیں :۔

القلب السليم الذى يلقى ربه وليس فيه احد سواه

قلبِ سلیم وہ دل ہے جو خدا کی ملاقات کرے جبکہ اس میں خدا کے سوا کوئی اور نہ ہو[1]

واضح سی بات ہے کہ اس جیسے مقامات پر قلب سے مراد انسان کی روح اور جان ہوتے ہیں ۔

اسلامی روایات میں قلب، اس کی سلامتی، اس کو لاحق ہونے والی آفتیں اور ان آفتوں کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں بہت سی باتیں مذکور ہیں جن سے اس اسلامی منطق کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام ہر چیز سے پہلے فکری، عقیدتی اور اخلاقی بنیادوں کو زبردست اہمیت دیتا ہے کیونکہ انسان کے تمام اعمال کا دارو مدار انہی چیزوں پر ہے ۔

جس طرح کہ ظاہری دل کی سلامتی اور تندرستی سے تمام جسم صحیح سالم اور تندرست رہتا ہے اور اس کے بیمار پڑ جانے سے تمام اعضاء بیمار ہو جاتے ہیں کیونکہ بدن کے تمام خلیوں (Cells) کو غذا خون کے ذریعے ملتی ہے اور خون، دل کے ذریعے بدن کے تمام حصوں میں پہنچتا ہے ۔

بالکل اسی طرح انسانی زندگی کے سالم اور فاسد ہونے کا دارو مدار بھی اس کے عقیدے اور اخلاق کے سالم اور فاسد ہونے پر ہے ۔

اس تفصیلی گفتگو کو امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث کے ساتھ ختم کرتے ہیں ۔ امام علیہ السلام فرماتے ہیں :

قلب چار قسم کے ہیں :۔

ایک وہ دل جس میں ایمان ہوتا ہے اور نفاق بھی ۔

ایک وہ دل جو الٹا ہوتا ہے ۔

ایک وہ دل جس پر مُہر لگی ہوتی ہے اور کوئی حق وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ۔

ایک وہ دل جو نورانی اور (غیر خدا سے) خالی ہوتا ہے ۔

پھر فرماتے ہیں :۔

نورانی دل مومن کا دل ہوتا ہے جس طرح خدا فرماتا ہے "افمن يمشى مكبا على وجهه اهدى امن يمشى سويا على صراط مستقيم" یعنی آیا جو شخص زمین پر منہ کے بل چلتا ہے وہ زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا جو شخص سیدھے ہو کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہے؟ (الملک ۔۔۔ ۲۲)

اور وہ دل جس میں ایمان بھی ہے اور نفاق بھی، تو یہ ایسے لوگوں کا دل ہے جو حق اور باطل کے بارے میں بالکل لاتعلق ہوتے ہیں اور ان کے درمیان فرق نہیں کرتے ۔ اگر حق کے ماحول میں پہنچ جائیں تو حق کے تابع ہو جاتے ہیں اگر باطل کے ماحول میں پھنس جائیں تو اس کے

---

[1] صافی بحوالہ کافی ۔

Marfat.com

طرف دار بن جاتے ہیں ۔
رہا وہ دل کہ جس پر مہر لگی ہوتی ہے وہ منافقین کا دل ہوتا ہے[1]

۲۔ آیت "فکبکبوا ...... کا مفہوم: حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام سے "فکبکبوا فیہا ھم والغاوون" والی آیت کے ذیل میں بہت سی روایات منقول ہیں ۔ مثلاً

ھم قوم وصفوا عدلا بالسنتھم ثم خالفوہ الی غیرہ

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو حق وانصاف کی زبان سے تو بڑی تعریف کرتے ہیں لیکن عمل میں اس کی مخالفت کرتے ہیں[2]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عمل کے بغیر باتیں کرنا کس قدر بُری اور قابلِ مذمت بات ہے اور اس قسم کے شخص کو جہنم کی آگ میں دردناک طریقے سے ڈالا جائے گا اور وہ لوگ ہوں گے جو خود بھی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں ان کی باتیں تو لوگوں کو حق کی طرف بلاتی ہیں لیکن اعمال باطل کی طرف دعوت دیتے ہیں ، بلکہ ان کے اعمال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اپنی باتوں پر ایمان نہیں ہے ۔

ضمنی طور پر اس طرف بھی توجہ رہے کہ " غاوون " کو " غی " کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنیٰ ہر قسم کی گمراہی نہیں بلکہ "مفردات" میں " راغب " کے بقول یہ گمراہی اور جہالت کی وہ قسم ہے جس کا مرکز اور منبع فاسد عقیدہ ہوتا ہے ۔

۳۔ آیت " فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم " کا مفہوم: اس کا معنیٰ ہے نہ تو ہمارے شفاعت کرنے والے موجود ہیں اور نہ ہی محبت بھرے دوست متعدد روایات اس ضمن میں بیان ہوئی ہیں جن میں سے بعض روایات میں صراحت کے ساتھ آیا ہے :

الشافعون الائمۃ والصدیق من المؤمنین

شافع تو آئمہ ہیں اور صدیق مومنین ہیں[3]

ایک اور حدیث میں جابر بن عبد اللہ انصاری سے منقول ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سُنا ہے :۔

ان الرجل یقول فی الجنۃ ما فعل صدیقی فلان وصدیقہ فی الجحیم فیقول اللہ اخرجوا لہ صدیقہ الی الجنۃ فیقول من بقی فی النار فما لنا من شافعین ولا صدیق حمیم

بعض بہشتی لوگ کہیں گے کہ ہمارے دوست کا کیا انجام ہوا ہے جبکہ ان کے دوست جہنم میں

---

[1] اصولِ کافی جلد ۲ صفحہ ۲۰۹ باب فی ظلمۃ قلب المنافق ۔
[2] تفسیر نور الثقلین کے مؤلف نے اس روایت کو " اصولِ کافی "، " تفسیر علی بن ابراہیم " اور " محاسنِ برقی " سے نقل کیا ہے ۔
[3] " محاسنِ برقی " منقول از تفسیر نور الثقلین اسی آیت کے ضمن میں ۔

Marfat.com

ہوں گے۔ خداوندِ عالم اس مومن کے دل کو خوش کرنے کے لیے حکم دے گا کہ ان کے دوستوں کو جہنم سے نکال کر بہشت میں بھیج دیا جائے تو ایسے موقع پر جہنم میں باقی رہ جانے والے لوگ کہیں گے ہائے افسوس! نہ تو کوئی ہماری شفاعت کرنے والا ہے اور نہ ہی کوئی مہربان دوست ہے[1]۔

ظاہر ہے کہ نہ تو شفاعت کسی معیار کے بغیر ہوگی اور نہ ہی بے حساب دوستوں کے بارے میں ان کی درخواست شفاعت ہوگی بلکہ شفاعت کرنے اور شفاعت کیے جانے والوں کے درمیان کسی قسم کا معنوی اور روحانی رابطہ ہونا ضروری ہے تاکہ شفاعت کا مقصد پورا ہو۔ (شفاعت کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد اوّل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۴۸ کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں)۔

---

[1] تفسیر مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

۱۰۵۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ الْمُرْسَلِينَ ۝
۱۰۶۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوهُمْ نُوحٌ اَلَا تَتَّقُونَ ۝
۱۰۷۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝
۱۰۸۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝
۱۰۹۔ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۱۱۰۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝
۱۱۱۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝
۱۱۲۔ قَالَ وَمَا عِلْمِيْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝
۱۱۳۔ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰي رَبِّيْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝
۱۱۴۔ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝
۱۱۵۔ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

ترجمہ

۱۰۵۔ نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا۔
۱۰۶۔ جب ان کے بھائی نوحؑ نے انھیں کہا: کیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے ؟
۱۰۷۔ میں تمھارے لیے رسولِ امین ہوں۔
۱۰۸۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔
۱۰۹۔ اس تبلیغِ رسالت کے بدلے میں، میں تم سے کسی قسم کی مزدوری نہیں مانگتا، میرا اجر تو میرے پروردگار کے پاس ہے۔

Marfat.com

۱۱۰۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۱۱۔ انھوں نے کہا: آیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں جبکہ پست اور رذیل لوگ تیری پیروی کر چکے ہیں۔

۱۱۲۔ (نوح نے) کہا: مجھے کیا معلوم ان کے عمل کیسے ہیں؟

۱۱۳۔ ان کا حساب وکتاب تو میرے پروردگار کے ذمّے ہے اگر تم سمجھ دار ہو۔

۱۱۴۔ میں کبھی بھی مومنین کو نہیں دھتکاروں گا۔

۱۱۵۔ میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

تفسیر

نوحؑ کے گرد افراد

قرآن مجید جناب ابراہیم علیہ السلام کی داستان اور ان کی اپنی گمراہ قوم کے ساتھ گفتگو کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا تذکرہ کرتا ہے اور اسے ایک اور سبق آموز داستان کی صورت پیش کرتا ہے اور چند آیات میں اس قوم کی ہٹ دھرمی، ضد اور بے شرمی کو ان کے دردناک انجام کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

سب سے پہلے کہتا ہے: قوم نوح نے رسولوں کو جھٹلایا (کذبت قوم نوح المرسلین)۔[1]

معلوم ہے کہ نوح کی قوم نے صرف نوح کی ہی تکذیب کی تھی لیکن چونکہ اصولی طور پر تمام انبیاء علیہم السّلام کی دعوت ایک ہوتی ہے لہٰذا نوح کی تکذیب تمام رسولوں کی تکذیب شمار ہوئی۔ لہٰذا خدا بھی یہی فرماتا ہے کہ نوح کی قوم نے "رسولوں" کو جھٹلایا۔

یہ احتمال بھی ہے کہ نوح علیہ السّلام کی قوم تمام ادیان اور مذاہب ہی کی منکر ہو اور وہ خدا کے تمام انبیاء کی تکذیب کرتی ہو چاہے وہ نوح سے پہلے گزر چکے تھے یا ان کے بعد آنے والے تھے۔

پھر ابراہیم اور موسیٰ علیہما السّلام کی طرح ان کی زندگی کا بلند نصب العین بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس وقت کو یاد کرو جب ان کے بھائی نوح نے انھیں کہا: کیا تم پرہیزگاری اختیار نہیں کرتے ہو (اذ قال لهم اخوهم نوح الا تتقون)۔

---

[1] "کذبت" کو مؤنث اس لیے لایا گیا ہے کہ قوم "جماعت" کے معنی میں ہے اور جماعت مونث لفظی ہے۔ بعض ارباب فن کہتے ہیں کہ قوم مونث ذاتی ہے کیونکہ اس کی تصغیر "قومیة" آتی ہے (پہلی بات طبرسی نے مجمع البیان میں اور دوسری فخر رازی نے اپنی تفسیر میں کہی ہے) لیکن آلوسی اپنی تفسیر روح المعانی میں کہتے ہیں کہ لفظ "قوم" مذکر اور مؤنث دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔

Marfat.com

"بھائی" کی تعبیر ایسی ہے جو مساوات اور برابری کی بنیاد پر ایک نہایت ہی محبت آمیز تعلق کو ظاہر کرتی ہے یعنی حضرت نوح علیہ السّلام ان پر کسی قسم کی برتری جتائے بغیر نہایت ہی سادگی اور صمیم قلب کے ساتھ انھیں دعوتِ پرہیزگاری دیتے رہے۔

اخوت کی تعبیر صرف حضرت نوح علیہ السّلام ہی کے لیے نہیں آئی بلکہ ہود، صالح اور لوط علیہم السّلام جیسے دوسرے انبیاء کے لیے بھی آئی ہے جو راہِ حق کے تمام راہنماؤں کی راہنمائی کر رہی ہے کہ ان کی دعوت نہایت ہی پیار، محبت اور عزم و خلوص پر مبنی ہونی چاہیے اور ہر قسم کی فوقیت طلبی سے دوری اختیار کرنی چاہیے تاکہ دینِ حق سے دُور بھاگے ہوئے دل زیادہ سے زیادہ نزدیک آجائیں اور کسی قسم کا بوجھ بھی اپنے لیے محسوس نہ کریں۔

چونکہ ہر قسم کی ہدایت اور مکمل نجات کا دارو مدار تقویٰ پر ہے لہٰذا اسے پہلے بیان کرنے کے بعد فرمایا گیا ہے: میں تمھارے لیے (اللہ کا) امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

"خدا سے ڈرو، تقویٰ اپناؤ اور میری اطاعت کرو" (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السّلام کی امانت کے لحاظ سے اپنی قوم میں ایک عرصہ دراز سے مسلم حیثیت تھی اور لوگ آپؑ کو "امین" کی اعلیٰ صفت کے ساتھ پہچانتے تھے۔ اسی لیے آپؑ بھی فرماتے ہیں: اسی دلیل کی بناء پر میں خدائی رسالت کی ادائیگی میں بھی امین ہوں اور مجھ سے کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں دیکھو گے۔

"تقویٰ" کو "اطاعت" پر مقدم کرنے کی وجہ یہ ہے کہ "اللہ" کی ذات پر مکمل ایمان و اعتقاد نہ ہو اور دل میں اس کی ذات کا خوف نہ ہو تو اس کے پیغمبر کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

ایک بار پھر حضرت نوح علیہ السّلام اپنی نبوت کی حقانیت پر ایک اور دلیل پیش کرتے ہیں۔ یہ ایسی دلیل ہے جس سے بہانہ بنانے والے لوگوں کی زبان بند کر دیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں: میں تم سے اس دعوت کے عوض میں کوئی مزدوری نہیں مانگتا (و ما اسئلکم علیہ من اجر)۔

"میرا اجر تو پروردگارِ عالم کے ذمے ہے" (ان اجری الا علی رب العالمین)۔

ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی عموماً نبوت کے دعویدار کی صداقت کی دلیل ہوتی ہے جبکہ مادی اغراض بخوبی واضح کرتی ہیں کہ اس کا مقصد مفاد پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ خاص کر اس زمانے کے اعراب اس مسئلے کے سلسلے میں کاہنوں اور ان جیسے افراد سے اچھی طرح واقف تھے۔

اس جملے کے بعد پھر وہی جملہ کہتے ہیں جو انھوں نے اپنی رسالت اور امانت کو بیان کرنے کے بعد کہا تھا: فرماتے ہیں: خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

لیکن ہٹ دھرم مشرکین اور خود سر متکبرین نے جب بہانہ تراشیوں کی تمام راہیں اپنے اوپر بند دیکھیں تو یہ بہانا بنانا شروع کر دیا اور کہا: آیا ہم تجھ پر ایمان لے آئیں جب کہ پست اور رذیل لوگ تیری پیروی کر چکے ہیں (قالوا انؤمن لك واتبعك الارذلون)۔

کسی رہبر اور پیشوا کی حیثیت اور اس کی قدر و قیمت اس کے پیروؤں سے پہچانی جاتی ہے اور اصطلاح کے مطابق

Marfat.com

صاحبِ مزار کو اس کے زائرین سے پہچانا جاتا ہے جب ہم تمھارے پیروکاروں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں چند ایک بے بضاعت، گمنام، فقیر اور غریب لوگ ہی نظر آتے ہیں جن کا سلسلۂ روزگار بھی نہایت ہی معمولی ہے تو پھر ایسی صورت میں تم کس طرح امید کر سکتے ہو کہ مشہور و معروف دولت مند اور نامی گرامی لوگ تمھارے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے۔

ہم اور یہ لوگ کبھی بھی ایک ساتھ نہیں چل سکتے ہم نہ تو کبھی ایک دسترخوان پر بیٹھے ہیں اور نہ ہی ایک چھت کے نیچے اکٹھے ہوئے ہیں تمھیں ہم سے کیسی غیر معقول توقع ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ اپنی اس بات میں سچے تھے کہ کسی پیشوا کو اس کے پیروکاروں سے پہچانا جاتا ہے لیکن ان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے شخصیت کے مفہوم اور معیار کو اچھی طرح نہیں پہچانا تھا۔ ان کے نزدیک شخصیت کا معیار مال، دولت لباس اور گھر اور خوبصورت اور قیمتی سواری تھا لیکن طہارت، تقویٰ، حق جوئی جیسی اعلیٰ انسانی صفات سے غافل تھے جو غریبوں میں زیادہ اور امیروں میں کم پائی جاتی ہیں۔

طبقاتی اونچ نیچ بدترین صورت میں ان کی افکار پر حکم فرما تھی۔ اسی لیے وہ غریب لوگوں کو "اراذل" سمجھتے تھے۔ "اراذل"، "ارذل" (بروزن "اہرم") کی جمع ہے اور وہ بھی "رذل" یعنی پست اور حقیر کی جمع ہے اور اگر وہ طبقاتی معاشرے کے قید خانے سے باہر نکل کر سوچتے اور باہر کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو انھیں معلوم ہو جاتا کہ ایسے لوگوں کا ایمان اس پیغمبرؑ کی حقانیت اور اس کی دعوت کی سچائی پر بذاتِ خود ایک دلیل ہے۔

لیکن نوح علیہ السلام انھیں یہ کہہ کر فوراً لاجواب کر دیتے ہیں کہ میرا کام تو حق کی طرف دعوت دینا اور معاشرے کی اصلاح کرنا ہے میں کیا جانوں کہ وہ کیا کرتے تھے (قال و ما علمی بما کانوا یعملون)۔

ان کا ماضی جو کچھ تھا وہ گزر چکا، معیار موجودہ حالت ہے اور آج انھوں نے خدائی راہبر کی دعوت کو "لبیک" کہا ہے اپنی اصلاح کے لیے تیار ہو گئے ہیں اور اپنے دل کو حق کے قبضۂ قدرت میں دے دیا ہے۔

انھوں نے گزشتہ زمانے میں اچھا یا برا کام کیا ہے تو "ان کا حساب و کتاب میرے پروردگار کے پاس ہے اگر تم کچھ سمجھدار ہو" اور تمھارے اندر قوتِ تمیز موجود ہے، (ان حسابھم الا علی ربی لو تشعرون)۔

اس گفتگو سے ضمنی طور پر یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ وہ لوگ ان مومنین کو غربت کے علاوہ اخلاقی اور عملی جرائم کا الزام بھی دینا چاہتے تھے کہ ان کے ماضی کا ریکارڈ خراب رہا ہے۔ حالانکہ اخلاقی جرائم معاشرے کے خوشحال طبقے میں کئی درجے زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ان کے پاس ان جرائم کے ہر طرح کے وسائل اور ذرائع ہوتے ہیں، وہ اپنے مال اور دولت کے نشے میں مغرور ہوتے ہیں اور خدا کے بندے بہت کم ہوتے ہیں۔

لیکن نوح علیہ السلام نے ان سے اس مسئلے میں الجھے بغیر یہی کہا کہ میں نے ان میں کوئی برائی نہیں دیکھی اور اگر واقعاً ایسا ہے جیسا تم کہتے ہو تو پھر ان کا حساب و کتاب خدا پر ہے۔

جو میرا فریضہ بنتا ہے وہ یہی ہے کہ میری دعوت سب حق طلب انسانوں کے لیے ہے "میں کبھی ایمان لانے والوں کو دھتکاروں گا نہیں" (و ما انا بطارد المومنین)۔

Marfat.com

درحقیقت یہ ان مغرور دولت مندوں کی ضمنی درخواست کا جواب ہے جو انھوں نے جناب نوح علیہ السلام سے کی تھی کہ ان غریبوں کو اپنے اطراف سے ہٹا دیں تاکہ ہم آپ کے پاس آئیں۔

میرا فریضہ صرف یہی ہے کہ لوگوں کو ڈراؤں میں تو صرف واضح طور پر ڈرانے والا ہوں (ان انا الا نذیر مبین)۔

جو شخص میری اس تنبیہ کو سنے اور کجروی سے صراطِ مستقیم پر آجائے تو وہ میرا پیروکار ہے۔ خواہ کوئی ہو اور اس کی مادی اور اجتماعی کیفیت خواہ کیسی ہی ہو۔

پھر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے اعتراض صرف حضرت نوح علیہ السلام پر ہی نہیں کیا کہ جو سب سے پہلے اولوا العزم رسول ہیں بلکہ پیغمبر خاتم الانبیاء اور اسی طرح دوسرے کئی انبیاء پر بھی کیا ہے انھوں نے اپنی سیاہ عینک سے ان سفید لباس والوں کو تاریکی میں دیکھا اور ہمیشہ انھیں دور کرنے کا تقاضا کرتے رہے۔ بلکہ وہ تو خدا اور ان انبیاء کو نہیں چاہتے تھے جن کے اس قسم کے پیروکار تھے۔

لیکن قرآن مجید سورۂ کہف میں کیسے عمدہ پیرائے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے:

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغدوة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم تريد زينة الحيوة الدنيا ولا تطع من اغفلنا قلبه عن ذكرنا واتبع هواه وكان امره فرطا۔ (کہف: ۲۸)

ان لوگوں کے ساتھ رہو جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور صرف اسی کی ذات کو چاہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کو دنیاوی زینت کی خاطر کبھی بھی ان سے نہ پھیرو اور ان لوگوں کی اطاعت مت کرو جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، وہی لوگ تو ہیں جنھوں نے اپنے نفس کی اطاعت کی ہے اور ان کا کام حد سے بڑھا ہوا ہے۔

یہی اعتراض ہمارے زمانے میں راہِ حق کے راہنماؤں اور رہبروں پر بھی کیا جاتا ہے کہ تمھارے طرفداروں کی زیادہ تر تعداد مستضعفین اور غریب لوگوں پر مشتمل ہے۔

اس طرح سے وہ ان کے عیب بیان کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ لاشعوری طور پر ان کی تعریف اور ان کے مشن کی حقیقت کی تائید کر رہے ہوتے ہیں۔

Marfat.com

۱۱۶۔ قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ ۝
۱۱۷۔ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِيْ كَذَّبُوْنِ ۝
۱۱۸۔ فَافْتَحْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِيْ وَمَنْ مَّعِيَ مِنَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝
۱۱۹۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝
۱۲۰۔ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِيْنَ ۝
۱۲۱۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
۱۲۲۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۱۶۔ انھوں نے کہا: اے نوح! اگر تم باز نہ آئے تو سنگسار کیے جاؤ گے۔

۱۱۷۔ (نوح نے) کہا: پروردگارا! میری قوم نے میری تکذیب کی ہے۔

۱۱۸۔ اب میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے (اور فیصلہ فرمادے)۔

۱۱۹۔ ہم نے نوح اور جو (لوگ اور جانور کشتی میں) ان کے ساتھ تھے سب کو نجات دی۔

۱۲۰۔ پھر باقی سب کو غرق کر دیا۔

۱۲۱۔ اس واقعے میں واضح نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے۔

۱۲۲۔ اور تمھارا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

تفسیر

نوح نجات پا گئے اور مشرک غرق ہو گئے

حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے اس گمراہ اور ہٹ دھرم قوم کا ردعمل بھی وہی ہے جو تاریخ میں دوسرے متکبرین کا

Marfat.com

رہا ہے یعنی وہی طاقت، اکڑ اور جان سے مار دینے کی دھمکی چنانچہ حضرت نوحؑ کی قوم والے بولے "اے نوح! اب تک جو کچھ ہوا ہے کافی ہے اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے اور ہمارے ماحول کو اپنی گفتگو سے پھر تلخ اور تاریک بنایا تو یقیناً تمھیں سنگسار کیا جائے گا" (قالوا لئن لم تنتہ یا نوح لتکونن من المرجومین)۔

"من المرجومین" کی تعبیر بتاتی ہے کہ ان میں سنگسار کرنے کی رسم پرانے وقتوں سے چلی آ رہی تھی۔ وہ درحقیقت نوح علیہ السّلام سے یہ کہنا چاہتے تھے کہ اگر تم نے اپنی دعوتِ توحید کو جاری رکھا اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف ایسے ہی بلاتے رہے تو تمھارا انجام بھی ہمارے دوسرے مخالفین کا سا ہو گا اور وہ ہے سنگساری جو قتل کی بدترین صورت ہے۔[1]

جب نوح علیہ السّلام نے یہ دیکھا کہ اس قدر مدت مدید تک میں انھیں دعوت دیتا رہا ہوں، اس واضح منطق کے ساتھ ان سے گفتگو کرتا رہا ہوں اور صبر و شکیبائی کی بھی حد کر دی، اس کے باوجود اس کا اثر صرف محدود سے چند لوگوں پر ہی ہوا ہے لہٰذا انھوں نے اپنی شکایت اللہ کی بارگاہ میں پیش کر دی۔ جس میں اپنا مفصل حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان بے منطق ظالم لوگوں کے چنگل سے نجات اور ان سے جدائی کی درخواست بھی کی۔

انھوں نے عرض کیا پروردگارا! "میری قوم نے مجھے جھٹلایا ہے" (قال رب ان قومی کذبون)۔

یہ ٹھیک ہے کہ خداوند عالم ہر چیز سے آگاہ ہے، لیکن اپنی شکایت پیش کرنے اور اپنی بعد کی درخواست پیش کرنے کے لیے مقدمہ کے طور پر یہ عرض کرتے ہیں۔

قابلِ توجہ یہ بات بھی ہے کہ جناب نوح علیہ السّلام اپنی اس درخواست میں اپنی ذات پر نازل ہونے والے مصائب کی شکایت نہیں کرتے بلکہ انھیں غم ہے تو صرف اس بات کا کہ لوگوں نے انھیں جھٹلایا اور خدائی پیغام قبول نہیں کیا۔

پھر عرض کرتے ہیں: اب جبکہ اس گمراہ ٹولے کے لیے ہدایت کا کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا "تو میرے اور ان کے درمیان جدائی ڈال دے اور ہمارے درمیان تو خود ہی فیصلہ فرما دے": (فافتح بینی و بینھم فتحًا)۔

جیسا کہ اربابِ لغت کہتے ہیں "فتح" دراصل کھولنے اور تعلقات کو ختم کرنے کے معنی میں ہے اور اس کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے، کبھی تو اس کا حسی پہلو ہوتا ہے جیسے "فتح الباب" (دروازے کا کھولنا) اور کبھی معنوی پہلو ہوتا ہے جیسے "فتح الھم" (رنج و غم کا کھولنا اور ان کا دور کرنا) اور "فتح المستغلق من العلوم" کا معنی علمی موشگافیاں ہے اور "فتح القضیۃ" کا معنی فیصلہ کرنا اور لڑائی جھگڑے کو ختم کرنا ہے۔

پھر وہ بارگاہ رب العزت میں عرض کرتے ہیں مجھے اور جو مومنین میرے ساتھ ہیں انھیں نجات دے (ونجنی ومن معی من المؤمنین)۔
اب یہاں پر رحمتِ الٰہی جناب نوحؑ کی مدد کو پہنچتی ہے اور دردناک سزا کی وعید جھٹلانے والوں کو تلاش کرتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] "رجم" دراصل "رجام" (بروزن "کتاب") کے مادہ سے "رجمۃ" (بروزن "لقمہ") کی جمع ہے جو پتھر کے اس ٹکڑے کے معنی میں ہے جسے قبر پر رکھا جاتا ہے یا جس کے گرد بت پرست لوگ چکر لگاتے ہیں۔ نیز "رجم" کسی کو اس حد تک پتھر مارنا جس سے اس کی موت واقع ہو جانے کے معنی میں ہے اور بعض اوقات قتل کے معنی میں بھی آتا ہے خواہ وہ کسی طرح بھی واقع ہو کیونکہ وہ لوگ پتھر سے ہی قتل کیا کرتے تھے۔

Marfat.com

ہم نے انھیں بھی اور جو لوگ ان کے ہمراہ کشتی میں تھے اور وہ انسانوں اور جانوروں سے بھری ہوئی تھی، سب کو نجات عطا کی: (فانجیناہ و من معہ فی الفلک المشحون)۔

"پھر دوسرے سب لوگوں کو غرق اور فنا کر دیا" (ثم اغرقنا بعد الباقین)۔

"مشحون" "شحن" (بروزن "صحن") کے مادہ سے بھر دینے کے معنی میں ہے اور کبھی کبھی تیار کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے "شحناء" اس دشمنی کو کہتے ہیں جو انسان کے تمام وجود میں بھر جائے۔

اس مقام پر مراد یہ ہے کہ وہ کشتی افراد اور تمام وسائل سے بھری ہوئی تھی اور اس میں کسی قسم کی کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ یعنی جب کشتی ہر لحاظ سے تیار اور چلنے پر آمادہ ہوگئی تو خداوندِ عالم نے طوفان بھیجا تاکہ نوح علیہ السلام اور دوسرے تمام کشتی نشین کسی قسم کی مشکل سے دوچار نہ ہوں یہ بجائے خود ایک نعمتِ الٰہی ہے۔

اس تمام واقعے کے آخر میں قرآن وہی کہتا ہے جو جناب موسیٰ اور جناب ابراہیم علیہما السلام کے ماجرے کے آخر میں کہا ہے، چنانچہ فرماتا ہے:۔

نوح کی داستان، ان کی متواتر دعوتِ حق، ان کا صبر و شکیبائی اور آخر کار ان کے مخالفین کی غرقابی اور تباہی و بربادی میں سب لوگوں کے لیے آیت اور نشانی ہے (ان فی ذلک لاٰیۃ)۔

"ہر چند کہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (و ما کان اکثرھم مؤمنین)۔

بنا بریں آپ بھی اے پیغمبر اسلام! اپنی قوم کے مشرکین کی سخت مزاجی، ترشروئی اور روگردانی سے پریشان نہ ہوں، صبر کا مظاہرہ کریں کیونکہ آپ اور آپ کے ساتھیوں کا انجام بھی وہی ہوگا جو نوح اور ان کے ساتھیوں کا ہوا اور گمراہوں کا انجام وہی ہوگا جو غرق ہونے والوں کا ہوا۔

اور جان لو "تمھارا پروردگار ناقابلِ شکست اور رحیم ہے" (و ان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

اس کی رحمت اس بات کی متقاضی ہے کہ انھیں بڑی حد تک مہلت عطا فرمائے اور اتمام حجت کرے اور ان کی عزت اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ انجام کار آپ کو کامیاب اور آپ کے دشمنوں کو شکست سے دوچار کر دے۔

Marfat.com

۱۲۳۔ كَذَّبَتْ عَادٌ الْمُرْسَلِينَ ۝

۱۲۴۔ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝

۱۲۵۔ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝

۱۲۶۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝

۱۲۷۔ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝

۱۲۸۔ أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝

۱۲۹۔ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ ۝

۱۳۰۔ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِينَ ۝

۱۳۱۔ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ۝

۱۳۲۔ وَاتَّقُوا الَّذِي أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُونَ ۝

۱۳۳۔ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ۝

۱۳۴۔ وَجَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝

۱۳۵۔ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

ترجمہ

۱۲۳۔ قوم عاد نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا۔

۱۲۴۔ جبکہ ان کے بھائی ہُود نے کہا: آیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے؟

۱۲۵۔ میں تمھارے لیے امین رسول ہوں۔

۱۲۶۔ خدائی تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۲۷۔ میں اس دعوت کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو صرف عالمین کے رب کے ذمے ہے۔

Marfat.com

۱۲۸۔ کیا تم ہر بلند مقام پر اپنی خواہش کی ایک ایک نشانی بناتے ہو۔

۱۲۹۔ خوبصورت اور مضبوط قلعے اور محلات تعمیر کرتے ہو گویا تم نے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔

۱۳۰۔ جب تم کسی کو سزا دیتے ہو تو جابر لوگوں کی طرح سزا دیتے ہو۔

۱۳۱۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

۱۳۲۔ تم اس خدا سے ڈرو جس نے تمھاری ان نعمتوں سے امداد کی جنھیں تم جانتے ہو۔

۱۳۳۔ تمھاری چوپایوں اور (لائق اور ارجمند) اولاد کے ذریعہ امداد فرمائی۔

۱۳۴۔ اسی طرح باغوں اور چشموں کے ذریعے۔

۱۳۵۔ (اگر تم کفران کرو تو) میں تم پر عظیم دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تفسیر

قوم عاد کے جرائم اور بے راہروی

اب قوم عاد اور ان کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کی باری آتی ہے اور اٹھارہ آیتوں میں ان کی مختصر سی سوانح، انجام اور اس سے حاصل ہونے والے عبرت آموز سبق بیان فرمائے جاتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قوم عاد "جزیرۃ العرب" کے جنوب میں واقع "یمن" کے اطراف اور "حضرموت" کے علاقے میں رہتی تھی۔

سرکش قوم نے ـــــــ جیسا کہ قرآن کہتا ہے ـــــــ "خدا کے رسولوں کو جھٹلایا" (کذبت عاد المرسلین)[1]

اگرچہ انھوں نے صرف حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی تھی لیکن چونکہ ہود کی دعوت تمام انبیاء الٰہی کی دعوت تھی لہٰذا انھوں نے گویا تمام انبیاء کی تکذیب کی۔

اس اجمالی ذکر کے بعد اب اس کی تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جبکہ ان کے بھائی ہود نے کہا: آیا تم تقویٰ اختیار نہیں کرتے (اذ قال لهم اخوهم هود الا تتقون)۔

---

[1] چونکہ قوم "عاد" ایک "جماعت اور قبیلہ" پر مشتمل تھی لہٰذا فعل مؤنث لایا گیا ہے اور "کذبت" کہا گیا ہے، کیونکہ یہ دونوں لفظ مؤنث لفظی ہیں۔

Marfat.com

چونکہ حضرت ہودؑ انھیں ایک بھائی کی مانند نہایت ہمدردی اور مہربانی کی صورت میں توحید و تقویٰ اور حق کی جانب دعوت دیتے رہے لہٰذا یہاں پر " اخ " (بھائی) کا کلمہ استعمال ہوا ہے۔

پھر انھوں نے فرمایا: میں تمھارے لیے امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

تمھارے درمیان میری زندگی کا سابقہ ریکارڈ اس حقیقت کا گواہ ہے کہ میں نے کبھی بھی خیانت کا راستہ نہیں اپنایا اور حق و صداقت کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں تھا۔

اسی بات پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں: جب صورتِ حال یہ ہے اور تم بھی اس سے بخوبی آگاہ ہو، " تو خدا سے ڈرو، اور پرہیزگاری اختیار کرو اور میری اطاعت کرو " کیونکہ میری اطاعت درحقیقت خدا کی اطاعت ہے (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں حصولِ زر کے لیے ایسا کر رہا ہوں اور یہ سب کچھ مال و دولت اور مقام و منصب تک پہنچنے کا ایک مقدمہ ہے تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ " میں اس دعوت کے بدلے تم سے ذرہ برابر بھی اجر نہیں مانگتا " (وما اسئلکم علیہ من اجر)۔

" میرا اجر تو بس پروردگارِ عالم کے پاس ہی ہے " (ان اجری الا علی رب العالمین)۔

تمام برکتیں اور نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو صرف اسی سے مانگتا ہوں، کیونکہ ہم سب کا پروردگار وہی ہے۔

قرآن مجید نے حضرت ہودؑ اور قوم عاد کی اس داستان کو بالترتیب چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے پہلے تو حضرت ہودؑ کی دعوت کے مندرجات کو بیان کیا ہے جو توحید اور تقویٰ پر مشتمل ہے۔ اس کو ہم ابھی پڑھ چکے ہیں۔

پھر ان کے ناشائستہ افعال اور ٹیڑھے پن کو بیان کرتے ہوئے انھیں تین موضوعات کی یاددہانی کراتا ہے۔ استفہام انکاری کی صورت میں انھیں جناب ہودؑ مخاطب کرکے فرماتے ہیں: کیا تم ہر بلند مقام پر اپنی خواہشات کی ایک نشانی بناتے ہو (اتبنون بکل ریع اٰیۃ تعبثون)۔

" ریع " دراصل بلند جگہ کے معنیٰ میں ہے اور " تعبثون " " عبث " کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ایسا کام ہے جس کا کوئی صحیح مقصد پیش نظر نہ ہو اور " آیۃ " کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مالدار اور ثروت مند قوم نے دوسروں پر اپنی خودنمائی، فخر اور بڑائی جتانے کے لیے پہاڑ کی بلندیوں اور اونچے اونچے ٹیلوں پر (برجوں وغیرہ کی مانند) عمارتیں بنا رکھی تھیں جن سے وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے اور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس گفتگو سے مراد ان کے وہ مکانات اور جھونپڑے ہیں جو وہ اونچی جگہ پر بناتے تھے اور ان سے لہو و لعب اور عیاشی کے اڈوں کا کام لیتے تھے جیسا کہ آج کے دور میں طاغوتی لوگوں کے درمیان رسم ہے۔

لیکن یہ تفسیر بعید معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ کلمہ " آیہ " اور لفظ " عبث " کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ احتمال بھی بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ قوم عاد نے اس قسم کے گھر سڑکوں اور راستوں کے کنارے بلند مقامات پر

Marfat.com

بنا رکھے تھے تاکہ ان بلندیوں سے وہ راہ چلتے لوگوں کا مذاق اڑائیں۔

ان تینوں تفسیروں میں سب سے پہلی تفسیر زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ایک بار پھر ان پر تنقید کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، فرماتے ہیں: تم خوبصورت اور پختہ محلات اور قلعے تعمیر کرتے ہو یوں ہوتا ہے جیسے تم لوگ اس دنیا میں ہمیشہ رہوگے۔ (و تتخذون مصانع لعلکم تخلدون)۔

"مصانع" "مصنع" کی جمع ہے جس کا معنی ہے خوبصورت اور پختہ مکان یا عمارت۔

جناب ہود علیہ السلام ان پر یہ اعتراض نہیں کرتے کہ تمھارے لیے مناسب گھر کیوں ہیں؟ بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم اس دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش اور گھروں اور محلات کو پختہ اور محکم بنانے میں اس قدر غرق ہو چکے ہو کہ تم نے سرائے آخرت کو بالکل فراموش کر دیا ہے دنیا کو ایک گزرگاہ سمجھنے کی بجائے سرائے جاودانی سمجھ رکھا ہے۔

جب صورت حال یوں ہو تو اس قسم کی غافل کر دینے اور غرور پیدا کرنے والی عمارتیں یقیناً قابلِ مذمت ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کسی جگہ سے گزر رہے تھے کہ آپ کی نگاہ ایک گنبد اور عمارت پر پڑی جو راستے کے اوپر بنے ہوئے تھے، آپ نے سوال فرمایا: "کہ یہ کیا چیز ہے"؟ ساتھیوں نے عرض کیا یہ ایک انصاری کی عمارت ہے، آپ وہیں پر تھوڑا سا رک گئے کہ اتنے میں اس عمارت کا مالک بھی آ گیا۔ اس نے سلام کیا آپ نے اپنا چہرہ مبارک دوسری طرف پھیر لیا۔

اس شخص نے یہ ماجرا اپنے ساتھیوں سے بیان کیا اور کہا:۔

"خدا کی قسم! میں اپنے بارے میں رسول اللہؐ کی نظر کو بہتر نہیں دیکھ رہا ہوں، معلوم نہیں کہ مجھ سے کیا بات ہوئی ہے اور میں نے کیا کیا ہے؟"

لوگوں نے بتایا کہ آنحضرت تمھاری اس عظیم الشان عمارت کو دیکھ کر ناراض ہو گئے ہیں۔

وہ انصاری گھر واپس آ گیا اور اس تمام عمارت کو گرا دیا۔ ایک دن آنحضرتؐ کا وہاں سے گزر ہوا لیکن اس عمارت کو نہ دیکھا تو پوچھا کہ وہ عمارت کیا ہوئی؟ تو لوگوں نے تمام ماجرا بیان کیا، آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

ان لکل بناء یبنی و بال علی صاحبہ یوم القیامۃ الا ما لا بد منہ

قیامت کے روز ہر عمارت اپنے مالک کے لیے وبالِ جان بن جائے گی، سوائے اس مقدار کے جو انسان کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے[1]

اس روایت سے اور اس قسم کی دوسری روایات سے اسلام کا نظریہ مکمل طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی عمارتوں کا مخالف ہے جو طاغوتی اور غافل کر دینے والی ہونے کے ساتھ ساتھ اسراف اور فضول خرچی کا مظہر ہوں اور مسلمانوں کو ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ وہ مستکبرین اور خدا سے بے خبر لوگوں کی طرح بلند و بالا عمارتیں تعمیر کریں خاص کر ایسے معاشرے میں جن میں غریب اور ضرورت مند

---

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

افراد کی تعداد زیادہ ہو۔

لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ آپؑ نے اس مقصد تک پہنچنے کے لیے طاقت کا سہارا نہیں لیا اور اس عمارت کے ڈھانے کا حکم صادر نہیں فرمایا، بلکہ ایک لطیف سے اخلاقی ردعمل کے ذریعے ———— بے پرواہی اور نفرت کا اظہار کر کے ———— اپنے مقصد کو واضح فرمایا۔

اس کے بعد قوم عاد پر ایک اور تنقید کا ذکر ہوتا ہے کہ وہ لڑائی جھگڑے کے وقت بے رحمی کا مظاہرہ کرتی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے: جب تم کسی کو سزا دیتے ہو تو حد سے تجاوز کر جاتے ہو۔ اور ظالم و جابر لوگوں کی طرح سزا دیتے ہو (واذا بطشتم بطشتم جبارین)۔

ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایسا کام کرے جس سے وہ سزا کا مستحق ہو لیکن اس کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ تم حق اور عدالت سے تجاوز کر جاؤ اور چھوٹے سے جرم کے بدلے سنگین اور سخت سزائیں دو اور غصے کے وقت لوگوں کا خون بہانا شروع کر دو اور تلوار لے کر لوگوں کے پیچھے پڑ جاؤ کیونکہ یہ زمانے کے جابر، ظالم اور سرکش لوگوں کا کام ہوتا ہے۔

راغب "مفردات" میں کہتے ہیں کہ "بطش" (بروزن "نقش") کا معنیٰ کوئی چیز طاقت اور زور کے ذریعے حاصل کرنا ہے۔

حضرت ہود علیہ السلام درحقیقت ان لوگوں کو تین وجوہ سے سرزنش کر رہے ہیں۔

ایک ان نشانیوں کی وجہ سے جو وہ خود خواہی اور خود نمائی کے لیے بلندیوں پر تعمیر کرتے تھے تاکہ ان کے ذریعے وہ دوسروں پر شیخی بگھار سکیں۔

دوسرے ان عمارتوں کی وجہ سے جو انھوں نے جابر حکمرانوں کے محلات کی طرح زیبا اور محکم بنا رکھی تھیں، جن سے ان کی لمبی آرزوؤں کی نشان دہی ہوتی تھی اور وہ اس نکتے سے غافل ہو چکے تھے کہ دنیا گزرگاہ ہے نہ کہ ہمیشہ کا گھر۔

تیسرے سزا دینے کے وقت جب وہ حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔ ان تینوں امور کی قدر مشترک وہی دوسروں پر فخر اور بقاء سے محبت کی حس ہے۔ اور اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی محبت ان پر اس حد تک غالب آچکی تھی کہ وہ بندگی کا اسلوب بھلا بیٹھے تھے اور دنیا پرستی میں اس قدر غرق ہو چکے تھے کہ خدائی دعوے کی حد تک جا چکے تھے۔ یہ چیزیں ایک بار پھر اس حقیقت کو ثابت کرتی ہیں کہ؛

حب الدنیا رأس کل خطیئۃ [1]

ان تینوں تنقیدات کے بعد انھیں ایک بار پھر تقویٰ کی دعوت دیتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے: ۔ اب جبکہ صورت حال یہ ہے تو تم تقویٰ اختیار کرو اور خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اب ہم حضرت ہود علیہ السلام کے بیان کے تیسرے حصے تک پہنچتے ہیں جس میں بندگانِ خدا پر نعمتوں کا ذکر ہے تاکہ اس طرح سے

---

[1] تفسیر فخر رازی، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

ان کی حسِ شکرگزاری کو متحرک کیا جاسکے اور وہ خدا کی طرف لوٹ آئیں ۔

اس سلسلے میں اجمال اور تفصیل کی روش سے استفادہ کیا گیا ہے جو بحث کو دل نشین کرنے کے لیے بے حد مفید ہوتی ہے۔ سب سے پہلے ان کی طرف روئے سخن کرکے فرماتے ہیں : اس خدا سے ڈرو جس نے ایسی نعمتوں کے ساتھ تمھاری امداد کی ہے جو تم جانتے ہو اور اس نے وہ نعمتیں ہمیشہ سے تمھیں دے رکھی ہیں (و اتقوا الذی امدکم بما تعلمون)[1]۔

پھر اس مختصر بیان کے بعد اس کی تشریح اور تفصیل بیان کرتے ہیں ۔ اس نے تمھیں چوپائے اور (لائق اور باآبرو) اولاد دے کر تمھاری امداد کی ہے (امدکم بانعام و بنین) ۔

خدا نے ایک طرف تو تمھیں مادی سرمائے سے نوازا ہے اس دور میں اس سرمایہ کا اہم حصّہ جانور اور چوپائے ہوا کرتے تھے ، دوسری طرف کافی حد تک افرادی قوت عنایت فرمائی ہے جو اس سرمائے کی حفاظت اور پرورش کر سکتی ہے ۔

یہ تعبیر قرآن مجید میں کئی مقامات پر دہرائی گئی ہے کہ جب بھی مادی نعمتوں کو شمار کیا گیا پہلے "مال" اور پھر "افرادی قوت" کی طرف اشارہ کیا گیا جو اس مال کی محافظ اور مربیّ ہوتی ہے ۔ یہ ایک طبیعی ترتیب معلوم ہوتی ہے نہ کہ مال کی اہمیت کے پیشِ نظر اسے مقدم کیا گیا ہے ۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶ میں ارشاد ہوتا ہے :۔

وامددناکم باموال و بنین وجعلناکم اکثر نفیرًا

ہم نے اموال اور اولاد کے ذریعے تمھاری امداد کی ہے اور تمھاری بہت سی تعداد قرار دی ہے ۔

پھر فرماتے ہیں : اور سرسبز اور تروتازہ باغات اور جاری پانی کے چشمے تمھیں بخشے ہیں (وجنات وعیون) ۔

بنابریں ہم نے افرادی قوت ، زراعت ، باغبانی ، پرورشِ حیوانات اور ذرائع نقل و حمل کے لحاظ سے تمھیں خود کفیل اور بے نیاز کر دیا ہے تاکہ تم اپنی زندگی میں کسی بھی چیز کی کمی اور پریشانی کا احساس نہ کرو ۔

لیکن کیا وجہ ہے کہ تم نے اس قدر نعمتیں عطا کرنے والے مالک کو فراموش کر دیا ہے اور رات دن جس کے خوانِ نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہو اسے نہیں پہچانا ۔

پھر اپنی گفتگو کے آخری مرحلے پر پہنچ کر انھیں متنبہ کرتے اور عذابِ الٰہی سے ڈراتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر تم نعمت کا انکار کرو گے تو ، مجھے تم پر بڑے دن کے عذاب کا خطرہ نظر آتا ہے ۔ (انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم) ۔

جس دن تم سب ظلم و ستم ، غرور و تکبّر ، ہوا و ہوس اور پروردگار سے دوری اور بیگانگی کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے ۔

---

[1] "امدکم" "امداد" کے مادہ سے ہے یہ لفظ دراصل ان امور پر بولا جاتا ہے جو مسلسل اور منظم طریقے پر انجام دیے جائیں اور چونکہ اللہ اپنی نعمتیں مسلسل اور ایک خاص نظام کے تحت اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے اسی لیے یہاں پر "امد" کا لفظ استعمال ہوا ہے ۔

Marfat.com

عموماً قرآن مجید میں "یوم عظیم" (بڑا دن) کا اطلاق قیامت پر ہوتا ہے اور وہ ہر لحاظ سے باعظمت ہے لیکن آیاتِ قرآنی میں بعض اوقات اس کا اطلاق ان سخت اور وحشت ناک ایّام پر بھی ہوا ہے جو سابقہ امتوں پر گزر چکے ہیں جیسا کہ خود اسی سورت میں جناب شعیب علیہ السلام کی داستان میں ہے کہ خداوندِ عالم نے قوم شعیب کو حق کے مقابلے میں سرکشی کی وجہ سے دردناک عذاب دیا (کہ بادل کے ٹکڑے سے ان پر بجلی گری) ۔ اس واقعے کے بعد اس دن کو "یومِ عظیم" کے نام سے ذکر کیا گیا ہے ۔

فاخذھم عذاب یوم الظلة انه کان عذاب یوم عظیم (الشعراء : ۱۸۹)

بنابریں زیرِ نظر آیات میں بھی ممکن ہے کہ "یومِ عظیم" سے اس دن کی طرف اشارہ ہو جس دن قومِ عاد کے سرکش اور متکبر لوگ اجاڑ کر رکھ دینے والے دردناک طوفان کے عذاب میں مبتلا ہوئے اور اس بات کی گواہ بعد میں آنے والی چند آیات ہیں ۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے روزِ قیامت کی یا دونوں ایّام کی سزاؤں کی طرف اشارہ ہو، کیونکہ دونوں دنوں کی تاریخ عظیم ہے ۔

Marfat.com

۱۳۶۔ قَالُوا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ○
۱۳۷۔ اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ○
۱۳۸۔ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ○
۱۳۹۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَهْلَكْنٰهُمْ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○
۱۴۰۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ○

ترجمہ

۱۳۶۔ (قوم عاد کے) ان افراد نے کہا ہمارے لیے یکساں ہے کہ تم ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو (خواہ مخواہ خود کو تھکاؤ نہیں)۔
۱۳۷۔ یہ وہی پہلے والے لوگوں کا طریقۂ کار ہے۔
۱۳۸۔ ہمیں ہرگز عذاب نہیں ہوگا۔
۱۳۹۔ انھوں نے ہُود کو جھٹلایا، تو ہم نے بھی انھیں تباہ کر دیا۔ اور اس میں (صاحبانِ علم کے لیے) آیت اور نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے۔
۱۴۰۔ اور تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے۔

تفسیر

نصیحت ہم پر اثر نہیں کرتی

گزشتہ آیات میں ہم نے خدا کے مہربان نبی کی اپنی سرکش قوم کے ساتھ مدلل گفتگو کا تذکرہ پڑھا۔ اب ہم اس قوم کے نامعقول اور اذیت ناک جوابات کا مطالعہ کریں گے، قرآن کہتا ہے، انھوں نے جواب میں کہا، تم خود کو مزید نہ تھکاؤ، ہمارے لیے یکساں ہے کہ خواہ ہمیں نصیحت کریں یا نہ کریں ہمارے دل میں ذرہ بھر اس کا اثر نہیں ہوگا (قالوا سواء علینا)۔

Marfat.com

(اوعظت ام لم تکن من الواعظین)۔

لیکن یہ اعتراض جو تم ہم پر کرتے ہو تو یہ تمھارا بے جا اعتراض ہے کیونکہ یہ تو گزشتہ لوگوں کا طریقۂ کار ہے (ان ھٰذا الا خلق الاولین)۔

اور تمھارے قول کے برعکس ہمیں کبھی بھی عذاب نہیں ہوگا، نہ اس دنیا میں اور نہ ہی کسی اور جہان میں (وما نحن بمعذبین)۔

"خلق" (خا اور لام کے ضمّہ کے ساتھ) کا معنی عادت، روش اور اخلاق ہے کیونکہ یہ کلمہ جب مفرد ہو تو خلق اور اخلاق عادات کے معنی میں آتا ہے اور اس صورت میں ان اعمال کی طرف اشارہ ہے جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں مثلاً بت پرستی کرنا، محکم اور دلفریب محلات بنانا، بلند و مرتفع مقامات پر برُج تعمیر کر کے شیخی بگھارنا، اسی طرح سزاؤں میں سختی سے کام لینا گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں کوئی نئی بات نہیں ہم سے پہلے لوگ بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے اور یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

بعض مفسرین نے اس سے جھوٹ اور دروغ گوئی مراد لی ہے یعنی اے ہوؑد! خدا اور قیامت کے بارے میں تمھاری باتیں سب جھوٹ ہیں جو پہلے بھی کہی جاتی تھیں (تو یہ معنی اس صورت میں ہوگا جب ہم خَلْق (بروزن حَلْق) پڑھیں۔ لیکن مشہور قرائت اس طرح نہیں ہے)۔

اس کے بعد قرآن مجید اس قوم کا دردناک انجام ان لفظوں میں بیان کرتا ہے :۔ ان لوگوں نے ہود کی تکذیب کی تو ہم نے انھیں تباہ و برباد کر دیا (فکذبوہ فاھلکناھم)۔

اس داستان کے اختتام پر پھر وہی دو عبرت انگیز جملے کہے جاتے ہیں جو جناب نوح، ابراہیم اور موسیٰ علیہم السلام کی داستانوں کے آخر میں کہے گئے ہیں۔ فرمایا گیا ہے: اس سرگزشت میں قدرتِ خدا، انبیاء کی استقامت اور سرکش اور جابر لوگوں کے انجام کی واضح اور روشن نشانی ہے لیکن پھر بھی ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (ان فی ذلک لاٰیۃ وما کان اکثرھم مؤمنین)۔

"اور تمھارا پروردگار طاقت ور اور ناقابلِ تسخیر اور رحیم و مہربان ہے (وان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

کافی حد تک ڈھیل دیتا ہے، مہلت عطا کرتا ہے، گمراہ لوگوں کے لیے روشن دلائل پیش کرتا ہے لیکن جب سزا دینے پہ آتا ہے تو یوں سخت گرفتار کرتا ہے کہ کسی کے لیے مجال فرار باقی نہیں رہ جاتی۔

Marfat.com

۱۴۱۔ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

۱۴۲۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝

۱۴۳۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝

۱۴۴۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

۱۴۵۔ وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝

۱۴۶۔ اَتُتْرَكُوْنَ فِيْ مَا هٰهُنَا اٰمِنِيْنَ ۝

۱۴۷۔ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝

۱۴۸۔ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيْمٌ ۝

۱۴۹۔ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ ۝

۱۵۰۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝

۱۵۱۔ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝

۱۵۲۔ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۴۱۔ قوم ثمود نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا۔

۱۴۲۔ جبکہ صالح نے انھیں کہا: آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟

۱۴۳۔ میں تمھارے لیے (اللہ کا) امین رسول ہوں۔

۱۴۴۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

Marfat.com

١٤٥۔ میں اس دعوت کے بدلے تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اُجرت تو صرف عالمین کے رب کے پاس ہے۔
١٤٦۔ آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیشہ نہایت ہی امن و سکون اور نعمتوں میں یہاں رہو گے۔
١٤٧۔ ان باغات اور چشموں میں۔
١٤٨۔ ان زراعتوں اور کھجور کے درختوں میں کہ جن کے پھل میٹھے اور پکے ہوئے ہیں۔
١٤٩۔ تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو اور ان میں عیش و نوش میں مگن ہو جاتے ہو۔
١٥٠۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
١٥١۔ اور مُسرف لوگوں کا کہنا نہ مانو۔
١٥٢۔ وہی جو زمین میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے۔

تفسیر

مُسرفین کی اطاعت نہ کرو

اس سورت میں بیان ہونے والی انبیاء کی داستان کا یہ پانچواں حصہ ہے جس میں قوم ثمود اور ان کے پیغمبر جناب صالحؑ کی مختصر سرگزشت بیان کی گئی ہے وہ " وادی القریٰ" میں رہتے تھے جو " مدینہ" اور " شام " کے درمیان واقع ہے۔ یہ قوم اس سرزمین میں خوشحال زندگی بسر کر رہی تھی لیکن اپنی سرکشی کی بناء پر صفحۂ ہستی سے یوں مٹ گئی کہ آج اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔

اس داستان کا آغاز مکمل طور پر قوم عاد اور قوم نوح کی داستانوں سے ملتا جلتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، فرمایا گیا ہے: قوم ثمود نے خدا کے رسولوں کو جھٹلایا (کذبت ثمود المرسلین)۔

کیونکہ تمام انبیاء کی دعوت حق ایک جیسی تھی اور اس قوم کا اپنے پیغمبر جناب صالحؑ کی تکذیب کرنا درحقیقت تمام رسولوں کی تکذیب کے مترادف تھا۔

اس اجمال کے بعد اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جبکہ ان کے ہمدرد پیغمبر صالح نے ان لوگوں سے کہا: آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟ (اذ قال لهم اخوهم صالح الا تتقون)۔

وہ جو کہ تمھارے بھائی کی مانند تمھارا ہادی اور راہبر تھا اس کی نظر میں نہ برتری جتانا تھا اور نہ ہی مادی مفادات، اسی لیے قرآن نے جناب صالح علیہ السلام کو " اخوہم " سے تعبیر کیا ہے۔ جناب صالح نے بھی دوسرے انبیاء کی مانند اپنی دعوت کا آغاز تقویٰ اور فرض کے احساس سے کیا۔

پھر اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے ہیں: "میں تمھارے لیے امین پیغمبر ہوں" میرا ماضی میرے اس دعویٰ کی بین دلیل ہے

Marfat.com

(انی لکم رسول امین)۔

" اسی لیے تم تقویٰ اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، کیونکہ میرے مدنظر رضائے الٰہی، تمھاری خیر و خوبی اور سعادت کے سوا اور کچھ نہیں (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

بنابریں" اس دعوت کے بدلے میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا اور نہ ہی مجھے تمھاری کسی چیز کی طمع ہے (وما اسئلکم علیہ من اجر)۔

میں تو کسی اور کے لیے کام کرتا ہوں اور میرا اجر بھی اسی کے پاس ہے۔" ہاں تو میرا اجر صرف عالمین کے پروردگار کے پاس ہے" (ان اجری الا علی رب العالمین)۔

یہ جناب صالح علیہ السلام کی داستان کا ابتدائی حصّہ تھا جو دو جملوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک دعوت کا پیش کرنا اور دوسرے رسالت کو بیان کرنا۔

پھر دوسرے حصّے میں افرادِ قوم کی زندگی کے قابلِ تنقید اور حسّاس پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں ضمیر کی عدالت کے کٹہرے میں لاکھڑا کرتے ہیں، فرماتے ہیں: "آیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہمیشہ امن و سکون اور ناز و نعمت کی زندگی بسر کرتے رہو گے (اتترکون فیما ھھنا اٰمنین)۔

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھاری یہ مادّی اور غفلت کی زندگی ہمیشہ کی زندگی ہے اور موت، انتقام اور سزا کا ہاتھ تمھارے گریبانوں تک نہیں پہنچے گا؟

پھر اجمال سے تفصیل کے طریقۂ کار کو کام میں لاتے ہوئے اپنے گزشتہ سربستہ جملے کی یوں تشریح کرتے ہیں: تم گمان کرتے ہو کہ ان باغات اور چشموں میں (فی جنات وعیون)۔

اور ان کھیتوں اور کھجور کے درختوں میں کہ جن کے پھل شیریں شاداب اور پکے ہوئے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رہو گے (و زروع و نخل طلعھا ھضیم)[1]

پھر ان کے پختہ اور خوشحال گھروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہتے ہیں:۔

تم پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو اور اس میں عیاشی کرتے ہو (و تنحتون من الجبال بیوتًا فارھین)۔

"فارہ"، "فرہ" (بروزن "فرح") کے مادہ سے ہے جس کا معنیٰ ہے ایسی خوشی جو جہالت اور ہوس پرستی پر مبنی ہو اور

---

[1] "طلع" "طلوع" کے مادہ سے ہے جو عموماً کھجور کے اس شگوفے کو کہتے ہیں جو میوہ ظاہر ہونے سے پہلے درخت سے سر نکالتا ہے اور ترازو کے دو پلڑوں کی مانند ہوتا ہے جو ایک دوسرے کے اوپر ہوتے ہیں ان خوشوں کے اندر خرما کا پھل ہوتا ہے جو اس وقت بہت ہی چھوٹا ہوتا ہے یہ شگوفہ شگافتہ ہوتا ہے جس سے خوشہ ظاہر ہوتا ہے کبھی طلع کھجور کے پہلے ثمر کے لیے بھی بولا جاتا ہے لیکن "ھضیم" "ھضم" کے مادہ سے ہے جس کے کئی معانی ہیں کبھی تو کسی چیز کے اندر گھس جانے کے معنی میں آتا ہے اور کبھی پکے ہوئے پھل کے معنی میں کبھی لطیف نرم اور پورے طور پر ہضم ہو جانے کے معنی میں۔ اور کبھی ہضم شدہ کے معنی میں۔ آیت بالا میں اگر طلع کو کھجور کے شگوفوں کے معنی میں لیا جائے اور "ہضم" کو اندر گھسی ہوئی چیز کے معنی میں تو اس وقت یہ اس درخت کے زبردست بارآور ہونے کی نشانی ہوگا اور اگر "طلع" کو کھجور کے پہلے ثمر کے معنی میں لیا جائے تو "ھضیم" کا معنی شاداب، لطیف، نرم اور پکا ہوا ہوگا۔

Marfat.com

کبھی کبھار کوئی کام مہارت کے ساتھ انجام دینے کے معنی میں بھی آتا ہے اگرچہ دونوں معنی مندرجہ بالا آیت کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں لیکن حضرت صالح کی طرف سے کی گئی ملامت اور سرزنش کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلا معنی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔

اگر ان تمام آیات کا قوم عاد کے بارے میں نازل ہونے والی گزشتہ آیات سے موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قوم عاد میں خودخواہی، مقام پرستی اور خودنمائی جیسی برائیاں تھیں، جبکہ قوم ثمود شکم کی اسیر اور ناز و نعمت بھری خوشحال زندگی سے بہرہ مند تھی لیکن دونوں قومیں ایک ہی منحوس انجام کو پہنچیں، کیونکہ انھوں نے انبیاء کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا اور خود پرستی کی پستی سے نکل کر خدا پرستی کی معراج کو اختیار نہیں کیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے کیفر کردار کو پہنچ گئیں۔

حضرت صالح علیہ السّلام اس تنقید کے بعد انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ۔حکم خدا کی مخالفت سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

اور مسرفین کا حکم نہ مانو (و لا تطیعوا امر المسرفین)۔

وہی جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور اصلاح نہیں کرتے (الذین یفسدون فی الارض و لا یصلحون)۔

اسراف اور فساد فی الارض کا باہمی رابطہ: ۔ ہم جانتے ہیں کہ اسراف قانون آفرینش اور قانون تشریع کی حدود سے تجاوز کا نام ہے اور یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ کسی صحیح نظام میں حد سے کسی قسم کا تجاوز فساد اور انتشار کا موجب بن جاتا ہے۔
بالفاظ دیگر اسراف فساد کا سرچشمہ ہے اور اسراف کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔

البتہ اس بات کی طرف بھی توجہ رہے کہ اسراف کا ایک وسیع مفہوم اور معنی ہے کبھی تو کھانے پینے جیسے زندگی کے سادہ اور عمومی مسائل میں اسراف ہوتا ہے (جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۳۱ میں آیا ہے)۔

کبھی حد سے زیادہ قصاص اور انتقام لینے کے سلسلے میں ہوتا ہے (جیسے سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۳۳ میں آیا ہے)۔

کبھی حد سے زیادہ خرچ کرنے کے سلسلے میں ہوتا ہے (جیسا کہ سورۂ فرقان کی آیت ۶۷ میں آیا ہے)۔

کبھی ایسا فیصلہ کرنے کے مفہوم میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جو جھوٹ اور کذب پر مبنی ہوتا ہے (جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۲۸ میں "مسرف اور کذب" ساتھ ساتھ ذکر ہوئے ہیں)۔

کبھی یہ اعتقادات میں ہوتا ہے کہ جو شک و شبہ تک جا پہنچتا ہے (جیسا کہ سورۂ مومن کی آیت ۳۴ میں مسرف اور مرتاب اکٹھے آتے ہیں) کبھی دوسروں پر برتری حاصل کرنے، استکبار اور استثمار کے معنی میں آتا ہے (جیسا کہ سورۂ دخان کی آیت ۳۱ میں فرعون کے بارے میں ہے):

انہ کان عالیا من المسرفین

وہ برتری کا خواہاں اور مسرف تھا۔

اور کبھی ہر قسم کے گناہ کے معنی میں بھی آتا ہے (جیسا کہ سورۂ زمر کی آیت ۵۳ میں ہے):

قل یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا

کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے آپ پر اسراف کیا ہے خدا کی رحمت سے مایوس ہونا

Marfat.com

کیونکہ خداوندِ عالم تمام گناہوں کو بخش دے گا۔

مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں اسراف اور فساد کا باہمی رابطہ بخوبی روشن ہو جاتا ہے۔

تفسیر "المیزان" میں "علامہ طباطبائی" کے فرمان کے مطابق یہ کائنات نظم اور صلاح کا ایک مجموعہ ہے حتیٰ کہ اگر کبھی کبھار ان کے اجزاء میں کوئی تضاد بھی دیکھنے میں آتا ہے تو اس میں بھی بڑی حد تک ملاپ اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ کائنات کا یہ نظام اہداف صالحہ کی طرف رواں دواں ہے اور اس کے ہر ایک جزء کے لیے ایک مقررہ راستہ ہے جس پر وہ گامزن ہے۔ اب اگر ان میں سے کوئی جزء اپنے مدار سے ہٹ جائے اور فساد کے راستے پر چل نکلے تو اس کے اور کائنات کے دوسرے اجزاء کے درمیان تصادم شروع ہو جاتا ہے اگر تو دوسرے اجزاء اسے اس کی اپنی راہ پر واپس لانے میں کامیاب ہو جائیں تو بہتر ورنہ اسے نابود کر دیتے ہیں تاکہ یہ نظام اپنے سفر کو صحیح صورت میں جاری رکھ سکے۔

انسان بھی اس عالم ہستی کا ایک جزء ہے اور اس عمومی قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے اگر فطری بنیادوں پر اپنے مدار پر حرکت کرتا رہے اور نظام ہستی سے ہم آہنگ رہے تو اپنے مقدر شدہ سعادت کے ہدف تک پہنچ جاتا ہے لیکن اگر اپنی حد سے تجاوز کر جائے اور "فساد فی الارض" کی راہ پر گامزن ہو جائے تو پہلے خداوندِ عالم اسے متنبہ کرتا ہے اور سخت اور دردناک حوادث کے ذریعے اسے متنبہ کرتا ہے۔ چنانچہ سورۂ روم کی آیت ۴۱ میں ہے:۔

ظهر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یرجعون

لوگوں کے اعمال کی وجہ سے جنگلوں اور سمندروں میں فساد ظاہر ہو گیا، خدا چاہتا ہے کہ لوگوں کے کچھ برے اعمال کی وجہ سے ان کا نتیجہ انھیں چکھائے شاید کہ وہ پلٹ آئیں۔

لیکن اگر یہ تنبیہ بھی کارگر ثابت نہ ہو اور فساد ان کے رگ و ریشہ میں جاگزیں ہو جائے تو خداوندِ عالم "عذاب استیصالی" کے ذریعے زمین کو ان کے وجود سے پاک کر دیتا ہے[1]

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خداوندِ عالم نے کس لیے "اسراف" کو "فساد فی الارض" اور عدم اصلاح کے ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔

---

[1] المیزان جلد ۱۵ صفحہ ۳۲۳

Marfat.com

۱۵۳۔ قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِيۡنَ ۞
۱۵۴۔ مَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا ۚۖ فَاۡتِ بِاٰيَةٍ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ ۞
۱۵۵۔ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرۡبٌ وَّلَـكُمۡ شِرۡبُ يَوۡمٍ مَّعۡلُوۡمٍ‌ ۞
۱۵۶۔ وَلَا تَمَسُّوۡهَا بِسُوۡٓءٍ فَيَاۡخُذَكُمۡ عَذَابُ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ۞
۱۵۷۔ فَعَقَرُوۡهَا فَاَصۡبَحُوۡا نٰدِمِيۡنَ ۞
۱۵۸۔ فَاَخَذَهُمُ الۡعَذَابُ‌ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاَيَةً‌ ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۞
۱۵۹۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ ۞

ترجمہ

۱۵۳۔ انھوں نے کہا: (اے صالح!) تم اپنی عقل کھو چکے ہو۔
۱۵۴۔ تم ہمارے جیسے ایک بشر ہی تو ہو، اگر سچ کہتے ہو تو کوئی نشانی لاؤ۔
۱۵۵۔ (صالح نے) کہا: یہ ناقہ ہے جس کا (بستی کے) پانی میں حصہ ہے اور تمھارے لیے مقررہ دن کا حصہ۔
۱۵۶۔ اسے ذرا سی بھی تکلیف نہ پہنچانا ورنہ تمھیں عظیم دن کا عذاب آلے گا۔
۱۵۷۔ آخر کار انھوں نے اس (ناقہ) پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیا پھر اپنے کیے پر نادم ہوئے۔
۱۵۸۔ عذابِ الٰہی نے انھیں اپنی لپیٹ میں لے لیا، اس میں ایک نشانی ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر مومن نہیں تھے۔
۱۵۹۔ اور تمھارا پروردگار عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔

Marfat.com

تفسیر

قوم صالح کی ہٹ دھرمی

آپ گزشتہ آیات میں گمراہ قوم کے سامنے حضرت صالح علیہ السّلام کی منطقی اور خیر خواہی پر مبنی گفتگو ملاحظہ فرما چکے ہیں اب صالح کے جواب میں اس قوم کی گفتگو سنیئے۔

انھوں نے کہا: اے صالح! تم سحر زدہ ہو کر اپنی عقل کھو چکے ہو، لہذا غیر معقول باتیں کرتے ہو (قالوا انما انت من المسحرین)۔

اور پھر یہی نہیں بلکہ "تم تو ہمارے جیسے بشر ہی تو ہو" اور کوئی بھی عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے جیسے شخص کی اطاعت کریں (ما انت الا بشر مثلنا)۔

اگر سچ کہتے ہو تو کوئی نشانی لاؤ تاکہ ہم تم پر ایمان لے آئیں (فأت بآية ان كنت من الصادقين)۔

"مسحر" سحر کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ہے "جس پر جادو کیا گیا ہو" اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بسا اوقات جادوگر لوگ جادو کے ذریعے انسان کی عقل و ہوش کو بیکار بنا دیتے ہیں صرف انھوں نے جناب صالح پر ہی یہ تہمت نہیں لگائی بلکہ اور لوگوں نے بھی دوسرے انبیاء پر ایسی تہمتیں لگائی ہیں۔ حتیٰ کہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک کو متہم کیا جیسا کہ سورۂ فرقان کی آیت ۸ میں ہے:

ان تتبعون الا رجلا مسحورا

ظالم لوگ کہتے تھے کہ تم تو اس شخص کی اتباع کرتے ہو جو مسحور ہونے کی بناء پر اپنی عقل کھو چکا ہے۔

جی ہاں! ان کے نزدیک عقل مند انسان وہ ہوتا ہے جو ماحول میں ڈھل جائے ابن الوقت بن جائے اور خود تمام برائیوں پر منطبق ہو جائے اگر کوئی انقلابی مرد خدا فاسد عقائد اور غلط نظام کے بطلان کے لیے قیام کرتا تو وہ اپنی اس منطق کی رو سے اسے دیوانہ، مجنون اور سحر زدہ کہتے۔

بعض مفسرین نے "مسحرین" کے معنی میں اور بھی کئی احتمالات کا ذکر کیا ہے جو اس سے قطعاً مناسبت نہیں رکھتے لہذا انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

بہرحال یہ سرکش لوگ حق طلبی کی خاطر نہیں بلکہ حیلے بہانوں کی بنا پر معجزے کے طلبگار ہوئے جس سے ان پر اتمام حجت ہو جائے، لہذا خداوند متعال کے حکم کے مطابق جناب صالح علیہ السلام نے کہا: یہ ناقہ ہے جس کے لیے بستی کے پانی میں حصہ ہے اور تمہارے لیے مقررہ دن کا حصہ ہے۔ (قال هذه ناقة لها شرب ولكم شرب يوم معلوم)۔

"ناقہ" کا معنی ہے اونٹنی، اور قرآن نے اس اعجاز آمیز حالت کی حامل اونٹنی کے بارے میں مجمل ذکر کیا ہے اس کی تفصیل اور خصوصیت کو بیان نہیں کیا لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ ایک عام اور معمولی اونٹنی نہیں تھی۔ بعض مفسرین کے بقول یہ اونٹنی معجزانہ

Marfat.com

صورت میں پہاڑ کے اندر سے برآمد ہوئی اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ بستی کا ایک دن کا پانی پی جاتی تھی جیسا کہ آیت میں اور سُورۂ قمر کی آیت ۲۸ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

البتہ اس کی اور خصوصیات بھی مختلف روایات میں ذکر ہوئی ہیں[1]

بہر صورت جناب صالح علیہ السلام کو حکم خداوندی تھا کہ ان لوگوں کو بتا دیں کہ یہ عجیب و غریب اور غیر معمولی اونٹنی ہے جو خداوند متعال کی بے انتہا قدرت کی ایک نشانی ہے لہٰذا اسے اپنے حال پر ہی رہنے دیں اور فرمایا کہ اسے ذرہ بھر بھی تکلیف نہ پہنچاؤ، ورنہ عظیم دن کا عذاب تمھیں اپنی لپیٹ میں لے لے گا (ولا تمسوھا بسوء فیأخذ کم عذاب یوم عظیم)۔

البتہ وہ سرکش قوم یہ نہیں چاہتی تھی کہ فریب خوردہ لوگ بیدار ہو جائیں کیونکہ لوگوں کی آگاہی کی وجہ سے اس کے مفادات کو خطرہ لاحق تھا لہٰذا ان سرکش اور مجرم لوگوں نے منصوبہ یہ بنایا کہ اس ناقہ کا ہی خاتمہ کر دیا جائے آخر کار اس پر حملہ کر ہی دیا اور ایک یا چند ضربات سے اس کا خاتمہ کر دیا اور پھر اپنے کیے پر نادم ہوگئے" کیونکہ عذاب الٰہی کو چند قدم کے فاصلے پر دیکھ رہے تھے۔ (فعقروھا فاصبحوا نادمین)[2]

چونکہ اس قوم کی سرکشی حد سے بڑھ گئی اور عملی طور پر اس نے ثابت کر دیا کہ وہ حق قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے لہٰذا ارادہ الٰہی اس بات کا متقاضی ہوا کہ زمین کو اس قوم کے وجود سے پاک کر دے، ایسی حالت میں عذاب الٰہی نے انھیں آلیا (فاخذھم العذاب)۔

اور جیسا کہ سُورۂ اعراف کی آیہ ۸۰، اور سُورۂ ہود کی آیت ۶۷ میں اجمالی طور پر مذکور ہے کہ پہلے پہل زبردست زلزلے نے ان کی زمین کو لرزا دیا، جب وہ خواب سے بیدار ہوئے اور اپنے زانوؤں کے بل بیٹھ گئے تو حادثے نے انھیں مہلت نہ دی۔ گرجدار بجلی بہت ہی زور کے ساتھ کڑکی اور دیواروں کو ان کے اوپر گرا دیا اور اسی حالت میں انھوں نے عجیب و غریب وحشت کے ساتھ جان دی۔

اس داستان کے آخر میں قرآن وہی کچھ کہتا ہے جو قوم ہود، قوم نوح اور قوم ابراہیم کی سرگزشت کے آخر میں کہتا ہے:۔

قوم صالح کی اس داستان میں آیت اور درس عبرت ہے کہ اس عظیم پیغمبر نے کس قدر پامردی، صبر اور عمدہ منطق کا مظاہرہ کیا اور ان روسیاہ لوگوں نے کس حد تک سرکشی، ہٹ دھرمی اور مخالفت کا اظہار کیا کہ بالآخر وہ اپنے منحوس انجام کو جا پہنچے، لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ وما کان

---

[1] اس بارے میں مزید تفصیلات کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۹ سُورۂ ہُود کی آیت ۶۱ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

[2] "عقروا" "عقر" (بروزن "قفل") کے مادہ سے ہے جس کا اصلی معنی کسی چیز کی اساس اور بنیاد ہے۔ جس کا ایک معنی تو "سر کاٹنے" کا ہے اور دوسرا "جانور کے پے" کرنے کا ہے۔ (یعنی جانور کے پاؤں کے پچھلے حصے کو کاٹنا اور زمین پر گرا دینا)۔

Marfat.com

اکثرھم مؤمنین)۔

یقیناً کوئی بھی شخص قدرتِ خدا پر غالب نہیں آسکتا ! جیسا کہ اس کی یہ قدرتِ کاملہ دوستوں بلکہ دشمنوں تک پہنچنے کے لیے اس کی رحمت میں مانع نہیں ہوسکتی لہٰذا "تمھارا پروردگار عزیز اور رحیم ہے"۔ (وان ربك لهو العزیز الرحیم)۔[1]

---

[1] روایات کے مطابق جس نے ناقۂ صالح کو قتل کیا وہ ایک شخص تھا جبکہ یہ عمل قرآن مجید میں "فعل جمع" کی صورت میں بیان ہوا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ دوسرے لوگ اس کے ہم عقیدہ ، ہم آواز اور اس کے عمل پر راضی تھے اور یہیں سے ایک بنیادی قاعدے کی راہ کھلتی ہے کہ مذہبی اور عقیدتی رشتہ مختلف لوگوں کو ایک ہی لڑی میں منسلک کر دیتا ہے اس کی مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۹ سورۂ ہود کی آیت ۶۵ کی طرف رجوع فرمائیں ۔

Marfat.com

۱۶۰۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ۞ۚۖ
۱۶۱۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۞ۚ
۱۶۲۔ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۞ۙ
۱۶۳۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۞ۚ
۱۶۴۔ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ؕ
۱۶۵۔ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۞ۙ
۱۶۶۔ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۞

ترجمہ

۱۶۰۔ قوم لُوط نے (خدا کے) رسولوں کی تکذیب کی۔
۱۶۱۔ جبکہ ان کے بھائی لُوط نے انھیں کہا: آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟
۱۶۲۔ میں تمھارے لیے امین رسول ہوں۔
۱۶۳۔ خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔
۱۶۴۔ میں تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف پروردگارِ عالمین کے ذمے ہے۔
۱۶۵۔ کیا تم جہان (والوں) میں سے صرف مذکر جنس کے پیچھے ہی جاتے ہو؟ (کیا یہ بُری اور شرم کی بات نہیں ہے؟)
۱۶۶۔ اور اپنی ازواج کو چھوڑ دیتے ہو جنھیں خدا نے تمھارے ہی لیے خلق فرمایا ہے، تم تو تجاوز کرنے والی قوم ہو۔

Marfat.com

تفسیر

بے حیا قوم!

چھٹے پیغمبر کہ جن کی اپنی اور گمراہ قوم کی زندگی کا ایک گوشہ اس سُورت میں بیان ہوا ہے، حضرت لوط علیہ السلام ہیں، باوجودیکہ جناب لوط علیہ السلام حضرت ابراہیمؑ کے ہم عصر ہیں۔ لیکن ان کا ماجرا ابراہیمؑ کی داستان کے بعد بیان ہوا کیونکہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب تو نہیں کہ واقعات کو باترتیب بیان کرے بلکہ اس کے پیش نظر تربیتی اور انسان سازی کے پہلو ہوتے ہیں جو دوسری مناسبتوں کے متقاضی بھی ہوتے ہیں جناب لوط کی زندگی اور ان کی قوم کا ماجرا ایسے انبیاء کی داستانوں سے زیادہ ہم آہنگ ہے جن کا ذکر ابھی بیان ہوا ہے۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: ۔ لوط کی قوم نے خدا کے بھیجے ہوئے افراد کی تکذیب کی (کذبت قوم لوط المرسلین)۔

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ " مرسلین " کو جمع کی صورت میں بیان کرنے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ایک ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی بھی پیغمبر کی تکذیب سب کی تکذیب شمار کی جاتی ہے یا پھر اس لیے ہے کہ وہ گزشتہ کسی بھی پیغمبر پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

پھر جناب لوط علیہ السلام کی دعوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کی دعوت بھی گزشتہ انبیاء جیسی تھی چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: جبکہ ان کے بھائی لوطؑ نے انھیں کہا کہ آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اذ قال لھم اخوھم لوط الا تتقون)۔

ان کی گفتگو کا انداز اور حد سے زیادہ اور گہری محبت و ہمدردی بتا رہی ہے کہ وہ ایک بھائی کی مانند ان سے باتیں کرتے تھے۔

پھر فرمایا گیا ہے: میں تمھارے لیے امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

کیا اب تک تم نے مجھ سے کوئی خیانت دیکھی ہے؟ اس کے بعد وحی الٰہی اور تمھارے رب کا پیغام پہنچانے میں بھی یقیناً امانت کو مدنظر رکھوں گا۔

"اب جبکہ صورتِ حال یہ ہے تو پرہیزگاری اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو"، کیونکہ میں راہِ سعادت کا رہبر ہوں (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

یہ نہ سمجھو کہ یہ دعوتِ الٰہی میرے گزر اوقات کا ایک ذریعہ ہے یا کسی مادی مقصد کو پیش نظر رکھ کر ایسا کام کر رہا ہوں، نہ، نہ میں تو ذرہ بھر بھی تم سے اُجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف عالمین کے رب کے پاس ہے (وما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علی رب العالمین)۔

پھر وہ ان کے ناشائستہ اعمال اور ان کی کچھ اخلاقی بے راہروی کی باتوں کو بیان کرتے ہیں اور چونکہ ان کا بڑا انحراف جنسی انحراف اور

Marfat.com

ہم جنس بازی تھا لہٰذا اسی بات پر زیادہ زور دے کر کہتے ہیں: آیا تم ساری دنیا میں صرف مردوں کے پاس ہی جاتے ہو (اتاتون الذکران من العالمین)۔

یعنی باوجودیکہ خداوندِ عالم نے اس قدر جنس مخالف تمھارے لیے خلق فرمائی ہے جن سے صحیح طریقے سے شادی کر کے پاک و پاکیزہ اور اطمینان بخش زندگی بسر کر سکتے ہو۔ خدا کی اس پاک اور فطری نعمت کو چھوڑ کر تم نے خود کو اس طرح کے پست اور حیا سوز کام سے آلودہ کر لیا ہے۔

آیت کی تفسیر میں یہ احتمال بھی موجود ہے کہ "من العالمین" کا جملہ خود اس قوم کے لیے ہو یعنی تمام جہان والوں میں صرف تم ہی ہو جنھوں نے یہ کج روی اختیار کی ہوئی ہے اور یہ بات بعض تاریخوں سے بھی ہم آہنگ ہے کہ قوم لوط ہی سب سے پہلی قوم ہے جس نے ہم جنس بازی کا وسیع صورت میں ارتکاب کیا ہے[1] لیکن بعد والی آیت سے پہلی تفسیر زیادہ ہم آہنگ ہے۔

پھر فرمایا: اپنی ازواج کو ترک کر دیتے ہو جنھیں خدا نے تمھارے لیے خلق فرمایا ہے (و تذرون ما خلق لکم ربکم من ازواجکم)۔

تم تو تجاوز کرنے والی قوم ہو (بل انتم قوم عادون)۔

یقیناً کسی روحانی یا جسمانی فطری ضرورت نے تمھیں اس بے راہروی پر آمادہ نہیں کیا بلکہ یہ تمھاری سرکشی ہے جس نے تمھارے دامن کو اس شرمناک فعل کی گندگی سے آلودہ کر دیا ہے۔

تمھارے کام کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص خوشبودار میوے، مقوی اور صحیح سالم غذائیں چھوڑ کر زہر آلود اور مار ڈالنے والی غذاؤں کو استعمال کرے۔ یہ فطری خواہش نہیں بلکہ سرکشی ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ لواطت ایک شرمناک فعل ہے: قرآن مجید نے سورۂ اعراف، ہود، حجر، انبیاء، نمل اور عنکبوت میں قوم لوط کے حالات اور ان کے اس بُرے گناہ کی طرف اشارہ کیا ہے، البتہ ہر مقام پر دوسرے مقام کی نسبت مختلف تعبیریں پائی جاتی ہیں درحقیقت ان میں سے ہر ایک تعبیر اس بے حیائی پر مبنی قبیح فعل کے کسی ایک پہلو کو اجاگر کرتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعراف آیہ ۸۱ میں ہے کہ لوط علیہ السلام نے انھیں کہا:

بل انتم قوم مسرفون

تم اسراف کرنے والے لوگ ہو۔

سورۂ انبیاء آیت ۷۴ میں ہے:۔

---

[1] اس بے شرم قوم کے انحراف کی وجہ ایک داستان ہے جو تاریخوں میں موجود ہے اور جسے ہم تفسیر نمونہ جلد ۹ میں سورۂ ہود کی آیت ۸۱ کے ذیل میں بیان کر چکے ہیں۔

Marfat.com

ونجیناہ من القریۃ التی کانت تعمل الخبائث انھم کانوا قوم سوء فاسقین

ہم نے لُوط کو اس بستی سے نجات دلائی جو "خبائث" کا ارتکاب کرتی تھی، وہ بہت بُرے اور فاسق لوگ تھے۔

سُورۂ شعراء کی زیرِ بحث آیت میں ہے کہ جناب لوط علیہ السّلام نے انھیں فرمایا۔

بل انتم قوم عادون

تم حد سے تجاوز کرنے والے لوگ ہو۔

سُورۂ نمل آیت ۵۵ میں ہے: ۔

بل انتم قوم تجھلون

تم جاہل اور نادان قوم ہو۔

سُورۂ عنکبوت کی آیت ۲۹ میں ہے کہ لُوط علیہ السّلام اپنی قوم سے کہتے ہیں: ۔

ائنکم لتأتون الرجال وتقطعون السبیل

تم مَردوں کے پاس جاتے ہو اور فطری اور نسلِ انسانی کے راستے کو منقطع کرتے ہو۔[1]

اس طرح سے یہ قبیح فعل "اسراف"، "خبیث"، "فسق"، "تجاوز"، "جہل" اور "قطع سبیل" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

"اسراف" اس لیے کیونکہ ان لوگوں نے اس بارے میں نظامِ آفرینش کو فراموش کر دیا تھا اور حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ تعدی کا لفظ بھی اس پر بولا گیا ہے۔

"خبیث" کا معنی ہے ایسا کام یا ایسی چیز جس سے انسان کی صحیح و سالم طبیعت نفرت کرے اور اس قبیح عمل سے بڑھ کر اور کون سا فعل ہوگا جس سے طبیعت نفرت کرے۔

"فسق" کا معنی ہے پروردگار کی اطاعت سے نکل جانا اور شخصیت انسانی کا ننگا ہو جانا اور یہ کام یقیناً اطاعتِ الٰہی سے خارج اور شخصیت انسانی کو ننگا کر دیتا ہے۔

"جہل" اس کے ان خطرناک نتائج سے بے خبری کی وجہ سے کہ جو فرد اور معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

اور "قطع سبیل" یعنی اس قبیح فعل کا بدترین انجام نسلِ انسانی کا خاتمہ ہے کیونکہ اگر یہ شرمناک فعل وسعت اختیار کر لے تو نسلِ انسانی ختم ہو کر رہ جائے وہ اس لیے کہ موافق جنس کی طرف میلان آہستہ آہستہ مخالف جنس سے تعلقات منقطع کرنے کا سبب بن جائے گا اور نسلِ بشر بڑھنے سے رک جائے گی۔

۲۔ لواطت کے خطرناک نتائج:۔ اگرچہ ہم نے تفسیر نمونہ کی نویں جلد (سُورۂ ہود کی آیات ۸۱ تا ۸۲ کی شرح) میں

---

[1] بعض مفسرین نے "تقطعون السبیل" کے جملے کی یوں تفسیر کی ہے کہ قوم لوط کے افراد راہزن، ڈاکو اور لٹیرے بھی تھے۔

Marfat.com

اس شرمناک فعل کے مضرات اور نقصانات پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر پھر بھی چند ایک مطالب کو بیان کرتے ہیں۔

پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث ہے۔

لا یجد ریح الجنة زنوق. وهو المخنث

جس سے لواطت کی جائے وہ بہشت کی خوشبو نہیں سونگھ پائے گا۔[1]

حضرت علی علیہ السلام کے ایک فرمان میں اس قبیح فعل کا کفر کی حد تک تعارف کرایا گیا ہے۔[2]

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے لواطت کی حرمت کا فلسفہ ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

علة تحريم الذكران للذكران، و الاناث للاناث، لما ركب في الاناث و ما طبع عليه الذكران. ولما في اتيان الذكران الذكران و الاناث للاناث. من انقطاع النسل. وفساد التدبير. وخراب الدنيا

مردوں پر مردوں کے اور عورتوں پر عورتوں کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ خدا نے مرد اور عورت کی جو فطرت بنائی ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ (اور اس فطری اور طبعی ساخت کی مخالفت، انسان کی روح اور جسم کے انحراف کا سبب بن جائے گی) اور یہ اس لیے بھی حرام ہے کہ اگر مرد، مردوں کے ساتھ، اور عورتیں عورتوں کے ساتھ ملاپ شروع کر دیں تو نسلِ انسانی منقطع ہو جائے اور اجتماعی زندگی کی تمام تدبیریں خرابی کا شکار ہو جائیں اور دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔[3]

اور اسلام کی نگاہ میں یہ فعل اس حد تک برا اور شرمناک ہے کہ اسلامی حُدود کے ابواب میں اس کی سزا کسی شک کے بغیر سزائے موت ہے حتیٰ کہ جو لوگ اس قبیح فعل کے کم ترین مرحلے کا ارتکاب کرتے ہیں ان کے لیے بھی سخت سے سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں منجملہ ان کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:۔

من قبل غلاما من شهوة الجمه الله يوم القيامة بلجام من نار

جو شخص کسی لڑکے کا شہوت کے ساتھ بوسہ لے خداوندِ عالم بروز قیامت اس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالے گا۔[4]

جو شخص اس حدیث میں مذکور بُرے فعل کا مرتکب ہو اس کی سزا انیس تا ننانوے کوڑے ذکر ہوئے ہیں۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ جنسی بے راہروی خطرناک ترین انحراف ہے کہ اگر یہ انسانی معاشرے میں رونما ہو جائے تو یہ اپنا منحوس سایہ تمام اخلاقی مسائل پر ڈال دیتا ہے اور انسانی مزاج اور جذبات کو گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔

(اس سلسلے میں مزید تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ جلد ۹ سورۂ ہود کی آیہ ۸۱ کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں)

---

[1]، [2]، [3] بحار الانوار، طبع جدید جلد ۹، ص ۶۴، ۶۷۔

[4] بحار الانوار جلد ۹، ص ۲۰۔

Marfat.com

۱۶۷۔ قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ۝
۱۶۸۔ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ۝
۱۶۹۔ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝
۱۷۰۔ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ۝
۱۷۱۔ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ۝
۱۷۲۔ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ۝
۱۷۳۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝
۱۷۴۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
۱۷۵۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۶۷۔ ان لوگوں نے کہا: اے لوط! اگر تم ایسی باتوں سے باز نہ آئے تو نکال دیئے جانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔
۱۶۸۔ کہا: میں تو (بہرحال) تمھارے اعمال کا دشمن ہوں۔
۱۶۹۔ پروردگارا! مجھے اور میرے خاندان کو ان کے کرتوتوں سے نجات دے۔
۱۷۰۔ ہم نے اسے اور اس کے خاندان سب کو نجات دی۔
۱۷۱۔ سوائے ایک بڑھیا کے جو اس گروہ میں باقی رہ گئی۔
۱۷۲۔ پھر باقی ماندہ لوگوں کو ہم نے ہلاک کر ڈالا۔
۱۷۳۔ اور ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی کس قدر بری بارش تھی ڈرائے جانے والوں پر۔
۱۷۴۔ (قوم لوط کی) اس داستان (اور ان کے منحوس انجام) میں نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے۔
۱۷۵۔ اور تیرا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

Marfat.com

تفسیر

قوم لوط کا انجام

قوم لوط کے افراد جو بادہ شہوت وغرور سے مست ہو چکے تھے، اس رہبر الٰہی کی نصیحتوں کو جان ودل سے قبول کرنے اور خود کو اس دلدل سے باہر نکالنے کی بجائے اس کے مقابلے پر تُل گئے اور انھیں کہا اے لوط! کافی ہو چکا ہے۔ اب خاموش رہو اگر ان باتوں سے باز نہ آئے تو تمھارا شمار بھی اس شہر سے نکال دیئے جانے والوں میں سے ہو گا (قالوا لئن لم تنته یالوط لتکونن من المخرجین)۔

تمھاری باتیں ہماری فکر اور آرام میں خلل ڈال رہی ہیں ہم ان باتوں کے سننے کے ہرگز روادار نہیں: اگر تمھاری یہی حالت رہی تو ہم تمھیں سزا دیں گے جو کم از کم جلاوطنی کی صورت میں ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید کے ایک اور مقام پر ہے کہ انھوں نے اپنی اس دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنایا اور حکم دیا کہ لوطؑ کے خاندان کو شہر سے باہر نکال دو کیونکہ وہ پاک لوگ ہیں اور گناہ نہیں کرتے۔

اخرجوهم من قریتکم انهم اناس یتطهرون (الاعراف: ۸۲)

ان گمراہ اور گناہ آلود لوگوں کی جسارت اس حد تک جا پہنچی کہ تقویٰ اور طہارت ان کے درمیان بہت بڑا عیب سمجھا جانے لگا اور ناپاکی اور گناہ سے آلودگی سرمایۂ افتخار! اور یہ کسی معاشرے کی تباہی کی علامت ہوتی ہے جو تیزی کے ساتھ برائیوں کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔

"لتکونن من المخرجین" سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فاسق وفاجر گروہ نے ایسے پاک وپاکیزہ لوگوں کو پہلے باہر نکال دیا جو ان کو ان کے بیہودہ اعمال سے روکا کرتے تھے لہٰذا انھوں نے حضرت لوط کو بھی یہی دھمکی دی کہ اگر تم نے اپنے اس تبلیغی سلسلے کو جاری رکھا تو تمھارا بھی وہی انجام ہو گا۔

بعض تفسیروں میں صراحت کے ساتھ تحریر ہے کہ وہ پاک دامن لوگوں کو بدترین طریقے سے جلاوطن کر دیا کرتے تھے[1]

لیکن حضرت لوط علیہ السلام نے ان دھمکیوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور اپنا کام جاری رکھا اور کہا: میں تمھارے ان کاموں کا دشمن ہوں۔ (قال انی لعملکم من القالین)۔

یعنی میں اپنا احتجاج برابر جاری رکھوں گا، تم جو کچھ میرا بگاڑنا چاہتے ہو بگاڑ لو مجھے راہ خدا اور برائیوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں ان دھمکیوں کی قطعاً کوئی پرواہ نہیں ہے۔

"القالین" جمع کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس احتجاج اور جہاد میں اور بھی بہت سے لوگ جناب لوط

---

[1] تفسیر روح المعانی اور تفسیر کبیر فخر رازی اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

علیہ السلام کے ہمنوا ہو چکے تھے یہ اور بات ہے کہ سرکش قوم نے آخر کار انھیں جلا وطن کر دیا۔
" قالین "" قال " کی جمع اور " قلی " (بروزن حلق یا بروزن شرک) کے مادہ سے ہے اور اس کا معنی ایسی عداوت ہے جو انسان کی روح میں اُتر جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب لُوط علیہ السلام کو ان کے اعمال سے کس قدر نفرت تھی؟
لائق توجہ بات یہ ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام فرماتے ہیں کہ " میں تمھارے اعمال کا دشمن ہوں" یعنی مجھے تمھاری ذات سے دشمنی نہیں بلکہ تمھارے شرمناک اعمال سے نفرت ہے اگر ان اعمال کو اپنے سے دور کر دو تو پھر تم میرے پکے دوست ہو۔
بہرحال جناب لوط علیہ السلام کی کسی بھی نصیحت سنے ان پر کوئی اثر نہ کیا ان کا تمام معاشرہ اس متعفن دلدل میں پھنس کر رہ گیا بڑی حد تک اتمام حجت بھی کی گئی مگر بے فائدہ۔ اب لوط علیہ السلام کی ذمہ داری کا آخری مرحلہ آن پہنچا لہٰذا وقت آپہنچا کہ جناب لوط علیہ السلام خود کو بھی اور جو لوگ ان پر ایمان لا چکے ہیں انھیں بھی اس گناہ آلود علاقے سے باہر نکال کرلے جائیں تاکہ ہولناک عذاب اس بے حیا قوم کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔
حضرت لوط علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں دستِ دعا بلند کر کے کہا:۔
پروردگارا! جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں مجھے اور میرے خاندان کو اس سے نجات دے (رب نجنی و اھلی مما یعملون)۔
بعض مفسرین کا خیال ہے کہ " اہل " سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو آپ پر ایمان لا چکے تھے لیکن سورۂ " ذاریات " کی آیت ۳۶ کہتی ہے:۔

فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین

صرف ایک ہی خاندان تھا جو ایمان لا چکا تھا۔
لیکن جیسا کہ ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ زیرِ تفسیر آیت میں بعض ایسی تعبیرات پائی جاتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی کچھ لوگ حضرت لُوط پر ایمان لا چکے تھے لیکن انھیں جلا وطن کر دیا گیا تھا۔
جو کچھ بتایا جا چکا ہے اس سے ضمنی طور پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جناب لوط علیہ السلام کی اپنے خاندان کے لیے دعا خاندانی شفقت اور رشتہ داری کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ ایمان لانے کی بنا پر تھی۔
خداوندِ عالم نے ان کی دعا قبول فرمائی جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ہم نے لُوط اور ان کے سب خاندان والوں کو نجات دی (فنجیناہ و اھلہ اجمعین)۔
سوائے اس بڑھیا کے جو گمراہ لوگوں کے درمیان باقی رہ گئی تھی (الا عجوزاً فی الغابرین)۔[1]
بچ رہنے والی یہ بڑھیا جناب لوط علیہ السلام کی بیوی ہی تھی جو عقیدے اور مذہب کے لحاظ سے اس گمراہ قوم سے ہم آہنگ و

---

[1] " غابر " " غبور " کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے باقی ماندہ اور بچی کھچی چیز۔ جب کوئی ایک گروہ کسی جگہ سے چل پڑے تو جو شخص وہیں پر رہ جائے اسے غابر کہتے ہیں اسی لیے مٹی کے بچے کھچے حصے کو " غبار " کہتے ہیں اور حیوان کے پستان سے دودھ دوہ لینے کے بعد جو بچ رہے اسے غبرۃ کہتے ہیں۔

Marfat.com

ہم خیال تھی ۔ وہ آخر دم تک جناب لوطؑ پر ایمان نہیں لائی اور اسی گمراہ قوم کے انجام سے دوچار ہوئی ۔ اس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۹ سورہ ہود کی مذکورہ آیات کے ذیل میں گزر چکی ہے ۔

ہاں تو خداوند عالم نے جناب لوط اور جو تھوڑے سے لوگ ان پر ایمان لے آئے تھے ان سب کو نجات بخشی ۔ چنانچہ انھوں نے حکم الٰہی کے تحت گناہ آلود لوگوں کے علاقہ سے رخت سفر باندھا اور راتوں رات چل پڑے اور گناہ و بے شرمی میں غرق لوگوں کو اپنے حال پر باقی چھوڑ دیا ۔ علی الصباح عذاب کا حکم صادر ہوا ، وحشت ناک لے نے ان کے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا جس سے ان کے آباد و شاد شہر، خوبصورت محلات، عیش و عشرت اور بے شرمی و بے حیائی پر مبنی ان کی زندگی غرض سب کچھ مکمل طور پر تہ و بالا ہوگیا، جیسا کہ خداوند عالم نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے : پھر ہم نے ان تمام لوگوں کو نیست و نابود کر دیا ۔ (ثم دمرنا الآخرین) ۔

اور ان پر بارش برسائی (لیکن کیسی بارش ؟ پتھروں کی بارش اور وہ بھی اس حد تک کہ ان کے کھنڈرات تک دکھائی نہ دیتے تھے) (و امطرنا علیھم مطرًا) ۔

کس قدر بُری بارش نے اس ڈرائے جانے والے گروہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا (فساء مطر المنذرین) ۔

معمول کے مطابق برسنے والی بارشیں مُردہ زمینوں کو زندہ کر دیتی ہیں اور ان میں تازہ روح پھونک دیتی ہیں ۔ لیکن یہ وحشتناک بارش تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے والی تھی ۔

سُورۂ ہود کی آیت ۸۲ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے قوم لوط کے شہر تہ و بالا ہوئے پھر ان پر پتھروں کی مسلسل بارش برسی اور جیسا کہ اسی آیت کی تفسیر میں ہم بتا چکے ہیں کہ پتھروں کی بارش ان پر شاید اس لیے تھی کہ ان کے نام و نشان تک مٹ جائیں اور آباد و شاد شہروں کی بجائے پتھر اور مٹی کے ٹیلے یادگار کے طور پر باقی رہ جائیں ۔

آیا یہ پتھر عظیم طوفان کی وجہ سے بیابانوں سے اُڑ اُڑ کر برسنے لگے یا آسمانی فضا میں اُڑتے پھرتے پتھر تھے کہ جو حکم خداوندی کے تحت وہاں پر برسے ۔

یا بعض مفسرین کے بقول قریب ہی خاموش آتش فشاں تھا جو حکم پروردگار کے مطابق پھٹ پڑا ۔ اور اسی کے پتھر بارش بن کر برسنے لگے ؟ یہ اچھی طرح معلوم نہیں ہے جو بات مسلّم ہے وہ یہ کہ اس تباہ کن بارش نے اس گناہ آلود سرزمین میں سے زندگی کا نام و نشان تک مٹا دیا ۔

اس واقعے کی تفصیل تفسیر نمونہ کی نویں جلد صفحہ ۱۸۰ سے ۱۸۶ تک اور گیارہویں جلد کے صفحہ ۱۰۲ سے ۱۱۰ تک میں مختلف نکات کے ساتھ بیان کی گئی ہے ۔

اس واقعے کے اختتام پر ایک بار پھر ان دو جملوں کا مطالعہ کرتے ہیں جو اس طرح کے دوسرے پانچ انبیاء کے واقعات کے آخر میں پڑھ چکے ہیں، ارشاد ہوتا ہے : اس ظالم اور بے حیا قوم کی داستان اور ان کے منحوس انجام میں آیت و نشانی اور درس عبرت ہے (ان فی ذٰلک لاٰیۃ) ۔

لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (و ما کان اکثرھم مؤمنین) ۔

Marfat.com

اس سے بڑھ کر اور کون سی واضح اور روشن نشانی ہو سکتی ہے جو تمھیں اہم اور نتیجہ خیز مسائل سے آگاہ کرتی ہے اور تمھیں ذاتی تجربات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

یقیناً گزشتہ لوگوں کی تاریخ ایک درسِ عبرت ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک نشانی ہے۔ یہ ذاتی تجربہ بھی نہیں ہے کیونکہ ذاتی تجربے میں تو نقصان اٹھانے کے بعد نتائج حاصل ہوتے ہیں لیکن اس میں دوسروں کے تجربوں سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اور تیرا پروردگار عزیز و رحیم ہے (و ان ربك لهو العزيز الرحيم)۔

اس سے بڑھ کر اور رحمت کیا ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے گناہوں سے آلودہ قوموں کو سزا نہیں دیتا بلکہ انھیں ہدایت در نظر ثانی کے لیے کافی ڈھیل اور لمبی مہلت دیتا ہے۔

اور پھر یہ کہ اس سے بڑھ کر اور کیا رحمت ہو کہ اس کی سزا میں سب خشک و تر نہیں جلتے حتیٰ کہ اگر ہزاروں لاکھوں گنہگار خاندانوں میں صرف ایک ہی مومن خاندان ہے تو وہ انھیں نجات عطا فرماتا ہے۔

اور غلبہ و قدرت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس قسم کے گناہ آلود شہروں کو چشم زدن میں یوں تہ و بالا کر دیتا ہے کہ صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان تک مٹ جاتا ہے جو زمین گناہگاروں کی آسائش و آرام کا گہوارہ ہوتی ہے اسے پل بھر میں ان کی موت پر مامور کر دیتا ہے اور حیات بخش بارش کو موت کی بارش میں تبدیل کر دیتا ہے۔

Marfat.com

۱۷۶۔ كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْـَٔيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ۝
۱۷۷۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝
۱۷۸۔ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝
۱۷۹۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝
۱۸۰۔ وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
۱۸۱۔ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ۝
۱۸۲۔ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝
۱۸۳۔ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝
۱۸۴۔ وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝

ترجمہ

۱۷۶۔ (مدین کے نزدیک شہر) ایکہ والوں نے (خدا کے) رسولوں کو جھٹلایا۔
۱۷۷۔ جبکہ شعیب نے انھیں کہا: کیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو؟
۱۷۸۔ میں تمھارے لیے امین رسول ہوں۔
۱۷۹۔ خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
۱۸۰۔ میں اس دعوت کے بدلے تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا، میرا اجر تو صرف عالمین کے پروردگار کے پاس ہے۔
۱۸۱۔ پیمانے کا حق ادا کرو (اور کم مت بیچو) اور لوگوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔
۱۸۲۔ اور ٹھیک ترازو سے تولا کرو۔

Marfat.com

۱۸۳۔ لوگوں کا حق کم نہ دیا کرو اور زمین میں خرابی نہ پھیلاتے پھرو۔
۱۸۴۔ جس نے تمھیں اور تم سے اگلی قوموں کو خلق کیا ہے، اس سے ڈرو۔

تفسیر

شعیبؑ اور اہلِ ایکہ

اس سورت میں انبیاء کے واقعات کا یہ ساتواں اور آخری حصّہ ہے۔ یہ اللہ کے عظیم نبی شعیب علیہ السلام اور ان کی سرکش قوم کی داستان ہے۔

اللہ کے یہ نبی مدین (شامات کے جنوب میں ایک شہر کا نام) اور ایکہ (بروزن لیلہ، مدین کے نزدیک ایک آبادی کا نام) میں رہتے تھے۔

سورۂ حجر کی آیت ۷۹، اس بات کی گواہ ہے کہ سرزمین ایکہ حجاز سے شام کی طرف جانے والے رستے میں تھی۔

پہلے فرمایا گیا ہے: ایکہ والوں نے خدا کے رسولوں کی تکذیب کی (کذب اصحاب الایکة المرسلین)۔

انھوں نے نہ صرف جناب شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی جو ان کی طرف مبعوث ہوئے بلکہ دعوت کی یگانگت اور وحدت کی وجہ سے دوسرے انبیاء بھی ان کی تکذیب سے محفوظ نہ رہ سکے یا انھوں نے کسی بھی آسمانی دین کو قبول نہیں کیا تھا۔

"ایکہ" دراصل ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں پر گھنے جنگلات ہوں کہ جسے فارسی میں "بیشہ" (اور اُردو میں کچھار۔ مترجم) کہتے ہیں۔ یہ علاقہ مدین کے پاس تھا۔ پانی اور گھنے درختوں کی رہبہ سے "ایکہ" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ قرائن بتلاتے ہیں کہ ایکہ کے رہنے والے بڑے خوشحال اور ثروت مند لوگ تھے۔ اور یہی خوشحالی اور ثروت ہی شاید ان کے غرور اور غفلت میں غرق ہو جانے کا سبب بن گئی۔

پھر اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے، جب شعیب نے انھیں کہا کہ آیا تقویٰ اختیار نہیں کرتے ہو (اذ قال لھم شعیب الا تتقون)۔

درحقیقت جناب شعیب علیہ السلام کی دعوت کا آغاز بھی دوسرے انبیاء کی مانند تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہوتا ہے کہ جو تمام اصلاحی کاموں کی بنیاد اور اخلاقی و سماجی برائیوں سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ ہے۔

یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ جس طرح جناب صالح، ہود، نوح اور لوط علیہم السلام کی داستانوں میں لفظ "اخوھم" آیا ہے یہاں پر دکھائی نہیں دیتا اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جناب شعیب علیہ السلام کا وطن "مدین" تھا ان کی رشتہ داری مدین والوں کے ساتھ تھی اہلِ ایکہ کے ساتھ نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ ہود کی آیہ ۸۴ میں جب صرف "مدین" کا تذکرہ آتا ہے تو یوں کہا جاتا ہے:

والی مدین اخاھم شعیبا

Marfat.com

زیر نظر آیت میں چونکہ " ایکہ" والوں کا ذکر ہے اور شعیب علیہ السلام سے ان کی کسی قسم کی رشتہ داری نہیں تھی لہٰذا یہاں پر وہ لفظ استعمال نہیں ہوا۔

پھر فرمایا گیا ہے۔ شعیب نے کہا: میں تمھارے لیے امین رسول ہوں (انی لکم رسول امین)۔

تقویٰ اختیار کرو، خدا سے ڈرو اور میری اطاعت کرو (کیونکہ میری اطاعت اسی کی ہی اطاعت ہے) (فاتقوا اللہ و اطیعون)۔

یہ بھی اچھی طرح جان لو کہ " میں اس دعوت کا اجر تم سے نہیں مانگتا میرا اجر تو صرف اور صرف عالمین کے رب کے پاس ہے" (و ما اسئلکم علیہ من اجر ان اجری الا علیٰ رب العالمین)۔

وہی ایک جملہ اور ہر لحاظ سے چاتُلا جملہ جو دوسرے تمام انبیاء کی دعوت کے آغاز میں آیا ہے، تقویٰ کی دعوت، اپنی دیانت امانت پر مبنی زندگی کا حوالہ اور اس بات پر خاص طور پر زور کہ اس دعوت الٰہی کا سبب صرف اور صرف روحانی ہے کوئی مادی فائدہ پیش نظر نہیں۔ یہ اس لیے فرمایا تاکہ بہانہ ساز اور بدگمان لوگوں کو بھاگنے کا موقع نہ مل سکے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے بھی دوسرے انبیاء کا سا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے انھوں نے تقویٰ اور اطاعت پروردگار پر مبنی عمومی دعوت دی۔ اپنی تعلیمات کے دوسرے حصے میں اس ماحول کی خرابیوں، اخلاقی اور اجتماعی برائیوں کی نشاندہی کی اور انھیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس خوشحال قوم کی اہم ترین خرابیاں اقتصادی ناہمواری، کھلم کھلا ظلم، حق کشی اور لوٹ کھسوٹ تھیں لہٰذا انھوں نے بھی انھی مسائل پر خاص زور دیا۔

پہلے فرماتے ہیں: پیمانے کا حق ادا کرو (ناپ تول میں کمی نہ کرو)۔ (اوفوا الکیل)۔

اور لوگوں کو نقصان اور گھاٹا نہ پہنچاؤ (و لا تکونوا من المخسرین)۔

سیدھے اور صحیح ترازو سے تولو (و زنوا بالقسطاس المستقیم)[۱]۔

لوگوں کا حق کم نہ کرو اور نہ ہی لوگوں کی اشیاء اور چیزوں میں عیب نکالو (و لا تبخسوا الناس اشیاءھم)۔

زمین پر خرابی نہ پھیلاتے پھرو (و لا تعثوا فی الارض مفسدین)۔

ان تین آیات میں شعیب علیہ السلام نے ایک مختصر مگر جچی تلی عبارت میں اس گمراہ قوم کو " پانچ حکم " دیئے ہیں۔ بعض مفسرین نے یہ تصور کیا ہے کہ یہ پانچ حکم ایک دوسرے کی تاکید کے طور پر آئے ہیں لیکن اگر خوب غور سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ پانچ حکم درحقیقت پانچ بنیادی اور مختلف مطالب کی طرف اشارہ ہے ان میں چار حکم ہیں اور ایک مجموعی کلیہ ہے۔

اس فرق کو معلوم کرنے کے لیے اس حقیقت کی طرف توجہ ضروری ہے کہ قوم شعیبؑ (ایکہ اور مدین کے لوگ) ایک اہم تجارتی راستے پر رہتے تھے۔ جہاں سے حجاز سے شام اور شام سے حجاز اور دوسرے مقامات کی طرف تجارتی قافلوں کی

---

[۱] " قسطاس " (بروزن مقیاس) ترازو کے معنی میں ہے بعض لوگ اسے رومی اور کچھ لوگ عربی لفظ سمجھتے ہیں بعض کا خیال ہے قسطاس بڑے ترازو کو کہتے ہیں اور میزان چھوٹے کو اور چونکہ قسطاس ایسا ترازو ہوتا ہے جس کی سوئی کی مانند زبان ہوتی ہے لہٰذا صحیح صحیح وزن بتاتا ہے۔

Marfat.com

آمدورفت ہوا کرتی تھی۔

معلوم ہے کہ ایسے قافلوں کو راستے میں بہت سی چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے اور بعض اوقات راستے میں پڑنے والے شہروں کے لوگ مسافروں کی ضروریات اور مشکلات سے بہت ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ان کی اجناس کو کم قیمت پر خریدتے ہیں اور اپنی چیزیں زیادہ قیمت پر فروخت کرتے ہیں (البتہ توجہ رہے کہ اس زمانے میں زیادہ تر کاروبار مال کے بدلے مال کی صورت میں ہوا کرتا تھا)۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی کا مال خریدتے ہیں اس میں ہزار عیب نکالتے ہیں، جب اپنا مال بیچتے ہیں تو اس کی ہزار تعریف کرتے ہیں۔ جب تولتے ہیں تو اپنا مال پورا پورا یا کم تولتے ہیں اور دوسروں کا مال بے پرواہی سے تولتے ہیں یا زیادہ تولتے ہیں چونکہ فریق ثانی بے چارہ ضرورت مند ہوتا ہے لہٰذا مجبور ہوتا ہے کہ ایسی بے انصافیاں قبول کرے۔

قافلوں اور کاروانوں سے ہٹ کر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے علاقے کے غریب اور بے بس لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہیں اور معاشرے کے مالدار اور سرمایہ دار لوگ ایسے مجبور اور بے بس لوگوں کے ساتھ اسی قسم کا ظالمانہ سلوک کرتے ہیں۔ غریب لوگ کوئی جنس بیچیں یا خریدیں اس کی قیمت دولت مندوں کی حسب منشا متعین ہوتی ہے اور پیمانہ بھی ہر حالت میں انھی کے اختیار میں ہوتا ہے اور بے بس اور بے نوا مستضعف "مردہ بدست زندہ" کے مصداق ان کے سامنے مجبور اور بے اختیار ہوتے ہیں۔

مندرجہ بالا گفتگو کو پیش نظر رکھ کر اب ہم آیات زیر بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔

ایک مقام پر تو انھیں پیمانے کا حق ادا کرنے کا حکم دیا جاتا ہے دوسری جگہ پر صحیح طور پر تولنے کا اور ہم جانتے ہیں کہ سامان کو یا تو تولا جاتا ہے اور یا ناپا جاتا ہے لہٰذا ہر دو صورتوں کی جداگانہ طور پر نشاندہی کی گئی ہے تاکہ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرادی جائے کسی بھی موقع پر کم نہ بیچیں۔

اور پھر یہ کہ کم فروشی کے بھی کئی طریقے ہیں کبھی ترازو یا پیمانہ تو ٹھیک ہوتا ہے لیکن اس کا حق ادا نہیں ہو پاتا اور کبھی ترازو اور پیمانہ صحیح نہیں ہوتا بلکہ خود ساختہ اور جعلی ہوتا ہے، مندرجہ بالا آیات میں ان سب باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ان دو تعبیروں کے واضح ہو جانے کے بعد اب ہم "لا تبخسوا" کی بات کرتے ہیں چنانچہ یہ "بخس" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ظالمانہ طریقے سے کسی کے حقوق گھٹا دینا اور کبھی یہ لفظ فریب دہی کے معنی میں بھی آتا ہے جس کا انجام دوسروں کے حقوق ضائع کرنا ہوتا ہے بنا بریں مندرجہ بالا جملے کا ایک وسیع معنی ہے جس میں لین دین میں کھوٹ، ملاوٹ، ٹھگی، لوٹ کھسوٹ اور دھوکا دہی سب شامل ہیں۔

رہا "لا تکونوا من المخسرین" کا جملہ تو چونکہ "مخسر" کا معنی ہے ایسا شخص جو کسی شخص یا کسی چیز کو خسارہ پہنچاتا ہے اور اس کے بھی کئی معانی ہیں جس میں خرید و فروخت اور لین دین میں ہر قسم کی کمی شامل ہے۔

اس لحاظ سے ہر قسم کی ناجائز منافع خوری اور لین دین میں ظلم و ستم، ہر طرح کی دھوکا بازی اور نقصان پہنچانے کی کوشش خواہ وہ کمیت میں ہو یا کیفیت میں، سب کچھ مندرجہ بالا حکم میں شامل ہیں۔

اور چونکہ اقتصادی ناہمواری اجتماعی نظام کے منتشر ہو جانے کا سبب بن جاتی ہے لہٰذا ان احکام کے آخر میں مجموعی صورت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے "ولا تعثوا فی الارض مفسدین" یعنی زمین میں خرابی نہ کرو اور معاشرے کو تباہی کی طرف نہ لے جاؤ

Marfat.com

ہر قسم کی لوٹ کھسوٹ اور ظالمانہ منافع خوری اور دوسروں کے حقوق ضائع کرنے سے پرہیز کرو۔

یہ احکام صرف شعیب علیہ السلام کے دور کے متمول اور ظالم معاشرے کے لیے ہی کارآمد نہیں بلکہ ہر دور اور ہر زمانے کے لیے کارساز ہیں اور معاشرتی مشکلات کا حل ہیں۔

جناب شعیب علیہ السلام اپنے آخری فرمان میں ایک بار پھر انھیں تقویٰ اور پرہیزگاری کی دعوت دیتے ہوئے کہتے ہیں:

اس خدا سے ڈرو جس نے تمھیں بھی اور گزشتہ اقوام کو بھی پیدا کیا ہے۔ (واتقوا الذی خلقکم والجبلۃ الاولین)۔

صرف تم ہی ایسی قوم نہیں ہو جس نے روئے زمین پر قدم رکھا ہے تم سے پہلے تمھارے آباؤ اجداد اور دوسری قومیں آئیں اور چلی گئیں ان کے ماضی کو اور اپنے مستقبل کو فراموش مت کرو۔

"جبلۃ" "جبل" سے ہے جس کا معنی ہے "پہاڑ"۔ اور اس کا اطلاق اس کثیر التعداد جماعت پر ہوتا ہے، جس کی عظمت پہاڑ ایسی ہوتی ہے۔ بعض مفسرین نے اس جماعت کی تعداد دس ہزار تک ذکر کی ہے۔

انسان کی طبیعت اور فطرت کو بھی "جبلت" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ پہاڑ کی مانند اٹل ہوتی ہے جسے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

شاید یہ اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو کہ میں جو یہ کہتا ہوں کہ ظلم و فساد کو چھوڑ دو، حقوق العباد ادا کرو اور عدالت کو پیش نظر رکھو تو یہ سب کچھ روز اوّل ہی سے انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔ میں تو صرف اس پاکیزہ فطرت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے آیا ہوں۔

لیکن افسوس کہ اس ہمدرد اور بیدار کرنے والے پیغمبر کی نصیحتیں ان پر کارگر نہیں ہوئیں۔ اس منطقی گفتگو کا جو انھوں نے تلخ اور نازیبا جواب دیا وہ ہم اگلی آیات میں پڑھیں گے۔

Marfat.com

۱۸۵۔ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝
۱۸۶۔ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝
۱۸۷۔ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ۝
۱۸۸۔ قَالَ رَبِّيْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝
۱۸۹۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ
يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝
۱۹۰۔ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝
۱۹۱۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ

۱۸۵۔ انھوں نے کہا تو تو بس پاگل ہے۔
۱۸۶۔ (اس کے علاوہ) تو فقط ہم جیسا انسان ہے تیرے بارے میں ہمارا گمان صرف یہی ہے کہ تو جھوٹا ہے
۱۸۷۔ اگر تو سچا ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسا دے۔
۱۸۸۔ (شعیب نے) کہا: میرا پروردگار ان اعمال سے زیادہ آگاہ ہے جو تم انجام دیتے ہو۔
۱۸۹۔ آخر کار انھوں نے اسے جھٹلایا اور "سایہ دار بادل" کے دن نے انھیں آلیا اور وہ عظیم دن کا عذاب تھا۔
۱۹۰۔ اس واقعے میں آیت اور نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان نہیں لائے۔
۱۹۱۔ اور تیرا پروردگار عزیز و رحیم ہے۔

Marfat.com

تفسیر

اس سرکش قوم کا انجام

اس ظالم اور ستم گر قوم نے جب خود کو شعیب علیہ السلام کی منطقی باتوں کے مقابلے میں بے دلیل دیکھا تو اپنی برائیوں کو جاری ساری رکھنے کے لیے ان پر تہمتوں کی بوچھاڑ کردی۔

سب سے پہلے وہی پرانا لیبل جو مجرم اور ظالم لوگ ہمیشہ سے خدا کے انبیاء پر لگاتے رہے ہیں آپ پر بھی لگایا اور کہا:۔
"تو تو بس پاگل ہے" (قالوا انما انت من المسحرین)۔[1]

تیری گفتگو میں کوئی منطقی اور مدلل بات دکھائی نہیں دیتی۔ تیرا خیال ہے کہ ایسی باتیں کرکے تو ہمیں اپنے مال میں آزادیٔ عمل سے روک دے۔

اس کے علاوہ "تو بھی تو صرف ہماری طرح کا ایک انسان ہے" کیا تو سمجھتا ہے کہ ہم تیری اطاعت کریں گے۔ آخر تجھے ہم پر کون سی فضیلت اور برتری حاصل ہے (وما انت الا بشر مثلنا)۔

تیرے بارے میں ہمارا یہی خیال ہے کہ تو ایک جھوٹا شخص ہے (و ان نظنک لمن الکاذبین)۔

ان کی یہ گفتگو کیسی تضادات پر مبنی ہے کبھی تو انھیں ایسا جھوٹا اور مفاد پرست انسان کہتے تھے جو دعوائے نبوت کی وجہ سے ان پر فوقیت حاصل کرنا چاہتا ہے اور کبھی انھیں مجنون کہتے تھے۔ ان کی آخری بات یہ تھی کہ بہت اچھا "اگر تو سچا ہے تو ہمارے سر پر آسمان سے پتھر برسا اور ہمیں اسی مصیبت میں مبتلا کر دے جس کی ہمیں دھمکی دے رہا ہے تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ ہم ایسی دھمکیوں سے نہیں ڈرتے (فاسقط علینا کسفا من السماء ان کنت من الصادقین)۔

"کسف" (بروزن پدر) "کسفہ" (بروزن "قطعہ") کی جمع ہے جس کا معنی ٹکڑا ہے اور آسمانی ٹکڑوں سے مراد پتھروں کے ٹکڑے ہیں جو آسمان سے برستے ہیں۔

یہ الفاظ کہہ کر انھوں نے اپنی ڈھٹائی اور بے حیائی کی انتہا کردی اور اپنے کفر و تکذیب کا بدترین مظاہرہ کیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے ان ناموزوں الفاظ، قبیح اور نازیبا کلمات اور عذاب الٰہی کے تقاضے کے جواب میں صرف ایک ہی جملہ کہا اور یہ کہا کہ میرا پروردگار ان اعمال سے زیادہ آگاہ ہے جو تم انجام دیتے ہو۔ (قال ربی اعلم بما تعملون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو وہ مجھ سے متعلق نہیں ہے آسمان سے پتھروں کا برسنا ہو یا کوئی دوسرا عذاب، میرے بس کی بات نہیں اور نہ ہی یہ اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہی تمھارے اعمال کو جانتا اور

---

[1] جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں "مسحر" اس شخص کو کہتے ہیں کہ جس پر کئی مرتبہ سحر کیا جائے اور جادوگر اس کی عقل کو بے کار کر دیں۔

Marfat.com

تمھارے استحقاق کے معیار سے باخبر ہے جب اس نے تمھیں سزا کا مستحق دیکھا اور وعظ ونصیحت نے بھی تم پر کوئی اثر نہ کیا اور کافی حد تک اتمام حجت بھی ہوگئی تو تم پر عذاب نازل کر کے تمھارا ستیاناس کر دے گا۔

یہ جملہ اور انبیاء کی داستانوں میں اس جیسی دوسری تعبیریں، واضح کرتی ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السّلام ہر چیز کو خدا کے حکم اور امر کے تابع سمجھتے ہیں اور انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ اپنی طرف سے کچھ کر سکتے ہیں۔

لیکن جوں توں کر کے آخر وہ وقت بھی آپہنچا کہ روئے زمین کو ایسے مجرمین کے وجود سے پاک کیا جائے چنانچہ قرآن مجید بعد والی آیت میں کہتا ہے: انھوں نے شعیب کو جھٹلایا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ "سایہ ڈالنے والے بادل" کے دن عذاب نے ان کو آلیا (فکذبوہ فاخذھم عذاب یوم الظلة)۔

اور "یہ عذاب، بڑے دن کا عذاب تھا" (انہ کان عذاب یوم عظیم)۔

"ظلہ" بادل کے اس ٹکڑے کو کہتے ہیں جو سایہ کر دیتا ہے بہت سے مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ مسلسل سات دن تک ان پر گرم ہوا چلتی رہی اس دوران میں بادِنسیم کا ایک بھی جھونکا نہیں آیا۔ اسی اثنا میں آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نمایاں ہوا اور بادِنسیم بھی چلنے لگی وہ لوگ فوراً اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور سخت تکلیف کی وجہ سے جب بادل کے سایے تلے آگئے تو سکھ کا سانس لیا۔

لیکن اچانک بادلوں سے بجلی کی ایک ایسی کڑک سنائی دی جس سے ان کے کان پھٹ گئے اس کے فوراً بعد ان پر آگ برسنے لگی اور زمین میں بھونچال آگیا جس سے وہ سب ہلاک اور برباد ہوگئے۔

ہم جانتے ہیں کہ بادلوں اور زمین کے درمیان طاقت ور الیکٹریسٹی کے باہمی تبادلے کے نتیجے میں "صاعقہ" پیدا ہوتی ہے اس کی آواز بہت وحشت ناک ہوتی ہے اور اس کا شعلہ بھی بہت بڑا ہوتا ہے جہاں یہ بجلی گرے وہاں بعض اوقات زلزلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے قوم شعیب کے عذاب کے بارے میں قرآن مجید کی مختلف سورتوں میں جو مختلف الفاظ آئے ہیں وہ دراصل ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۹۱ میں "رجفة" (زلزلہ) سورۂ ہود کی آیت ۹۴ میں "صیحة" (زبردست آواز) اور زیرِ گفتگو آیت میں "عذاب یوم الظلة" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

ہر چند کہ قرطبی اور فخر رازی جیسے مفسرین نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ اصحاب ایکہ اور اصحاب مدین دو مختلف قومیں تھیں اور دونوں کے لیے علیحدہ علیحدہ عذاب نازل ہوا، لیکن متعلقہ آیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احتمال زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

اس داستان کے آخر میں بھی انھی الفاظ کو دہرایا گیا ہے جو چھ بزرگ انبیاء کی گزشتہ داستانوں میں آئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے: سرزمین ایکہ کے لوگوں کی داستان، ان کے مہربان نبی شعیب کی محبت بھری تبلیغ، ان لوگوں کی طرف سے ڈھٹائی، سرکشی اور تکذیب اور انجام کار اس ظالم قوم کی گرجدار بجلی سے تباہی اور بربادی میں عبرت کی نشانی اور درس موجود ہے (ان فی ذٰلک لاٰیة)۔

لیکن ان میں سے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے (وما کان اکثرھم مؤمنین)۔

Marfat.com

اس کے باوجود خداوند رحیم و مہربان نے انھیں کافی مہلت دی تاکہ وہ سمجھ جائیں اور اپنی اصلاح کرلیں لیکن جب وہ عذاب کے مستحق ہوگئے تو اس نے بھی اپنی قہاری قدرت کی شان دکھلائی اور ان پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، یقیناً تیرا پروردگار ناقابلِ تسخیر اور رحیم ہے (وان ربک لھو العزیز الرحیم)۔

چند اہم نکات

۱۔ **انبیاء کی دعوت میں مکمل ہم آہنگی:** ۔ ان سات عظیم انبیاء کے واقعات کہ جو درحقیقت تربیتی دروس کے سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں کے آخر میں اس نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے کہ انھی انبیاء کی داستانیں قرآن مجید کی اور سورتوں میں بھی بیان ہوئی ہیں لیکن اس انداز سے بیان نہیں ہوئیں جیسا کہ اس سورت میں کہ جن کا آغاز بھی ایک جیسا اور انجام بھی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو۔

ان داستانوں کے پانچ حصوں میں ان کی دعوت کا موضوع تقویٰ ہے پھر ان کی امانت کا بیان ہے اور کسی قسم کی اجرت طلب نہ کرنے کا ذکر ہے۔

پھر اس دور میں پائی جانے والی لغزشوں اور غلطیوں پر دوستانہ طریقے سے تنقید کی گئی ہے۔

پھر ان گمراہ لوگوں کے بُرے ردِ عمل اور نہایت ہی بھونڈے طریقے کا ذکر ہے آخر کار موقع کی مناسبت سے نازل ہونے والے دردناک عذاب کا بیان ہے۔

ان ساتوں داستانوں میں سے ہر ایک کے آخر میں اسے آیت اور عبرت کی نشانی بتایا گیا ہے اور ان گمراہ قوموں کی اکثریت کے ایمان نہ لانے کا تذکرہ ہے۔

اور پھر ان سب کے آخر میں خدا کی "قدرت" اور "رحمت" کا ذکر ہے۔

یہ ہم آہنگی سب سے پہلے اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی دعوت میں "توحید" کی جھلک پائی جاتی ہے کہ ان سب کا "واحد" پروگرام تھا اور جس کا آغاز اور انجام ہم آہنگ ہے۔ سب انبیاء انسان سازی کی کلاسوں کے معلّم تھے ہرچند کہ مرورِ زمان کے ساتھ اور انسانی معاشرے کی پیش رفت کی بناء پر ان کلاسوں کے مضامین تبدیل ہوتے رہے لیکن ان سب کے اصول، بنیادیں اور نتائج ایک جیسے تھے اور پھر یہ بھی کہ یہ داستانیں اسلام اور اوائل کے چند گنے چُنے مومنین کے دلوں کے لیے ڈھارس اور تسلی کا کام بھی دیتی ہیں بلکہ ہر دَور کے مومنین کے لیے موجب تسلّی ہیں کہ وہ مخالفین کی کثرت اور گمراہ قوم کی اکثریت سے ہرگز نہ گھبرائیں اور اپنے کام کے نتائج کی سو فیصد اُمید رکھیں۔

نیز ہر دور اور ہر عصر کے ظالم اور ستمگر اور گمراہ لوگوں کے لیے ایک زبردست تنبیہ بھی ہیں کہ وہ سزائے الٰہی کو کسی بھی لمحے اپنے سے دُور تصور نہ کریں کیونکہ ان پر زلزلوں، بجلیوں، ہولناک طوفانوں، آتش فشاں پہاڑوں، زمین کے پھٹنے کی صورتوں اور سیلاب اور بارشوں جیسے عذاب بھی نازل ہوسکتے ہیں اور آج کا انسان بھی ایسے عذاب کے سامنے اسی طرح بے بس ہے جس طرح گزشتہ زمانے کے لوگ۔ کیونکہ موجودہ دَور کا انسان اپنی تمام صنعتی اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود اس طرح کے عذابوں کے سامنے عاجز اور بے بس ہے۔

قرآن مجید کا ان تمام داستانوں کے بیان کرنے کا مقصد صرف اور صرف یہی ہے کہ انسان رشد اور ارتقاء کے مراحل طے کرے،

Marfat.com

اپنے قلب و روح میں نور اور روشنی پیدا کرے ، اپنی سرکش خواہشات کو کنٹرول کرے اور ظلم و ستم اور ہر قسم کی لغزشوں کا مقابلہ کرے ۔

۲۔ سب کی دعوت کا آغاز تقویٰ سے :۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان انبیاء علیہم السلام کی انہی داستانوں کے اہم حصے سورۂ ہود اور سورۂ اعراف میں بھی آچکے ہیں لیکن ان کا آغاز عموماً خدا کی توحید اور یگانگت سے ہوا ہے مثلاً اس جملے سے " یاقوم اعبدوا الله مالکم من الٰه غیره " یعنی اے میری قوم خدا کی عبادت کرو کیونکہ اس کے علاوہ تمھارا کوئی معبود نہیں ہے ۔

لیکن جیسا کہ آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں اس سورہ میں " الا تتقون " کہہ کر دعوتِ تقویٰ سے آغاز کرتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ہر دو کا نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے کیونکہ جب تک کسی انسان میں تقویٰ کی کم از کم حدود یعنی حق طلبی اور حق جوئی نہ پائی جائیں ، اس وقت تک اس پر نہ توحید کی دعوت مؤثر ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی اور چیز۔ لہٰذا سورۂ بقرہ کے آغاز میں ہم پڑھتے ہیں ۔

ذٰلك الکتٰب لا ریب فیه هدی للمتقین

یہ وہ آسمانی کتاب ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے ۔

البتہ تقویٰ کے کئی مراتب ہوتے ہیں اور ہر مرتبہ ، دوسرے مرتبے کے لیے ایک بنیاد ہوتا ہے ۔

سورۂ شعراء اور سورۂ اعراف و سورۂ ہود کے مضامین میں ایک اور فرق یہ بھی نظر آتا ہے کہ اعراف اور ہود میں انبیاء کا بُت پرستی کے خلاف جہاد کا تذکرہ ہے اور دوسرے مسائل اس کے تحت ہیں ، لیکن یہاں فخر و غرور ، تکبّر و نخوت ، اسراف و ہوس ، جنسی بے راہروی ، لوٹ کھسوٹ ، کم فروشی اور دھوکے بازی جیسے اخلاقی اور سماجی جرائم کے خلاف زور دیا گیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے قرآن مجید میں ایسی داستانوں کے بار بار دہرانے کا بھی کوئی خاص مقصد ہوتا ہے اور ہر دفعہ کسی خاص مقصد کو بیان کیا گیا ہے ۔

۳۔ شرک سب برائیوں کی بنیاد ہے :۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ جن اقوام کا اس سورت کے مختلف مقامات پر ذکر ہوا وہ اصل توحید سے منحرف ہو کر شرک اور بت پرستی جیسی لعنت میں گرفتار ہو گئی تھیں اور یہ چیز ان سب کے درمیان ایک قدرِ مشترک تھی اس کے علاوہ وہ خاص اخلاقی اور سماجی برائیوں میں بھی مبتلا ہو گئی تھیں ۔ اور یہی چیز انھیں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہے :

کچھ قومیں غرور میں مبتلا تھیں (جیسے قوم ہود) ۔

کچھ قومیں فضول خرچ اور عیاش تھیں (جیسے صالح کی قوم) ۔

کچھ قومیں جنسی بے راہروی کا شکار تھیں (جیسے جناب لوط کی قوم) ۔

کچھ بہت مال پرست تھیں جس کے لیے وہ اپنے کاروبار میں دھوکا دہی کا مظاہرہ کرتی تھیں (جیسے شعیبؑ کی قوم) ۔

کچھ قوموں کو اپنی ثروت مندی کا گھمنڈ تھا (جیسے نوح علیہ السلام کی قوم) ۔

Marfat.com

لیکن انھیں جو عذاب دیا گیا وہ تقریباً ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا، چنانچہ:۔

کچھ تو بجلی کی کڑک اور زلزلے سے نابود ہوگئیں (جیسے شعیب، صالح، لوط اور ہود علیہم السلام کی قومیں)۔

کچھ طوفان اور سیلاب کے ذریعے صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں (جیسے نوح علیہ السلام کی قوم)۔

درحقیقت جو زمین ان کے عیش و آرام کا گہوارہ تھی وہ ایک دن ان کے لیے وبالِ جان بن گئی اور انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور جو ہوا اور پانی ان کی زندگی کے ضامن تھے ان کی موت پر عمل درآمد کرنے کے لیے تیار کیے گئے۔

کس قدر عجیب کیفیت ہے انسان کی کہ اس کی زندگی، موت کے منہ میں ہے اور موت زندگی کے سائے میں، اس کے باوجود بھی غافل اور مغرور ہے۔

Marfat.com

۱۹۲۔ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ؕ

۱۹۳۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۙ

۱۹۴۔ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۙ

۱۹۵۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ؕ

۱۹۶۔ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ

۱۹۷۔ اَوَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ؕ

ترجمہ

۱۹۲۔ اور یہ (قرآن) عالمین کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔

۱۹۳۔ روح الامین اسے لے کر نازل ہوا ہے۔

۱۹۴۔ تیرے (پاک) دل پر، تاکہ تو (لوگوں کو) ڈرائے۔

۱۹۵۔ اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا ہے۔

۱۹۶۔ اس کی تعریف تو گزشتہ لوگوں کی کتابوں میں بھی آچکی ہے۔

۱۹۷۔ کیا یہی نشانی ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔

تفسیر

گزشتہ کتابوں میں قرآن کی عظمت

گزشتہ انبیاء کی سات داستانوں کے بیان کرنے اور ان کی تاریخ میں پوشیدہ درس ہائے عبرت کا ذکر کرنے کے بعد قرآن مجید ایک بار پھر اسی گفتگو کی طرف لوٹ جاتا ہے جس سے اس سورت کا آغاز ہوا تھا یعنی قرآن مجید کی عظمت اور خدا کے کلام مبین کی حقانیت کی طرف، چنانچہ فرماتا ہے: یہ عالمین کے پروردگار کی جانب سے نازل ہوا ہے (وانه لتنزیل رب العالمین)۔

Marfat.com

اصولی طور پر گزشتہ انبیاء کی سرگزشت اور وہ بھی نہایت صحیح اور دقیق انداز میں کہ جس میں نہ تو کوئی خرافات ہے اور نہ ہی جھوٹے افسانے ہیں جبکہ وہ ماحول افسانوں اور قصّے کہانیوں کا تھا اور پھر ان صحیح واقعات اور داستانوں کو وہ شخص بیان فرما رہا ہے جس نے مطلقاً کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور یہ اعجاز قرآن کی ایک علامت ہے۔

اسی وجہ سے آگے چل کر ارشاد فرمایا گیا ہے: "اسے روح الامین خدا کی طرف سے لایا ہے" (نزل به الروح الامین)۔

اگر وحی کا وہ فرشتہ اور "پروردگار کا روح امین" اسے خداوند عالم کی طرف سے نہ لاتا تو یہ کلام اس قدر روشن، تابناک اور ہر قسم کے خرافات اور باطل قصّے کہانیوں سے قطعاً پاک نہ ہوتا۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں پر وحی کے فرشتے کی دو عنوانوں سے توصیف کی گئی ہے۔ ایک عنوان ہے "روح" اور دوسرے "امین"۔ روح جو حیات کا سرچشمہ ہوتی ہے اور "امانت" جو ہدایت اور رہبری کی شرط اوّلین شمار ہوتی ہے۔

جی ہاں اسی "روح الامین" نے قرآن مجید خداوند عالم کی طرف سے تیرے دل پہ اتارا ہے تاکہ تو لوگوں کو ڈرائے (علی قلبك لتکون من المنذرین)[1]

مقصد یہ ہے کہ تو لوگوں کو ڈرائے اور انھیں اس خطرناک انجام سے مطلع کرے جو توحید سے منحرف ہوجانے کی وجہ سے ان کے دامن گیر ہوگا۔ گزشتہ لوگوں کی تاریخ بیان کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ موجودہ لوگوں کا دل بہلایا جائے اور انھیں قصے کہانیوں میں ہی مشغول رکھا جائے بلکہ اصلی مقصد یہ ہے کہ ان کے اندر ذمّہ داری کا احساس پیدا کیا جائے اور انھیں بیدار کیا جائے۔ اصل مدعا یہ ہے کہ ان کی صحیح تربیّت کی جائے اور انھیں انسان بنایا جائے۔

تاکہ کسی شخص کے لیے کسی قسم کے عذر کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اسے واضح عربی زبان میں نازل کیا گیا ہے (بلسان عربی مبین)۔

قرآن مجید فصیح عربی میں نازل ہوا ہے اور ہر قسم کے ابہام سے بھی خالی ہے تاکہ ڈرانے اور بیدار کرنے کے لیے بہت واضح اور گویا ہو کیونکہ اس دور کے لوگ نہایت ہی بہانہ ساز اور ہٹ دھرم تھے۔

وہی عربی زبان جو دنیا کی کامل ترین زبان ہے اور دنیا کے مفید ترین اور غنی ترین ادبیات پر مشتمل ہے۔

اس نکتے کی جانب بھی توجہ ضروری ہے کہ لفظ "عربی" کا ایک معنیٰ خود فصاحت اور بلاغت بھی ہے البتہ کیفیّتِ زبان سے قطع نظر کرتے ہوئے ..... جیسا کہ راغب اصفہانی مفردات میں لکھتے ہیں:

والعربی، الفصیح البین من الکلام۔

عربی فصیح اور آشکارا گفتگو کو کہتے ہیں۔

---

[1] ظاہر ہے کہ یہاں پر "قلب" سے مراد پیغمبر اکرمؐ کی پاک و پاکیزہ روح ہی ہے نہ کہ گوشت کا وہ لوتھڑا جو گردش خون کا سبب ہوتا ہے یہاں پر یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے اپنی روح کے ساتھ قرآن مجید کو قبول فرمایا ہے اور اس عظیم آسمانی معجزے کا مرکز آپ کا قلب ہی ہے۔

Marfat.com

ابنِ منظور نے بھی "لسان العرب" میں یہی معنی لکھا ہے :۔

تو اس صورت میں یہ مقصد نہیں ہوگا کہ عربی زبان پر انحصار کیا گیا ہے بلکہ مدعا یہ ہوگا کہ قرآن مجید کی صراحت اور مفہوم کی وضاحت کو پیش نظر رکھا گیا ہے آئندہ آیات بھی اسی معنیٰ کی تائید کرتی ہیں اور سورۂ حٰم سجدہ کی آیت ۴۴ میں بھی آیا ہے۔

ولو جعلناه قرآنا اعجميا لقالوا لولا فصلت اٰياته

اگر ہم اس قرآن کو گونگا اور مبہم نازل کرتے تو وہ لوگ کہتے کہ اس قرآن کی آیات روشن اور واضح کیوں نہیں بیان کی گئیں ؟

یہاں پر اعجمی کا معنی غیر فصیح کلام ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید کی حقانیت کے دلائل میں سے ایک اور دلیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس کتاب کی توصیف گزشتہ لوگوں کی کتابوں میں بھی بیان کی جا چکی ہے اور انھوں نے آئندہ زمانے میں اس کے ظہور کی خوشخبری دی ہے (وانه لفی زبر الاولین)۔[۱]

خصوصاً جناب موسیٰ علیہ السلام کی تورات میں اس پیغمبر اور اس آسمانی کتاب کے اوصاف کی طرف اشارہ موجود تھا اور علماء بنی اسرائیل ان اوصاف سے بخوبی واقف تھے یہاں تک کہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اوس" اور "خزرج" کے دو قبیلوں کا پیغمبر اسلامؐ پر ایمان لانے کا سبب بھی وہ پیش گوئیاں تھیں جو بنی اسرائیل کے علماء اس پیغمبر کے ظہور اور اس آسمانی کتاب کے نزول کے بارے میں کیا کرتے تھے۔

اس لیے قرآن مجید فرماتا ہے: آیا یہی نشانی ان کے لیے کافی نہیں ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء اس سے بخوبی آگاہ ہیں۔ (اولم یکن لهم اٰیة ان یعلمه علماء بنی اسرآءیل)۔

ظاہر سی بات ہے کہ جس ماحول میں بنی اسرائیل کے اس قدر علماء موجود تھے اور مشرکین کے ساتھ مکمل طور پر ان کی نشست و برخاست تھی، یہ بات قطعاً ناممکن تھی کہ قرآن مجید اپنے بارے میں بغیر کسی ثبوت کے اتنی بڑی بات کہہ دے کیونکہ اس کی تردید میں ہر طرف سے شور و غوغا بلند ہو جاتا لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ نزول آیات کے موقع پر یہ مسئلہ اس قدر واضح اور اظہر من الشمس تھا کہ کوئی بھی اس کا انکار نہ کر سکا۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۸۹ میں بھی ہے :۔

وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاءهم ما عرفوا کفروا به

وہ (یہودی) لوگ اس سے پہلے مشرکین کے ظلم وستم کے سامنے (پیغمبر اسلام کے ظہور کے ذریعہ) فتح و کامرانی کی آرزو کیا کرتے تھے لیکن جب وہی کتاب اور پیغمبر جنھیں وہ پہلے سے پہچانتے تھے ان کے پاس آگئے تو وہ اس کے منکر ہو گئے۔

یہ سب کچھ قرآن کی صدقِ گفتار اور اس کی حقانیتِ دعوت کا روشن گواہ ہے

---

[۱] "زبر" زبور کی جمع ہے جو کتاب کے معنی میں ہے اور دراصل یہ "زبر" (بروزن "ابر") کے مادہ سے لیا گیا ہے جس کا معنی ہے "لکھنا"۔

Marfat.com

۱۹۸۔ وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰى بَعْضِ الْاَعْجَمِيْنَ ۝

۱۹۹۔ فَقَرَاَهٗ عَلَيْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ۝

۲۰۰۔ كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

۲۰۱۔ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝

۲۰۲۔ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

۲۰۳۔ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ ۝

ترجمہ

۱۹۸۔ اگر ہم اسے کسی عجمی (غیر عرب) پر نازل کرتے۔

۱۹۹۔ اور وہ اس کو ان کے سامنے پڑھتا تو وہ اس پر ایمان نہ لاتے۔

۲۰۰۔ (جی ہاں) ہم قرآن کو اسی طرح مجرموں کے دلوں میں سے گزارتے ہیں۔

۲۰۱۔ وہ لوگ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

۲۰۲۔ (عذاب الٰہی) اچانک ان کو آئے گا کہ انھیں اس کا خیال بھی نہیں ہو گا۔

۲۰۳۔ تو وہ اس وقت کہیں گے آیا ہمیں کچھ مہلت مل سکتی ہے؟

تفسیر

اگر قرآن کسی عجمی پر نازل ہوتا تو......؟

ان آیات میں سب سے پہلے کفار کے ایک اور احتمالی بہانے کی پیش بندی کی گئی ہے اور گزشتہ آیات میں قرآن مجید کے واضح عربی زبان میں ہونے کے بارے میں جو گفتگو تھی اس کی تکمیل کی گئی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اگر ہم اس قرآن کو کسی عجمی (غیر عرب اور غیر فصیح) پر نازل کرتے...... (ولو نزلناہ علی بعض الاعجمین)۔

Marfat.com

اور وہ ان آیات کو ان لوگوں کے سامنے پڑھتا تو وہ ہرگز ایمان نہ لاتے (فقرأہ علیھم ما کانوا بہ مؤمنین)۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں "عربی" کا لفظ کبھی تو ان لوگوں پر بولا جاتا ہے جو اہلِ عرب کی نسل سے ہوں اور کبھی یہ فصیح کلام کے معنی میں آتا ہے اسی طرح اس کا مقابل لفظ "عجمی" ہے اس کے بھی دو معنی ہیں ایک غیر عرب نسل اور دوسرے غیر فصیح کلام اور مندرجہ بالا آیت میں دونوں معانی کا احتمال ہے لیکن جو بات زیادہ قرینِ عقل معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں پر "غیر عرب نسل" کی طرف اشارہ ہے۔

یعنی عربوں کی نسل پرستی اور قومی تعصب اس قدر شدید ہے کہ اگر قرآن مجید کسی غیر عرب شخص پر نازل ہوتا تو ان کے تعصب کی موجیں انھیں اس کے قبول کرنے سے مانع ہوتیں حالانکہ موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ ایک حقیقی عرب خاندان کے شریف انسان پر فصیح و بلیغ بیان کے ساتھ نازل ہوا ہے اور کتب آسمانی میں بھی اس کے بارے میں بشارت آچکی ہے اور بنی اسرائیل کے علماء بھی اس کی گواہی دے چکے ہیں پھر بھی ان میں سے بہت سے لوگ ایمان نہیں لاتے اگر رسول میں یہ اوصاف ہرگز نہ ہوتے تو وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟

پھر تاکید مزید کے طور پر فرمایا گیا ہے: ہم قرآن مجید کو اسی طرح مجرموں کے دلوں میں سے گزارتے ہیں (کذٰلک سلکناہ فی قلوب المجرمین)۔

واضح بیان اور ایسے شخص کی زبان کے ذریعے جو انھی میں سے ہے اور وہ لوگ اس کے اخلاق اور طرزِ کلام سے بھی آشنا ہیں اور وہ ایسے مطالب پیش کرتا ہے کہ جن کی تائید سابقہ کتابوں میں بھی آچکی ہے۔ المختصر اس قرآن کو ان تمام اوصاف کے ساتھ جس کی قبولیت ہر ایک کے لیے آسان ہو اس گناہ گار قوم کی طرف بھیجا ہے لیکن یہ بیمار دل اسے قبول نہیں کرتے جس طرح صحیح و سالم اور مقوی غذا کو غیر سالم اور بیمار معدہ قبول نہیں کرتا اور اسے واپس پلٹا دیتا ہے۔

(توجہ رہے کہ "سلکناہ" "سلوک" کے مادہ سے ہے جس کا معنی "راستے سے گزرنا" ہے اور ایک راہ سے آنا اور دوسری راہ سے گزر جانا)۔

اسی لیے فرمایا گیا ہے: ایسی صورت میں یہ ہٹ دھرم لوگ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں (لا یؤمنون بہ حتّٰی یروا العذاب الالیم)۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں ایک اور احتمال کا ذکر کیا ہے اور وہ یہ کہ "کذٰلک سلکناہ فی قلوب المجرمین" سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اس عصبیت، ہٹ دھرمی اور قبول نہ کرنے کی عادت کو ان کے اپنے جرائم اور گناہوں کی وجہ سے ان کے دلوں میں اتار دیا۔

اس معنی کی رُو سے یہ آیت بعینہٖ "ختم اللہ علی قلوبھم" "یعنی خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی" کے مانند ہو جائے گی۔
لیکن پہلی تفسیر اوّل و آخر کی آیات سے زیادہ ہم آہنگ ہے لہٰذا بہت سے مفسرین نے اسے ہی اختیار کیا ہے[1]

---

[1] مندرجہ بالا چند آیات میں مفرد کی پانچ ضمیریں ان الفاظ میں ملتی ہیں "نزلناہ"، "قرأہ"، "وما کانوا بہ" (باقی اگلے صفحہ پر)

Marfat.com

ہاں ہاں! وہ اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک عذاب الٰہی ناگہانی طور پر ان کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے اور انھیں اس کا خیال بھی نہ ہو (فیأتیھم بغتۃ و ھم لا یشعرون)۔[۱]

اس میں شک نہیں کہ اس عذاب الٰہی سے مراد جو انھیں اچانک اپنی لپیٹ میں لے لے گا یہی دنیاوی عذاب، نیست و نابود کر دینے والی بلائیں ہیں جسے "استیصالی عذاب" کہتے ہیں۔

اسی لیے اس آیت کے بعد فرمایا گیا ہے: ایسی صورت میں وہ اپنی صحیح حالت کی طرف لوٹ آئیں گے، اپنے شرمناک ماضی پر پچھتائیں گے، اپنے خطرناک مستقبل سے سخت خوف کھائیں گے اور کہیں گے کیا ہمیں کچھ مہلت مل جائے گی، "تاکہ ہم ایمان لائیں اور اپنے برباد ماضی کو آباد کریں (فیقولوا ھل نحن منظرون)۔

چند ایک نکات

۱۔ قومی اور قبائلی تعصبات:

اس میں شک نہیں کہ انسان جس سرزمین، قوم یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اسی سے اس کو عشق کی حد تک محبت ہوتی ہے اور اس کا یہ جغرافیائی، قومی اور قبائلی تعلق نہ صرف معیوب ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کے لیے ایک مؤثر عامل بھی ہے لیکن اس تعلق کے لیے کوئی حد اور حساب ہے کہ اگر یہ اس سے بڑھ جائے تو یہ نقصان دہ ہے بلکہ ہولناک مصیبت کا سبب بھی بن جاتا ہے۔ لہٰذا جس قومی اور قبائلی تعصب کی مذمت کی گئی ہے وہ یہی حد سے بڑھ جانے والا تعلق ہوتا ہے۔

"تعصب" اور "عصبیت" دراصل "عصب" کے مادہ سے ہے اس کا معنی ہے وہ چربی جو اعضاء کے جوڑوں کو آپس میں مربوط رکھتی ہے۔ اسی مناسبت سے ہر قسم کے ارتباط اور باہمی وابستگی کو "تعصب" اور "عصبیت" کہنے لگے، لیکن عام طور پر یہ لفظ افراط اور مذموم مفہوم میں بولا جاتا ہے۔

تاریخی طور پر قوم، قبیلے، نسل اور وطن کا حد سے زیادہ دفاع بہت سی جنگوں کا سبب بنا ہے اور قبائلی اور نسلی آداب و رسوم کے نام پر بہت سی برائیاں ایک سے دوسری قوم کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

یہی دفاع اور حد سے بڑھ جانے والی طرفداری بسا اوقات اس حد تک جا پہنچتی ہے کہ انسان کی نگاہ میں اپنی قوم اور قبیلے کا بدترین انسان، بہترین انسان بن جاتا ہے اور دوسری قوم اور قبیلے کا بہترین شخص بھی بدترین شخص سمجھا جاتا ہے اور یہی آداب و رسوم کا

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) "سلکناہ" اور "لا یؤمنون بہ" پہلی تفسیر کے مطابق یہ سب کی سب قرآن کی طرف لوٹ رہی ہیں لیکن دوسری تفسیر کے مطابق بعض ضمیریں قرآن کی طرف اور بعض ہٹ دھرمی اور عدم قبولیت کی جانب پلٹ رہی ہیں لیکن جب تک قرینہ موجود نہ ہو ایسا کرنا مشکل ہے۔

حاشیہ صفحہ ھذا:- [۱] توجہ رہے کہ "فیأتیھم" کا جملہ منصوب ہے اور "حتی یروا" پر اس کا عطف پڑ رہا ہے لہٰذا اسی تناظر میں اس کا معنی بیان کرنا چاہیے۔

Marfat.com

بھی حال ہے گویا نسلی تعصب خود پرستی اور جہالت کا ایک پردہ ہوتا ہے جو انسان کی عقل و ادراک پر پڑ جاتا ہے جس سے وہ صحیح فیصلہ کرنے کی قوت کھو بیٹھتا ہے۔

بعض قوموں میں یہ تعصب زبردست حد تک پایا جاتا ہے جن میں سے وہ عرب بھی ہیں جو اپنے تعصب میں عالمی شہرت کے حامل ہیں اور ان کے بارے میں ہم ابھی آیات بالا میں بھی پڑھ چکے ہیں ان میں جاہلیت عرب کا تعصب اس حد تک پایا جاتا تھا کہ اگر قرآن مجید کسی غیر عرب پر نازل ہوتا تو وہ ہرگز اس پر ایمان نہ لاتے۔

روایات میں بھی تعصب کو اخلاق مذمومہ کی فہرست میں شمار کیا گیا ہے اور اس کی زبردست مذمت کی گئی ہے حتیٰ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

من کان فی قلبه حبة من خردل من عصبية بعثه الله يوم القيامة مع اعراب الجاهلية

جس شخص کے دل میں رائی برابر بھی تعصب ہوگا خداوند عالم اسے قیامت کے دن زمانۂ جاہلیت کے اعراب کے ساتھ محشور فرمائے گا[1]

ایک اور حدیث میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام فرماتے ہیں:۔

من تعصب او تعصب له فقد خلع ربقة الايمان من عنقه

جس شخص نے تعصب برتا یا جس کے لیے تعصب برتا گیا اس نے ایمان کے حلقے کو اپنی گردن سے اتار پھینکا[2]

روایات ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ "ابلیس پہلا وہ شخص ہے جس نے تعصب کا مظاہرہ کیا۔

جیسا کہ نہج البلاغہ میں ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام نے تعصب کے سلسلے میں ایک نہایت ہی جامع و مانع اور مدلل گفتگو فرمائی ہے جو کہ "خطبہ قاصعہ" میں موجود ہے ہم اس کا ایک حصہ ذیل میں درج کرتے ہیں، امام فرماتے ہیں:۔

اما ابليس فتعصب على آدم لاصله وطعن عليه فى خلقته، فقال انا نارى وانت طينى

ابلیس نے اپنی تخلیق کے بل بوتے پر آدمؑ کے ساتھ تعصب برتا اور آدم کی تخلیق پر طعن و تشنیع کرتے ہوئے کہا کہ میں آگ سے ہوں اور تو مٹی سے۔

پھر آگے چل کر امامؑ فرماتے ہیں:۔

فان کان لا بد من العصبية فليكن تعصبكم لمكارم الخصال و محامد الافعال ومحاسن الامور

---

[1]، [2] اصول کافی جلد ۲ ص ۲۲۲ (باب العصبیہ)۔

Marfat.com

اگر تعصب کے بغیر چارہ نہیں ہے تو پھر تمھارا یہ تعصب پسندیدہ اخلاق، نیک افعال اور اچھے کاموں کے لیے ہونا چاہیے[1]

ضمنی طور پر اس حدیث سے بھی بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک پسندیدہ اور مستحسن واقعیت پر ڈٹ جانا نہ صرف قابلِ مذمت نہیں بلکہ انسان کے جاہلیت کے غلط رسم ورواج اور ربط وضبط کی وجہ سے پیدا ہونے والے روحانی خلا کو بھی پُر کر سکتا ہے۔

اسی لیے تو حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے جب "تعصب" کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:۔

العصبية التي يأثم عليها صاحبها ان يرى الرجل شرار قومه خيرًا من خيار قوم اخرين. وليس من العصبية ان يحب الرجل قومه. ولكن من العصبية ان يعين قومه على الظلم

جس تعصب کی وجہ سے انسان گناہ گار ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی قوم کے بُرے لوگوں کو دوسری قوموں کے اچھے افراد سے بہتر سمجھا جائے اگر کوئی شخص اپنی قوم اور قبیلے سے محبت رکھتا ہے تو یہ تعصب نہیں ہوگا بلکہ عصبیت تو اس بات میں ہے کہ انسان اپنے قبیلے اور قوم کی ظلم وستم میں امداد کرے[2]

آیات اور روایات میں عصبیت کو "حمیت" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے یا اسے "حمیۃ جاہلیہ" کا نام دیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں کرنے کی بہت سی باتیں ہیں لیکن اپنی گفتگو کو دو حدیثوں کے بیان پر ختم کرتے ہیں:۔

امیرالمومنین علی علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

ان الله عزوجل يعذب ستة بست، العرب بالعصبية، والدهاقنة بالكبر، والامراء بالجور، والفقهاء بالحسد، والتجار بالخيانة، واهل الرستاق بالجهل

خداوند عالم چھ طرح کے لوگوں کو چھ طرح کی صفات کی وجہ سے معذّب کرے گا عربوں کو ان کے تعصب کی بنا پر، جاگیرداروں (اور صاحبان ثروت) کو ان کے تکبّر کی وجہ سے، حکمرانوں کو ان کے ظلم وجور کی وجہ سے، فقہاء کو ان کے حسد کی بنا پر، تاجروں کو خیانت کی وجہ سے اور دیہاتیوں کو ان کی جہالت کی بنا پر[3]

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز چھ چیزوں سے پناہ مانگا کرتے تھے:

كان رسول الله (ص) يتعوذ في كل يوم من ست من الشك والشرك والحمية والغضب والبغي والحسد[4]

---

[1] نہج البلاغہ، خطبہ قاصعہ نمبر ۱۹۲۔

[2] اصول کافی (باب العصبیہ) جلد ۲ ص ۲۲۳۔　[3]، [4] بحار، ج ۷۳، ص ۲۸۹

Marfat.com

شک، شرک، حمیّت (تعصّب)، غضب، ظلم اور حسد سے[1]

۲۔ **دنیا کی طرف لوٹ جانے کی درخواست :۔** مرنے کے فوراً ہی بعد گناہ گار اور مجرم لوگوں کی آہ وحسرت کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ اور ان کے اندر دنیا کی طرف پلٹ جانے کی امنگ پیدا ہوجاتی ہے اور پھر بے فائدہ آہ و فریاد اور ناقابلِ قبول دعائیں شروع ہوجاتی ہیں۔

آیاتِ قرآنی میں اس کے بہت سے نمونے موجود ہیں جن میں سے ایک سادہ ترین نمونہ انھی آیات میں موجود ہے جن کی ہم تفسیر بیان کررہے ہیں یعنی :۔

"ھل نحن منظرون" یعنی آیا ہمیں مہلت ملے گی ؟

سورۂ انعام کی آیت ۲۷ میں ہم پڑھتے ہیں :

یالیتنا نرد ولا نکذب بآیات ربنا

اے کاش ہم واپس لوٹ جاتے اور اپنے رب کی آیات کی تکذیب نہ کرتے۔

سورۂ احزاب کی آیت ۶۶ میں آیا ہے :

یا لیتنا اطعنا اللہ و اطعنا الرسولا

اے کاش ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کی ہوتی۔

سورۂ مومنون کی آیات ۹۹ تا ۱۰۰ میں آیا ہے :

حتّٰی اذا جاء احدھم الموت قال رب ارجعون لعلی اعمل صالحًا فیما ترکت۔

مجرم لوگوں کی یہ کیفیت برقرار رہے گی یہاں تک کہ ان میں سے ایک کے پاس موت آجائے گی تو وہ کہے گا خداوندا! مجھے واپس پلٹا دے تاکہ میں اپنے گزشتہ تاریک اعمال کی تلافی کرکے اعمالِ صالحہ انجام دوں۔

یہی صورتِ حال رہے گی یہاں تک کہ گناہ گار لوگ آتشِ جہنم کے کنارے لاکھڑے کیے جائیں گے تو وہاں پر بھی وہ اپنی یہی بات دہرائیں گے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام آیہ ۲۷ :

ولو ترٰی اذ وقفوا علی النار فقالوا یالیتنا نرد و لا نکذب بآیات ربنا ونکون من المؤمنین

اگر آپ مجرموں کو اس وقت دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آتشِ جہنم کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے اور کہیں گے اے کاش! ہم پلٹ جاتے اور اپنے پروردگار کی آیات کو نہ جھٹلاتے اور مومنین سے ہوتے۔

---

[1] بحار الانوار جلد ۲، ص ۲۸۹۔

Marfat.com

لیکن ظاہر ہے کہ امرِ الٰہی میں ایسی بازگشت ممکن نہیں ہے کیونکہ اگر ناپختہ میوہ اپنے درخت کی طرف واپس جاکر پک سکتا ہے اور ناقص پیدا ہونے والا بچہ رحم مادر کی طرف واپس پلٹایا جاسکتا ہے تو ایسی بازگشت بھی ممکن ہوسکتی ہے لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوا لہٰذا مجرم ٹولہ بھی واپس نہیں پلٹایا جائے گا۔

لہٰذا اس افسوس کے تدارک کا بہترین راستہ یہی ہے کہ یہیں پر رہ کر عملِ صالح انجام دیئے جائیں اور گناہوں سے توبہ کی جائے کیونکہ ابھی فرصت باقی ہے ورگرنہ باقی سب بے فائدہ ہے۔

۲۔ عجم کی ایک فضیلت:۔ اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ایک فرمان ہے جسے علی بن ابراہیم نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے:

لو نزل القرآن علی العجم ما اٰمنت به العرب. و قد نزل علی العرب فاٰمنت به العجم، فهذه فضیلة العجم.

اگر قرآن عجم پر نازل ہوتا تو عرب اس پر ایمان نہ لاتے لیکن عرب پر نازل ہوا ہے اور عجم اس پر ایمان لے آئے ہیں اور یہ عجمیوں کی ایک فضیلت ہے[1]

اس سلسلے میں تفسیر نمونہ کی چوتھی جلد (سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ کے ذیل) میں بھی کچھ ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۶۵۔

Marfat.com

۲۰۴۔ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ○
۲۰۵۔ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ○
۲۰۶۔ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ○
۲۰۷۔ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ ○
۲۰۸۔ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ○
۲۰۹۔ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ○
۲۱۰۔ وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ○
۲۱۱۔ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ○
۲۱۲۔ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ○

ترجمہ

۲۰۴۔ آیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں ؟
۲۰۵۔ اگر ہم انھیں سالہا سال بھی اس زندگی سے بہرہ مند کر دیں ......
۲۰۶۔ پھر وہ عذاب ان کے پاس آپہنچے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے۔
۲۰۷۔ تو دنیا سے اس قدر فائدہ اٹھانا ان کے لیے سُود مند نہیں ہو گا۔
۲۰۸۔ ہم نے کسی بھی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اسے خبردار کرنے والے موجود تھے۔
۲۰۹۔ تاکہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں اور ہم ہرگز ظالم نہیں ہیں۔
۲۱۰۔ یہ آیتیں شیطانوں اور جنوں نے نازل نہیں کیں۔
۲۱۱۔ یہ چیز ان کے لائق بھی نہیں اور نہ یہ کام ان کے بس میں ہے۔
۲۱۲۔ وہ تو (ان آسمانی خبروں کے) سننے سے دور رکھے گئے ہیں۔

Marfat.com

تفسیر

قرآن پاک پر ایک اور تہمت

چونکہ گزشتہ آیات اس جملے پر ختم ہو گئی تھیں جب مجرم اور گناہ گار لوگ عذابِ الٰہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور موت کی وادی میں اتر چکے ہوں گے تو دوبارہ پلٹ جانے کی درخواست کریں گے تاکہ اپنے گناہوں کی تلافی کر سکیں تو موجودہ آیات انھیں دو طرح سے جواب دے رہی ہیں۔

پہلا یہ کہ آیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی کرتے ہیں (افبعذابنا یستعجلون)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم کئی مرتبہ طنزیہ اپنے پیغمبر سے اس عذاب کے جلد آنے کا تقاضا کیا کرتے تھے جس کے متعلق وہ تمھیں پیش گوئی کر چکے تھے لیکن اب جبکہ تم اسی عذاب میں پھنس چکے ہو تو اس سے مہلت اور چھٹکارے کی درخواست کر رہے ہو تاکہ اس طرح سے تم اپنے ماضی کی تلافی کر سکو؛ ایک دن تم اس چیز کو مذاق سمجھتے تھے لیکن آج اسے ہر حقیقت سے بالاتر حقیقت دیکھ رہے ہو۔

بہر صورت بات خواہ کچھ بھی ہو پروردگار عالم کا طریقہ کار یہی ہے کہ جب تک مہلت نہ دے اور اتمام حجت نہ کرلے کسی قوم کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا لیکن جب اتمام حجت ہو جائے اور کہنے کے لائق باتیں کہی جا چکی ہوں اور کافی حد تک لوگوں کو مہلت مل جائے اور پھر بھی وہ راہِ راست پر نہ آئیں تو پھر اللہ انھیں ایسے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے کہ جس سے چھٹکارا ناممکن ہوتا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ: اگر ہم انھیں اور بھی کئی سال اس دنیاوی زندگی سے بہرہ مند کر دیں ...... (افرأیت ان متعناهم سنین)۔

پھر جس عذاب کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا ان کے دامن گیر ہو گا ..... (ثم جآءهم ما کانوا یوعدون)۔

یہ سامانِ حیات انھیں کوئی بھی فائدہ نہیں پہنچائے گا (ما اغنٰی عنهم ما کانوا یمتعون)۔

بالفرض اگر انھیں مہلت دے بھی دی جائے ——— جبکہ اتمام حجت کے بعد کوئی مہلت نہیں دی جائے گی ——— اور بالفرض کئی اور سال بھی وہ یہیں پر رہ جائیں اور غرور و غفلت میں مگن رہیں تو کیا اس دنیاوی زندگی میں بیشتر مادی مفادات کے علاوہ اور کوئی کام کریں گے؟ کیا وہ اپنے گزشتہ دور کی تلافی کریں گے؟ یقیناً نہیں اور بالکل نہیں! پھر جب عذاب نازل ہو تو کیا یہ چیزیں اس وقت ان کی کوئی مشکل حل کر سکیں گی؟ یا ان کے انجام میں کوئی تبدیلی پیدا کر دیں گی؟

زیر بحث آیات کی تفسیر میں یہ احتمال بھی ہے کہ وہ لوگ دنیا کی طرف دوبارہ واپس جانے کی درخواست اس لیے نہیں کریں گے کہ وہ حق کی طرف لوٹ آئیں گے یا اپنے گناہوں کی تلافی کریں گے بلکہ ان کی درخواست اس لیے ہوگی کہ وہ دنیا میں جا کر اس جہان کی ناپائیدار نعمتوں سے بہرہ مند ہوں اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں لیکن یہ بات بھی انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی اور جلد یا بدیر وہ اس فانی دنیا سے عالم بقا کو کوچ ضرور کریں گے اور اپنے اعمال کے نتائج ضرور بھگتیں گے۔

Marfat.com

یہاں پر ایک یا کئی سوال پیدا ہوتے ہیں بعد والی آیات جن کا جواب دیتی ہیں اور وہ یہ کہ : اصولی طور پر جب خداوند عالم کو ہر قوم کے مستقبل کا علم ہے تو پھر مہلت دینے کی کیا ضرورت ہے ؟

اور یہ بھی کہ جب گزشتہ امتوں نے پے در پے اپنے انبیاء کو جھٹلایا اور جیسا کہ ان میں سے بہت سے انبیاء کی داستان کے آخر میں " وما کان اکثرھم مؤمنین " آیا ہے یعنی ان میں سے اکثریت ایمان نہیں لاتی رہی تو پھر انبیاء کے پے در پے بھیجنے کا کیا ہی مقصد تھا کہ وہ آئیں اور لوگوں کو ڈرائیں اور تبلیغ کریں ؟

انھی سوالات کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ یہ خدائی طریقۂ کار ہے کہ ہم کسی بستی کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتے جب تک ان کی طرف خبردار کرنے والے نہ بھیجیں اور انبیاء وعظ و نصیحت کے لیے اور اتمام حجت کے لیے بھیجے جاتے ہیں (وما اھلکنا من قریۃ الا لھا منذرون)۔

تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور بیدار ہوجائیں اور ان کے لیے حق کی طرف پلٹ آنے کا موقع موجود ہو (ذکریٰ)[۱]

اور اگر ہم اپنے رسولوں کے ذریعے لوگوں کو نہ ڈراتے اور اتمام حجت کیے بغیر انھیں عذاب میں مبتلا کردیتے تو یہ ظلم ہوتا حالانکہ ہم ہرگز ظالم و ستم گار نہیں ہیں بلکہ اصولی طور پر ظلم و ستم ہمارے شایان شان ہی نہیں ہے (وما کنا ظالمین) ۔

یہ ظلم ہوگا کہ ہم غیر ظالم لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں یا ظالموں کو کافی حد تک اتمام حجت کیے بغیر نیست و نابود کردیں ۔

جو کچھ ان آیات میں ذکر ہوا ہے درحقیقت وہ مشہور و معروف عقلی اصول ہے جسے " قاعدہ قبح عقاب بلا بیان " کہتے ہیں۔ اسی کی مانند سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۵ میں بھی آیا ہے :

وما کنا معذبین حتّٰی نبعث رسولا

ہم لوگوں کو اس وقت تک ہرگز عذاب نہیں دیتے جب تک ان میں کسی رسول کو نہ بھیج دیں جو انھیں حقائق بتائے ۔

یقیناً کافی حد تک حقائق بیان کیے بغیر سزا دینا قبیح اور ظلم ہے اور خداوند حکیم عادل ہرگز ایسا نہیں کرتا اور یہ وہی چیز ہے جسے علم اصول میں " اصل برائت " کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے یعنی جس حکم کے ثبوت کے لیے کافی حد تک دلیل موجود نہ ہو، اسی اصول کی بنا پر اس کی نفی ہوجاتی ہے (مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ سورۂ بنی اسرائیل کی ۱۵ ویں آیت کی تفسیر کا مطالعہ فرمائیں) ۔

پھر ایک اور بہانے یا دشمنان قرآن کی ایک اور ناجائز تہمت کا جواب دیا گیا ہے کیونکہ وہ کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا رابطہ کسی جن کے ساتھ ہے ۔ وہ انھیں یہ آیات تعلیم دیتا ہے جبکہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ تنزیل من رب العالمین ہے ۔

---

[۱] یہاں پر "ذکریٰ" کا کیا اعراب بنتا ہے؟ مفسرین نے چار احتمال کا ذکر کیا ہے پہلا یہ کہ ممکن ہے یہ کلمہ " منذرون " کا مفعول لہٗ ہو (مندرجہ بالا تفسیر بھی اسی بنیاد پر ہے) دوسرا یہ کہ " منذرون " کا " مفعول مطلق " ہو کیونکہ "انذار" اور "تذکر" قریب المعنی ہیں۔ تیسرا یہ کہ " منذرون " میں جو ضمیر ہے یہ کلمہ اس سے حال بن رہا ہے اور چوتھا یہ کہ (ھذہ) مبتدا محذوف کی خبر ہو یعنی " ھذہ ذکریٰ "۔

Marfat.com

یہاں پر ارشاد فرمایا گیا ہے: شیاطین اور جنات نے ان آیات کو نازل نہیں کیا ہے (و ماتنزلت به الشیاطین)۔
پھر دشمنوں کے اس بے بنیاد الزام کے جواب میں فرمایا گیا ہے: جنوں اور شیطانوں کے ہرگز لائق نہیں ہے کہ وہ اس جیسی کتاب نازل کریں (و ماینبغی لھم)۔
یعنی اس عظیم کتاب کے مضامین ایسے ہیں جن میں حق کا راستہ، پاکی، عدالت، تقویٰ اور ہر قسم کے شرک کی نفی موجود ہے۔ ان سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب شیطانی افکار اور الہامات سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی جبکہ شیطانوں کا کام شر و فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ یہ کتاب تو مجسم خیر اور فلاح و بہتری ہے۔ بنابریں صرف اس کے مضامین پر ہی اگر غور کیا جائے تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے پھر یہ کہ وہ ایسا کام کرنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے (و ما یستطیعون)۔
اگر ایسا کام کرنا ان کے بس میں ہوتا تو "کاہنوں" جیسے افراد جو نزولِ قرآن کے زمانے میں شیاطین سے قریبی رابطہ رکھتے تھے وہ اس جیسی کتاب تیار کر لیتے (یا کم از کم وہ مشرکین جن کا شیاطین کے ساتھ رابطہ مسلّم تھا) لیکن وہ سب کے سب عاجز آ گئے اور اپنے عجز سے ثابت کر دیا کہ یہ آیات ان کی طاقت سے باہر ہیں۔
اس کے علاوہ خود کاہنوں کو بھی اس بات کا اعتراف تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے بعد ان شیاطین کا رابطہ آسمانی خبروں سے منقطع ہو گیا ہے جن کے ساتھ ان کا تعلق تھا اور وہ (آسمانی خبریں) سننے سے معزول اور برطرف کر دیئے گئے ہیں (انھم عن السمع لمعزولون)۔
کئی قرآنی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے شیاطین آسمانوں میں چلے جایا کرتے تھے اور وہاں کی خبریں چرا لاتے تھے اور جو باتیں فرشتوں کے درمیان ہوا کرتی تھیں وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں کو بتا دیا کرتے تھے لیکن اسلام کے عظیم الشان پیغمبر کی ولادت باسعادت اور آپؐ کے ظہور کے ساتھ ہی باتیں چرانے کا یہ سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا اور خبریں دینے کا رابطہ بھی ختم ہو گیا ان باتوں کا تو مشرکین کو بھی علم تھا، بالفرض اگر مشرکین نہ بھی جانتے ہوں تو قرآن یقیناً اس کی خبر دیتا ہے[1]
اسی بنا پر مندرجہ بالا آیات میں قرآن مجید نے ایک دلیل کے عنوان سے اس کو بیان کیا ہے۔
اس طرح سے اس تہمت کا جواب تین طریقوں سے دیا گیا ہے:
۱۔ قرآنی مضامین شیطانی القا سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔
۲۔ شیاطین ایسا کام کر بھی نہیں سکتے۔
۳۔ شیطانوں کو آسمانی خبریں چرانے سے روک دیا گیا ہے۔

---

[1] شیاطین کو چوری چھپے باتیں سننے سے روک دینے کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے "سیرت ابن ہشام" جلد اول ص ۲۱۶ کے بعد کے اوراق ملاحظہ فرمائیں۔ ہم نے اس موضوع کی تفسیری تشریح اور شیاطین کے "شہاب ثاقب" کے ذریعے آسمانوں میں سے چوری چھپے باتیں سننے سے مار بھگائے جانے کو تفسیر نمونہ کی جلد ۱۱ میں سورۂ حجر آیت ۱۶ تا ۱۸ کے ذیل میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

Marfat.com

۲۱۳۔ فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِيۡنَ ۝

۲۱۴۔ وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۝

۲۱۵۔ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝

۲۱۶۔ فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝

۲۱۷۔ وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ۝

۲۱۸۔ الَّذِىۡ يَرٰىكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ۝

۲۱۹۔ وَتَقَلُّبَكَ فِى السّٰجِدِيۡنَ ۝

۲۲۰۔ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ۝

ترجمہ

۲۱۳۔ خدا کے ساتھ کسی اور کو معبود مت پکارو ورنہ عذاب پانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔

۲۱۴۔ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ۔

۲۱۵۔ اپنے بازوان مومنین کے لیے جھکا دو جو تمھاری پیروی کرتے ہیں۔

۲۱۶۔ اگر وہ تمھاری نافرمانی کریں تو کہہ دو کہ میں اس کام سے بیزار ہوں جو تم کرتے ہو۔

۲۱۷۔ اور خداوند عزیز و رحیم پر توکل کرو۔

۲۱۸۔ وہی جو تمھیں اس وقت دیکھتا ہے جب (عبادت کے لیے) کھڑے ہوتے ہو۔

۲۱۹۔ اور سجدہ گزاروں میں تمھاری نقل و حرکت کو دیکھتا ہے۔

۲۲۰۔ وہی خدا سننے اور جاننے والا ہے۔

Marfat.com

تفسیر

قریبی رشتہ داروں کو اسلام کی دعوت

خداوندِ عالم نے گزشتہ آیات میں اسلام اور قرآن کے بارے میں مشرکین کے موقف کو بیان کرنے کے بعد زیرِ نظر آیات میں اپنے پیغمبر کو ان مشرکین کے سامنے اپنی پالیسی واضح کر دینے کا حکم صادر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں پانچ امور کی نشاندہی کی گئی ہے۔

خداوندِ عالم سب سے پہلے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو توحید پر عقیدہ راسخ کرنے کی دعوت دیتا ہے کیونکہ توحید ہی تمام انبیاء کی دعوت کا بنیادی عنصر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: خدا کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو مت پکارو، ورنہ سزا پاؤ گے (فلا تدع مع اللہ الٰھاً اٰخر فتکون من المعذبین)۔

اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علمبردارِ توحید تھے اور آپ کے بارے میں اس عقیدے سے انحراف کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ سب سے پہلے آپ ہی کی ذات کو مخاطب کیا گیا ہے تاکہ دوسرے لوگ اپنا حساب خود کر لیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ دوسروں کی تربیت کا آغاز خودسازی سے کیا جائے۔

پھر اس سے بھی بڑھ کر ایک اور مرحلے کا حکم دیا گیا ہے: اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈراؤ اور شرک اور حکمِ الٰہی کی نافرمانی سے خوف دلاؤ (وانذر عشیرتک الاقربین)[1]

اس میں شک نہیں کہ کسی وسیع انقلابی پروگرام کو سب سے پہلے ایک محدود اور مختصر حلقوں سے شروع کیا جاتا ہے اور کیا ہی بہتر ہو کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی دعوت کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کریں کیونکہ ایک تو وہ آپ کے پاکیزہ ماضی کو دوسروں سے بہتر پہچانتے ہیں اور دوسرے قریبی رشتہ داری کی محبت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ یہی لوگ دوسروں سے زیادہ آپ کی باتوں کو سنیں اس لیے کہ قریبی رشتے دار عموماً دوسروں کی نسبت حسد، کینہ اور دشمنی سے دُور ہوتے ہیں۔

علاوہ ازیں اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کسی سے نہ تو سودے بازی کرتے ہیں اور نہ ہی دوغلی پالیسی اپناتے ہیں بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں تک کو توحید، حق اور عدالت کی دعوت سے مستثنیٰ نہیں فرماتے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو اسلام کے اس عظیم پیغمبر نے اس پر عمل درآمد کے لیے ایک منصوبہ بنایا جس کی تفصیل انشاء اللہ آپ نکات کے ذیل میں پڑھیں گے۔

تیسرے مرحلے میں دائرہ تبلیغ اور وسیع ہوتا ہے، حکم ہوتا ہے: جو مومنین تمھاری اتباع کرتے ہیں (ان کا محبت اور تواضع کے ساتھ

---

[1] "عشیرۃ" "عشرۃ" (دس کا عدد) سے مشتق ہے اور چونکہ دس کا عدد اپنی حد تک ایک مکمل عدد سمجھا جاتا ہے، اسی لیے قریبی رشتہ داروں کو "عشیرہ" کہا جاتا ہے کیونکہ ان کے ذریعے انسان کا ایک مکمل گروپ بنتا ہے۔ ممکن ہے کہ "معاشرت" کا مادہ بھی اسی معنی سے لیا گیا ہو کیونکہ معاشرت ہی سے انسانوں کا ایک کامل مجموعہ تشکیل پاتا ہے۔

Marfat.com

استقبال کرو اور اپنے بال و پران کے لیے جھکا دو (واخفض جناحك لمن اتبعك من المؤمنین)

یہ عمدہ تعبیر ایسی تواضع کے لیے کنایہ ہے کہ جس میں مہر و محبت اور نرمی پائی جائے جیسا کہ پرندے جب اپنے بچوں سے محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو اپنے بال و پر کھول کر نیچے نیچے جاتے اور اپنے بچوں کو ان کے اندر لے لیتے ہیں تا کہ ایک تو وہ درپیش احتمالی خطرے سے بچ جائیں دوسرے انتشار اور افتراق کا شکار نہ ہوں اسی طرح پیغمبر اسلامؐ کو بھی حکم ہے کہ وہ سچے مومنین کو اپنے پروں کے نیچے لے لیں۔

یہ معنی خیز تعبیر مومنین کے ساتھ محبت کے مختلف اہم پہلوؤں کو بیان کر رہی ہے جس میں اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو سب کچھ واضح ہو جاتا ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ ڈرانے اور خوف دلانے کے حکم کے فوراً بعد اس جملے کا ذکر اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ اگر تربیتی مسائل بیان کرنے کے لیے کہیں سختی سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے تو فوراً ہی مہر و محبت اور نرمی سے کام لینے کا امر بھی کر دیا گیا ہے تا کہ ان دونوں کو ملا کر مناسب نتیجہ اخذ کیا جا سکے۔

پھر چوتھا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے: "اگر وہ تمھاری دعوت قبول نہ کریں اور مخالفت پر کمر بستہ ہو جائیں تو تم گھبراؤ نہیں بلکہ ان سے کہہ دو کہ میں تمھارے طرز عمل سے بیزار ہوں"۔ اس طرح سے اپنا لائحہ عمل ان پر واضح کر دو (فان عصوك فقل انی بریء مما تعملون)۔

ظاہر یہ ہے کہ "عصوك" میں جو ضمیر ہے وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیکی رشتہ داروں کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی آپ کی دعوت الی الحق کے بعد بھی انھوں نے آپ کا حکم نہ مانا اور اپنی مخالفت کو جاری رکھا تو آپ بھی ان کے سامنے اپنی پوزیشن واضح کر دیں۔

قرآن کی یہ پیش گوئی بھی پوری ہو کر رہی۔ نکات کے ذیل میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔ چنانچہ علی علیہ السلام کے سوا سب لوگوں نے آنحضرتؐ کی یہ دعوت مسترد کر دی کچھ لوگوں نے تو خاموشی اختیار کر لی اور کچھ نے تمسخر اڑا کر اپنی مخالفت کا اظہار کیا۔

آخر کار مذکورہ منصوبوں کی تکمیل کے لیے اپنے پیغمبر کو اللہ تعالیٰ پانچواں حکم دیتا ہے:

اور خداوند عزیز و رحیم پر توکل کرو (وتوکل علی العزیز الرحیم)۔

اس طرح کی مخالفتوں سے قطعاً نہ گھبراؤ، دوستوں اور پیروکاروں کی قلت کی بنا پر اپنے آہنی عزائم پر کاربند رہو تم اکیلے نہیں ہو تمھاری پناہ گاہ ذات خداوند عالم ہے جسے کوئی شکست نہیں دے سکتا اور وہ بے حد رحیم و مہربان ہے۔

وہی خداوند جہاں جس کے عزیز و رحیم ہونے کی توصیف کی گئی ہے۔

وہی خدا جس نے اپنی عظیم قدرت سے فرعون اور اہل فرعون کے ظلم، نمرود اور اس کے حواریوں کے غرور، قوم نوح کے تکبر اور خود خواہی، قوم عاد کی دنیا پرستی اور قوم لوط کی ہوس پرستی کو خاک میں ملا دیا اور ان عظیم انبیاء اور مومنین کو نجات دلائی اور اپنی رحمت کاملہ میں شامل فرمایا جو اقلیت میں تھے۔

Marfat.com

وہی خدا جو تجھے حالتِ قیام میں بھی دیکھتا ہے (الذی یراك حین تقوم)۔
اور سجدہ گزاروں میں بھی تمھاری نقل و حرکت کو ملاحظہ کرتا ہے (و تقلبك فی الساجدین)۔
جی ہاں: وہی تو ہے سننے اور دیکھنے والا (انه هو السمیع العلیم)۔
اس طرح سے خداوندِ عالم کی عزیز اور رحیم کی صفات کے علاوہ تین اور صفات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے دلوں کو مزید تقویت ملتی ہے اور پہلے سے زیادہ ڈھارس بندھ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اللہ اپنے رسول کی تکالیف کو دیکھ رہا ہے اور ان کے قیام، سجدے اور حرکت اور سکون سے پوری طرح باخبر ہے۔
آپ کی آواز کو سنتا ہے۔
اور آپ کی ضروریات سے آگاہ ہے۔
اسی لیے ایسے خدا پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اپنے تمام کام اسی کے سپرد کر دینا چاہییں۔

چند ایک نکات

۱۔ "تَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ" کی تفسیر: "الذی یراك حین تقوم" و تقلبك فی الساجدین" سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے ان دو جملوں کی مختلف تفسیر کی ہے۔
آیات کا ظاہری مفہوم تو وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ: جب آپ قیام کرتے ہیں تب بھی آپ کو خداوندِ عالم دیکھتا ہے اور جب آپ سجدہ کرنے والوں میں نقل و حرکت کرتے ہیں تب بھی وہ آپ کو دیکھتا ہے۔
ممکن ہے قیام نماز کے لیے ہو یا عبادت کے واسطے نیند سے بیدار ہونا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ کا یہ قیام "فرادیٰ نماز" کے لیے ہو جبکہ ممکن ہے "تقلبك فی الساجدین" نماز باجماعت کی طرف اشارہ ہو۔
یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ سب قیام مراد ہوں۔
"تقلب" کا معنی چلنا پھرنا، حرکت کرنا اور ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہونا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تعبیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس سجدے کی طرف اشارہ ہو جو آپ دوسرے نمازیوں کے ساتھ بجا لاتے تھے۔
یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے اس چلنے پھرنے کی طرف اشارہ ہو جب آپ اپنے نمازی ساتھیوں کا حال معلوم کرنے کے لیے ان کی عبادت کی حالت میں چلتے پھرتے تھے۔
بہر صورت مجموعی طور پر یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کے حالات میں سے کوئی حالت اور آپ کی کوششوں میں سے کوئی کوشش خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی جس سے آپ لوگوں کے حالات سدھارتے اور دینِ حق کی نشر و اشاعت فرماتے ہیں، سب سے خداوندِ عالم آگاہ ہے (توجہ رہے کہ اس آیت میں آنے والے سب افعال کا تعلق مضارع سے ہے جو حال اور مستقبل کا معنی دیتے ہیں)۔
لیکن یہاں پر دو اور تفسیریں بھی ہیں جو آیت کے ظاہر سے تو ہم آہنگ نہیں ہیں لیکن ہو سکتا ہے کہ اس کی باطنی تفسیریں ہوں۔

Marfat.com

پہلی یہ کہ نمازیوں پر آنحضرتؐ کی نگاہیں جو کہ پس پشت سے ان پر پڑتی تھیں اس طرح تھیں کہ جس طرح آپ سامنے کی چیزوں کو دیکھ سکتے تھے پس پشت بھی اسی طرح چیزوں کو دیکھ سکتے تھے جیسا کہ ایک حدیث میں آپ ارشاد فرماتے ہیں:

لا ترفعوا قبلی ولا تضعوا قبلی، فانی اراکم من خلفی کما اراکم من امامی

نہ تو مجھ سے پہلے سجدہ سے سر اٹھاؤ اور نہ ہی مجھ سے پہلے سجدہ میں سر رکھو کیونکہ میں تمھیں پس پشت بھی ویسا ہی دیکھتا ہوں جیسا کہ سامنے سے دیکھتا ہوں۔

یہ فرمانے کے بعد آپ نے شاہد کے طور پر مندرجہ بالا آیت کی تلاوت فرمائی [۱]

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس سے مراد آنحضرتؐ کا جناب آدمؑ سے جناب عبداللہ تک پاک و پاکیزہ انبیاء کی صلبوں میں منتقل ہونا ہے جو پروردگار عالم کی نظرِ کرم کے تحت انجام پایا یعنی جب بھی آپ کا پاکیزہ نور ایک ساجد اور توحید پرست پیغمبر سے دوسرے موحد اور سجدہ گزار نبی میں منتقل ہوتا خدا اس سے آگاہ تھا۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں ہے کہ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے "وتقلبك فی الساجدین" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

فی اصلاب النبیین صلوات الله علیهم

انبیاء کی صلبوں میں خدا کی ان پر رحمت ہو [۲]

تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ حضرت امام محمد باقرؑ اور امام جعفر صادق علیہما السلام نے اس جملے کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے:

فی اصلاب النبیین نبی بعد نبی، حتّٰی اخرجه من صلب ابیه عن نکاح غیر سفاح من لدن اٰدم

انبیاء کی صلبوں میں رکھا، ایک پیغمبر سے دوسرے پیغمبر کی صلب میں، یہاں تک کہ خداوند عالم نے آپ کو آپ کے باپ کی صلب سے باہر نکالا، پاکیزہ نکاح کے ساتھ اور ہر طرح کی ناپاکی اور آلائشوں سے دور رکھا [۳]

البتہ آیات بالا اور ان کی تفسیر سے قطع نظر ہمارے پاس ایسے دلائل بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کے آباؤ اجداد کبھی مشرک نہیں تھے اور ان کی ولادت ہر قسم کے شرک و برائی سے پاک اور نہایت ہی مقدس ماحول میں ہوئی ہے (مزید

---

[۱] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

[۲] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۶۹۔

[۳] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

تفصیل کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۵ میں سورۂ انعام کی آیت ۴، کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں)۔
مندرجہ بالا تفسیریں آیت کی باطنی تفسیریں ہیں ۔

۲۔ **دعوت ذوالعشیرہ :** تاریخ اسلام کی رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعثت کے تیسرے سال اس دعوت کا حکم ہوا کیونکہ اب تک آپ کی دعوت مخفی طور پر جاری تھی ۔ اور اس مدت میں بہت کم لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی " وانذر عشیرتک الاقربین " اور یہ آیت بھی " فاصدع بما تؤمر واعرض عن المشرکین " (سورۃ الحجر آیہ ۹۴) تو آپ کھلم کھلا دعوت دینے پر مامور ہو گئے ۔ اس کی ابتداء اپنے قریبی رشتہ داروں سے کرنے کا حکم ہوا[1]

اس دعوت اور تبلیغ کی اجمالی کیفیت کچھ اس طرح سے ہے :

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جناب ابو طالب کے گھر میں دعوت دی اس میں تقریباً چالیس افراد شریک ہوئے آپ کے چچاؤں میں سے ابو طالب، حمزہ اور ابولہب نے بھی شرکت کی ۔

کھانا کھا لینے کے بعد جب آنحضرتؐ نے اپنا فریضہ ادا کرنے کا ارادہ فرمایا تو ابولہب نے بڑھ کر کچھ ایسی باتیں کیں جس سے سارا مجمع منتشر ہو گیا لہٰذا آپ نے انھیں کل کے کھانے کی دعوت دے دی ۔

دوسرے دن کھانا کھانے کے بعد آپ نے انھیں فرمایا :

> " اے عبد المطلب کے بیٹو ! پورے عرب میں مجھے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا جو اپنی قوم کے لیے مجھ سے بہتر چیز لایا ہو ، میں تمھارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی لے کر آیا ہوں اور خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمھیں اس دین کی دعوت دوں ، تم میں سے کون ہے جو اس کام میں میرا ہاتھ بٹائے تاکہ وہ میرا بھائی ، میرا وصی اور میرا جانشین ہو " ؟

سب لوگ خاموش رہے سوائے علی بن ابی طالب کے جو سب سے کم سن تھے ۔ علی اٹھے اور عرض کی :

> " اے اللہ کے رسول ! اس راہ میں میں آپ کا یار و مددگار ہوں گا "

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ علی کی گردن پر رکھا اور فرمایا :

> ان ھذا اخی ووصی وخلیفتی فیکم فاسمعوا لہ واطیعوہ
>
> یہ (علی) تمھارے درمیان میرا بھائی ، میرا وصی اور میرا جانشین ہے اس کی باتوں کو سنو اور اس کے فرمان کی اطاعت کرو ۔

یہ سن کر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور تمسخر آمیز مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی ، ابو طالب سے کہنے لگے " اب تم اپنے بیٹے کی باتوں کو سنا کرو اور اس کے فرمان پر عمل کیا کرو "

---

[1] سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۸۰ ۔

Marfat.com

اس روایت کو بہت سے اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے جن میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:
ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی اور طبری۔ مؤرخ ابن اثیر نے یہ واقعہ اپنی کتاب "کامل" میں اور "ابوالفداء" نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے بہت سے مورخین نے اپنی اپنی کتابوں میں اسے درج کیا ہے [1]

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دنوں کس حد تک تنہا تھے اور لوگ آپ کی دعوت کے جواب میں کیسے کیسے تمسخر آمیز جملے کہا کرتے تھے۔ اور علی علیہ السلام ان ابتدائی ایام میں جبکہ آپ بالکل تنہا تھے کیونکر آنحضرتؐ کے مدافع بن کر آپ کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس وقت قریش کے ہر قبیلے کا نام لے لے کر انھیں بلایا اور انھیں جہنم کے عذاب سے ڈرایا، کبھی فرماتے:

یا بنی کعب انقذوا انفسکم من النار

اے بنی کعب! خود کو جہنم سے بچاؤ۔

کبھی فرماتے:

یا بنی عبد الشمس ...... کبھی فرماتے یا بنی عبد مناف ....

کبھی فرماتے:

یا بنی ھاشم ....

کبھی فرماتے:

یا بنی عبد المطلب ...... انقذوا انفسکم من النار

تم خود ہی اپنے آپ کو جہنم سے بچاؤ، ورنہ کفر کی صورت میں میں تمہارا دفاع نہیں کرسکوں گا [2]

---

[1] مزید تفصیل کے لیے کتاب المراجعات ص ۱۳۰ کے بعد اور کتاب احقاق الحق جلد ۴ ص ۶۲ کے بعد کا مطالعہ فرمائیں۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۷ ص ۴۸۵۹ اسی آیت کے ذیل میں (تھوڑی سی تلخیص کے ساتھ)۔

Marfat.com

۲۲۱۔ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝

۲۲۲۔ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝

۲۲۳۔ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝

۲۲۴۔ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ۝

۲۲۵۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ۝

۲۲۶۔ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ ۝

۲۲۷۔ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا
مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ۝

ترجمہ

۲۲۱۔ کیا تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں ؟

۲۲۲۔ ہر جھوٹے گناہ گار پر نازل ہوتے ہیں ۔

۲۲۳۔ وہ جو کچھ بھی سنتے ہیں (دوسروں کو) بتا دیتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں ۔

۲۲۴۔ (پیغمبر شاعر نہیں ہیں) شاعر تو وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں ۔

۲۲۵۔ کیا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں ؟

۲۲۶۔ اور وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے ۔

۲۲۷۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال انجام دیئے ہیں اور خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں اور جب ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اپنے (اور دوسرے مومنین کے) دفاع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں (اور اپنے شعری ذوق کو کام میں لاتے ہیں) اور جنھوں نے ظلم کیا ہے انھیں جلد معلوم ہو جائے گا کہ انھیں کہاں لوٹ کر جانا ہے ۔

Marfat.com

تفسیر

رسولِ اکرمؐ شاعر نہیں ہیں

مندرجہ بالا آیات جو سورہ شعراء کی آخری آیات ہیں ایک بار پھر اس گفتگو کی طرف لوٹ رہی ہیں جن میں دشمنان رسول کی اس تہمت کا ذکر ہے کہ قرآن شیطانی القاء کا مجموعہ ہے چنانچہ یہ آیات دو ٹوک اور دلچسپ انداز میں اس تہمت کا جواب دے رہی ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: کیا تمھیں معلوم ہے کہ شیاطین کن لوگوں پر نازل ہوتے ہیں (ھل انبئکم علی من تنزل الشیاطین)۔

وہ ہر جھوٹے گناہ گار پر نازل ہوتے ہیں (تنزل علی کل افاك اثیم)[1]

شیطان جو کچھ سنتے ہیں اس میں بہت سے جھوٹ ملا کر اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں اور ان میں سے اکثر دروغ گو ہیں (یلقون السمع و اکثرھم کاذبون)۔

قصہ مختصر یہ کہ شیطانی القاء کی نشانیاں بالکل واضح ہوتی ہیں جن کے ذریعے انھیں پہچاننا بالکل آسان ہوتا ہے۔

شیطان ایک خطرناک، ایذا رساں، تخریب کار وجود کا نام ہے جس کی بتائی ہوئی باتیں فساد اور تخریب کاری پر مبنی ہوتی ہیں اور اس کے خریدار بھی جھوٹے اور گناہ گار لوگ ہوا کرتے ہیں اور ان امور میں سے کوئی ایک بھی قرآن اور اس کے لانے والے سے مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ہی اس سے ذرہ بھر مشابہت رکھتا ہے۔

اس دور کے لوگوں نے جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صادق، امین اور مصلح کے طور پر پہچانا تھا۔ قرآنی مضامین بھی سوائے توحید، حق، عدالت اور تمام موارد میں اصلاح کی دعوت کے سوا اور کچھ نہیں ہیں تو پھر کس بناء پر تم انھیں شیطانی القاء کے ساتھ متہم کرتے ہو؟

"افاك اثیم" سے مراد وہی "کاہن لوگ" ہیں جن کا شیطانوں کے ساتھ رابطہ تھا اور شیاطین چوری چھپے کان لگا کر فرشتوں سے سچی باتیں سنتے تھے اور پھر اپنی طرف سے بہت سے جھوٹ ملا کر کاہنوں کو بتایا کرتے تھے اور پھر کاہن لوگ اس کو مزید مرچ مصالحہ لگا کر اور جھوٹ ملا کر لوگوں کو بتایا کرتے تھے ایک سچ کے ساتھ سو سو جھوٹ ملا دیا کرتے تھے۔

---

[1] "افاك" "افك" (بروزن پلک) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے "بہت بڑا جھوٹ" اسی لیے "افاك" اس شخص کو کہتے ہیں جو بڑا جھوٹا ہو اور "اثیم" "اثم" (بروزن اسم) کے مادہ سے ہے جس کا معنی ایسا کام ہے جو انسان کو ثواب حاصل کرنے سے مؤخر کر دیتا ہے اور عام طور پر گناہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لہذا "اثیم" کا معنی گناہ گار ہوگا۔

Marfat.com

نزولِ وحی کا سلسلہ شروع ہوا تو شیاطین کو آسمانوں پر جانے سے روک دیا گیا اس سے چوری چھپے سننے کا سلسلہ تو ختم ہوگیا اس کے بعد تو جو کچھ بھی وہ کاہنوں کو بتایا کرتے تھے سو فیصد جھوٹ، کذب اور افتراء کا پلندہ ہوتا تھا ایسی صورت میں قرآنی مضامین کا ان کے ساتھ کیا موازنہ کیا جا سکتا ہے؟ اور صادق اور امین رسول کا جھوٹے اور کذاب کاہنوں سے کیونکر مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

"یلقون السمع" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں۔ پہلی تفسیر یہ ہے کہ "یلقون" میں جو ضمیر ہے وہ شیطانوں کی طرف لوٹ رہی ہے اور "سمع" کا معنی مسموعات (یعنی سنی سنائی باتیں) ہے۔ یعنی شیاطین سنی سنائی باتیں اپنے دوستوں تک پہنچاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہیں (بہت سے جھوٹ ان میں سے اپنی طرف سے ملا دیتے ہیں)۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ "یلقون" میں موجود ضمیر ان جھوٹے گناہ گاروں کی طرف لوٹ رہی ہے جو شیطانوں کی باتوں کو غور سے سنتے ہیں یا جو کچھ وہ شیطانوں سے سنتے تھے وہ دوسرے لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔

لیکن پہلی تفسیر زیادہ صحیح نظر آتی ہے [۱]

زیرِ نظر چوتھی آیت میں پیغمبر اسلامؐ پر کفار کی طرف سے لگائے جانے والے ایک اور الزام کا جواب دیا گیا ہے۔ کفار آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شاعر کہتے تھے جیسا کہ سورۂ انبیاء کی پانچویں آیت میں آیا ہے کبھی کہتے تھے "بل ھو شاعر" (بلکہ وہ تو شاعر ہے) حتیٰ کہ کبھی آپ کو "شاعرِ مجنون" بھی کہا کرتے تھے جیسا کہ سورہ صافات کی آیت ۳۶ میں ہے:

و یقولون ء انا لتارکوا اٰلھتنا لشاعر مجنون

وہ کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے خداؤں کو ایک پاگل شاعر کی وجہ سے چھوڑ دیں؟

قرآن مجید موجودہ آیت میں نہایت ہی منطقی بیان کے ساتھ فرماتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کا طریقۂ کار شعراء کے طریقہ کار سے بالکل جدا ہے۔ شعراء تخیلات اور تصورات کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں جبکہ رسول اللہؐ ایک حقیقی اور واقعی دنیا میں رہ رہے ہیں اور عالمِ انسانیت کو ایک نظام عطا فرما رہے ہیں۔

شعراء عموماً عیش و نوش کے طالب ہوتے ہیں اور یار کے خال و زلفِ دراز کے اسیر ہوتے ہیں (خصوصاً وہ شعراء جو اس دور میں اور حجاز کے ماحول میں رہتے تھے، جیسا کہ ان کے اشعار سے ظاہر ہے)۔

اسی وجہ سے "شعراء وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی پیروی گمراہ لوگ کرتے ہیں" (والشعراء یتبعھم الغاوون)۔

---

[۱] کیونکہ "یلقون" "القاء" کے مادہ سے ہے اور اس جیسے مقامات پر خبروں اور مطالب کے منتقل کرنے کے معنی میں ہے جیسا کہ سورۂ حج کی آیت ۵۳ میں ہے:۔

لیجعل ما یلقی الشیطان فتنۃ للذین فی قلوبھم مرض

اور "اکثرھم کاذبون" کا جملہ بھی شیاطین کے کاموں سے مناسبت رکھتا ہے۔ وگرنہ جو لوگ "افاک اثیم" ہوتے ہیں وہ سب کے سب جھوٹے ہوتے ہیں نہ کہ اکثر لوگ (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

پھر اس کے فوراً بعد اس جملے کا اضافہ فرمایا گیا ہے: کیا تو نے نہیں دیکھا کہ " وہ ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں" (الم تر انھم فی کل واد یھیمون)[1]

وہ اپنی شاعرانہ سوچوں اور تشبیہوں میں غرق رہتے ہیں حتیٰ کہ جدھر قافیہ انھیں لے جاتا ہے اُدھر ہی چل نکلتے ہیں۔

یہ لوگ عموماً منطق اور استدلال کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے اشعار ان کے ہیجانات کی پیداوار ہوتے ہیں اور یہی ہیجانات اور خیالی دوڑ ہر زمانے میں انھیں ایک نئی وادی میں لے جاتے ہیں۔

جب کسی سے خوش ہو جاتے ہیں تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اسے اوجِ ثریا تک پہنچا دیتے ہیں خواہ وہ تحت الثریٰ کا مستحق ہی کیوں نہ ہو اور اسے ایک خوبصورت فرشتہ بنا دیتے ہیں خواہ وہ شیطانِ لعین ہی کیوں نہ ہو۔

اور جب کسی سے ناراض ہو جاتے ہیں تو اپنی ہجویات کے ذریعے گویا اسے اسفل السافلین تک پہنچا دیتے ہیں خواہ وہ مقدس آسمانی فرشتہ ہی کیوں نہ ہو۔

کیا قرآن مجید کے پیچے تلے مضامین، شاعروں کی فکری سرزمین سے ذرہ بھر بھی مشابہت رکھتے ہیں؟ خاص کر اس دور کے شعراء سے کہ جن کا کام ہی صرف شراب و جمال، معشوق اور خط یار اور منظورِ نظر قبیلہ کی مدح اور دشمنوں کی ہجو کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔

پھر یہ کہ شعراء عموماً بزم کے شیر ہوتے ہیں مرد میدان نہیں ہوتے، اہل سخن ہوتے ہیں صاحبانِ عمل نہیں، لہٰذا بعد والی آیت میں ارشاد ہوتا ہے کیا دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے (وانھم یقولون مالا یفعلون)۔

لیکن پیغمبر اسلام تو سراپا عمل ہیں حتیٰ کہ آپ کے بدترین دشمن بھی آپ کے عزمِ راسخ، زبردست استقامت اور عمل کے پہلوؤں کو اہمیت دینے کی تعریف کرتے ہیں، کجا شاعر اور کجا اسلام کے عظیم الشان پیغمبرؐ؟

مندرجہ بالا تصریحات کو مدنظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن نے شعراء کی تین علامتیں بیان کی ہیں:

پہلی یہ کہ: ان کے پیروکار گمراہ لوگ ہوتے ہیں وہ خیالی دنیا میں مگن اور حقائق سے گریزاں رہتے ہیں۔

دوسری یہ کہ ان لوگوں کا کوئی خاص مطمح نظر نہیں ہوتا۔ ان کا فکری راستہ بہت جلد تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ ہیجانات و جذبات سے متاثر ہو کر آسانی کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔

تیسری یہ کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جن پر خود عمل نہیں کرتے یہاں تک کہ جن حقائق کو وہ خود بیان کرتے ہیں ان پر بھی عمل نہیں کرتے۔

لیکن ان علامات میں سے کوئی ایک بھی پیغمبر میں نہیں پائی جاتی بلکہ آپ ان کے بالکل برعکس ہیں۔

لیکن چونکہ شعراء میں نیک اور بامقصد شاعر بھی ہوتے ہیں جو صاحبانِ عمل اور اہلِ حقائق ہوتے ہیں۔ حقانیت اور پاکیزگی کی طرف دعوت دیتے ہیں (ہر چند کہ اس قماش کے شاعر اس دور میں بہت کم ملتے تھے) قرآن مجید نے ایسے باایمان ہنرمندوں

---

[1] "یھیمون"، "ھیام" (بروزن "قیام") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے بغیر مقصد کے چلنا پھرنا۔

Marfat.com

اور حق و صداقت کے متلاشیوں کا حق ضائع ہونے سے بچانے کے لیے، ایک استثناء کے ذریعے ان کی صف کو دوسروں سے جدا کر دیا چنانچہ فرماتا ہے: لیکن جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنھوں نے عمل صالح انجام دیئے ہیں (الا الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات)۔

جن شعراء کا ہدف صرف شعر گوئی نہیں ہوتا بلکہ وہ اشعار کے پردے میں خدائی اور انسانی اہداف کے متلاشی ہوتے ہیں ایسے شعراء جو صرف اشعار میں غرق ہو کر خدا کو بھول نہیں جاتے بلکہ " جو خدا کو بہت یاد کرتے ہیں اور ان کے اشعار لوگوں کو خدا کی یاد دلاتے ہیں (و ذکروا اللہ کثیرًا)۔

جب ان پر ظلم و ستم کیا جاتا ہے تو وہ اپنے فدق کی بناء پر اپنے اور دوسرے مومنین کے دفاع کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں (و انتصروا من بعد ما ظلموا)۔

اگر وہ اپنے اشعار کے ذریعے کسی کی ہجو اور مذمت کرتے ہیں تو اس لیے کہ حق پر ہونے والے حملوں کا دفاع کریں۔

تو اس طرح سے قرآن پاک نے ان بامقصد شعراء کی چار صفات بیان کی ہیں۔ " ایمان" "عمل صالح" "خدا کا ذکر کثیر" اور اپنے اور دوسرے مومنین پر ہونے والے ظلم کا شعری طاقت کے ذریعے دفاع"۔

اور چونکہ اس سورت کی بیشتر آیات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اوائل اسلام کے معدودے چند مومنین کی دلجوئی کے لیے نازل ہوئی ہیں کیونکہ انھیں اس وقت کثیر تعداد میں دشمنوں کا سامنا تھا اور چونکہ اس سورہ کی بہت سی آیات پیغمبر اکرمؐ پر لگائی جانے والی ناروا تہمتوں کے جواب اور آپ کے دفاع کے طور پر نازل ہوئی ہیں لہٰذا ان ہٹ دھرم اور ضدی دشمنوں کو سورۃ کے آخر میں ایک بار پھر متنبہ کیا گیا ہے کہ جن لوگوں نے ظلم کیا ہے وہ بہت جلد جان لیں گے کہ ان کی بازگشت کدھر کو ہے اور ان کا کیا انجام ہوگا (وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون)۔

اگرچہ بعض مفسرین نے ان کی بازگشت اور انجام کو دوزخ تک ہی منحصر کرنا چاہا ہے لیکن اسے محدود کرنے کی کوئی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں ہے بلکہ ممکن ہے کہ جنگ بدر وغیرہ میں انھیں جن پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس دنیا میں جس ذلت اور زبوں حالی کا شکار ہوئے ہیں، بھی اس آیت کے مفہوم میں جمع ہو۔

چند اہم نکات

۱۔ **پیغمبرؐ پر شاعری کی تہمت کیوں؟** جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ قرآن مجید کی مختلف آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین اسلام اور دشمنان پیغمبر آپؐ پر جو الزام تراشی کیا کرتے تھے اس میں آپ کی طرف شعر اور شاعری کی نسبت بھی تھی اور مندرجہ بالا آیات اسی الزام کے جواب میں ہیں۔

وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ قرآن مجید ذرہ برابر بھی اشعار سے مشابہ نہیں ہے یعنی قرآن اور اشعار کا کوئی بھی جوڑ نہیں ہے۔ نہ تو ظاہری لحاظ سے یعنی نظم، وزن اور قافیہ کے لحاظ سے اور نہ ہی مضامین کے اعتبار سے۔ یعنی شاعرانہ تشبیہات، تخیلات اور تغزل کے اعتبار سے۔

Marfat.com

لیکن چونکہ وہ دیکھتے تھے کہ قرآن مجید لوگوں کے افکار و اذہان میں بے حد اثر کر رہا ہے اور اس کا دلنشین لحن ان کی روح کے اندر اتر رہا تھا لہٰذا اس نور خداوندی پر پردہ ڈالنے کے لیے کبھی تو اسے جادو کا نام دیتے اور کبھی شعر کا، جادو اس لیے کہ وہ اذہان پر بہت زیادہ تاثیر کرتا ہے اور شعر اس لیے کہ دلوں میں ارتعاش پیدا کر کے انھیں اپنی طرف مائل کر لیتا ہے۔

وہ تو درحقیقت اس کی مذمت کرنا چاہتے تھے لیکن ان الفاظ کے ساتھ اس کی تعریف کر رہے ہوتے تھے اور ان کی یہ گفتگو اس بات کی دلیل تھی کہ قرآن مجید دلوں اور دماغوں پر معجزانہ اثر کرتا ہے۔

قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کہتا ہے:۔

وما علمناہ الشعر وما ینبغی لہ ان ھو الا ذکر و قرآن مبین لینذر من کان حیا

ہم نے انھیں شعر کی تعلیم نہیں دی اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے بلکہ یہ تو واضح ذکر، بیداری اور قرآن ہے تاکہ جن لوگوں کے بدن میں جان ہے انھیں ڈرائیں۔ (یٰس ــــ ۶۹-۷۰)

۲۔ اسلام میں شعر و شاعری کا مقام:۔ اس میں شک نہیں کہ شعری ذوق اور شعری صلاحیت انسان کی دوسری تمام صلاحیتوں کی مانند اس وقت ایک قیمتی سرمایہ شمار ہوگی جب وہ صحیح خطوط پر چلے اور اس سے مثبت اور تعمیری فائدہ حاصل کیا جائے لیکن اگر اسے معاشرے کے اعتقاد اور اخلاق کی بنیادوں کو تباہ اور ویران کرنے اور معاشرے میں برائی اور بے راہروی کی ترغیب دلانے کا ذریعہ بنا لیا جائے یا اس سے انسانی معاشرے کو کھوکھلا کیا جائے یا بیہودہ بنا دیا جائے اور خیالی پلاؤ پکانے کی حد تک محدود رکھا جائے یا ایک بے مقصد مشغلے کے طور پر اس سے استفادہ کیا جائے تو ایسی صورت میں یہ صرف بے قیمت ہی نہیں مضر اور نقصان دہ بھی ہے۔

اور اس جملے کے ساتھ اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے کہ آخر آیاتِ بالا سے کیا سمجھا جائے شاعر ہونا اچھی بات ہے یا بری مناسب ہے یا غیر مناسب؟ اور اسلام شعر کے موافق ہے یا مخالف؟

اور یہ بھی یاد رہے کہ اسلام اس سلسلے میں "اہداف"، "اطراف" اور "نتائج" کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرتا ہے۔ جب ماہِ رمضان المبارک کی ایک رات، امیرالمومنین کے کچھ دوستوں نے افطار کے وقت شعر اور شعراء کے بارے میں گفتگو شروع کر دی، تو آنجنابؑ نے ارشاد فرمایا:

اعلموا ان ملاک امرکم الدین، و عصمتکم التقوی، و زینتکم الادب، وحصون اعراضکم الحلم

جان لو تمھارے تمام کاموں کا معیار دین، تمھارا محافظ تقویٰ، تمھاری زینت ادب اور تمھاری آبرو کے محکم قلعے حلم اور بردباری ہیں[1]

امام عالی مقام کا یہ ارشاد اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک وسیلہ ہوتا ہے جس کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار اس کے

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید جلد ۲۰ ص ۴۶۱۔

Marfat.com

ہدف اور مقصد پر ہوتا ہے کہ جس کے لیے شعر کہا جاتا ہے ۔

لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اقوام عالم کی تاریخ ادبیات میں شعر سے بہت ہی غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے اور اس خداداد ذوقِ لطیف سے گندے ماحول میں اس قدر شرمناک کام لیا گیا کہ بسا اوقات وہ فساد اور تخریب کاری کا موثر ترین ذریعہ بن گیا خصوصاً عصرِ جاہلیت میں جو کہ عرب قوم کے اخلاقی اور فکری انحطاط کا دور تھا کیونکہ اس دور میں " شعر " " شراب" اور "غارتگری" شانہ بشانہ چل رہے تھے ۔

لیکن اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ تاریخ میں تعمیری اور بامقصد شعر نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے اور اپنی شہامت کے جوہر دکھائے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات اس نے کسی قوم اور ملت کو خونخوار اور وحشی دشمن کے مقابلے میں یوں متحد کر دیا کہ وہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دشمن پر یوں ٹوٹ پڑی کہ اس کے دانت کھٹے کر دیئے اور اسے ہزیمت اٹھانے پر مجبور کر دیا ہم نے اپنے اسلامی انقلاب کی تحریک کے دوران میں بھی دیکھا ہے اور موزوں اشعار اور شعر کے قالب میں ڈھلے ہوئے نعرے بھی سنے ہیں کہ جن کی وجہ سے عوام میں جوش وخروش اور ذوق وولولہ پیدا ہو جاتا ہے اور جرات کا خون ان کی رگوں میں دوڑنے لگتا ہے اور ان سادہ اور مختصر اشعار نے کہ جن سے بہادری اور جرات کا مظاہرہ ہوتا ہے ، کس قدر دشمن کو لرزہ براندام کر دیا تھا ؟ اور اس کے ایوانِ حکومت کی بنیادوں کو کس طرح ہلا کر رکھ دیا تھا ۔

اور اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ بسا اوقات ایک اخلاقی شعر انسان کے قلب و روح میں اس حد تک اُتر جاتا ہے کہ ایک بہت بڑی کتاب بھی اس قدر موثر ثابت نہیں ہوسکتی ۔

جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ :۔

ان من الشعر لحکمة، وان من البیان لسحرًا

بعض اشعار حکمت اور بعض بیان جادو ہوا کرتے ہیں [1]

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اشعار قیامت برپا کر دیتے ہیں ۔

بسا اوقات شاعرانہ موزوں کلمات دشمن کے دل پر تلوار سے زیادہ اور تیر سے بڑھ کر کارگر ثابت ہوتے ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے اشعار کے سلسلے میں فرمایا ہے :

والذی نفس محمد بیدہ فکانما تنضحونھم بالنبل

اس ذات کی قسم محمدؐ کی جان جس کے دستِ قدرت میں ہے ان اشعار کے ذریعے گویا تم ان کی طرف تیر چلا رہے ہو [2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کلمات اس وقت ارشاد فرمائے جب دشمن اپنے ہجویہ اشعار کے ذریعے مسلمانوں کے

---

[1] اس حدیث کو بہت سے شیعہ و سنی علماء نے اپنی اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے (کتاب الغدیر جلد ۲ ص ۹ کا مطالعہ فرمائیں)۔

[2] مسند احمد بن حنبل جلد ۳ ص ۴۶۰ ۔

Marfat.com

حوصلے پست کر رہا تھا تو آپ نے حکم دیا کہ دشمن کی مذمت اور مسلمانوں کے حوصلے بلند کرنے کے لیے اشعار پڑھے جائیں۔

ایک مرتبہ ایک مدافع اسلام شاعر کے بارے میں فرمایا:

اهجهم فان جبرئیل معك

ان کی مذمت اور ہجو کرو کہ جبرائیل تمھارے ساتھ ہیں۔[1]

خصوصاً جب باایمان شاعر کعب بن مالک اسلام کی تقویت کے لیے شعر پڑھ رہے تھے تو رسول پاکؐ سے دریافت کیا یارسول اللہ! اشعار کی مذمت میں تو یہ آیات نازل ہو چکی ہیں میں کیا کروں؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ان المؤمن یجاهد بنفسه وسیفه ولسانه

مومن اپنی جان، تلوار اور زبان کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔[2]

آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے بھی بامقصد اشعار اور شعراء کی بہت تعریف، ان کے حق میں دعا اور ان کے لیے بہت سے انعام واکرام کی روایات ملتی ہیں۔ اگر ہم ان تمام کو یہاں پر لکھنا شروع کر دیں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔

لیکن افسوس کہ تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ملتے ہیں جنھوں نے اس عظیم صلاحیت اور ملکوتی ذوق لطیف کو جو تخلیق کائنات کا بہترین مظہر ہے آلودہ کر دیا اور اسے اوج ثریا سے مادیت کے تحت الثریٰ میں ڈال دیا اور انھوں نے اس قدر جھوٹے اشعار کہے ہیں کہ مندرجہ ذیل ضرب المثل وجود میں آگئی ہے " احسنه اکذبه " (یعنی جس شعر میں زیادہ جھوٹ ہو گا وہی زیادہ اچھا ہوگا)۔ کبھی تو اس سے ظالموں اور جابر حکمرانوں کی مدح سرائی کی گئی اور ناچیز اور حقیر سے صلہ اور انعام کے لیے اس قدر خوشامد اور چاپلوسی کی کہ گویا اپنے تیئں سات آسمان اتار کر اُن کے پاؤں میں رکھ دیئے "تاکہ قزل ارسلان کے پاؤں کا بوسہ لیں"۔

اور کبھی عیش و شراب، رسوائی اور بے حیائی میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ قلم ان کے ذکر کرنے سے شرماتا ہے۔

اور کبھی ایسے شعراء نے اپنے اشعار کے ذریعہ جنگوں کی آگ بھڑکائی اور لوٹ مار اور قتل وغارت کے لیے انسانوں کو آپس میں لڑا دیا اور بے گناہوں کے خون سے صفحہ زمین کو رنگین کر دیا۔

لیکن ان کے مقابلے میں باایمان اور عالی ظرف شعراء بھی موجود رہے ہیں جنھوں نے مادیت کو ٹھوکر مار دی۔ اور اس ملکوتی عطیہ کو انسانوں کی آزادی، تقویٰ اور پاکیزگی کے راستے میں استعمال کیا۔ ڈاکوؤں، لٹیروں اور ظالم وجابر حکمرانوں سے پنجہ آزمائی کی اور اوج کمال وافتخار تک جا پہنچے۔

کبھی حق کے دفاع میں ایسے ایسے شعر کہے کہ ہر بیت کے بدلے جنت میں ایک گھر خرید لیا۔[3]

---

[1] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۹۹۔

[2] تفسیر قرطبی جلد ۷، ص ۴۸۶۹۔

[3] حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

من قال فینا بیت شعر بنی الله له بیتاً فی الجنة

جو شخص ہمارے بارے میں ایک بیت کہے گا خدا اس کا گھر بہشت میں بنائے گا۔ (الغدیر جلد ۲ ص ۲)

Marfat.com

اور کبھی "بنی امیہ" اور "بنی عباس جیسے ظالم و جابر حکام کے دورِ حکومت میں جبکہ اس حد تک گھٹن کا ماحول تھا کہ سانس لینا بھی دشوار تھا تو "مدارس آیات" جیسے قصیدے کہہ کہہ کر دلوں کو جلا بخشی اور جھوٹ اور فریب کے پردے چاک کرکے رکھ دیئے۔ گویا یہ اشعار ان سے روح القدس کہلا رہا تھا[1]

کبھی معاشرے کے محکوم و محروم اور پسے ہوئے طبقے میں تحرک پیدا کرنے کے لیے شعر کہتے رہے جس سے ان کے اندر جوش اور ولولہ پیدا ہو جاتا تھا۔

اور قرآن مجید بھی ایسے لوگوں کے لیے فرماتا ہے:

الا الذین اٰمنوا وعملوا الصالحات و ذکروا اللّٰہ کثیرًا و انتصروا من بعد ما ظلموا

اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ اس طرح کے شاعر بسا اوقات ایسی جاودانہ یادگاریں چھوڑ جاتے ہیں کہ بعض روایات کے مطابق عظیم ہادیانِ اسلام لوگوں کو ان کے اشعار یاد کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ جس طرح کہ "عبدی" کے اشعار کے بارے میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

یا معشر الشیعۃ علموا اولادکم شعر العبدی فانہ علی دین اللّٰہ

اپنی اولاد کو عبدی کے اشعار تعلیم دو کیونکہ وہ خدا کے دین پر تھا[2]

ہم بھی اپنی اس گفتگو کو "عبدی" کے ان مشہور و معروف اشعار کے ساتھ ختم کرتے ہیں جو اس نے پیغمبرؐ کی خلافت اور جانشینی کے بارے میں کہے ہیں:

وقالوا رسول اللّٰہ ما اختار بعدہ — اماماً ولکنا لانفسنا اخترنا

اقمنا اماماً ان اقام علی الھدیٰ — اطعنا وان ضل الھدایۃ قومنا

فقلنا اذًا انتم امام امامکم — بحمد من الرحمٰن تھتم ولا تھنا

ولکننا اخترنا الذی اختار ربنا — لنا یوم خم ما اعتدینا ولا حلنا

ونحن علی نور من اللّٰہ واضح — فیارب زدنا منک نورًا وثبتنا

ترجمہ:۔ انھوں نے کہا کہ رسولِ خدا نے اپنے بعد کسی کو امام نہیں بنایا ہم تو خود ہی اپنے لیے امام کا انتخاب کریں گے۔

ہم ایسے امام کا انتخاب کریں گے کہ اگر وہ ہدایت پر گامزن رہا تو ہم بھی اس کی اطاعت کریں گے اور

---

[1] ایک اور حدیث میں امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:
ما قال فینا قائل بیت شعر حتی یؤید بروح القدس (عیون اخبار الرضا)

[2] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۷۰۔

Marfat.com

اگر گمراہی کی راہ اختیار کی تو ہم اسے سیدھا کریں گے (یا اسے ہٹا دیں گے)۔

تو ہم نے انھیں کہا پھر تو تم اپنے امام آپ ہی ہو گے بحمد للہ تم لوگ سرگرداں پھر رہے ہو لیکن ہم سرگرداں نہیں ہیں۔

ہم نے اسے امام تسلیم کیا ہے جسے غدیر خم کے دن ہمارے لیے ہمارا امام بنایا گیا تھا۔ ہم اس سے ذرہ برابر انحراف نہیں کریں گے۔

ہم اللہ تعالیٰ کے واضح نور پر ہیں اور اے پروردگار! تو اس نور میں مزید اضافہ فرما اور ہمیں بھی ثابت قدم رکھ۔[1]

۲۔ ذکرِ خدا: مندرجہ بالا آیات میں ہم نے پڑھا ہے کہ با مقصد شعراء کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ خدا کو زیادہ یاد کرتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے:

"ذکر کثیر سے مراد حضرت فاطمہ زہرا کی تسبیح ہے (جو تکبیر، حمد اور تسبیح پر مشتمل ہے)۔

ایک اور حدیث میں آپ ہی فرماتے ہیں:

سخت ترین اور اہم ترین امور میں سے ایک سخت اور اہم امر جو خدا نے اپنی مخلوق پر فرض کیا ہے خدا کا ذکر کثیر ہے۔

پھر آپ نے فرمایا:

میری مراد یہ نہیں ہے کہ لوگ "سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" کہیں اگرچہ یہ بھی اس کا ایک جزء ہے لیکن "ذکر اللہ عند ما احل وحرم فان کان طاعۃ عمل بہا وان کان معصیۃ ترکہا" یعنی میرا مقصد یہ ہے کہ جب انسان کسی حلال اور حرام کا سامنا کرے تو اس وقت خدا کو یاد کرے اگر اس میں خدا کی اطاعت ہے تو اسے انجام دے اور اگر معصیت ہے تو اسے چھوڑ دے۔[2]

پروردگارا! تو ہمارے دلوں کو اپنی یاد کے ساتھ سرشار فرما! تاکہ جہاں اور جس چیز میں تیری ذات کی رضامندی ہے اسے اپنائیں اور جس میں تیری ذات کی ناراضی ہے اسے چھوڑ دیں۔

خداوندا! ہماری زبانوں کو گویا، ہمارے قلم کو توانا اور ہمارے دلوں کو خلوص سے بھر دے! تاکہ ان سب کو تیری راہ اور تیری رضا میں کام میں لائیں۔ آمین یا رب العالمین!

تفسیر سورۂ شعراء ختم ہوئی

۱۰ رجب ۱۴۰۳ھ۔ روز ولادت حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام

---

[1] الکنیٰ والالقاب جلد ۲ ص ۴۵۵۔

[2] اصول کافی۔

Marfat.com

سورۂ نمل

مکہ میں نازل ہوئی

اس کی ۹۳ آیات ہیں

Marfat.com

سورۂ نمل کے مضامین

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں مشہور قول کی بناء پر یہ سورہ مکہ میں سورۂ شعراء کے بعد نازل ہوئی ہے۔

مجموعی طور پر اس سورۃ کے مضامین بھی وہی ہیں جو دوسری مکی سورتوں کے ہوتے ہیں یعنی اعتقادی لحاظ سے زیادہ تر مبداء او معاد پر زور دیا گیا ہے اور قرآن مجید، وحی، عالمِ آفرینش میں خداوند عالم کی نشانیوں اور قیامت کی کیفیت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

عملی اور اخلاقی مسائل کی رُو سے اللہ تعالیٰ کے پانچ عظیم نبیوں کے حالات بیان کیے گئے ہیں منحرف اور گمراہ اقوام کے ساتھ ان کے مقابلے کا ذکر ہے تاکہ اس طرح سے ایک تو ان مومنین کی تسلی کا سامان فراہم کیا جا سکے جو خاص طور پر ان دنوں مکہ میں نہایت اقلیت میں تھے اور دوسرے ہٹ دھرم اور ظالم مشرکین کے لیے تنبیہ ہو تاکہ وہ صفحہ تاریخ میں گزشتہ سرکشوں کا انجام دیکھ کر کچھ عبرت حاصل کریں، بیدار ہوں اور ہوش میں آجائیں!

اس سورہ کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ حضرت سلیمان اور ملکہ سباء کی داستان، ملکہ کے توحید پر ایمان لانے کی کیفیت، جناب سلیمان کے ساتھ ہُدہُد جیسے پرندوں اور چیونٹی جیسے حشرات کی گفتگو پر مشتمل ہے۔

اسی وجہ سے اس سورت کا نام بھی "نمل" (چیونٹی) ہے۔ عجیب بات یہ بھی ہے کہ بعض روایات میں اسے "سورۂ سلیمان" کے نام سے یاد کیا گیا ہے (کبھی سورۂ سلیمان اور کبھی سورۂ نمل) اور جیسا کہ آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس کے یہ نام بہت ہی مناسب ہیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے لیے گئے ہیں۔ ان میں ایسے اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے کہ لوگ عام طور پر ان سے بے خبر تھے۔

ساتھ ہی اس سورت میں پروردگارِ عالم کے بے انتہا علم، کائنات میں اس کی ہر چیز پر نگرانی اور بندوں پر اس کی حاکمیت کہ جس کی طرف توجہ انسان کی تربیت کے لیے نہایت ہی مؤثر ہے کا ذکر بھی ہے۔

یہ سورت "بشارت" کے ساتھ شروع ہوتی ہے اور "تنبیہ" پر ختم ہو جاتی ہے۔ بشارت وہ جو قرآن مجید مومنین کے لیے لایا ہے اور تنبیہ اس بات کی کہ خداوندِ عالم تم لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

Marfat.com

سورۂ نمل کی فضیلت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے:

من قرء طس سليمان كان له من الاجر عشر حسنات، بعدد من صدق سليمان،
وكذب به، وهود وشعيب وصالح وابراهيم ويخرج من قبره
وهو ينادى لا اله الّا الله

جو شخص سورہ طس سلیمان (سورۂ نمل) کی تلاوت کرے گا خداوندِ عالم اسے ان لوگوں کی تعداد سے دس گنا اجر دے گا، جنھوں نے سلیمان کی تصدیق یا تکذیب کی۔ اسی طرح ان لوگوں کی تعداد سے بھی جنھوں نے جناب ہود، شعیب، صالح اور ابراہیم علیہم السلام کی تصدیق یا تکذیب کی اور بروز قیامت جب وہ اپنی قبر سے باہر نکلے گا تو اس کے منہ پر " لا الٰہ الّا اللہ " کا ورد ہوگا۔[1]

ہر چند کہ اس سورت میں جناب موسیٰ، سلیمان، داؤد، صالح اور لوط علیہم السلام کا تذکرہ ہے اور جناب ہود، شعیب اور ابراہیم علیہم السلام کا ذکر نہیں ہوا ہے لیکن چونکہ دعوت کے لحاظ سے تمام انبیاء یکساں ہیں لہٰذا یہاں روایت میں ان کا ذکر باعثِ تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک حدیث میں ہے:

جو شخص طواسین ثلاث (سورۂ شعراء، نمل اور قصص کہ جن کے آغاز میں طس ہے) کی ہر شب جمعہ تلاوت کرے گا وہ اولیاء اللہ سے ہوگا۔ اسی کے جوار اور اس کے لطف و حمایت کے زیر سایہ رہے گا۔[2]

---

[1] مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

[2] ثواب الاعمال (منقول از نور الثقلین جلد ۴ ص ۷۴)۔

Marfat.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۱۔ طٰسٓ تِلۡکَ اٰیٰتُ الۡقُرۡاٰنِ وَکِتَابٍ مُّبِیۡنٍ ○

۲۔ ھُدًی وَّ بُشۡرٰی لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ○

۳۔ الَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَھُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ھُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ○

۴۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ زَیَّنَّا لَھُمۡ اَعۡمَالَھُمۡ فَھُمۡ یَعۡمَھُوۡنَ ○

۵۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَھُمۡ سُوۡٓءُ الۡعَذَابِ وَ ھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ ھُمُ الۡاَخۡسَرُوۡنَ ○

۶۔ وَاِنَّکَ لَتُلَقَّی الۡقُرۡاٰنَ مِنۡ لَّدُنۡ حَکِیۡمٍ عَلِیۡمٍ ○

ترجمہ

خداوند رحمان و رحیم کے نام سے

۱۔ طٰس ۔ یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں۔

۲۔ مومنین کے لیے ہدایت اور بشارت ہیں ۔

۳۔ وہی جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

۴۔ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے (بُرے) اعمال کو یوں خوشنما بنائیں گے کہ وہ بھٹکتے ہی پھریں گے

۵۔ وہ ایسے لوگ ہیں جن کے لیے بُرا (اور دردناک) عذاب ہے اور وہی لوگ آخرت میں سب سے زیادہ خسارہ اٹھانے والے ہوں گے۔

۶۔ اور یقیناً یہ قرآن حکیم اور دانا خدا کی طرف سے تجھ پر بھیجا جاتا ہے ۔

Marfat.com

تفسیر

قرآن ایک حکیم دانا کی طرف سے ہے

اس سورت کے آغاز میں ہم ایک بار پھر حروفِ مقطعات کا سامنا کر رہے ہیں اور پھر یہ کہ ان حروف کے فوراً ہی بعد قرآن مجید کی عظمت کی بات ہوتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس کا ایک راز یہ ہو کہ یہ عظیم کتاب اور اس کی آیات مبین تو الف، با جیسے سادہ اور معمولی حروف سے بنی ہیں لیکن تعریف کے لائق تو وہ آفریدگار ہے جس نے ایسا محیّر العقول کارنامہ معمولی اور سادہ سے مواد کے ذریعے ظاہر کیا۔ اس سلسلے میں ہم سورۂ بقرہ، آلِ عمران اور سورۂ اعراف کے آغاز میں کافی اور مفصل گفتگو کر چکے ہیں (تفسیر نمونہ کی جلد اوّل، دوم اور ششم کا مطالعہ فرمائیے)۔

پھر فرمایا گیا ہے: یہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات ہیں (تلك اٰيات القراٰن و كتاب مبين)۔

لفظ "تلک" دور کے لیے اسم اشارہ ہے۔ یہاں یہ ان آسمانی آیات کی عظمت کے اظہار کے لیے ہے اور "مبین" کی تعبیر اس بات کی تاکید ہے کہ یہ قرآن خود بھی واضح اور آشکار ہے اور حقائق کو آشکار کرنے والا بھی ہے[1]

اگرچہ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ "قرآن" اور "کتاب مبین" کے دو الگ الگ معنی ہیں اور کتاب مبین سے مراد "لوحِ محفوظ" ہے لیکن آیت کا ظاہر بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔ پہلا الفاظ اور تلاوت کے لباس میں اور دوسرا تحریر اور کتابت کے لباس میں۔

اسی سلسلے کی دوسری آیت میں قرآن مجید کی ایک اور صفت بیان ہوئی ہے اور وہ یہ کہ "یہ ایسا قرآن ہے جو مومنین کے لیے ہدایت کا ذریعہ اور بشارت کا وسیلہ ہے" (هدًى و بشرٰى للمؤمنين)۔

"وہ وہی لوگ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں" (الذين يقيمون الصلٰوة ويؤتون الزكٰوة وهم بالاٰخرة هم يوقنون)۔

اس لحاظ سے ایک تو ان کا مبداء اور معاد پر پختہ عقیدہ ہے۔ دوسرے ان کا خدا اور خلق خدا کے ساتھ محکم تعلق ہے اسی لیے مندرجہ بالا اوصاف ان کے مکمل عقیدے اور طرز عمل کی طرف اشارہ ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ مومنین اعتقادی اور عملی لحاظ سے صاف اور واضح راستہ اختیار کر چکے ہیں تو پھر کیا ضرورت ہے کہ قرآن ان کی ہدایت کے لیے آئے؟

---

[1] "مبین" "ابانہ" کے مادہ سے ہے اور جیسا کہ بعض مفسرین نے (جیسے آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں) کہا ہے کہ یہ مادہ کبھی فعل لازم کے معنی میں آتا ہے اور کبھی فعل متعدی کے معنی میں۔ پہلی صورت میں "مبین" کا معنی ہے واضح اور آشکار۔ اور دوسری صورت میں آشکار کرنے والا۔

Marfat.com

اگر توجہ کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہدایت کے مختلف مراحل ہیں اور ہر مرحلہ اپنے سے بالاتر مرحلے کے لیے مقدمہ اور زینہ ہوتا ہے اسی طرح یہ سلسلہ اوپر کو چلا جاتا ہے اسی سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہدایت کا دائم اور برقرار رہنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کی ہم اپنی شب و روز کی نماز میں ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگا کرتے ہیں" اھدنا الصراط المستقیم " کہ خداوندا! ہمیں اس راہ پر ثابت قدم رکھ اور اس پر قائم و دائم رکھ کیونکہ تیری مہربانی کے بغیر ایسا قطعاً ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ قرآن اور کتاب مبین کی آیات سے استفادہ کرنا صرف ان لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جن کے اندر حقیقت طلبی اور حق جوئی کی تڑپ پائی جاتی ہو ہر چند کہ وہ مکمل ہدایت تک نہ بھی پہنچے ہوں۔

اگر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کہیں پر قرآن مجید کو" پرہیز گاروں" کے لیے ہدایت کہا گیا ہے (بقرہ — ۲) کہیں پر" مسلمانوں" کے لیے ہدایت کہا گیا ہے (نحل — ۱۰۲) اور یہاں پر" مومنین" کے لیے ہدایت کہا گیا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ جب تک کم از کم تقویٰ، تسلیم اور حقیقت پر ایمان انسان کے دل میں نہ ہو اس وقت تک وہ حق کی تلاش میں نہیں نکل سکتا اور کتاب مبین کے نور سے بہرہ مند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ظرف میں استعداد اور قابلیت کا ہونا بھی شرط ہے۔

اس سے قطع نظر" ہدایت" اور" بشارت" باہمی طور پر صرف مومنین کے لیے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لیے ایسی بشارت نہیں ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر قرآن کی بعض آیات میں ہدایت کو عام لوگوں کے لیے شمار کیا گیا ہے۔ اور" ھدًی للناس" (بقرہ — ۱۸۵) کہا گیا ہے تو اس سے مراد تمام وہ لوگ ہیں جن کے اندر حق کی قبولیت کے لیے قابلیت پائی جاتی ہے ورنہ متعصب قسم کے ہٹ دھرم لوگ تو دل کے ایسے اندھے ہوتے ہیں کہ اگر ایک کی بجائے ہزاروں سورج ان کے لیے چمکنے لگ جائیں تو بھی وہ ذرہ برابر بہرہ یاب نہیں ہو پائیں گے۔

پھر قرآن ان لوگوں کے حالات بیان فرماتا ہے جو مومنین کے برعکس ہیں اور ان کے نہایت الم ناک حالات کا ایک رُخ یوں بیان فرماتا ہے: جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے بُرے اعمال کو بنا سنوار کر پیش کریں گے۔ وہ زندگی کی راہوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں (ان الذین لایؤمنون بالأخرۃ زینا لھم اعمالھم فھم یعمھون)۔

ان کی نگاہوں میں نجاست، طہارت ہوتی ہے، برائی، بھلائی ہوتی ہے، پستی بلندی ہوتی ہے اور بدبختی سعادت و کامیابی ہوتی ہے۔

جی ہاں! یہی انجام ہوتا ہے ان لوگوں کا جو غلط راہ پر گامزن ہوتے ہیں اور اسی راہ پر ڈٹے رہتے ہیں۔

جب انسان غلط کام کرتا ہے تو آہستہ آہستہ برائی اس کی نظروں میں کم ہو جاتی ہے اور وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے جب ایک عرصے تک اس سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر اس کے لیے مختلف توجیہات گھڑنا شروع کر دیتا ہے اور پھر ایک مدت کے بعد وہ برائی اس کی نگاہوں میں خوبصورت چیز بلکہ ایک فریضہ بن جاتی ہے اور دنیا میں کتنے مجرم لوگ ہیں جو اپنے ان ناشائستہ اور غلط کاموں پر فخر و مباہات کرتے اور انھیں مثبت کام شمار کرتے ہیں۔

Marfat.com

اقدار اور معیار جب یوں بدل جاتے ہیں تو انسانی زندگی بے راہ اور سرگرداں ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ انسانی زندگی کی بدترین کیفیت ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اسی آیت میں اور سورہ انعام کی آیت ۱۰۸ میں "زینت دینے" کی نسبت "خدا" کی طرف دی گئی ہے جبکہ آٹھ مقامات پر "شیطان" کی طرف اور دو جگہوں میں فعل مجہول "زین" آیا ہے، اگر غور سے دیکھا جائے تو سب ایک ہی حقیقت کو بیان کر رہے ہیں۔

یہ جو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ "مسبب الاسباب" ہے یعنی اسباب کا پیدا کرنے والا وہی ہے اس لحاظ سے ہر کام کے نتیجے کا تعلق خدا سے بنتا ہے اور خداوندِ عالم نے یہ خاصیت تکرار عمل میں رکھ دی ہے کہ آہستہ آہستہ جب انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے تو پہچان کی حس تبدیل ہو جاتی ہے اور اس سے انسان بھی جواب دہ رہتا ہے اور خدا پر بھی کوئی اعتراض وارد نہیں ہوتا (غور کیجیے گا)۔

اور اگر شیطان یا خواہشاتِ نفسانی کی طرف اس کی نسبت دی گئی ہے تو اس لیے کہ اس کے نزدیکی اور بلاواسطہ عوامل یہی ہوتے ہیں۔

اور اگر کہیں پر فعل مجہول کی صورت میں آیا ہے تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عمل کی فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ بار بار کے ارتکاب سے انسان کے اندر یہ عمل "حالت" "ملکہ" اور "عشق" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

پھر "اعمال کے مزین کرنے" کا نتیجہ بیان فرماتے ہوئے ایسے لوگوں کا انجام اس طرح بیان کیا گیا ہے: یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے برا، سخت اور دردناک انجام ہے (اولئک الذین لھم سوء العذاب)۔

دنیا میں سرگرداں، مایوس، حیران و پریشان ہوں گے اور آخرت میں سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

"اور وہ آخرت میں سب سے زیادہ نقصان اٹھانے والے ہوں گے" (وھم فی الاٰخرۃ ھم الاخسرون)۔

ان کے سب سے زیادہ نقصان اٹھانے کی وجہ وہی ہے جو سورۂ کہف کی آیہ ۱۰۳ – ۱۰۴ میں آئی ہے۔

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا ٥ الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا

کہہ دیجیے کہ آیا میں تمھیں اعمال کے لحاظ سے زیادہ نقصان اٹھانے والے لوگوں کا تعارف کراؤں؟ وہ وہی لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیاوی زندگی میں بیکار ہو گئی ہیں جبکہ وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ وہ نیک اعمال انجام دے رہے ہیں۔

اس سے بڑھ کر اور کیا نقصان ہوگا کہ انسان اپنے برے اعمال کو نیک اعمال سمجھے اور اپنی تمام توانائیاں ان پر صرف کر دے اور مثبت کام سمجھ کر انھیں بجا لا رہا ہے لیکن ان کا انجام بدبختی، سیاہ بختی اور عذاب کے سوا اور کچھ نہ ہو۔

اسی سلسلے کی آخری آیت جو قرآنی مضامین کی عظمت کے سلسلے میں گزشتہ اشاروں کی تکمیل کے طور پر اور انبیاء کرام علیہم السلام کے حالاتِ زندگی کے لیے جو ابھی شروع ہونے والے ہیں کے مقدمے کی صورت میں ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

Marfat.com

اس میں ذرہ بھر بھی شک نہیں ہے کہ یہ قرآن خداوند حکیم و دانا کی طرف سے تیری جانب بھیجا جاتا ہے (و انك لتلقی القرآن من لدن حكيم عليم)۔

اگرچہ "حکیم" اور "علیم" ہر دو خدا کی دانائی کی طرف اشارہ ہیں لیکن "حکمت" عام طور پر عملی پہلو کو بیان کرتی ہے اور "علم" نظری پہلو کو، بالفاظ دیگر "علیم" خداوند عالم کے بے انتہا علم کی خبر دیتا ہے اور "حکیم" کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اس عالم کے معرضِ وجود میں لانے اور قرآن کے نازل کرنے میں حساب و کتاب اور ہدف و مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

اور اس طرح کا قرآن جب ان صفات کے مالک پروردگار کی طرف سے نازل ہو تو اسے مبین اور آشکار کرنے والی کتاب ہی ہونا چاہیے جو مومنین کے لیے ہدایت اور بشارت کا سبب ہو اور اس کی داستانیں ہر طرح کی خرافات اور تحریف سے پاک ہوں[1]

حق بینی اور ایمان

انسانی زندگی کا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ وہ حقائق کو اسی طرح سمجھے جیسا کہ وہ ہیں اور ان کے بارے میں صحیح موقف رکھتا ہو۔ نظریات، خواہشات، انحرافی میلان اور حب و بغض حقائق کو صحیح طور پر دیکھنے اور سمجھنے میں مانع نہ ہوں اور فلسفہ کی جو سب سے اہم تعریف کی گئی ہے وہ بھی یہی ہے یعنی "حقائق کا ادراک جیسا کہ وہ ہیں"۔

یہی وجہ ہے کہ معصومین نے خداوندِ عالم سے جو اہم ترین تقاضا کیا ہے وہ بھی یہی ہے کہ:

اللهم ارنى الاشياء كما هى

خداوندا! حقائق اور موجودات کو ہمیں ویسے ہی دکھا جیسے وہ ہیں (تاکہ ہم اقدار کو صحیح معنوں میں سمجھ کر ان کا حق ادا کریں)۔

اور یہ حالت ایمان کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ سرکش خواہشات نفسانی اس راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ یہ رکاوٹیں تقویٰ کے بغیر اور خواہشاتِ نفسانی پر کنٹرول کیے بغیر دُور نہیں ہو سکتیں۔

اسی لیے ہم نے مندرجہ بالا آیات میں پڑھا ہے:

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہم ان کے بُرے اعمال کو زینت دیتے ہیں اور وہ سرگرداں ہو جاتے ہیں۔

اس کا ظاہری نمونہ ہم اپنی آنکھوں کے ساتھ اپنے دور کے دُنیا پرست افراد کی زندگی میں دیکھ رہے ہیں۔

وہ ایسی چیزوں پر فخر کرتے ہیں اور ایسے امور کو اپنے تمدن کا حصہ شمار کرتے ہیں جو درحقیقت ننگ و عار، گناہ اور رسوائی کے علاوہ

---

[1] "تلقیٰ" باب تفعیل کا فعل مضارع ہے اور مجہول کا صیغہ ہے جس کا ثلاثی مجرد کا صیغہ ایک مفعول کی طرف متعدی ہوتا ہے (لقی) اور ثلاثی مزید فیہ کا صیغہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہوتا ہے اس آیت میں خداوندِ عالم فاعل اور قرآن کا نازل کرنے والا ہے پیغمبر اکرمؐ مفعول اول ہیں اور قرآن مفعول دوم ہے۔ یہاں پر چونکہ فعل مجہول کی صورت میں آیا ہے لہٰذا پہلا مفعول نائب فاعل ہے اور دوسرا مفعول ظاہری طور پر ذکر ہوا ہے۔

Marfat.com

اور کچھ نہیں ہیں۔

وہ بے لگامی اور بے مہاری کو "آزادی" کی علامت،

عورتوں کی عریانی اور فحاشی کو "تہذیب" کا نشان،

مقابلۂ حسن کو "شخصیت" کی علامت،

مختلف گناہوں میں آلودگی کو "حریت" کی نشانی،

آدم کشی، جرائم کے ارتکاب اور تباہ کاری کو "طاقت" کی دلیل،

تخریب کاری اور دوسروں کے سرمایے کی لوٹ مار کو "نوآبادیات"،

ذرائع ابلاغ کو فحاشی اور اخلاق باختگی میں استعمال کرنے کو "احترام آدمیت"،

مظلوموں کے حقوق کی پائمالی کو "انسانی حقوق کا احترام"،

نشے کی عادت ڈالنے، ہوا و ہوس اور ننگ و رسوائی میں مبتلا کرنے کو "آزادی کی ایک صورت"،

دروغ، ٹھگ بازی اور لوٹ کھسوٹ اور ہر جائز و ناجائز ذریعے سے دوسروں کے مال و ثروت کے اصول کو "استعداد اور صلاحیت کی علامت"،

عدل و انصاف کے اصولوں کی پابندی اور دوسروں کے حقوق کے احترام کو "نااہلی اور نالائقی کی علامت"،

جھوٹ، وعدہ خلافی، دورنگی اور فریب کاری کو "سیاست" قرار دیتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ بُرے اور باعثِ ننگ و عار کاموں کو ان کی نظروں میں اس حد تک بنا سجا کر پیش کیا گیا ہے کہ یہی نہیں کہ وہ اس سے شرم محسوس نہیں کرتے بلکہ ان پر فخر بھی کرتے ہیں۔ جب صورتِ حال ایسی ہو تو واضح ہے کہ ایسی دنیا کا چہرہ مہرہ کیسا ہونا چاہیے اور یہ بھی معلوم ہے کہ جو راستہ وہ اختیار کیے ہوئے ہیں کہاں کو جا رہا ہے؟

Marfat.com

۷۔ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِاَهْلِهٖۤ اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ؕ سَاٰتِیْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ اٰتِیْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ ○

۸۔ فَلَمَّا جَآءَهَا نُوْدِیَ اَنْۢ بُوْرِكَ مَنْ فِی النَّارِ وَ مَنْ حَوْلَهَا ؕ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۹۔ یٰمُوْسٰۤى اِنَّهٗۤ اَنَا اللّٰهُ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○

۱۰۔ وَ اَلْقِ عَصَاكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّ لَمْ یُعَقِّبْ ؕ یٰمُوْسٰى لَا تَخَفْ ۫ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ○

۱۱۔ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

۱۲۔ وَ اَدْخِلْ یَدَكَ فِیْ جَیْبِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ ۫ فِیْ تِسْعِ اٰیٰتٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَ قَوْمِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ ○

۱۳۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ اٰیٰتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ○

۱۴۔ وَ جَحَدُوْا بِهَا وَ اسْتَیْقَنَتْهَاۤ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِیْنَ ○

ترجمہ

۷۔ اس وقت کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا: مجھے دُور سے آگ دکھائی دے رہی ہے (تم یہیں ٹھہرو) میں ابھی تمھارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا شعلہ تاکہ تم اسے تاپ سکو۔

۸۔ جب وہ آگ کے نزدیک پہنچے تو ایک آواز سنائی دی کہ بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے اور وہ جو اس کے اطراف میں ہے اور پاک و منزہ ہے وہ اللہ جو عالمین کا پروردگار ہے۔

Marfat.com

۹۔ اے موسیٰ! میں عزیز و حکیم اللہ ہوں۔

۱۰۔ تم اپنا عصا پھینک دو، جب اسے دیکھا تو وہ (جلدی کے ساتھ) چھوٹے چھوٹے سانپوں کی مانند اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے (تو وہ گھبرا گئے اور) واپس مُڑے اور پلٹ کر بھی نہ دیکھا، اے موسیٰ! ڈرو نہیں کہ رسول میرے حضور ڈرا نہیں کرتے۔

۱۱۔ مگر یہ کہ کسی نے ظلم کیا ہو اور پھر وہ برائی کو نیکی میں تبدیل کرے۔ تو (میں اس کی توبہ کو قبول کرتا ہوں اور) میں غفور و رحیم ہوں۔

۱۲۔ اور اپنا ہاتھ ذرا اپنے گریبان میں ڈالو، جب باہر نکلے گا تو چمکدار اور روشن ہوگا اور اس میں کوئی عیب نہیں ہوگا اور یہ ان نو معجزوں میں سے ہے جن کے ساتھ تم فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جاؤ گے، وہ فاسق اور سرکش لوگ ہیں۔

۱۳۔ اور جب ہماری روشنی عطا کرنے والی آیات ان کے پاس آئیں تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا جادو ہے

۱۴۔ اور ظلم و تکبر کی بناء پر ان کا انکار کیا حالانکہ دل میں ان کا یقین رکھتے تھے۔

تفسیر

موسیٰؑ آگ کے شعلے کی امید لے کر آئے

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ اس سُورت میں قرآنِ مجید کی اہمیت کو بیان کرنے کے بعد خدا کے پانچ عظیم انبیاء اور ان کی اقوام کے حالات کا تذکرہ ہے جن میں مومنین کی کامیابی اور کافروں کی سزا کا واضح طور پر وعدہ موجود ہے۔

سب سے پہلے خدا کے ایک اولوالعزم نبی جناب موسیٰ علیہ السلام کے واقعات بیان کیے گئے ہیں اور براہِ راست ان کی زندگی کے نہایت حساس لمحات کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ بات اس لمحے سے شروع ہوتی ہے جب وحی کی پہلی کرن ان کے دل پر پڑی اور وہ خداوندِ عالم کے پیغام اور کلام سے آشنا ہوئے۔ ارشاد ہوتا ہے: اس وقت کو یاد کیجیے جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا: مجھے دُور سے آگ دکھائی دی ہے (اذ قال موسیٰ لاھلہ انی اٰنست نارًا)[۱]
"تم یہیں پر ٹھہر جاؤ! میں ابھی تمھارے لیے کوئی خبر لاتا ہوں یا آگ کا شعلہ تاکہ تم اسے تاپ سکو (سآتیکم

۱۔ "اٰنست" "ایناس" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو آرام و اطمینان سے دیکھنا اور انسان کو انسان بھی اسی معنی میں کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

منها بخبر او اٰتیکم بشهاب قبس لعلکم تصطلون)[1]

اور یہ اس رات کا واقعہ ہے جب جناب موسیٰ علیہ السّلام اپنی زوجہ دختر شعیب کے ہمراہ مصر جا رہے تھے تو راستے میں ایک بیابان تاریک میں پھنس گئے اور انھیں رات پڑ گئی، راستہ کھو بیٹھے اور طوفانی ہوائیں چلنے لگیں پھر یہ کہ اسی وقت ان کی بیوی کو وضع حمل کی تکلیف شروع ہو گئی۔ جناب موسیٰ نے سردی دور کرنے کے لیے آگ کی بہت ضرورت محسوس کی لیکن اس بیابان میں کچھ بھی نہیں تھا اچانک انھیں دور سے آگ کا شعلہ نظر آیا تو بہت خوش ہوئے اور اسے انسانوں کی موجودگی کی دلیل سمجھا انھوں نے کہا میں جاتا ہوں یا تو تمھارے لیے کوئی خبر لاؤں گا یا پھر آگ کا شعلہ جسے تم تاپ سکو۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ موسیٰ فرماتے ہیں میں "تمھارے لیے کوئی خبر لاؤں گا یا آگ کا شعلہ ("تمھارے لیے" جمع کی ضمیر ہے) ہو سکتا ہے یہ اس لیے ہو کہ آپ کی بیوی کے علاوہ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی بچہ یا بچے ہوں کیونکہ مدین میں آپ کی شادی کو دس سال گزر چکے تھے یا پھر اس لیے کہ بیابان میں اس قسم کی گفتگو مخاطب کے بیشتر اطمینان اور سکون کا باعث بنتی ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے اہلِ خاندان کو وہیں پہ چھوڑا اور اس طرف کو چل دیئے جدھر آگ جلتی دیکھی تھی "جب اس کے نزدیک پہنچے تو آواز آئی بابرکت ہے وہ جو اس آگ میں ہے اور جو اس کے اطراف میں ہے اور پاک و منزہ ہے وہ اللہ جو عالمین کا پروردگار ہے (فلما جاءها نودی ان بورك من فی النار ومن حولها وسبحان الله رب العالمین)۔

"جو اس آگ میں ہے" اور "جو اس کے اطراف میں ہے" سے کون مراد ہے؟ مفسرین نے اس بارے میں کئی احتمال پیش کیے ہیں ان میں سے جو احتمال زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "جو آگ میں ہے" سے مراد جناب موسیٰ ہیں کیونکہ آگ کے وہ شعلے جو سبز درخت کے درمیان سے ظاہر ہو رہے تھے موسیٰ علیہ السّلام سے اس قدر نزدیک تھے کہ گویا وہ خود اس کے اندر تھے اور "جو اس کے اطراف میں ہے" سے مراد خداوند عالم کے مقرّب فرشتے ہیں جو اس خاص لمحے اس مقدس سرزمین کو گھیرے ہوئے تھے۔ یا پھر اس کے برعکس یعنی جو آگ میں ہیں سے مراد فرشتے ہیں اور جو اطراف میں ہے سے مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

بہرحال بعض روایات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السّلام آگ کے نزدیک پہنچے تو رک گئے اور خوب غور سے دیکھنے لگے تو نظر آیا کہ درخت کی سبز ٹہنی سے شعلۂ آتش بھڑک رہا ہے جوں جوں یہ شعلہ بڑھتا جا رہا ہے، سبز درخت مزید روشن اور خوبصورت ہوتا جا رہا ہے۔ نہ تو آگ کی حرارت درخت کو جلاتی ہے اور نہ ہی درخت کی رطوبت آگ کو بجھاتی ہے یہ منظر دیکھ کر وہ تعجب کرنے لگے۔ ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹہنی لیے ہوئے تھے وہاں سے آگ لینے کی غرض سے جھکے تو آگ خود بخود ان کی طرف آنے لگی،

---

[1] "شہاب" اس روشنی کے معنی میں ہے جو آگ کے ستون کی مانند چمکتی ہے اور جس روشنی میں بھی ستون کی مانند چمک ہو اسے "شہاب" کہا جاتا ہے اور دراصل شہاب ان سرگردان آسمانی پتھروں کو کہا جاتا ہے جو اطرافِ زمین میں پائی جانے والی ہواؤں سے نہایت تیزی کے ساتھ ٹکراتے ہیں تو ان سے آگ کے شعلے بلند ہوتے ہیں اور فضا میں آگ کا ستون بنا دیتے ہیں۔

"قبس" (قفس کے وزن پر) آگ کے اس شعلے کو کہتے ہیں جو آگ سے الگ کیا جاتا ہے۔

"تصطلون" "اصطلاء" کے مادہ سے ہے جس کا معنی آگ تاپنا ہے۔

Marfat.com

ڈر کر پیچھے ہٹے کبھی وہ آگ کی طرف بڑھتے اور کبھی آگ ان کی طرف لپکتی کہ اسی اثناء میں ایک اور آواز آئی اور انھیں وحی کی بشارت دی گئی ۔

مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام آگ سے اس قدر نزدیک تھے کہ " من فی النار " کے جملے کا مصداق بن گئے ۔

تیسری تفسیر جو اس جملہ کی بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ " من فی النار " سے مراد خدا کا نور ہے جو آگ کے شعلے میں جلوہ نمائی کر رہا تھا اور " من حولها " سے مراد جناب موسیٰ علیہ السلام ہیں جو اس شعلے کے نزدیک موجود تھے اور تمام صورتوں میں خدا کے بارے میں " جسم " ہونے کے تصوّر اور توہم کو دُور کرنے کے لیے آیت کے آخر میں " سبحان الله رب العلمین " کا جملہ لایا گیا ہے جو خدا کے ہر قسم کے عیب و نقص ، جسم و جسمانیت اور جسمانی عوارض سے مبرا ، منزہ اور پاک ہونے کو ظاہر کرتا ہے ۔

ایک بار پھر آواز بلند ہوئی اور موسیٰ کو مخاطب کر کے کہا : اے موسیٰ ! میں عزیز اور حکیم اللہ ہوں (یا موسٰی انه انا الله العزیز الحکیم) ۔

یہ جملہ اس لیے تھا تاکہ موسیٰ علیہ السلام سے ہر قسم کا شک و شبہ دُور کیا جا سکے اور وہ جان لیں کہ یہ خداوندِ عالم ہی ہے جو ان سے مخاطب ہے نہ کہ آگ کا شعلہ یا درخت ۔ وہ خدا جو " ناقابلِ شکست " اور " صاحب حکمت و تدبیر " ہے ۔

یہ تعبیر درحقیقت اس معجزے کے لیے مقدمہ کے طور پر ہے جو بعد والی آیت میں بیان ہو گا ۔ کیونکہ اعجاز بھی پروردگارِ عالم کی ان دو صفات کی وجہ سے منصۂ شہود پر آتا ہے ۔ ایک قدرت اور دوسری حکمت ۔ لیکن بعد والی آیت تک پہنچنے سے پہلے یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو کیسے یقین پیدا ہوا کہ یہ خدائی ندا ہے ، غیر خدا کی آواز نہیں ؟

تو اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ اس آواز کے ساتھ ایک روشن معجزہ بھی تو ہے اور وہ ہے سبز درخت کی ٹہنیوں میں سے آگ کے شعلے کا بلند ہونا ، جو اس بات کا زندہ گواہ تھا کہ یہ ایک خدائی امر ہے ۔

اس کے علاوہ اگلی آیت میں دیکھیں گے کہ اس آواز کے فوراً بعد موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے جس کے تحت وہ عصا اور ید بیضا کا معجزہ حاصل کرتے ہیں اور یہ دو سچے گواہ تھے اس آواز کی حقانیت اور صداقت پر ۔

ان سب سے قطع نظر قاعدہ کے مطابق خدائی آواز کی اپنی خصوصیت ہوتی ہے جو اسے تمام دوسری آوازوں سے ممتاز کرتی ہے اور جب انسان اسے سنتا ہے تو اس کے قلب و روح پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ اس کے ندائے الٰہی ہونے میں ذرہ بھر بھی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔

چونکہ رسالت کے امور بجا لانے کے لیے ظاہری قدرت و طاقت اور حقانیت کی سند کی ضرورت ہوتی ہے خاص کر جب امورِ رسالت کی ادائیگی فرعون جیسے ظالم اور جابر شخص کے سامنے ہو تو اس مقام پر حکم ہوتا ہے : اپنا عصا زمین پر پھینکو (و الق عصاك) ۔

موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر دے مارا تو اچانک وہ بہت بڑا سانپ بن گیا " جب موسیٰ علیہ السلام نے اس پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ رہا ہے تو ڈر کر واپس ہوئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا

Marfat.com

(فلما راٰھا تھتز کانھا جآن و لّٰی مدبرًا و لم یعقب)[1]

یہ احتمال بھی ہے کہ عصا پہلے تو چھوٹے سے سانپ میں تبدیل ہوا ہو پھر مختلف مراحل کے بعد بہت بڑے اژدہا میں تبدیل ہوگیا ہو۔

یہاں پر ایک بار پھر موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہوتا ہے: اے موسیٰ! ڈرو نہیں کیونکہ رسول میرے حضور ڈرا نہیں کرتے (یا موسٰی لا تخف انی لا یخاف لدی المرسلون)۔

یہ قرب پروردگار کا مقام ہے وہ پروردگار جو قادر و توانا ہے۔ یہ اس کی بارگاہ امن ہے۔ یہاں ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں پر خوف و ہراس کا وجود ہی نہیں ہے یعنی اے موسیٰ! تم عظیم پروردگار کے سامنے ہو اور اس کی ذات کے سامنے ہونے کا خاصہ یہ ہے کہ یہاں پر مطلق امن و سکون ہے۔

اسی طرح کی ایک اور تعبیر سورۂ قصص کی آیت ۳۱ میں بھی ہے:

یا موسٰی اقبل و لا تخف انک من الاٰمنین

اے موسیٰ! لوٹ جاؤ اور گھبراؤ نہیں کیونکہ تم امن میں آچکے ہو۔

لیکن بعد والی آیت میں "انی لا یخاف لدی المرسلون" کے جملے کا استثناء کرتے ہوئے فرمایا ہے مگر جن لوگوں نے ظلم کیا ہے پھر توبہ کر کے اپنے گناہوں کی تلافی کی ہے اور اپنی برائیوں کو نیکی میں تبدیل کر دیا ہے تو میں بھی غفور و رحیم ہوں (الا من ظلم ثم بدل حسنًا بعد سوٓء فانی غفور رحیم)۔

اس استثناء کا پہلے جملے سے کیا ربط ہے؟ مفسرین کی طرف سے اس میں دو مختلف نظریئے ہیں۔

پہلا تو یہ کہ گزشتہ آیت میں ایک محذوف موجود ہے اور وہ یہ کہ "پیغمبروں کے علاوہ دوسرے لوگ امان میں نہیں ہیں" پھر استثناء کر کے کہتا ہے مگر جن لوگوں نے ظلم و گناہ کے بعد توبہ کی اور اپنی اصلاح کر لی تو وہ بھی خدا کی حدودِ امن میں داخل ہو جائیں گے۔

دوسرا یہ کہ خود جملہ مذکورہ ہی سے استثناء ہے اور ظلم سے ترکِ اولیٰ کی طرف اشارہ ہے، جو کبھی کبھار انبیاء سے سرزد ہو جاتا ہے اور مقامِ عصمت کے بھی منافی نہیں ہے یعنی اگر انبیاء ترکِ اولیٰ کا ارتکاب کریں تو وہ بھی امن و امان میں نہیں ہیں اور خدا ان کا بھی سخت مواخذہ اور محاسبہ کرتا ہے جیسا کہ جناب آدم اور جناب نوح علیہما السلام کے بارے میں قرآنی آیات میں مذکور ہے۔

مگر وہ انبیاء جو اپنے ترکِ اولیٰ کی جانب فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اور خداوند کریم کے دامنِ محبت میں پناہ لیتے ہیں اور اپنے اعمالِ صالحہ اور حسنات کے ذریعے اس کی تلافی کرتے ہیں جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی داستان میں اس قبطی شخص کے قتل کا

---

[1] بعض مفسرین کا نظریہ ہے کہ "جان" دبی "جن" ہے جس کا معنی نہ دیکھی جانے والی مخلوق ہے کیونکہ چھوٹے اور باریک سانپ عموماً گھاس پھونس اور زمین کی دراڑوں میں چھپے رہتے ہیں اور اندر ہی اندر چلتے رہتے ہیں۔

Marfat.com

تذکرہ آتا ہے جس میں جناب موسیٰ علیہ السّلام نے اپنے ترکِ اولیٰ کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کی :

رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی

پروردگارا! میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے مجھے بخش دے (قصص / ۱۶)

پھر خدا نے انھیں دوسرا معجزہ دکھایا اور فرمایا اپنے ہاتھ کو اپنے گریبان میں لے جاؤ جب وہ نکلے گا تو چمک رہا ہو گا بغیر اس کے کہ اس میں کسی قسم کا عیب ہو (و ادخل یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء)۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ سفیدی ، برص کی بیماری کی وجہ سے پیدا ہونے والی نہیں بلکہ وہ نورانیت اور روشنی ہے جو بذاتِ خود ایک معجزے اور خارق العادت امر کے وجود پر دلالت کرتی ہے ۔

پھر موسیٰ علیہ السّلام پر مزید مہربانی کے طور پر اور راہِ راست سے انحراف کرنے والوں کے لیے ہدایت کے مزید امکانات کے لیے فرمایا گیا ہے : تمھارے معجزات صرف یہی دو نہیں بلکہ یہ دو ان نو معجزوں میں سے ہیں جنھیں لے کر تم فرعون اور اس کی قوم کی طرف بھیجے جاؤ گے کیونکہ وہ باغی اور فاسق لوگ چلے آرہے ہیں اور انھیں ایسی ہدایت و رہنمائی کی ضرورت ہے جس کے ہمراہ بہت بڑے معجزات ہوں (فی تسع اٰیات الی فرعون و قومہ انھم کانوا قوماً فاسقین)۔[۱]

اس آیت کے ظاہر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو معجزے بھی موسیٰ علیہ السّلام کے ان نو مشہور معجزوں میں شامل ہیں ، جو اللہ نے انھیں عطا کیے تھے۔ اس کے بارے میں ہم تفصیلی گفتگو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۱ کے ذیل میں کر چکے ہیں اور یہ واضح کر چکے ہیں کہ دوسرے سات معجزے یہ تھے : طوفان ، زرعی آفات ، ٹڈی دل ، مینڈکوں کی فراوانی اور دریائے نیل کے پانی کا خون کے رنگ میں تبدیل ہو جانا ، ان پانچ حوادث میں سے ہر ایک فرعون اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک تنبیہ تھی ، وہ جب بھی ان میں سے کسی مصیبت میں مبتلا ہوتے تو فوراً موسیٰ علیہ السّلام کے دامن سے وابستہ ہو جاتے تاکہ یہ بلائیں دُور ہوں ۔

دوسرے دو معجزات ایک تو "خشک سالی" اور دوسرا "میووں کی قلت" تھی ۔ جن کی طرف سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۰ میں ارشاد موجود ہے کہ :

و لقد اخذ نا اٰل فرعون بالسنین و نقص من الثمرات لعلھم یذکرون

ہم نے فرعون والوں کو خشک سالی اور میووں کی قلت میں مبتلا کر دیا تاکہ وہ سنبھل جائیں ۔

اس سلسلے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ کی جلد ۱۲ صفحہ ۲۷۷ (اُردو ترجمہ) ملاحظہ فرمائیں ۔

آخر کار جناب موسیٰ علیہ السّلام معجزے کے نہایت طاقتور ہتھیار سے مسلح ہو کر فرعون اور اس کے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے

---

[۱] "فی تسع اٰیات" میں جار اور مجرور یا تو "اذھب" سے متعلق ہیں یا پھر کسی ایسے عمومی فعل سے جو تقدیری ہوتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ "فی" کا لفظ "مع" کے معنی میں ہو اور "الی فرعون" بھی یا اسی مقدر جملے سے متعلق ہے یا پھر ایک اور مقدر جملے "انت مرسل بھا" سے متعلق ہے ۔

Marfat.com

اور انھیں دینِ حق کی طرف دعوت دی، قرآن مجید بعد والی آیت میں فرماتا ہے: جب ہماری روشنی عطا کرنے والی آیات ان کے پاس آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو بالکل کھلا جادو ہے (فلما جاء تھم اٰیاتنا مبصرة قالوا ھٰذا سحر مبین)۔

ہم جانتے ہیں کہ یہ تہمت تنہا جناب موسیٰ پر نہیں لگائی گئی بلکہ متعصب اور ہٹ دھرم لوگوں نے انبیاء کے ساتھ اپنی مخالفت کی توجیہ اور دوسروں کا راستہ روکنے کے لیے تمام انبیاء پر تہمت لگائی اور یہ ان کے مشن کی عظمت کی واضح دلیل ہے۔

جبکہ ہم جانتے ہیں کہ انبیاء کرام خداوندِ عالم کے برگزیدہ، حق طلب اور پارسا بندے تھے اور جادوگر تو منحرف، مادیت پرست اور ٹھگ قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ جادوگر ہمیشہ ایسا کام کرسکتے ہیں جو بالکل محدود ہوتا ہے اور انبیاء کے معجزات غیر محدود ہوتے ہیں اور ان کی دعوت کے مطالب اور ان کے تمام پروگرام حق وحقیقت پر مشتمل ہوتے ہیں ان کا اور جادوگروں کا کیا مقابلہ؟

اور پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن نے زیرِ نظر آیات کے آخر میں ایک اور اہم انکشاف کیا ہے اور وہ یہ کہ ان کے یہ اتہامات اس لیے نہیں تھے کہ وہ سچ مچ شک وشبہ میں مبتلا تھے بلکہ انھوں نے ان معجزات کا انکار ظلم اور تکبر کی وجہ سے کیا جبکہ ان کے دل میں مکمل یقین اور اطمینان تھا" (وجحدوا بھا و استیقنتھا انفسھم ظلمًا و علوًّا)۔

اس تعبیر سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ ایمان ایک علیحدہ حقیقت ہے اور علم ویقین علیحدہ حقیقتیں! اور یہ بات بالکل ممکن ہے کہ علم وآگاہی کے ہوتے ہوئے بھی انکار سرزد ہوتا رہے۔

دوسرے لفظوں میں ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ "حق کے آگے ظاہری اور باطنی دونوں صورتوں میں جھک جانا"

بنابریں اگر کوئی شخص کسی چیز کے متعلق یقین تو رکھتا ہے لیکن ظاہر یا باطن میں اس کے آگے جھکتا نہیں ہے تو اس پر اس کا ایمان نہیں ہے بلکہ وہ کافر اور منکر ہے اور یہ ایک لمبی بحث ہے جس سے فی الحال ہم انھی اشاروں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک حدیث میں کفر کی پانچ اقسام میں سے ایک کفر جحودی (انکاری کفر) بھی بتائی ہے اور "جحود" کے شعبہ جات میں سے ایک شعبہ یہ بتایا ہے:

ھوان یجحد الجاحد و ھو یعلم انه حق قد استقر عنده

اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کسی چیز کا انکار کرے جبکہ وہ جانتا ہو کہ وہ حق ہے اور یہ حق اس کے نزدیک ثابت بھی ہوچکا ہو۔

پھر امام نے اسی آیت کو ثبوت کے لیے تلاوت فرمایا[1]

اور یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ قرآن مجید نے فرعونیوں کے انکار کے اسباب دو بتائے ہیں: ایک ظلم اور دوسرے "بڑا بننے کی خواہش"

ممکن ہے کہ "ظلم" سے دوسروں کے حقوق غصب کرنے کی طرف اشارہ ہو اور "علوًّا" سے مراد ان کی بنی اسرائیل پر

---

[1] کافی جلد ۲ باب وجوہ الکفر ص ۲۸۷۔

Marfat.com

فوقیت طلبی ہو یعنی وہ دیکھ رہے تھے کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو تسلیم کرتے ہیں تو ان کے غلط مفادات خطرے میں پڑ جائیں گے اور ساتھ ہی وہ اپنے غلاموں یعنی بنی اسرائیل کی صف میں آکھڑے ہوں گے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی ان کے لیے قابل قبول نہ تھی۔

یا پھر "ظلم" سے مراد اپنی ذات پر ظلم ہے اور "علوًا" سے مراد دوسروں پر ظلم ہے۔ جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت ۹ میں آیا ہے:

بما كانوا بأياتنا يظلمون

اس لیے کہ وہ ہماری آیات پر ظلم کرتے تھے۔

بہرحال اسی آیت کے آخر میں ایک نہایت ہی مختصر مگر جامع فقرے کے ذریعے فرعون اور فرعون والوں کے انجام کو درس عبرت کے طور پر بیان کیا گیا ہے ان کے غرق اور نیست و نابود ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: دیکھیے مفسد لوگوں کا کیا انجام ہوا (فانظر كيف كان عاقبة المفسدين)۔

قرآن مجید نے اس مقام پر اس بات سے پردہ نہیں اٹھایا کیونکہ اس قوم کی عبرت ناک کہانی وہ دوسری آیات میں پڑھ چکے تھے اور اس مختصر سے اشارے سے وہ جو کچھ سمجھ سکتے تھے سمجھ لیا۔

ساتھ ہی یہ بھی بتاتے چلیں کہ فرعونیوں کی تمام برائیوں کو لفظ "مفسد" میں جمع کر کے بیان کر دیا گیا ہے کیونکہ ایک تو اس کا مفہوم جامع ہے اور دوسرے عقیدہ اور عمل کی تباہی دونوں اس میں شامل ہیں نیز انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی برائیوں کی طرف اشارہ اس میں موجود ہے۔ لفظ "افساد" میں ان کے تمام اعمال کو اکٹھا کر کے بیان کر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

۱۵۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

۱۶۔ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ۭ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ○

ترجمہ

۱۵۔ ہم نے داؤد اور سلیمان کو اچھا خاصا علم عطا کیا اور انھوں نے کہا اس خدا کے لیے حمد ہے جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی ہے۔

۱۶۔ اور سلیمان، داؤد کے وارث ہوئے اور اے لوگو! ہمیں پرندوں کی گفتگو کی تعلیم دی جا چکی ہے اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے اور یہ ایک کھلم کھلا فضیلت ہے۔

تفسیر

داؤدؑ اور سلیمانؑ کی حکومت

جناب موسیٰ علیہ السلام کی داستان کا ایک گوشہ بیان کرنے کے بعد خدا دو اور عظیم انبیاء "داؤد" اور "سلیمان" کے واقعات بیان کرتا ہے البتہ داؤد کے بارے میں ایک اشارہ سا ہے لیکن سلیمان کے بارے میں مفصل گفتگو ہے۔

ان دو انبیاء کی داستان کا یہ حصہ جناب موسیٰ کی داستان کے بعد اس لیے ذکر ہوا ہے کیونکہ یہ باپ بیٹا بھی بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے تھے ان کی اور دوسرے انبیاء کی تاریخ کا فرق یہ ہے کہ انھوں نے بنی اسرائیل کی فکری اور اجتماعی آمادگی کے پیش نظر ایک عظیم حکومت تشکیل دی اور اسی حکومت کے ذریعے دین الٰہی کو وسعت ملی لہٰذا یہاں پر دوسرے انبیاء کی نسبت گفتگو کا انداز بھی کچھ اور ہے۔ دوسرے انبیاء کے بارے میں ہے کہ انھیں اپنی قوم کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا یہاں تک کہ بعض کو تو ان کی قوم نے شہر بدر کر دیا لیکن یہاں پر ایسی چیزوں کا تذکرہ نہیں ہے۔ یہاں بات بالکل مختلف ہے۔

یہاں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر خداوند عالم کی طرف دعوت دینے والے افراد کو حکومت تشکیل دینے کی توفیق حاصل ہو جائے تو کس قدر مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور کس حد تک حالات سدھر سکتے ہیں؟

بہرحال یہاں پر علم، قدرت اور عظمت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔

Marfat.com

جن وانس سمیت تمام مخلوقات کے حکومتِ الٰہیہ کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا تذکرہ ہے۔
اس کے علاوہ پرندوں کا بھی اس حکومت کے تابع ہونے کا ذکر ہے۔
اور آخر میں منطقی اور مدلل دعوت کے ذریعے بُت پرستی کے خلاف زبردست معرکے اور پھر حکومت کی طاقت سے صحیح صحیح فائدہ اٹھانے کا تذکرہ ہوگا۔
یہی وہ امتیازات ہیں جو ان دو پیغمبروں کو دوسرے انبیاء سے جُدا کرتے ہیں۔
قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے علم عطا کرنے کے ذکر سے ان انبیاء کی داستان کا ذکر کیا ہے جو کسی صالح اور طاقتور حکومت کا بنیادی عنصر ہے، فرمایا گیا ہے: ہم نے داؤد اور سلیمان کو اچھا خاصا علم عطا فرمایا۔ (ولقد اٰتینا داؤد و سلیمان علمًا)۔
بعض مفسرین نے یہاں پر اپنے آپ کو خواہ مخواہ زحمت میں ڈالا ہے اور یہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس علم سے مراد کون سا علم ہے جو داؤد اور سلیمان کو عطا کیا گیا ہے۔
بعض مفسرین نے دوسری آیت کے قرینے سے قضا اور فیصلے کا علم مراد لیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے:

و اٰتیناہ الحکمۃ وفصل الخطاب

ہم نے داؤد کو حکمت عطا کی اور جھگڑوں کے ختم کرنے کا طریقہ بتایا۔ (ص / ۲۰)

و کلًّا اٰتینا حکمًا و علمًا

ہم نے ان میں سے ہر ایک (داؤد اور سلیمان) کو فیصلے کرنے کی قوت اور علم عطا کیا۔ (انبیاء / ۷۹)

بعض مفسرین نے انھی آیات میں موجود منطق الطیر (پرندوں کی زبان) کے قرینے سے پرندوں کے ساتھ گفتگو کا علم مراد لیا ہے۔
بعض دوسرے مفسرین نے قرآنی آیات کے قرینے سے زرہ وغیرہ کے بنانے کا علم مراد لیا ہے۔
لیکن ظاہر ہے کہ یہاں "علم" وسیع معنوں میں ہے جس میں توحید، مذہبی عقائد اور دینی قوانین کا علم بھی شامل ہے اور قضا کا علم بھی بلکہ وہ تمام علوم بھی جو اس طرح کی وسیع اور طاقتور حکومت کے لیے ضروری ہوتے ہیں کیونکہ کسی حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل جو عدل و انصاف کی بنیادوں پر قائم ہو اور آباد و آزاد ہو وہ ایک وسیع اور سرشار علم کے بغیر ناممکن ہے۔ اس طرح سے قرآن مجید نے انسانی معاشرے اور حکومت کی تشکیل میں علم کے مقام کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ معاشرے اور حکومت کے لیے اس کی حیثیت عمارت کے بنیادی پتھر کی سی ہے۔
اور اس کے بعد جناب داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السّلام کی زبانی یہ جملہ نقل کیا گیا ہے: اور انھوں نے کہا تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے (و قالا الحمد للہ الذی فضلنا علٰی کثیر من عبادہ المؤمنین)۔

Marfat.com

اور یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ "علم" کی عظیم نعمت کے فوراً بعد "شکر" کی بات آئی ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ ہر نعمت کا شکر لازم ہے اور شکر کی حقیقت یہ ہے کہ جس نعمت کو جس کام کے لیے خلق کیا گیا ہے اسے اسی کے لیے استعمال کیا جائے اور خدا کے ان دو عظیم پیغمبروں نے اپنے خداداد علم سے ایک حکومت الٰہیہ کو منظم کرنے میں بھرپور فائدہ اٹھایا۔

ضمنی طور پر ہم یہ بھی آپ کو بتاتے چلیں کہ انھوں نے اپنی دوسروں پر فضیلت کا معیار "علم" کو قرار دیا ہے نہ کہ اقتدار اور حکومت کو۔ نیز شکر بھی علم کی نعمت عطا ہونے پر ادا کیا ہے کیونکہ اگر کسی کی قدر و قیمت ہے تو علم سے ہے اور ہر قدرت و طاقت علم ہی سے میسر آتی ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ ایک باایمان قوم پر حکومت کرنے پر شکر ادا کر رہے ہیں کیونکہ فاسد اور بے ایمان لوگوں پہ حکومت کوئی قابلِ فخر بات نہیں ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیش آتا ہے کہ انھوں نے شکر کے موقع پر یہ کیوں فرمایا ہے کہ خدا نے ہمیں بہت سے مومنین پر فضیلت عطا فرمائی ہے یہ کیوں نہیں فرمایا تمام مومنین پر؟ جبکہ وہ اپنے دور کے تمام لوگوں سے افضل تھے۔

ممکن ہے کہ ان کے یہ الفاظ ادب اور انکساری کے پیشِ نظر ہوں کیونکہ ایسے انسان کبھی بھی اپنے آپ کو تمام دوسروں سے برتر نہیں سمجھتے۔

یا پھر اس لیے کہ انھوں نے کسی خاص زمانے کو مدِ نظر نہ رکھا ہو بلکہ تمام زمانے ان کے پیشِ نظر ہوں اور معلوم ہے کہ تاریخِ بشریت میں ان سے بھی عظیم کئی انبیاء گزرے ہیں۔

بعد والی آیت میں پہلے، حضرت داؤدؑ سے جناب سلیمانؑ کے وراثت پانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اور سلیمان، داؤد کے وارث ہوئے (وورث سلیمان داؤد)۔

یہاں پر "ارث" سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلے میں مفسرین کے درمیان مختلف آراء پائی جاتی ہیں:

بعض مفسرین اسے علم و دانش کی میراث سمجھتے ہیں کیوں کہ ان کی سمجھ کے مطابق انبیاء کی کوئی میراث نہیں ہوتی۔

بعض نے اسے مال اور حکومت کی میراث میں منحصر قرار دیا ہے کیونکہ اس کلمہ سے سب سے پہلے ذہن میں یہی معنی آتا ہے

بعض نے پرندوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے علم کو میراث بتایا ہے (منطق الطیر)۔

لیکن اگر آیت پر توجہ دی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ آیت مطلق ہے اور بعد والے جملوں میں علم کا بیان بھی آیا ہے اور دوسری نعمتوں کا بھی (او تینا من کل شیء) تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم آیت کے مفہوم کو محدود کر دیں۔ لہٰذا جناب سلیمان علیہ السّلام اپنے باپ کی ہر چیز کے وارث بنے۔

جو روایات اہلِ بیت اطہار علیہم السلام کے ذریعے سے ہم تک پہنچی ہیں ان سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلبیت علیہم السّلام کے سامنے جو بھی یہ کہتا کہ انبیاء اپنی میراث نہیں چھوڑتے اور "نحن معاشر الانبیاء لا نورث" (ہم انبیاء کا گروہ اپنی کوئی میراث نہیں چھوڑتے) سے استدلال کرتا تو وہ اس کے جواب میں یہی آیت تلاوت فرماتے اور اس سے یہ ثابت کرتے کہ مذکورہ حدیث چونکہ کتابِ خدا کے مخالف ہے لہٰذا قطعاً قابلِ اعتبار نہیں۔

Marfat.com

جو حدیث اہلِ بیت سے وارد ہوئی ہے اس میں ہے :

جب ابوبکر نے مصمم ارادہ کرلیا کہ فدک کو جناب فاطمہ سلام اللہ علیہا سے چھین لے اور یہ بات جناب فاطمہ تک پہنچی تو آپ ابوبکر کے پاس تشریف لے گئیں اور فرمایا :

افی کتاب اللہ ان ترث اباك و لا ارث ابی لقد جئت شیئا فریا ،فعلی عمد

ترکتم کتاب اللہ و نبذتموہ وراء ظھورکم اذ یقول، وورث سلیمان داؤد

کیا کتابِ خدا میں ہے کہ تم تو اپنے باپ کے وارث ہو لیکن میں اپنے باپ کی وارث نہ ہوں یہ تو عجیب بات ہے ! ! کیا تم نے کتاب اللہ کو جان بوجھ کر پسِ پشت ڈال دیا ہے ؟ جبکہ خدا فرماتا ہے کہ سلیمان داؤد کے وارث بنے [1]

پھر قرآن فرماتا ہے : سلیمان نے کہا اے لوگو ! ہمیں پرندوں کی گفتگو کی تعلیم دی گئی ہے (وقال یاایھا الناس علمنا منطق الطیر) ۔

اور ہمیں سب کچھ دیا گیا ہے ، اور یہ واضح اور روشن فضیلت ہے (واوتینا من کل شیءٍ ان ھٰذا لھو الفضل المبین) ۔

اگرچہ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ نطق اور بولنے کا لفظ انسان کے علاوہ کسی اور کے لیے صحیح نہیں البتہ مجازی معنی کی اور بات ہے لیکن اگر غیر انسان بھی اپنے منہ سے ایسی آواز اور الفاظ نکالیں جو معانی اور مطالب کو بیان کرتے ہوں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اسے نطق نہ کہیں ، کیونکہ " نطق " ہر وہ لفظ ہوتا ہے جو کسی حقیقت اور مفہوم کو بیان کرتا ہو [2]

البتہ ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ مخصوص آوازیں جو بعض جانور غم و غصّے کے وقت یا خوشی کے موقع پر یا درد و غم کے موقع پر یا اپنے بچوں سے پیار کے وقت نکالتے ہیں وہ بھی نطق ہے ایسا نہیں ہے بلکہ یہ ایسی آوازیں ہیں جو خاص حالت کے ساتھ منہ سے نکلتی ہیں لیکن جیسا کہ آگے چل کر آیات سے مفصل معلوم ہوگا کہ جناب سلیمان علیہ السلام ہُدہُد کے ساتھ معانی اور مطالب پر مبنی گفتگو کرتے ہیں ، اس کے ذریعے پیغام بھیجتے اور اسے پیغام کا جواب لانے کا حکم دیتے ہیں ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات ان آوازوں کے علاوہ جو ان کے حالات بیان کررہی ہوتی ہیں ، خداوندِ عالم کے حکم کے مطابق اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ خاص مواقع پر گفتگو کریں ۔ اسی طرح آئندہ آیات میں " چیونٹی " کی گفتگو کے بارے میں

---

[1] کتاب احتجاج طبرسی منقول از تفسیر نورالثقلین جلد ۴ ص ۷۵ ۔

[2] " ابن منظور " کتاب " لسان العرب " میں کہتے ہیں کہ نطق کا معنی گفتگو کرنا ہے ۔ پھر کہتے ہیں " وکلام کل شیءٍ منطقہ ومنہ قولہ تعالیٰ علمنا منطق الطیر " ہر چیز کا کلام اس کا نطق ہوتا ہے اور علمنا منطق الطیر والی آیت بھی اسی باب سے ہے پھر وہ علماءِ ادب میں سے ابن سیدہ سے یہ بات نقل کرتے ہیں (یہ جو کہتے ہیں کہ بات کرنا صرف انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے اس کے برخلاف) کبھی غیر انسان کے لیے بھی نطق کا استعمال ہوتا ہے ۔
اس نکتے کی طرف بھی توجہ لازمی ہے کہ علمائے منطق اور فلاسفہ کے نزدیک نطق اس قدرت فکر کو کہتے ہیں جو انسان کو بولنے کی طاقت عطا کرتی ہے ۔

Marfat.com

بھی بحث ہوگی۔

البتہ قرآن مجید میں بعض مقامات پر نطق اپنے وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے جو "نطق" کی روح اور نتیجہ کی حقیقت کو بیان کرتا ہے اور وہ ہے" مافی الضمیر کا بیان" اور یہ بیان خواہ الفاظ اور گفتگو کی صورت میں ہو یا دوسرے حالات کی صورت میں، جیسے یہ آیت ہے:۔

هٰذا کتابنا ینطق علیکم بالحق

یہ ہماری کتاب ہے جو حق بات تمھیں بتاتی ہے۔ (جاثیہ / ۲۹)

لیکن جناب سلیمان کی پرندوں کے ساتھ گفتگو کو اس معنی میں تفسیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ حضرت سلیمانؑ مندرجہ بالا آیات کے ظاہر کی رُو سے پرندوں کے خاص الفاظ کو سمجھ سکتے تھے جو وہ اپنا مطلب بیان کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور پرندوں کے ساتھ گفتگو بھی کر سکتے تھے۔

اس سلسلے میں مزید تفصیل انشاءاللہ چند اہم نکات کے ذیل میں آئے گی۔

"او تینا من کل شیءٍ" (ہمیں ہر چیز سے عطا کیا گیا ہے) یہ جملہ اس محدودیت کے خلاف ہے جس کے بعض مفسرین قائل ہیں کہ اس کا وسیع مفہوم ہے اور اس میں وہ تمام وسائل شامل ہیں جو مادی اور روحانی لحاظ سے حکومت الٰہیہ کی تشکیل کے لیے ضروری ہوتے ہیں اور اصولاً اس کے بغیر یہ کلام ناقص ہوگا اور گذشتہ آیات کے ساتھ اس کا کوئی واضح تعلق نہیں ہوگا۔

اس مقام پر فخر رازی نے ایک سوال پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ آیا" علمنا "اور" او تینا " (ہم کو تعلیم دی گئی، ہم کو عطا کیا گیا) متکبرین کا سا کلام نہیں ہے؟

پھر اس کا جواب بھی انھوں نے خود ہی دیا ہے اور وہ یہ کہ یہاں پر جمع کی ضمیر سے مراد خود جناب سلیمانؑ اور ان کے والد ہیں یا خود سلیمانؑ اور ان کے رفقائے حکومت ہیں اور یہ معمول ہے کہ جب کوئی سربراہِ مملکت گفتگو کرتا ہے تو جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ دین اور سیاست: بعض کوتاہ نظر یہ سمجھتے ہیں کہ دین وعظ و نصیحت یا انسان کی شخصی اور نجی زندگی کے مسائل کا نام ہے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے بلکہ دین مجموعہ ہے تمام قوانینِ حیات کا اور ایسا وسیع پروگرام ہے جو تمام انسانی زندگی خصوصاً اس کے اجتماعی مسائل کو اس کے اندر لیے ہوئے ہے۔

انبیاء کو اس لیے بھیجا گیا تاکہ وہ عدل کو قائم کریں۔ (حدید / ۲۵)

دین انسان کی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے اور بنی نوع انسان کی آزادی کے تحفظ کے لیے ہے۔

(سورۂ اعراف / ۱۵۷)

Marfat.com

دین، مستضعفین کو ظالموں کے چنگل سے آزاد کروانے اور ظالموں کا تسلط ختم کرنے کے لیے ہے ۔
مختصر یہ کہ دین تزکیہ نفس کی راہ پر تعلیم و تربیت کر کے انسان کامل بنانے کے لیے آیا ہے ۔ (جمعہ / ۲)
ظاہر ہے کہ یہ عظیم مقاصد حکومت تشکیل دیئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے ۔ کون شخص اخلاقی نصیحتوں کے ذریعے عدل و انصاف کا راج قائم کر سکتا ہے اور ظالموں کے ہاتھوں کو مظلوموں کے گریبانوں تک جانے سے کون شخص وعظ و نصیحت کے ذریعے روک سکتا ہے ؟
کون شخص غلاموں کے ہاتھوں سے غلامی کی زنجیریں طاقت کا سہارا لیے بغیر توڑ سکتا ہے ؟
جس معاشرے میں ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈہ مشینری فاسد اور مفسد لوگوں کے ہاتھ میں ہو، وہاں تعلیم و تربیت کے صحیح اصولوں کا نفاذ کون شخص کر سکتا ہے ؟ اور کون شخص اخلاقی فضائل کو انسان کے اندر اس کے بغیر پروان چڑھا سکتا ہے ۔
یہی وجہ ہے ہم کہتے ہیں کہ " دین " " سیاست " سے جدا نہیں ہے اور یہ دونوں ایسے عناصر ہیں جو ایک دوسرے کا اٹوٹ حصہ ہیں اگر دین سیاست سے جدا ہو جائے تو دین اپنا انتظامی بازو کھو دے گا ۔ اگر سیاست دین سے جدا ہو جائے تو ایک ایسے تخریبی عنصر میں تبدیل ہو جائیگی، جو خود سر لوگوں کے مفادات کی حفاظت کرے گی ۔
اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ آپ نے اپنے آسمانی دین کو دنیا بھر میں بڑی تیزی سے متعارف کروایا تو اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ آپ نے موقع ملتے ہی ایک حکومت تشکیل دی اور اسی حکومت الٰہیہ کے ذریعے آپ نے خدا کے بتائے ہوئے مقاصد کو عملی جامہ پہنایا ۔
اگر کچھ اور انبیاء کو بھی اس قسم کا موقع ملا تو انھوں نے بھی بہتر انداز میں دعوت حقہ پیش کی لیکن جو انبیاء مشکلات میں گھرے ہوئے تھے اور حالات نے انھیں حکومت تشکیل دینے کی اجازت نہیں دی تو وہ اپنی دعوت کو اس انداز میں پیش کر کے زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے ۔
۲ ۔ **نظام حکومت الٰہیہ :** ۔ کتنی جاذب نظر بات یہ ہے کہ جناب سلیمانؑ و داؤدؑ نے شرک اور بت پرستی کے آثار کا بہت جلد خاتمہ کر کے نظام الٰہی کا نفاذ کر دیا ۔ ایک ایسا نظام جس کا اصلی اور بنیادی عنصر علم و دانش اور مختلف شعبوں میں آگاہی ہے ۔
ایسا نظام جس کے تمام پروگراموں اور منصوبوں میں " خدا " کا نام سرفہرست ہے ۔
ایسا نظام جس میں تمام لائق عناصر سے استفادہ کیا گیا ہے ۔ حتیٰ کہ مقصد کے حصول کے لیے ایک پرندے سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ۔
ایسا نظام جس میں دیووں کو مقید کر دیا گیا اور ظالموں کو ٹھکانے لگا دیا گیا ۔
مختصر یہ ۔ ایسا نظام جس کے پاس فوجی طاقت بھی بہت حد تک تھی اور جاسوسی کے ذرائع بھی کافی تھے جو لوگ اقتصادیات اور پیداوار کے مختلف امور میں مہارت یا کافی حد تک واقفیت رکھتے تھے ان سب کو ایمان اور توحید کے پرچم تلے جمع کر دیا ۔
۳ ۔ **پرندوں کی بولی :** ۔ مندرجہ بالا آیات میں بھی اور آگے چل کر ہدہد اور سلیمان علیہ السلام کی داستان کے سلسلے کی آیات میں بھی، پرندوں کی گفتگو اور اس کے ادراک کے بارے میں واضح اشارہ موجود ہے ۔
اس میں شک نہیں کہ ـــــ دوسرے جانوروں کی مانند ـــــ پرندے بھی مختلف حالات میں مختلف آوازیں

Marfat.com

نکالتے ہیں کہ اگر غور وخوض سے کام لیا جائے تو ان کی آوازوں سے ان کی مختلف کیفیتوں کا پتہ چلایا جاسکتا ہے کہ کون سی آواز غصّے کی ہے اور کون سی خوشی کی کس آواز سے ان کی بھوک کا پتہ چلایا جاسکتا ہے، کس سے ان کی تمنّا کا، کس آواز سے وہ اپنے بچّوں کو بلاتے ہیں اور کس سے وہ انھیں وحشت ناک حادثے کی خبر دیتے ہیں ۔

اس حد تک تو پرندوں کی آواز میں کسی کو شک وشبہ نہیں اور ہم میں سے ہر ایک کم وبیش اس چیز سے آگاہ ہے ۔

لیکن اس سورت کی آیات ظاہراً اس سے بڑھ کر کچھ اور مطلب بیان کرتی ہیں۔ یہاں ان کے خاص انداز سے گفتگو کرنے کا ذکر ہے جس میں عجیب وغریب مطالب بیان ہوئے ہیں۔ ایک انسان کے ساتھ ان کے افہام وتفہیم کی بات کی گئی ہے اگرچہ یہ چیز بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن اگر ان مطالب کی طرف توجّہ کی جائے جسے پرندوں کے بارے میں ماہرین نے اپنی کتابوں میں تحریر کیا ہے اور اسی طرح جو چیزیں بعض لوگوں کے ذاتی مشاہدے میں آئی ہیں انھیں دیکھا جائے تو یہ بات قطعاً عجیب معلوم نہیں ہوگی ۔

ہم تو جانوروں خاص کر پرندوں کی فہم اور سمجھ کے بارے میں بھی اس سے بھی بڑھ کر عجیب وغریب معلومات رکھتے ہیں ۔

بعض جانور اور پرندے ایسے ہوتے ہیں جو اپنا گھر یا گھونسلا بنانے میں اس قدر ماہر ہیں کہ بعض مواقع پر ماہر انجینئروں پر بھی بازی لے جاتے ہیں۔

بعض پرندے اپنے آئندہ پیدا ہونے والے بچّوں کے مستقبل کے بارے میں اور ان کی ضروریات اور مشکلات کے سلسلے میں اس حد تک باخبر ہوتے ہیں اور ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے اس قدر کوشش کرتے ہیں کہ ہم سب کے لیے باعثِ حیرت ہے ۔

ان کی موسم کے بارے میں پیش گوئی حتیٰ کہ بعض اوقات تو وہ کئی ماہ پہلے ہی موسم کا اندازہ لگا لیتے ہیں ۔ ایسے پرندے بھی ہیں جو زلزلوں کی قبل از وقت اطلاع دے دیتے ہیں ۔ یہاں تک کہ خفیف ترین جھٹکوں کی اطلاع دینے والے آلات سے بھی بہت پہلے بتا دیتے ہیں ۔

دورِ حاضر میں حیوانات کو سدھا کر سرکسوں میں ان سے جو کام لیے جاتے ہیں انھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے کیونکہ وہ وہاں پر واقعاً محیّر العقول کارنامے سرانجام دیتے ہیں۔

"چیونٹیوں" کے حیرت ناک کارنامے اور ان کا حیران کن تمدّن !

"شہد کی مکھیوں" کے عجائبات زندگی اور ان کی حیرت انگیز سراغ رسانی !

"مہاجر پرندوں" کی عجیب وغریب معلومات اور اس قدر عظیم سفر کے درمیانی راستے سے باخبری کہ جن کی وجہ سے وہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کا درمیانی لیکن بہت طولانی فاصلہ طے کر لیتے ہیں ۔

سمندروں کی گہرائیوں کے بارے میں "آزاد مچھلیوں" کی بہت زیادہ معلومات کہ جن کے ذریعے وہ اجتماعی صورت میں سارا سال مختلف سمندروں میں گھومتی پھرتی ہیں، عمومی طور پر ایسے مسائل ہیں جو علمی لحاظ سے مسلّم ہیں اور ان کے ادراک یا جبلّت یا اسے جو بھی نام دیں پر بیّن دلیل ہے ۔

Marfat.com

بعض جانوروں کے بعض حواس قوی ہوتے ہیں جیسے چمگادڑ میں راڈار جیسی مشینری ہوتی ہے یا بعض حشرات کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے، بعض پرندوں کی نگاہیں بہت تیز ہوتی ہیں ۔ یہ سب چیزیں بھی اس بات کی دلیل ہیں کہ حیوانات وغیرہ تمام چیزوں میں ہم سے زیادہ پسماندہ نہیں ہیں۔

مندرجہ بالا امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مخصوص انداز میں گفتگو بھی کر سکتے ہیں اور جو ان کی گفتگو کے الفاظ اور طریقے سے واقف ہیں ان سے ہم کلام ہو سکتے ہیں۔

قرآنی آیات میں بھی مختلف عنوانات کے تحت اس امر کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ۔ مثلاً سورۂ انعام کی آیت ۳۸ میں ہے:

وما من دابة فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیه الا امم امثالکم

روئے زمین پر ایسا کوئی حرکت کرنے والا جانور اور اپنے دو پروں سے اڑنے والا کوئی پرندہ ایسا نہیں ہے جن کی تم جیسی امتیں نہ ہوں[۱]

روایات میں بھی بہت سی ایسی چیزیں موجود ہیں جو جانوروں، خاص کر پرندوں کی گفتگو پر دلالت کرتی ہیں حتی کہ ان میں سے ہر ایک کی زبان کو نعروں کی طرح کی بولی بتایا گیا ہے ۔ اگر اس کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی[۲]

ایک روایت میں ہے کہ جناب امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے عبداللہ بن عباس سے فرمایا:

ان الله علمنا منطق الطیر کما علم سلیمان بن داود، ومنطق کل دابة فی برا و بحر

خداوند عالم نے ہمیں پرندوں کی بولی کی بھی تعلیم دی ہے جس طرح سلیمان بن داؤد کو تعلیم دی تھی اور خشکی اور تری میں چلنے والی ہر مخلوق کی بولی بھی سکھائی ہے[۳]

۴۔ "لا دارث" حدیث :۔ اہل سنت کی مختلف کتابوں میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب ایک حدیث موجود ہے جو اس طرح کے مضمون پر مشتمل ہے ۔

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناه صدقة

ہم پیغمبر لوگ اپنی میراث نہیں چھوڑتے جو ہم سے رہ جائے اسے راہ خدا میں صدقے کے طور پر خرچ کر دیا جائے۔

اور بعض کتابوں میں "لا نورث" کا جملہ نہیں ہے بلکہ "ما ترکناه صدقة" کی صورت میں نقل کیا گیا ہے

اس روایت کی سند عام طور پر ابوبکر تک جا کر ختم ہو جاتی ہے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد مسلمانوں کی زمام امور

---

[۱] سورہ انعام کی آیت ۳۸ کے ذیل میں ایک اور تفصیلی گفتگو بھی ہے ۔ (ملاحظہ ہو تفسیر نمونہ جلد پنجم)

[۲] انہی آیات کے ذیل میں مزید معلومات کے لیے "تفسیر قرطبی" کا مطالعہ فرمائیے اور تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ،، کی طرف رجوع فرمائیں۔

[۳] مذکورہ حوالہ۔

Marfat.com

اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ اور جب حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا یا پیغمبر اکرمؐ کی بعض بیویوں نے ان سے پیغمبرؐ کی میراث کا مطالبہ کیا تو انھوں نے اس حدیث کا سہارا لے کر انھیں میراث سے محروم کر دیا۔

اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح (جلد ۳ کتاب الجہاد والسیر ص ۱۳۷۹) میں بخاری نے جزو ہشتم کتاب الفرائض کے صفحہ ۱۸۵ پر اور اسی طرح بعض دیگر افراد نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ مذکورہ کتابوں میں سے بخاری میں بی بی عائشہ سے ایک روایت نقل کی گئی ہے:

فاطمہ زہرا علیہا السّلام اور جناب عباس بن عبدالمطلب (رسول اللہ کی وفات کے بعد) ابوبکر کے پاس آئے اور ان سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔ اس وقت انھوں نے اپنی فدک کی اراضی اور خیبر سے ملنے والی میراث کا مطالبہ کیا تو ابوبکر نے کہا کہ میں نے رسولِ خدا (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم) سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا: "ہم میراث میں کوئی چیز نہیں چھوڑ جاتے، جو کچھ ہم سے رہ جائے وہ صدقہ ہوتا ہے"۔

جناب فاطمہ زہراؑ نے جب یہ سنا تو ناراض ہو کر وہاں سے واپس آگئیں اور مرتے دم تک ان سے بات نہیں کی[1]

البتہ یہ حدیث مختلف لحاظ سے تجزیہ و تحلیل کے قابل ہے لیکن اس تفسیر میں ہم چند ایک نکات بیان کریں گے:

۱۔ یہ حدیث، قرآنی متن کے مخالف ہے اور اس اصول اور کلیہ قاعدہ کی رُو سے ناقابلِ اعتبار ہے کہ جو بھی حدیث کتاب اللہ کے مطابق نہ ہو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور ایسی حدیث کو پیغمبر اسلامؐ یا دیگر معصومین علیہم السّلام کا قول سمجھ کر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ہم مندرجہ بالا آیات میں پڑھ چکے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السّلام جناب داؤد علیہ السّلام کے وارث بنے اور آیت کا ظاہر مطلق ہے کہ جس میں اموال بھی شامل ہیں۔ جناب یحییٰ اور حضرت زکریا علیہما السّلام کے بارے میں ہے:

یرثنی ویرث من اٰل یعقوب

خداوندا! مجھے ایسا فرزند عطا فرما جو میرا اور آلِ یعقوب کا وارث بنے۔ (مریم / ٦)

حضرت "زکریا" کے بارے میں تو بہت سے مفسرین نے مالی وراثت پر زور دیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں "وراثت" کی آیات کا ظاہر بھی عمومی ہے کہ جو بلا استثناء سب کے لیے ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اہلِ سنت کے مشہور عالم علامہ قرطبی نے مجبور ہو کر اس حدیث کو غالب اور اکثر عمل کی حیثیت سے قبول کیا ہے نہ کہ عمومی کلیے کے طور پر، اور اس کے لیے یہ مثال دی ہے کہ عرب ایک جملہ کہتے ہیں:

(انا معشر العرب اقری الناس للضیف)

---

[1] صحیح بخاری جزو ۸ ص ۱۸۵۔

Marfat.com

ہم عرب لوگ دوسرے تمام افراد سے بڑھ کر مہمان نواز ہیں (حالانکہ یہ کوئی عمومی حکم نہیں ہے)۔[1]

لیکن ظاہر ہے کہ یہ بات اس حدیث کی اہمیت کی نفی کر رہی ہے کیونکہ حضرت سلیمان اور حضرت یحییٰ کے بارے میں اس قسم کا عذر قبول کرلیں تو پھر دوسرے کے بیے بھی یہ قطعی نہیں رہ جاتی۔

۲۔ مندرجہ بالا روایت ان دوسری روایات کے خلاف ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوبکر نے جناب فاطمہ زہرا کو فدک واپس لوٹانے کا پختہ ارادہ کرلیا تھا لیکن دوسرے لوگ اس میں حائل ہوگئے تھے چنانچہ سیرت حلبی میں ہے

فاطمہ بنت رسولؐ، ابوبکر کے پاس اس وقت آئیں جب وہ منبر پر تھے۔ انھوں نے کہا:

اے ابوبکر! کیا یہ چیز قرآن مجید میں ہے کہ تمھاری بیٹی تمھاری وراثت لے لیکن میں اپنے باپ کی میراث نہ لوں؟

یہ سن کر ابوبکر رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے پھر وہ منبر سے نیچے اترے اور فدک کی واپسی کا پروانہ فاطمہ کو لکھ دیا۔ اسی اثناء میں عمر آگئے۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا کہ میں نے یہ تحریر لکھ دی ہے تاکہ فاطمہ کو ان کے باپ سے ملنے والی وراثت واپس لوٹا دوں!

عمر نے کہا: اگر آپ یہ کام کریں گے تو پھر دشمنوں کے ساتھ جنگی اخراجات کہاں سے پورے کریں گے؟ جبکہ عربوں نے آپ کے خلاف قیام کیا ہوا ہے۔ یہ کہا اور تحریر لے کر اسے پارہ پارہ کر دیا۔[2]

یہ کیونکر ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے تو صریحی طور پر ممانعت کی ہو اور ابوبکر اس کی مخالفت کی جرأت کریں؛ اور پھر عمر نے جنگی اخراجات کا تو سہارا لیا لیکن پیغمبر اکرمؐ کی حدیث پیش نہیں کی۔

مندرجہ بالا روایت پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پر پیغمبر اسلام کی طرف سے ممانعت کا سوال نہیں تھا، بلکہ سیاسی مسائل آڑے تھے اور ایسے موقع پر معتزلی عالم ابن ابی الحدید کی گفتگو یاد آجاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

میں نے اپنے استاد علی بن فارقی سے پوچھا کہ کیا فاطمہ اپنے دعویٰ میں سچی تھیں؟ تو انھوں نے کہا جی ہاں! پھر میں نے پوچھا تو ابوبکر نے انھیں فدک کیوں نہ دیا، جب کہ وہ انھیں سچا اور برحق بھی سمجھتے تھے۔

اس موقع پر میرے استاد نے معنی خیز تبسم کے ساتھ نہایت ہی لطیف اور پیارا جواب دیا حالانکہ ان کی مذاق کی عادت نہیں تھی، انھوں نے کہا:

لو اعطاها الیوم فدك بمجرد دعواها لجاءت الیه غدًا وادعت لزوجها الخلافة! و زحزحته عن مقامه ولم یمکنه الاعتذار والموافقة بشیء

---

[1] تفسیر قرطبی جلد ۷، ص ۴۰۸۰۔

[2] سیرت حلبی جلد ۳ ص ۳۹۱۔

Marfat.com

اگر وہ آج انھیں صرف ان کے دعویٰ کی بناء پر ہی فدک دے دیتے تو پھر کل اپنے شوہر کی خلافت کا دعویٰ دائر کرکے ابوبکر کو ان کے مقام سے متزلزل کردیتیں تو پھر نہ تو ان کے بیے کسی عذر کی گنجائش باقی رہتی اور نہ ہی ان سے موافقت کا امکان[1]

۲۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی ایک مشہور حدیث ہے جسے شیعہ اور سنی میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، حدیث یہ ہے:

العلماء ورثة الانبياء

علماء، انبیاء کے وارث ہوتے ہیں[2]

نیز یہ قول بھی آنحضرتؐ ہی سے منقول ہے:

ان الانبياء لم يورثوا دينارًا ولا درهمًا

انبیاء اپنی میراث میں نہ تو دینار چھوڑتے ہیں اور نہ ہی درہم[3]

ان دونوں حدیثوں کو ملا کر پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو یہ بات باور کرائیں کہ انبیاء کے لیے سرمایہ افتخار ان کا علم ہے اور اہم ترین چیز جو وہ یادگار کے طور پر چھوڑ جاتے ہیں ان کا ہدایت و راہنمائی کا پروگرام ہے اور جو لوگ علم و دانش سے زیادہ بہرہ مند ہوں گے وہی انبیاء کے اصلی وارث ہوں گے۔ بجائے اس کے کہ ان کی مال پر نگاہ ہو اور اسے یادگار کے طور پر چھوڑ جائیں۔ اس کے بعد اس حدیث کو نقل بہ معنی کردیا گیا اور اس کی غلط تعبیریں کی گئیں اور شاید "ما ترکناه صدقة" والے جملے کا بعض روایات میں اس پر اضافہ کردیا گیا۔

اس مقام پر ہم اپنی بحث کو اہل سنت کے مشہور مفسر فخر رازی کی اس گفتگو پر ختم کرتے ہیں جو انھوں نے سورۂ نساء کی آیت ۱۱ کے ضمن میں کی ہے تاکہ بات زیادہ لمبی نہ ہوجائے۔ فخر رازی لکھتے ہیں:

> "اس آیت (اولاد کی وراثت والی آیت) کی منجملہ اور تخصیصات کے ایک تخصیص وہ چیز ہے، جو اکثر مجتہدین (اہل سنت) کا مذہب ہے کہ انبیائے کرام اپنی وراثت کے طور پر کچھ نہیں چھوڑ جاتے لیکن (عمومی طور پر) شیعوں نے اس بات کی مخالفت کی ہے۔ روایت میں ہے کہ جب فاطمہ (علیہا السلام) نے اپنی وراثت کا مطالبہ کیا تو ان لوگوں نے اس حدیث کے ذریعے انھیں اپنی وراثت سے محروم کردیا کہ "نحن معاشر الانبياء لا نورث ما ترکناه صدقة" یعنی ہم پیغمبر لوگ کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں صدقہ ہوتا ہے۔

---

[1] شرح نہج البلاغہ، ابن ابی الحدید جلد ۱۶ ص ۲۸۴۔

[2] صحیح ترمذی باب العلم حدیث ۱۹ و سنن ابن ماجہ مقدمہ حدیث ۱۷۔

[3] اصول کافی جلد اول باب صفة العلم حدیث ۲۔

Marfat.com

تو اس موقع پر جناب فاطمہ نے (اولاد کی وراثت والی) عمومی آیت سے استدلال پیش کیا گویا وہ اس طرح سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں کہ قرآن کے عمومی حکم کو خبر واحد کے ساتھ محدود نہیں کیا جا سکتا۔

فخر رازی آگے کہتے ہیں کہ شیعہ کہتے ہیں کہ:

بالفرض اگر مان بھی لیا جائے کہ قرآن کو خبر واحد کے ذریعے محدود کیا جا سکتا ہے تو یہاں پر تین دلیلوں کی وجہ سے تخصیص جائز نہیں۔

پہلی بات یہ کہ:۔ قرآن مجید واضح طور پر کہہ رہا ہے کہ زکریا نے خدا سے درخواست کی کہ وہ انھیں ایسا فرزند عطا کرے جو ان کا اور آل یعقوب کا وارث بنے! اسی طرح قرآن ایک اور مقام پر کہتا ہے کہ سلیمان نے داؤد سے وراثت پائی۔ چونکہ ان آیات کو علم اور دین جیسی وراثت پر لاگو نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس قسم کی وراثت مجازی وراثت کہلاتی ہے اس لیے کہ ان انبیاء نے اپنی اولاد کو علم اور دین کی تعلیم دی نہ یہ کہ یہ چیزیں وراثت کے طور پر حاصل کر کے اپنی اولاد کو ان کا وارث بنا دیا۔

وراثت حقیقی صرف اور صرف مال ہی میں تصور کی جا سکتی ہے (جو کسی سے حاصل کیا جائے اور دوسروں کو دیا جائے)۔

دوسری بات یہ ہے کہ:۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جس مسئلہ کی ابوبکر کو ضرورت ہی نہیں تھی اس سے تو وہ آگاہ ہوں لیکن فاطمہ، علی اور عباس جو عظیم ترین زاہد اور عالم تھے اور پیغمبر اسلام کی وراثت سے بھی انھیں سروکار تھا، اس سے بالکل بے خبر ہوں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پیغمبر اسلام یہ حدیث اس شخص کو تو تعلیم دیں جسے ضرورت نہ ہو اور ان سے مخفی رکھیں جنھیں اس کی ضرورت ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ:۔ "ماترکناہ صدقۃ" والا جملہ "لا نورث" کے بعد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جن اموال کو ہم نے صدقہ قرار دیا ہے وہ میراث کے دائرہ میں نہیں آتے کیونکہ وہ صدقہ کے ساتھ مخصوص ہو جاتے ہیں نہ کہ تمام اموال!

پھر فخر رازی مذکورہ بالا مشہور استدلالات کا مختصر سا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"فاطمہ زہرا نے جب ابوبکر کے ساتھ بات چیت کی تو اس پر راضی ہو گئیں۔

اس کے علاوہ اجماع بھی اس بات پر ہے کہ ابوبکر کی بات صحیح تھی[1]

[1] تفسیر فخر رازی جلد ۹ ص ۲۱۰۔

Marfat.com

لیکن ظاہر ہے کہ فخر رازی کا یہ استدلال قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی ابھی اہل سنت کی مشہور اور معتبر کتابوں سے ثابت کر آئے ہیں کہ فاطمہ زہرا علیہا السلام نہ صرف یہ کہ ابوبکر سے راضی نہیں ہوئیں بلکہ اس قدر ان پر ناراض ہوئیں کہ مرتے دم تک ان سے گفتگو نہیں کی۔

اس سے قطع نظر، یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی ایسے مسئلہ پر اجماع قائم ہو جائے جس میں وحی کے زیرِ سایہ تربیت پانے والے افراد علی و زہرا علیہما السلام اور جناب عباس جیسی شخصیتیں نہ صرف شریک ہی نہیں بلکہ مخالف بھی ہیں۔

Marfat.com

۱۷۔ وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ وَالطَّيْرِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○

۱۸۔ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَوْا عَلٰى وَادِ النَّمْلِ ۙ قَالَتْ نَمْلَةٌ يّٰۤاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ ۚ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ ۙ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○

۱۹۔ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْۤ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰى وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِيْنَ ○

ترجمہ

۱۷۔ سلیمان کے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر ان کے پاس جمع ہوئے اور وہ اس قدر زیادہ تھے کہ آپس میں ملحق ہونے کے لیے انھیں توقف کرنا پڑتا۔

۱۸۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ چیونٹیوں کی سرزمین کی طرف آنکلے تو ایک چیونٹی نے کہا "اے چیونٹیو! تم اپنے بلوں میں گھس جاؤ، کہیں سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں بے خبری میں روند نہ ڈالے۔

۱۹۔ (سلیمان) اس کی بات پر مسکرا دیئے اور ہنس کر کہا: پروردگارا! جو نعمتیں تونے مجھے اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں مجھے ان کے شکر کی توفیق عطا فرما اور مجھے توفیق دے کہ میں وہ عمل صالح انجام دوں جو تیری رضا کا سبب بنے اور مجھے اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں کے زمرے میں داخل فرما۔

تفسیر

حضرت سلیمانؑ وادی نمل میں

اس سورت کی اور سورۂ سبا کی آیات سے یہ بات بخوبی سمجھی جاتی ہے کہ حضرت سلیمان کی داستانِ حکومت کوئی عام سا

Marfat.com

واقعہ نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف قسم کی غیر معمولی باتیں ہیں اور بہت سے معجزات پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اسی سورت میں بیان ہوئے ہیں: مثلاً جناب سلیمانؑ کا جنوں اور پرندوں پر حکومت کرنا، چیونٹیوں کا کلام سمجھ لینا اور ہُدہُد سے ہم کلام ہونا، اسی طرح کچھ واقعات سورہ سبا میں بیان ہوئے ہیں۔

درحقیقت خداوند عالم نے ایسی عظیم حکومت کے قیام اور اتنی عظیم طاقتیں جناب سلیمانؑ کے لیے مسخر کرکے اپنی قدرت کا مظاہرہ فرمایا ہے اور ایک موحد انسان کے نزدیک قدرت خدا کے آگے یہ کام بالکل آسان ہے۔

انھی آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: سلیمان کے جنوں، انسانوں اور پرندوں کے لشکر ان کے پاس جمع ہوگئے (وحشر لسلیمان جنودہ من الجن والانس والطیر)۔

لشکر والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ نظم وضبط کو برقرار رکھنے کے لیے حکم دیا جاتا کہ "اگلی صفوں کو روکے رکھیں اور پچھلی صفوں کو چلاتے رہیں تاکہ سب مل کر حرکت کریں (فھم یوزعون)۔

"یوزعون" "وزع" (بروزن "جمع") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے روکنا۔ اور جب اس کا اطلاق فوج اور لشکر وغیرہ پر ہو تو اس کا مطلب ہے کہ لشکر کے اگلے حصے کو روکے رکھیں تاکہ پچھلے حصے کے فوجی بھی اس کے ساتھ آملیں، اور افتراق وبدنظمی پیدا نہ ہو۔

"وزع" کسی چیز کے بارے میں لالچ کرنے اور اس کے ساتھ ایسا زبردست تعلق پیدا کرنے کے معنی میں ہے جو انسان کو دوسرے کاموں سے روک دے۔

اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمان کا لشکر تعداد میں زیادہ تھا اور خاص نظم وضبط کے تحت حرکت کرتا تھا۔

"حشر" "حشر" (بروزن "نشر") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کثیر تعداد کے افراد کو اپنے ٹھکانوں سے نکال کر میدان جنگ وغیرہ کی طرف لے چلنا۔ اس سے اور اسی طرح بعد والی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان نے کسی علاقے پر لشکر کشی کی تھی لیکن اس لشکر کشی کی تفصیل واضح طور پر معلوم نہیں ہے۔ چونکہ بعد والی آیت "وادی نمل" کے بارے میں گفتگو کرتی ہے لہٰذا بعض مفسرین نے اس آیت سے یہ سمجھا ہے کہ وہ "وادی النمل" (چیونٹیوں کی سرزمین) طائف کے قریب کا علاقہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ وہ شام کے نزدیک کی سرزمین ہے۔

لیکن چونکہ اس موضوع کے بیان میں کوئی اخلاقی یا تربیتی پہلو نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا آیت میں اس بارے میں مزید گفتگو نہیں ہوئی۔

بعض مفسرین نے اس بارے میں بھی اختلاف کیا ہے کہ کیا تمام جن وانس اور پرندے حضرت سلیمان کے لشکر میں شامل تھے (ایسی صورت میں آیت میں مذکور "من" "بیانیہ ہوگا") یا ان میں سے کچھ افراد لشکر میں شامل تھے (تو ایسی صورت میں "من" "تبعیض" کا ہوگا)۔ یہ ایک اضافی بحث معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس بات میں شک نہیں کہ جناب سلیمان علیہ السلام کی تمام روئے زمین پر حکومت نہیں تھی بلکہ ان کی حکومت میں شام، بیت المقدس اور شاید اس کے اطراف کا کچھ علاقہ شامل تھا۔

Marfat.com

حتیٰ کہ بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں آپ نے یمن کی سرزمین پر بھی تسلط حاصل نہیں کیا تھا بلکہ "ہُدہُد" کے واقعے اور ملکہ سباء کے ایمان لانے کے بعد آپ نے وہاں غلبہ پایا۔

"تفقد الطیر" سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمان کے زیر فرمان پرندوں میں ایک ہُدہُد بھی تھا جب سلیمان علیہ السلام نے اسے غیر حاضر پایا تو اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی اگر تمام پرندے ہوتے جن میں ہزاروں کی تعداد میں ہُدہُد بھی ہوتے اور ان میں سے ایک یہ پرندہ بھی تو یہ تعبیر صحیح نہ ہوتی۔ (غور کیجیے گا)

بہرحال جناب سلیمانؑ اس عظیم لشکر کے ساتھ چلے حتیٰ کہ چیونٹیوں کی سرزمین پر پہنچ گئے (حتّٰی اذا اتوا علی واد النمل)۔

یہاں پر چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی نے دوسری چیونٹیوں سے مخاطب ہو کر کہا:

"اے چیونٹیو! اپنے اپنے بلوں میں چلی جاؤ تاکہ سلیمان اور ان کا لشکر تمھیں بے خبری میں پامال نہ کر دے (قالت نملۃ یا ایھا النمل ادخلوا مساکنکم لا یحطمنکم سلیمان وجنودہ و ھم لا یشعرون)۔[1]

اس سرزمین میں جناب سلیمانؑ اور ان کے لشکر کی آمد سے چیونٹی کیونکر مطلع ہوئی اور اس نے اپنی آواز دوسری چیونٹیوں تک کیونکر پہنچائی، اس بارے میں تفصیلی گفتگو انشاء اللہ نکات کی بحث میں آئے گی۔

البتہ ضمنی طور پر اس جملے سے یہ استفادہ ہوتا ہے کہ سلیمان کی عدالت چیونٹیوں تک پر آشکار ہو گئی کیونکہ اس جملے کا مفہوم یہ ہے کہ اگر وہ اس بات کی طرف متوجہ ہوں تو ایک کمزور سی چیونٹی کو بھی پامال کرنا گوارا نہیں کرتے چنانچہ اگر وہ پامال کرتے ہیں تو ان کی اس طرف توجہ نہیں ہوتی!

سلیمان یہ سن کر مسکرا دیئے اور ہنسے (فتبسم ضاحکا من قولھا)۔

حضرت سلیمان کس وجہ سے ہنسے؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ظاہر امر یہ ہے کہ بذاتِ خود یہ قضیہ ایک عجیب چیز تھی کہ ایک چیونٹی اپنے ساتھیوں کو سلیمان کے عظیم لشکر سے آگاہ کرے اور اس کی بے توجہی کا ذکر کرے اور یہی عجیب امر جناب سلیمان کے ہنسنے اور مسکرانے کا سبب بنا۔

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کی یہ ہنسی خوشی کی ہنسی تھی کیونکہ آپ کو معلوم ہو گیا کہ چیونٹی تک کی مخلوق ان کی اور ان کے لشکر والوں کی عدالت اور تقویٰ کا اعتراف کرتی ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آپ کی خوشی کا سبب یہ تھا کہ خداوندِ عالم نے انھیں اس قدر قدرت عطا فرمائی ہے کہ لشکر عظیم کے شور و غل کے باوجود وہ چیونٹی جیسی مخلوق کی آواز سے غافل نہیں ہیں۔

---

[1] بعض مفسرین نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ "نملۃ" میں "تا" بیانِ وحدت کے لیے ہے اور نمل کو ظاہر کلمہ کی رعایت سے مؤنث لایا گیا ہے۔

Marfat.com

بہر حال وجہ خواہ کچھ بھی ہو اس موقع پر جناب سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں چند معروضات پیش کیں ۔

پہلی یہ کہ خداوندا! جو نعمتیں تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہیں ان کا شکر کرنے کا طریقہ مجھے سکھا دے ۔
(وقال رب اوزعنی ان اشکر نعمتک التی انعمت علیّ وعلیٰ والدی)[۱]

تاکہ میں اپنی ان تمام عظیم نعمتوں کو تیری اس راہ میں بروئے کار لاؤں جس میں تیری خوشی اور رضا ہے اور میں جادۂ حق سے انحراف نہ کروں کیونکہ ان تمام نعمتوں کا شکر تیری امداد اور نصرت کے بغیر ناممکن ہے ۔

دوسری یہ کہ " مجھے توفیق عطا فرما تاکہ ایسا نیک عمل بجالاؤں کہ جس سے تو راضی ہو (وان اعمل صالحا ترضاہ)۔

کیونکہ میرے لیے یہ لشکر و سپاہ اور حکومت و سلطنت کوئی اہمیت نہیں رکھتے ۔ اہم چیز یہ ہے کہ میں ایسے نیک اعمال بجا لاؤں جس سے تو راضی ہو۔ چونکہ "اعمل" فعل مضارع کا صیغہ ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جناب سلیمان نے دائمی توفیق کی درخواست کی ہے ۔

آخر میں تیسری عرض داشت یہ پیش کی کہ پروردگارا! مجھے اپنی رحمت کے ساتھ اپنے صالح بندوں کے زمرے میں شامل فرما
(وادخلنی برحمتک فی عبادک الصالحین)۔

چند اہم نکات

ا۔ جناب سلیمانؑ کا جانوروں کی بولی جاننا :۔ حیوانات کی دنیا کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں اور اس بارے میں تمام ترقی کے باوجود ابھی تک اس پر شک و ابہام کے پردے پڑے ہوئے ہیں ۔

البتہ بہت سے کاموں میں ہم ان کی فہم، سمجھ اور مہارت کے آثار ضرور دیکھتے ہیں ۔

شہد کی مکھیوں کا گھر بنانا، شہد کے چھتے کا منظم و مضبوط کرنا، چیونٹیوں کا موسم سرما کی ضروریات کے لیے اپنی غذا کو ذخیرہ کرنا، جانوروں کا دشمن سے اپنا دفاع کرنا، حتیٰ کہ ان کا بہت سی بیماریوں کے علاج سے باخبر ہونا، دور دراز کے فاصلوں سے اپنے آشیانوں اور بلوں تک واپس لوٹ آنا، لمبے اور طویل فاصلے طے کر کے منزل مقصود تک پہنچنا، آئندہ حوادث کے بارے میں پیشگی اندازہ لگا لینا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حیوانات کی پُراسرار زندگی کے بارے میں ابھی تک بہت سے مسائل ایسے ہیں جو قابلِ حل ہیں ۔

ان تمام باتوں سے ہٹ کر بہت سے جانور ایسے ہیں کہ اگر انھیں سدھایا جائے اور ان کی تربیت کی جائے تو وہ ایسے ایسے عجیب و غریب کارنامے انجام دیتے ہیں جو انسان کے بھی بس میں نہیں ہوتے ۔

---

[۱] " اوزعنی " " ایزاع " بمعنی " الہام " کے معنی میں ہے ۔ یا انحراف کے روکنے کے معنی میں یا پھر عشق و محبت کے معنی میں ہے لیکن بیشتر مفسرین نے پہلا معنی اختیار کیا ہے ۔

Marfat.com

لیکن پھر بھی اچھی طرح معلوم نہیں کہ وہ انسانی دنیا سے کس حد تک باخبر ہیں ؟ کیا وہ واقعًا یہ جانتے ہیں کہ ہم (انسان) کون لوگ ہیں اور کیا کرتے ہیں ؟ ہو سکتا ہے ہمیں ان میں اس قسم کے ہوش اور سمجھ کے آثار نہ ملیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان میں ان چیزوں کا فقدان ہے ۔

اسی بناء پر اگر ہم نے مندرجہ بالا داستان میں یہ پڑھا ہے کہ چیونٹیوں کو جناب سلیمان کے اس سرزمین میں آنے کی خبر ہو گئی تھی اور انھیں اپنے بلوں میں گھس جانے کا حکم ملا تھا تا کہ وہ لشکر کے پاؤں تلے کچلی نہ جائیں اور سلیمان بھی اس بات سے باخبر ہو گئے تھے تو زیادہ تعجب کی بات نہیں ہے ۔

اس کے علاوہ ——— جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ——— سلیمان کی حکومت غیر معمولی اور معجزانہ امور پر مشتمل تھی اسی بناء پر بعض مفسرین نے اپنے نظریئے کا اس طرح اظہار کیا ہے کہ سلیمان علیہ السّلام کے دورِ حکومت میں بعض جانوروں میں اس حد تک آگاہی کا پایا جانا ایک اعجاز اور خارقِ عادت بات تھی لہٰذا اگر دوسرے ادوار میں اس قسم کی باتیں جانوروں میں نہیں ملتیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے ۔

ان کی اس قسم کی گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں سلیمان اور چیونٹی یا سلیمان اور ہُدہُد کی داستان کو کنایہ، مجاز یا زبانِ حال وغیرہ پر محمول کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ ظاہر امر کی حفاظت اور حقیقی معنی پر محمول کرنے کا امکان بھی موجود ہے [۱]

۲۔ **حضرت سلیمانؑ اور شکرِ الٰہی :** الٰہی حکمرانوں اور ظالم و جابر حکمرانوں کے درمیان ایک بڑا فرق یہ ہے کہ جب ظالموں کو حکومت حاصل ہوتی ہے تو وہ غرور اور غفلت میں غرق ہو کر تمام انسانی اقدار کو فراموش کر دیتے ہیں اور اپنی خود سری کا شکار ہو جاتے ہیں جبکہ خدائی حکام جب اقتدار حاصل کر لیتے ہیں تو اسے اپنے دوش پر ایک عظیم ذمہ داری سمجھتے ہیں، دوسروں سے زیادہ خدا کی بارگاہ کا رُخ کرتے ہیں اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق خدا سے طلب کرتے ہیں جیسا کہ سلیمان علیہ السّلام نے سریرِ قدرت پر پہنچنے کے بعد جس سب سے اہم چیز کا خدا سے سوال کیا وہ شکرِ خدا کی ادائیگی اور ان نعمتوں کو راہِ حق اور بندوں کی فلاح میں استعمال کرنے کا سوال تھا ۔

اور پھر قابلِ توجہ یہ بات ہے کہ انھوں نے اپنی درخواست کو " اوزعنی " کے لفظ سے شروع کیا ہے جس کا مفہوم اس عظیم مقصد کے انجام دینے کے لیے اندرونی ہدایت اور تمام باطنی طاقتوں کو اکٹھا کرنا ہے گویا سلیمان خدا سے دعا کر رہے ہیں خدایا مجھے اس قدر قدرت عطا فرما کہ میں اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے اپنی تمام اندرونی توانائیوں کو اکٹھا کر کے تیرا شکر ادا کروں اور اپنے فرائض کو پورا کروں اور تو ہی مجھے اس راستے پر چلا تا رہ کیونکہ یہ نہایت ہی کٹھن، خوفناک اور طولانی سفر ہے اور اس جیسی عظیم حکومت میں تمام لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کا یہی راستہ ہے ۔

جناب سلیمان نے نہ صرف ان نعمتوں کے شکر کی توانائی کا تقاضا نہیں کیا کہ جو خود ان کو ذاتی طور پر عطا کی گئی تھیں بلکہ اپنے ماں باپ کو عطا کی جانے والی نعمتوں کے شکر کی توفیق بھی چاہی کیونکہ انسان کو ملنے والی بہت سی نعمتیں اسے ماں باپ کی طرف سے

---

[۱] ہم تفسیر نمونہ کی جلد پنجم میں سورۃ انعام کی آیت ۳۸ کے ذیل میں بھی اس بارے میں گفتگو کر چکے ہیں ۔

Marfat.com

میراث میں ملتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ خداوندِ عالم جو وسائل ماں باپ کو عطا کرتا ہے وہ اولاد کے لیے بڑی حد تک ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔

۲۔ حضرت سلیمانؑ اور عملِ صالح:۔ یہ بات بھی باعثِ دلچسپی ہے کہ باوجودیکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس اس قدر بے نظیر طاقت اور حکومت تھی لیکن انھوں نے خدا سے سوال کیا کہ آپ کو ہمیشہ شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کا خدا کے نیک بندوں میں شمار ہو۔

اس درخواست سے واضح ہوتا ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے اقتدار حاصل کرنے کا مقصد اعمالِ صالح کی بجا آوری ہے اور باوقار عمل، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ ان اعمال کی بجا آوری کے لیے مقدمہ ہیں۔

اعمالِ صالح بھی خدا کی رضا و خوشنودی کے حصول کا مقدمہ ہیں جو منتہائے مقصود اور سب غایتوں کی آخری غایت ہے۔

دوسری بات یہ کہ، صالح افراد کے زمرے میں شمولیت اعمالِ صالحہ کی ادائیگی سے بھی بڑھ کر ایک بلند درجہ ہے کیونکہ پہلا مرحلہ ذاتی درستی کا ہے اور دوسرا عمل کی درستی کا۔ (غور کیجیے گا)۔

دوسرے لفظوں میں بسا اوقات انسان اعمالِ صالح بجا لاتا ہے لیکن یہ اس کی ذات، روح اور وجود میں رچ بس نہیں جاتے لہٰذا سلیمان خدا سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ انھیں اپنی عنایات میں اس حد تک شامل کر دے کہ ان کا صالح ہونا ان کے اعمال سے بھی بڑھ جائے اور ان کی روح اور رگ و ریشے میں رچ بس جائے اور یہ بات خدا کی رحمت کے بغیر قطعاً ناممکن ہے۔

سچ مچ خدا کا صالح بندہ ہونا کس قدر قیمتی اور انمول عطیہ ہے کہ جناب سلیمان اس قدر جاہ و جلالِ ملک و سلطنت، حکومت و حشمت کے باوجود بھی درخواست کرتے ہیں کہ خداوندِ عالم انھیں اپنی رحمت کے زیرِ سایہ اپنے خالص بندوں میں قرار دے اور ہر وقت انھیں ایسی لغزشوں سے محفوظ رکھے جو انسانوں سے سرزد ہو جاتی ہیں، خاص کر بڑے منصب پر فائز لوگوں سے اور سربراہانِ حکومت سے۔

Marfat.com

۲۰۔ وَتَفَقَّدَ الطَّيْرَ فَقَالَ مَا لِيَ لَا أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ
مِنَ الْغَائِبِينَ ۝
۲۱۔ لَأُعَذِّبَنَّهُ عَذَابًا شَدِيدًا أَوْ لَأَذْبَحَنَّهُ أَوْ لَيَأْتِيَنِّي
بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۝
۲۲۔ فَمَكَثَ غَيْرَ بَعِيدٍ فَقَالَ أَحَطْتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ وَجِئْتُكَ
مِنْ سَبَإٍ بِنَبَإٍ يَقِينٍ ۝
۲۳۔ إِنِّي وَجَدْتُ امْرَأَةً تَمْلِكُهُمْ وَأُوتِيَتْ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ وَلَهَا
عَرْشٌ عَظِيمٌ ۝
۲۴۔ وَجَدْتُهَا وَقَوْمَهَا يَسْجُدُونَ لِلشَّمْسِ مِنْ دُونِ اللَّهِ وَزَيَّنَ لَهُمُ
الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ ۝
۲۵۔ أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ
يَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝
۲۶۔ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ۝ السجدة

ترجمہ

۲۰۔ (سلیمان نے ہُدہُد) پرندے کی تلاش شروع کی اور کہا کہ مجھے ہُدہُد دکھائی کیوں نہیں دے رہا ؟ یا کیا وہ کہیں غائب ہوگیا ہے۔

۲۱۔ میں اسے یقیناً سخت سزا دوں گا یا اسے ذبح کر ڈالوں گا یا وہ (اپنی غیر حاضری کی) کوئی واضح دلیل میرے سامنے پیش کرے۔

۲۲۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ (ہُدہُد آ گیا اور) کہا : مجھے ایسی چیز کا پتہ چلا ہے جس سے آپ آگاہ نہیں ہیں

Marfat.com

میں سرزمینِ سبا سے ایک سچی خبر لایا ہوں ۔

۲۳۔ میں نے ایک عورت کو دیکھا ہے جو وہاں کے لوگوں پر حکومت کر رہی ہے اور اس کے پاس سب کچھ ہے، خصوصاً بہت عظیم تخت ۔

۲۴۔ (لیکن) میں نے اسے اور اس کی قوم کو دیکھا ہے کہ وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر سورج کو سجدہ کرتے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کی نگاہوں میں مزیّن کر رکھا ہے انھیں صحیح راستے سے بھٹکا دیا ہے اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ہیں ۔

۲۵۔ وہ کیوں ایسے خدا کو سجدہ نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین میں مخفی چیزوں کو ظاہر کرتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو یا ظاہر کرتے ہو ۔

۲۶۔ وہ ایسا خدا ہے جس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں اور وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے ۔

تفسیر

ہُدہُد اور ملکۂ سبا کی داستان

آیات کے اس حصے میں خداوندِ عالم حضرت سلیمانؑ کی حیرت انگیز زندگی کے ایک اور اہم واقعے کی طرف اشارہ فرماتا ہے اور ہُدہُد اور ملکہ سباء کا قصہ بیان کرتا ہے، فرماتا ہے: سلیمان کو ہُدہُد دکھائی نہ دیا تو وہ اسے ڈھونڈھنے لگے ۔ (و تفقد الطیر)۔

یہ تعبیر اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کرتی ہے کہ حضرت سلیمان اپنی حکومت کے حالات اور ملک کی کیفیت کو اچھی طرح مدِنظر رکھتے تھے یہاں تک کہ ایک پرندہ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں تھا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر پرندے سے مراد ہُدہُد ہے جیسا کہ قرآن اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ انھوں نے کہا "کیا ہوا کہ مجھے ہُدہُد دکھائی نہیں دے رہا" (فقال مالی لا اری الھد ھد)۔

"یا کیا وہ غائب ہے (ام کان من الغائبین)۔

سلیمان کو کیسے معلوم ہوا کہ ہُدہُد غیر حاضر ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ اس وجہ سے کہ جب آپ سفر کرتے تو پرندے آپ کے سر پر سایہ کیے رہتے تھے، چونکہ اس وقت اس سائبان میں اس کی جگہ خالی نظر آئی لہٰذا انھیں معلوم ہو گیا کہ ھُد ھُد غیر حاضر ہے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں کہ سلیمان کے نظمِ حکومت میں پانی کی تلاش کا کام ہُدہُد کے ذمّہ تھا لہٰذا پانی کی ضرورت کے وقت

Marfat.com

جب اسے تلاش کیا گیا تو وہ نہیں ملا۔

بہرحال، اس گفتگو کی ابتداء میں حضرت سلیمان نے فرمایا: مجھے وہ دکھائی نہیں دے رہا، پھر فرمایا" یا یہ کہ وہ غائب ہے" ممکن ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ کیا وہ کسی معقول عذر کے بغیر غیر حاضر ہے یا معقول عذر کی وجہ سے غائب ہے۔

بہرصورت ایک با استقلال منظم اور طاقت ور حکومت میں یہی ہوتا ہے کہ ملک میں جو بھی اتار چڑھاؤ ہو وہ سربراہِ حکومت کی نظر میں ہو حتیٰ کہ کسی پرندے کی حاضری اور غیر حاضری ایک عام ملازم کی موجودگی اور عدم موجودگی اس کے پیشِ نظر ہو اور یہ ایک بہت بڑا درس ہے۔

حضرت سلیمان نے دوسروں کو درس دینے اور حکم عدولی پر سزا دینے کی خاطر مندرجہ ذیل جملہ کہا تاکہ ہُدہُد کی غیر حاضری دوسرے پرندوں پر بھی اثر کرے چہ جائیکہ اہم عہدوں اور اعلیٰ مناصب پر فائز انسان، فرمایا: میں یقیناً اسے سخت سزا دوں گا (لاعذبنه عذابًا شديدًا)۔

یا اسے ذبح کر ڈالوں گا (او لاَاذبحنه)۔

یا پھر وہ اپنی غیر حاضری کی میرے سامنے واضح دلیل پیش کرے (او ليأتيني بسلطان مبين)۔

یہاں پر" سلطان" سے مراد ایسی دلیل ہے جو انسان کے مقصود کو ثابت کرنے کے لیے اس کے تسلّط کا سبب بنتی ہے اور پھر" مبین" کے ساتھ اس کی تاکید اس لیے کہ خلاف ورزی کرنے والا اپنی خلاف ورزی کی مکمل طور پر واضح اور روشن دلیل لائے۔

درحقیقت جناب سلیمانؑ نے غیر حاضری کی صورت میں ایک طرف: یہ ملہ دینے کی بجائے خلاف ورزی ثابت ہو جانے پر سزا کی تنبیہ کی ہے اور اپنی اس تنبیہ میں بھی دو مراحل بیان کیے ہیں جو جرم کی نوعیت کے مطابق ہیں ایک مرحلہ بغیر موت کے سزا ہے اور دوسرا سزائے موت کا مرحلہ ہے۔

ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ انھیں اپنی حکومت اور طاقت کا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ اگر ایک کمزور سا پرندہ بھی معقول اور واضح دلیل پیش کرے تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔

ہدہد کی غیر حاضری کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا (فمكث غير بعيد)۔ کہ ہُدہُد واپس آ گیا اور سلیمان کی طرف رُخ کر کے کہنے لگا: مجھے ایک ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس سے آپ آگاہ نہیں ہیں میں آپ کے لیے سرزمینِ سبا سے ایک یقینی (اور بالکل تازہ) خبر لایا ہوں (فقال احطت بما لم تحط به وجئتك من سبأ بنبأ يقين)۔

گویا ہُدہُد نے جناب سلیمانؑ کے چہرے پر غصے کے آثار دیکھ لیے تھے لہٰذا ان کی ناراضی دُور کرنے کے لیے سب سے پہلے اس نے ایک ایسے اہم مطلب کی مختصر الفاظ میں خبر دی جس سے جناب سلیمان اس قدر علم و دانش رکھنے کے باوجود بے خبر تھے، جب ان کا غصّہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اس ماجرا کی تفصیل بیان کی۔

یہ بات بھی قابلِ توجّہ ہے کہ سلیمان کے لشکر والے حتیٰ کہ پرندہ تک کو بھی جو ان کے تابع فرمان تھے جناب سلیمان نے

Marfat.com

اس قدر آزادی، امن وامان اور جسارت عطا کی ہوئی تھی کہ ہُدہُد نے کھل کر ان سے کہہ دیا: مجھے ایسی چیز معلوم ہوئی ہے جس کی آپ کو بھی خبر نہیں ہے۔

اس کی گفتار کا طریقہ ایسا نہیں تھا جیسے چاپلوس درباریوں کا جابر بادشاہوں کے سامنے ہوتا ہے کہ کسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے مدتوں خوشامد کرتے رہتے ہیں پہلے آپ کو ذرّہ ناچیز بتلاتے ہیں پھر چاپلوسی اور خوشامد کے ہزاروں پردوں میں کوئی بات "بادشاہ سلامت" کے قدموں پر نثار کرتے ہیں اور کبھی بھی اپنی بات کھول کر بیان نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ پھول کی پتی سے بھی نازک کنایوں کا سہارا لیتے ہیں مبادا بادشاہ سلامت کی خاطر مبارک ملول ہو جائے۔

ہاں تو ہُدہُد نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میری غیر حاضری کسی دلیل کے بغیر نہیں تھی، میں ایک ایسی اہم خبر لایا ہوں جس سے آپ بھی بے خبر ہیں۔

ضمنی طور پر یہ تعبیر سب لوگوں کے لیے ایک بہت بڑا درس بھی ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہُدہُد جیسی ایک چھوٹی سی مخلوق ایسی بات جانتی ہو جس سے اپنے دور کے بہت بڑے دانشور بھی بے خبر ہوں۔ انسان کو نہیں چاہیے کہ اپنے علم و دانش پر گھمنڈ کرے چاہے وہ نبوت کے وسیع علم کا مالک سلیمان ہی کیوں نہ ہو۔

بہر حال ہُدہُد نے ماجرے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا: میں سرزمین سبا میں چلا گیا تھا میں نے دیکھا کہ ایک عورت وہاں کے لوگوں پر حکومت کر رہی ہے اس کے قبضے میں سب کچھ ہے خاص طور پر اس کا ایک بہت بڑا تخت بھی ہے (انی وجدت امرأة تملکھم واوتیت من کل شیٔ ولھا عرش عظیم)۔

ہُدہُد نے ان تین جملوں میں ملکِ سبا کی تقریباً تمام خصوصیات بتا دیں اور وہاں کے طرزِ حکومت سے بھی سلیمانؑ کو باخبر کر دیا۔

پہلی خصوصیت تو یہ ہے وہ ایک ایسا آباد شاد ملک ہے جس میں ہر طرح کی نعمتیں اور سہولیات مہیا ہیں۔

دوسری یہ کہ ان لوگوں پر ایک عورت حکومت کر رہی ہے جس کا ایک نہایت ہی آراستہ دربار ہے حتیٰ کہ سلیمانؑ کے دربار سے بھی زیادہ آراستہ کیونکہ ہُدہُد نے حضرت سلیمان کا تخت دیکھا ہوا تھا اس کے باوصف اس نے ملکہ سباء کے تخت کو "عرش عظیم" کے عنوان سے یاد کیا۔

ان الفاظ کے ساتھ اس نے سلیمان کو یہ بات جتلا دی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ یہ تصور کر لیں کہ تمام جہان آپ کے قلمرو حکومت میں ہے اور صرف آپ کا تخت باعظمت ہے۔

سلیمانؑ ہُدہُد کی یہ بات سن کر ایک گہری سوچ میں پڑ گئے لیکن ہُدہُد نے انھیں مزید سوچنے کی مہلت نہ دی اور فوراً ہی ایک اور بات پیش کر دی۔ اس نے کہا: جو عجیب و غریب اور تکلیف دہ چیز میں نے وہاں دیکھی ہے وہ یہ کہ میں نے دیکھا ہے کہ وہ عورت اور اس کی قوم خدا کو چھوڑ کر سورج کے سامنے سجدہ کرتے ہیں (وجدتھا وقومھا یسجدون للشمس من دون اللہ)۔

شیطان ان پر مسلط ہو چکا ہے اور اس نے ان کے اعمال کو ان کے لیے مزیّن کر رکھا ہے (لہٰذا وہ سورج کو سجدہ کرنے میں

Marfat.com

فخر محسوس کرتے ہیں) (وزین لھم الشیطان اعمالھم)۔

اس طرح سے "شیطان نے انھیں راہِ حق سے روک رکھا ہے (فصد ھم عن السبیل)۔

وہ بُت پرستی میں اس قدر غرق ہو چکے ہیں کہ مجھے یقین نہیں کہ وہ آسانی سے اس راہ سے پلٹ جائیں۔ وہ بالکل ہدایت نہیں پائیں گے (فھم لا یھتدون)۔

ہُدہُد نے ان الفاظ کے ساتھ ان کی مذہبی اور روحانی حیثیت بھی واضح کر دی کہ وہ بُت پرستی میں خوب مگن ہیں، حکومت آفتاب پرستی کو ترویج کرتی ہے۔ اور لوگ اپنے بادشاہ کے دین پر ہیں۔

ان کے بت کدوں اور دوسرے حالات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس غلط راہ پر ڈٹے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ جنون کی حد تک محبت کرتے اور اپنی اس غلط روش پر فخر کرتے ہیں ایسے حالات میں جبکہ حکومت اور عوام ایک ہی ڈگر پر چل رہے ہیں ان کا ہدایت پانا بہت مشکل ہے۔

پھر کہا: وہ اس خدا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزوں کو باہر نکالتا ہے اور اسے بھی جانتا ہے جسے تم چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو (الا یسجدوا للہ الذی یخرج الخبأ فی السماوات والارض و یعلم ما تخفون وما تعلنون)۔[1]

"خبأ" (بروزن "صبر") ہر مخفی اور پوشیدہ چیز کے معنی میں ہے اور یہاں پر خداوند عالم کے آسمان اور زمین کے غیب پر محیط ہونے کی طرف اشارہ ہے یعنی وہ لوگ اس خدا کو سجدہ کیوں نہیں کرتے جو آسمان و زمین کے پوشیدہ امور کو جانتا ہے۔ یہ جو بعض مفسرین نے آسمان کی مخفی چیزوں سے خصوصی طور پر بارش اور زمین کی چیزوں سے بالخصوص نباتات مراد لیا ہے تو درحقیقت یہ اس کے واضح مصداق ہیں۔

اسی طرح جنھوں نے موجودات کو غیب، عدم کے پردے سے باہر نکالنا مراد لیا ہے وہ بھی اس کا ایک مصداق ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پہلے تو خدا کے آسمان و زمین کے مخفی امور سے باخبر ہونے کی بات ہوئی ہے پھر انسان کے دل میں چھپی ہوئی چیزوں سے آگاہی کا ذکر ہوا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اور بھی تو کئی صفات ہیں مگر ہُدہُد نے صرف خدا کے کائنات میں عالم الغیب ہونے کا ذکر کیوں کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاید اس مناسبت سے ہو کہ جناب سلیمان اپنی تمام قدرت و توانائی کے باوجود ملک سبا کی ان خصوصیات سے بے خبر تھے اور ہُدہُد یہ کہتا ہے کہ اس خدا کے دامنِ لطف سے متمسک ہونا چاہیے جس سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔

---

[1] "الا" کا کلمہ اس جگہ پر بعض مفسرین کے نزدیک "ان" اور "لا" سے مرکب ہے اور وہ اسے "صد ھم" یا "زین لھم" کے متعلق جانتے ہیں اور "لام" کو مقدر سمجھتے ہیں جو مجموعی طور پر یوں ہوگا "صد ھم عن السبیل لئلا یسجدوا للہ" لیکن ظاہر یہ ہے کہ "الا" یہاں پر حرف تحضیض اور "ھلا" کے معنی میں ہے اور جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں یہ بھی ہُدہُد کے کلام کا حصہ ہے ہر چند کہ بعض مفسرین نے اسے جملہ استینافیہ بنا کر کلام الٰہی قرار دیا ہے۔

Marfat.com

یا پھر اس مناسبت کی وجہ سے کہا ہے کیونکہ ــــــــــ مشہور یہ ہے کہ ــــــــــ ہُدہُد کے اندر ایک خاص حس پائی جاتی ہے جس کے ذریعے زمین کے اندر موجود پانی کا اسے پتہ چل جاتا ہے لہٰذا اس نے خداوندِ عالم کی بات کی ہے اور وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ توصیف ذاتِ خداوندِ متعال ہی ہے جو عالمِ ہستی کی تمام پوشیدہ چیزوں سے باخبر ہے۔

وہ اپنی گفتگو کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے: وہ خدا وہ ہے جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور جو عرشِ عظیم کا پروردگار اور مالک ہے (اللہ لا الٰہ الا ھو رب العرش العظیم)۔

اس طرح سے اس نے پروردگار کی "توحیدِ عبادت" اور "توحیدِ ربوبیت" کو بیان کرکے اور ہر طرح کے شرک کی نفی کرکے اپنی گفتگو کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔

چند اہم نکات

چند سبق آموز باتیں: مندرجہ بالا چند آیات میں بہت سے ایسے نکات موجود ہیں جو تمام لوگوں کی زندگی اور حکومتوں کے چلانے کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

۱۔ کسی حکومت کا سربراہ یا کسی ادارے کا سربراہ اپنے انتظامی امور میں اس قدر باریک بین ہو کہ ایک عام اور معمولی فرد کی غیر حاضری تک کا نوٹس لے۔

۲۔ کسی ادارے کا سربراہ ایک فرد کی قانون شکنی تک کا نوٹس لے تاکہ اس کی خلاف ورزی دوسرے افراد میں سرایت نہ کر جائے لہٰذا اس کی سختی سے پیش بندی کرے۔

۳۔ کسی کی غیر حاضری اور عدم موجودگی میں اس پر مقدمہ نہیں چلایا جانا چاہیے بلکہ اسے حتی الامکان اپنے دفاع کا موقع دینا چاہیے۔

۴۔ جتنا جرم ہو سزا اتنی ہی ملنی چاہیے۔

۵۔ حیثیت وطاقت کے لحاظ سے انسان خواہ کتنا بڑا کیوں نہ ہو اسے دلیل اور منطق قبول کر لینی چاہیے خواہ وہ کسی چھوٹے شخص کے منہ سے کیوں نہ نکلے۔

۶۔ عوامی ماحول میں اس قدر آزادی ہونی چاہیے کہ ایک عام آدمی بھی اپنے سربراہِ مملکت کو آزادانہ طور پر کہہ سکے "کہ میں ایسی چیز جانتا ہوں جو آپ نہیں جانتے۔"

۷۔ ہو سکتا ہے کہ ایک عام اور معمولی فرد ایسے مسائل سے باخبر ہو جسے بہت بڑے عالم اور طاقتور لوگ بھی نہ جانتے ہوں اور انسان کو کبھی بھی اپنے علم و دانش پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔

۸۔ انسان کی اجتماعی زندگی کی ضروریات اس قدر زیادہ ہیں کہ بعض اوقات سلیمان جیسے بہت بڑے انسانوں کو بھی ایک چھوٹے سے پرندے کی ضرورت درپیش آجاتی ہے۔

۹۔ اگرچہ عورت میں بہت سے کاموں کی صلاحیت پائی جاتی ہے حتیٰ کہ خود یہی داستان بھی آگے چل کر بتائے گی

Marfat.com

کہ ملکہ سبا میں بہت زیادہ فہم وذکا پائی جاتی تھی لیکن اس کے باوجود حکومت کی سربراہی اس کے جسم وروح کی ساخت سے چنداں مناسبت نہیں رکھتی حتیٰ کہ ہُدہُد جیسے پرندے کو بھی اس بات پر تعجب کرنا پڑا کہ "میں نے ایک عورت کو ان پر حکمرانی کرتے دیکھا ہے۔"

۱۰۔ عموماً لوگوں کا بھی وہی دین ہوتا ہے جو ان کے بادشاہوں کا ہوتا ہے لہٰذا اسی داستان میں ہم نے پڑھا ہے کہ ہُدہُد نے کہا کہ میں نے اس عورت اور اس کی قوم کو دیکھا کہ وہ سورج کی پوجا کر رہے ہیں (پہلے ملکہ کی بات کی اور پھر اس کی قوم کی)۔

۲۔ چند سوال اور ان کا جواب:۔ بعض مفسرین نے یہاں پر چند ایک سوال پیش کیے ہیں:

ان میں سے ایک یہ ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ سلیمان کے پاس اس قدر علم تھا اور وسائل بھی پھر ایسے ملک کے وجود سے بے خبر کیوں تھے۔ اور پھر یمن اور سلیمان کا مرکز حکومت جو ظاہراً شام تھا کا طویل فاصلہ ہُدہُد نے کیونکر طے کیا اور پھر یہ کہ کیا ہُدہُد بھول کر وہاں پہنچ گیا تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

پہلے سوال کے بارے میں ممکن ہے کہ یہ جواب دیا جائے کہ سلیمان اس ملک سے قاعدۃً تو باخبر تھے لیکن اس کی خصوصیات اور تفصیلات اچھی طرح نہیں جانتے تھے۔ علاوہ ازیں ان دو ملکوں کے درمیان حجاز کے بیابان کا فاصلہ بھی تھا اور ذرائع رسل ورسائل ہمارے آج کے ذرائع کی طرح بھی نہیں تھے (البتہ علم غیب اور الہام الٰہی کی بات دوسری ہے)۔

رہا ہُدہُد کے لیے اس مسافت کا طے کرنا تو یہ کوئی غیر ممکن بات نہیں ہے کیونکہ ہم ایسے پرندوں کو بھی جانتے ہیں جو زمین کے قطب شمالی اور قطب جنوبی کا درمیانی فاصلہ طے کرتے رہتے ہیں جبکہ یمن اور شام کا درمیانی فاصلہ مذکورہ فاصلے کے مقابلہ میں بالکل ہی ناچیز ہے۔

ممکن ہے ہُدہُد اس علاقے میں اس لیے آیا ہو کیونکہ بعض روایات میں ہے کہ جناب سلیمان خانۂ خدا کی زیارت کے لیے شام سے مکہ تشریف لائے ہوئے تھے تاکہ ابراہیم علیہ السلام کے مقرر کردہ طریقۂ کار کے مطابق حج بجالائیں پھر وہ وہاں سے جنوب کی طرف چلے یہاں تک کہ ان کا یمن کی سرزمین تک زیادہ فاصلہ نہیں رہ گیا تھا اور جب آپ آرام فرما رہے تھے تو ہُدہُد نے موقع غنیمت جان کر وہاں سے پرواز کر کے ملکہ سبا کے محل پر آ بیٹھا اور وہاں پر عجیب وغریب صورتِ حال نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی [1]

---

[1] اس واقعے کی مزید تفصیلات کے لیے "دائرۃ المعارف فرید وجدی" جلد ۱۰ ص ۷۱۴ مادہ "ہُدہُد" ملاحظہ فرمائیں۔ ہر چند کہ اس کی مفصل روایت مبالغے سے خالی نہیں ہے۔

Marfat.com

۲۷۔ قَالَ سَنَنْظُرُ اَصَدَقْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ○

۲۸۔ اِذْهَبْ بِّكِتٰبِیْ هٰذَا فَاَلْقِهْ اِلَیْهِمْ ثُمَّ تَوَلَّ عَنْهُمْ فَانْظُرْ
مَاذَا یَرْجِعُوْنَ ○

۲۹۔ قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اِنِّیْۤ اُلْقِیَ اِلَیَّ كِتٰبٌ كَرِیْمٌ ○

۳۰۔ اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

۳۱۔ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَیَّ وَ اْتُوْنِیْ مُسْلِمِیْنَ ○

۳۲۔ قَالَتْ یٰۤاَیُّهَا الْمَلَؤُا اَفْتُوْنِیْ فِیْۤ اَمْرِیْ مَا كُنْتُ قَاطِعَةً اَمْرًا
حَتّٰى تَشْهَدُوْنِ ○

۳۳۔ قَالُوْا نَحْنُ اُولُوْا قُوَّةٍ وَّ اُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ وَّ الْاَمْرُ اِلَیْكِ
فَانْظُرِیْ مَاذَا تَاْمُرِیْنَ ○

۳۴۔ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً اَفْسَدُوْهَا وَ جَعَلُوْۤا اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ
اَذِلَّةً وَ كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ○

۳۵۔ وَ اِنِّیْ مُرْسِلَةٌ اِلَیْهِمْ بِهَدِیَّةٍ فَنٰظِرَةٌۢ بِمَ یَرْجِعُ
الْمُرْسَلُوْنَ ○

ترجمہ

۲۷۔ (سلیمان نے) کہا ہم تحقیق کریں گے اور دیکھیں گے کہ تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے۔

۲۸۔ میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کے سامنے ڈال دے پھر لوٹ آ (ایک کونے میں چھپ کر) دیکھ کہ وہ کیا ردّعمل کرتے ہیں؟

Marfat.com

۲۹۔ (ملکہ سبا نے) کہا اے سردارو! یہ ایک نہایت ہی اہم خط میرے پاس گرایا گیا ہے۔
۳۰۔ یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس طرح ہے: رحمٰن و رحیم اللہ کے نام سے ....
۳۱۔ تمھیں میری یہی نصیحت ہے کہ مجھ سے سرکشی نہ کرو اور حق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ۔
۳۲۔ (پھر) کہا اے سردارو! (اور اے بزرگو!) اس اہم معاملے میں اپنی رائے دو، کیونکہ میں نے کوئی بھی اہم کام تمھاری شرکت کے بغیر انجام نہیں دیا۔
۳۳۔ (درباریوں نے) کہا ہم بہت طاقت ور ہیں اور ہمارے پاس بہت جنگی قوت ہے لیکن آخری فیصلہ کرنا پھر بھی تیرے ہاتھ میں ہے۔ تیرا حکم کیا ہے؟
۳۴۔ ملکہ نے کہا جب بادشاہ کسی آبادی والے علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ (جی ہاں) ان کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔
۳۵۔ میں اس وقت جنگ کو خلافِ مصلحت سمجھتی ہوں لہٰذا) ایک قیمتی تحفہ اس کی طرف بھیجتی ہوں تاکہ پتہ چل جائے کہ میرے ایلچی کیا خبر لاتے ہیں۔

تفسیر

بادشاہ تباہیاں لاتے ہیں

حضرت سلیمان نے غور سے ہُدہُد کی باتیں سنیں اور سوچنے لگ گئے۔ ممکن ہے ان کا زیادہ گمان یہی ہو کہ یہ خبر سچی ہے اور اس کے جھوٹا ہونے پر کوئی دلیل بھی موجود نہیں ہے لیکن چونکہ یہ بات معمولی نہ تھی بلکہ ایک ملک اور ایک بڑی قوم کی تقدیر اس سے وابستہ تھی لہٰذا انھوں نے ایک فرد کی خبر پر اکتفا نہیں کیا بلکہ وہ اس حساس موضوع پر مزید تحقیق کرنا چاہتے تھے۔

لہٰذا اس طرح فرمایا ہم اس بارے میں تحقیق کریں گے اور دیکھیں گے کہ آیا تو نے سچ کہا ہے یا جھوٹوں میں سے ہے (قال سننظر اصدقت ام کنت من الکاذبین)۔

اس بات سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اہم اور نتیجہ خیز مسائل کے بارے میں توجہ دینی چاہیے خواہ اس کی اطلاع کسی معمولی سے فرد کی جانب سے کیوں نہ ملے۔ اور جلد ہی اس کے بارے میں تحقیقات کرنی چاہیے (جیسا کہ "سننظر" میں "سین" کا اقتضاء ہے)۔

Marfat.com

سلیمان علیہ السلام نے نہ تو ہُدہُد کو جھوٹا کہا اور نہ ہی بغیر دلیل کے اس کی بات کو تسلیم کیا بلکہ اس بارے میں تحقیقات کا حکم صادر فرمایا۔

بہرحال سلیمانؑ نے ایک نہایت مختصر لیکن جامع خط تحریر فرمایا اور ہُدہُد کو دے کر کہا: "میرا یہ خط لے جاؤ اور ان کے پاس جا کر ڈال دو پھر لوٹ آؤ اور ایک کونے میں ٹھہر جاؤ اور دیکھو وہ کیا ردِعمل کرتے ہیں" (اذهب بکتابی هٰذا فالقه الیهم ثم تول عنهم فانظر ماذا یرجعون)[1]۔

"القه الیهم" (تو ان کی طرف ڈال دے) کی تعبیر سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہُدہُد کو حکم دیا گیا کہ اس خط کو اس وقت ان کے پاس جا کر ڈال دینا جب ملکہ سباء اپنے درباریوں کے ساتھ محفل جمائے ہوئے ہو، تاکہ فراموشی اور اخفا کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ جائے۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہُدہُد ملکہ کے محل میں داخل ہو کر اس کے سونے کے کمرے میں پہنچ گیا اور خط اس کے سینے یا گردن پر ڈال دیا اس کے لیے کوئی خاص دلیل نہیں ہے اگرچہ بعد والی آیت میں ہے۔

انی القی الی کتاب کریم

میری طرف ایک اہم خط پھینکا گیا ہے۔

یہ آیت اس دعوٰی سے موافقت رکھتی ہے۔

ملکہ سباء نے خط کھولا اور اس کے مندرجات سے آگاہی حاصل کی چونکہ اس نے اس سے پہلے سلیمانؑ کا نام اور شہرت سن رکھی تھی اور خط کے مندرجات سے بھی واضح ہوتا تھا کہ جناب سلیمان نے سباء کے بارے میں سخت فیصلہ کر لیا ہے لہٰذا وہ گہری سوچ میں پڑ گئی اور چونکہ ملک کے اہم ترین مسائل میں وہ اپنے مصاحبین سے مشورہ کیا کرتی تھی لہٰذا اس بارے میں بھی انھیں اظہار خیال کی دعوت دی اور ان سے مخاطب ہو کر کہا اے سردارو اور بزرگو! ایک نہایت ہی باوقار خط میری طرف پھینکا گیا ہے (قالت یا ایها الملؤا انی القی الی کتاب کریم)۔

کیا سچ مچ ملکہ سباء نے چٹھی رساں کو نہیں دیکھا تھا اور خود خط کے اندر موجود قرائن سے اس نے خط کی حقانیت کو تسلیم کر لیا تھا اور اسے یہ احتمال بھی پیدا نہ ہوا کہ یہ خط جعلی ہے۔

یا اپنی آنکھوں سے قاصد کو دیکھ لیا تھا اور اس کی محیر العقول کیفیت بذاتِ خود اس بات کی دلیل تھی کہ اس کے پس پردہ یقیناً کوئی حقیقت کارفرما ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بات خواہ کچھ بھی ہو اسے خط پر یقین آ گیا۔

ملکہ نے یہ کیوں کہا کہ یہ بہت ہی باعظمت خط ہے یا تو اس لیے کہ اس خط کے مطالب بہت ہی گہرے تھے یا پھر اس لیے

---

[1] بعض مفسرین کہتے ہیں کہ "ثم تول عنهم" معنی کے لحاظ سے مؤخر ہے اور عبارت میں مقدم ہے اور تقدیری صورت میں یوں ہوگا "فانظر ما ذا یرجعون ثم تول عنهم" یہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اس جملے کو اس قوم کی طرف سے واپس لوٹ آنے کے معنی میں لیا ہے جبکہ آیت کا ظاہری معنی یہ ہے کہ تو ان سے رُخ پھیر کر ایک کونے میں انتظار کر کہ وہ کیا ردِعمل کرتے ہیں۔

Marfat.com

کہ اس کا آغاز خدا کے نام سے ہوا تھا اور اختتام پر جناب سلیمانؑ کے صحیح دستخط تھے اور مہر لگی تھی[1] یا اس کا لکھنے والا باعظمت انسان تھا۔ مفسرین نے یہ مختلف احتمالات ذکر کیے ہیں ممکن ہے کہ یہ سب احتمالات جامع مفہوم میں جمع ہوں کیونکہ یہ ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

یہ ٹھیک ہے کہ وہ لوگ سورج پرست تھے لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت سے بُت پرست خدا پر بھی ایمان رکھتے تھے اور اسے "رب الارباب" کا نام دیتے تھے اور اس کا احترام کرتے تھے اور تعظیم بجالاتے تھے۔

پھر ملکہ سباء نے خط کا مضمون سناتے ہوئے کہا "یہ خط سلیمان کی طرف سے ہے اور اس کے مندرجات یوں ہیں: رحمان و رحیم اللہ کے نام سے ...... (انہ من سلیمان و انہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)۔

"میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم میرے مقابلے میں سرکشی سے کام نہ لو اور حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے میرے پاس آجاؤ (الا تعلوا علی و أتونی مسلمین)۔[2]

بعید معلوم ہوتا ہے کہ جناب سلیمانؑ نے اسی عبارت اور انھی عربی الفاظ میں خط لکھا ہو بنا بریں ممکن ہے مندرجہ بالا جملے یا توصرف معنی کو بیان کر رہے ہیں یا پھر سلیمانؑ کے خط کا خلاصہ ہوں جسے ملکہ سباء نے ان افراد کے سامنے بیان کیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس خط کا مضمون درحقیقت صرف تین جملوں پر مشتمل ہے۔

پہلے جملے میں خدا کا نام اور اس کے رحمان اور رحیم ہونے کا ذکر ہے۔

دوسرے جملے میں خواہشاتِ نفسانی پر کنٹرول کرنے اور تکبر و برتری کی خواہش کو ترک کرنے کا حکم ہے کہ جو تمام انفرادی اور اجتماعی برائیوں کی جڑ ہے۔

اور تیسرے جملے میں حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کردینے کا تذکرہ ہے۔

اگر غور سے کام لیں تو معلوم ہوگا اس کے علاوہ کوئی اور ایسی چیز تھی بھی نہیں جو قابلِ ذکر ہو۔

حضرت سلیمان کے خط کا تذکرہ کرنے کے بعد اہلِ دربار کی طرف رُخ کرکے ملکہ نے یوں کہا "اے سردارو! اس اہم معاملے میں تم اپنی رائے کا اظہار کرو، کیونکہ میں کوئی بھی اہم کام تمھاری شرکت اور تمھاری رائے کے بغیر انجام نہیں دیتی ہوں" (قالت یا ایھا الملؤا افتونی فی امری ما کنت قاطعۃ امراحتّٰی تشھدون)۔

اس رائے طلبی سے وہ ان کے درمیان اپنی حیثیت ثابت کرنا چاہتی تھی اور ان کی نظر اور توجہ اپنی طرف مبذول کرنا چاہتی تھی

---

[1] حدیث میں آیا ہے کہ کسی خط کی عظمت اور وقار اس کی مُہر میں ہے (تفسیر مجمع البیان، المیزان اور قرطبی)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جب پیغمبر اسلامؐ نے عجم کے لیے خط لکھنا چاہا تو آپ سے عرض کی گئی کہ عجمی لوگ بغیر مُہر کے خط قبول نہیں کرتے تو آپ نے حکم دیا کہ ایک انگوٹھی تیار کروائی جائے جس کے نگینے پر یہ الفاظ کندہ ہوں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور یہی مُہر آپ خط پر لگا دیا کرتے تھے (تفسیر قرطبی اسی آیت کے ذیل میں)۔

[2] ممکن ہے "الا تعلوا علی" کا جملہ مجموعی طور پر "کتاب" سے بدل ہو اور ممکن ہے کہ یہاں پر "ان" بمعنی "ای" کے ہو اور تفسیر کے لیے ہو اور یہ احتمال بھی ہے کہ ایک محذوف جملے سے متعلق ہو اور وہ "اوصیکم" ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

تاکہ اس طرح سے وہ ان کی رائے اور اپنے فیصلے کو ہم آہنگ کر سکے۔

"افتونی" "فتویٰ" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے پیچیدہ مسائل میں خوب سوچ بچار کر کے صحیح صحیح فیصلہ کرنا۔

چنانچہ اس طرح سے ملکہ سبا نے ایک تو ان کے آگے مسئلے کی پیچیدگی کو واضح کر دیا اور دوسرے اس نکتہ کی جانب ان کی توجہ مبذول کروائی کہ اپنے نظریئے کا اظہار کرتے وقت خوب غور و فکر سے کام لیں تاکہ بعد میں غلط نتائج کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

"تشھدون" "شہود" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے ایسی موجودگی جو تعاون اور مشورے پر مشتمل ہو۔

اشرافِ قوم نے جواب میں کہا ہم بڑی طاقت والے اور جنگجو لوگ ہیں لیکن آخری فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے دیکھیے آپ کیا حکم دیتی ہیں؟ (قالوا نحن اولوا قوة واولوا بأس شديد والامر اليك فانظری ماذا تأمرين)۔

اس طرح سے انھوں نے ایک تو اس کے سامنے اپنی فرمانبرداری کا اظہار کر دیا اور دوسرے اپنی قوت کا ذکر کر کے میدانِ جنگ میں لڑنے کا مشورہ بھی دے دیا۔

جب ملکہ نے ان کا جنگ کی طرف رجحان دیکھا اور اندرونی طور پر اس کا قطعاً یہ ارادہ نہیں تھا تو ان کی اس جنگی پیاس کو بجھانے نیز صحیح حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے انھیں قانع کرنے کے لیے کہا "جب بادشاہ کسی آباد علاقے میں داخل ہوتے ہیں تو انھیں تباہ و برباد کر دیتے ہیں" (قالت ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها)۔

اور وہاں کے باعزت لوگوں کو ذلیل کر دیتے ہیں (وجعلوا اعزة اهلها اذلة)۔

کچھ کو مار ڈالتے ہیں کچھ کو قیدی بنا لیتے ہیں اور کچھ کو بے گھر کر دیتے ہیں۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا ہے لوٹ مار کرتے ہیں۔

پھر اس نے تاکید کے طور پر بلکہ یقینی صورت میں کہا "جی ہاں! وہ ایسا ہی کرتے ہیں" (وكذلك يفعلون)۔

درحقیقت ملکہ سبا خود بھی ایک "بادشاہ" تھی لہٰذا وہ بادشاہوں سے اچھی طرح واقف تھی کہ بادشاہوں کی جنگی حکمت عملی دو حصوں پر مشتمل ہوتی ہے ایک تباہی اور بربادی اور دوسرے باعزت افراد کو ذلیل کرنا کیونکہ انھیں تو صرف اپنے ہی مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ قوم و ملت کے مفادات اور ان کی سربلندی سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوتا لہٰذا عمومی طور پر یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں۔

پھر ملکہ نے کہا: ہمیں سب سے پہلے سلیمان اور اس کے ساتھیوں کو آزمانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ وہ واقعاً ہیں کیسے لوگ؟ آیا سلیمان بادشاہ ہے یا پیغمبر ہے؟ تباہ کار ہے یا مصلح، اقوام و ملل کو ذلیل کرتا ہے یا عزت بخشتا ہے؟ تو اس کام کے لیے ہمیں تحفے تحائف سے استفادہ کرنا چاہیے لہٰذا میں ان کی طرف کچھ معقول تحفے بھیجتی ہوں پھر دیکھوں گی کہ میرے قاصد ان کی طرف سے کیا ردِ عمل لاتے ہیں (وانی مرسلة اليهم بهدية فناظرة بم يرجع المرسلون)۔

بادشاہوں کو تحفے تحائف سے بڑی محبت ہوتی ہے اور یہ تحفے اور ہدیے ہی ان کی بہت بڑی کمزوری ہوتے ہیں۔ انھیں تحفے دے کر جھکایا جا سکتا ہے ہم دیکھیں گے اگر سلیمان نے ان تحائف کو قبول کر لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ بادشاہ ہے اور ہم بھی ڈٹ کر اس کا مقابلہ کریں گے اور اپنی پوری طاقت استعمال کریں گے کیونکہ ہم بہرحال طاقتور ہیں اور اگر اس نے

Marfat.com

ان تحائف سے بے رُخی برتی اور اپنی باتوں پر ڈٹا رہا تو ہم سمجھ لیں گے کہ وہ خدا کا نبی ہے تو ایسی صورت میں ہمیں بھی عقلمندی سے کام لینا ہوگا۔

ملکہ سبا نے جناب سلیمان کے لیے کیا تحائف بھیجے؟ اس بارے میں قرآن نے تو کچھ نہیں بتایا، صرف کلمہ "ہدیہ" نکرہ کی صورت میں بیان کرکے اس کی عظمت کو ضرور واضح کر دیا ہے البتہ مفسرین نے اس بارے میں بہت کچھ کہا ہے جن میں سے بعض باتیں مبالغہ آرائی اور افسانوی رنگ سے خالی نہیں ہیں۔

بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ پانچ سو بہترین غلام اور پانچ سو بہترین کنیزیں ان کے لیے بھیجی گئیں، غلاموں کو زنانہ لباس میں اور کنیزوں کو مردانہ لباس میں، غلاموں کے کانوں میں گوشوارے اور ہاتھوں میں کنگن اور کنیزوں کے سر پر خوبصورت ٹوپیاں تھیں، ملکہ نے اپنے خط میں لکھا کہ اگر آپ اللہ کے نبی ہیں تو غلاموں اور کنیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیں۔

انھیں زر و جواہرات اور قیمتی زیورات سے آراستہ کرکے بہترین سواریوں پر سوار کرکے اور جواہرات کی معقول مقدار دے کر جناب سلیمان کی خدمت میں بھیجا گیا۔

اور ساتھ ہی ملکہ نے قاصد کو یہ بات بھی سمجھا دی کہ تمھارے دربار میں پہنچتے ہی اگر سلیمان نے تمھیں خشم آلود اور غضب ناک نگاہوں سے دیکھا تو سمجھ لینا کہ یہ بادشاہوں کا انداز ہے اور اگر پیار بھرے انداز میں خندہ پیشانی کے ساتھ تمھیں شرف حضور بخشا تو سمجھ لینا کہ خدا کا نبی ہے۔

چند ایک نکات

۱۔ نامہ نگاری کے آداب: مندرجہ بالا آیات میں اہل سبا کے نام حضرت سلیمانؑ کے خط کے بارے میں جو کچھ مذکور ہے وہ طرز نامہ نگاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے جو اہم اور دور رس نتائج کا حامل ہے جس نے خداوند رحمان و رحیم کے نام سے شروع ہو کر صرف دو سچے تلے جملوں میں تمام مفہوم کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔

اسلامی تاریخ اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے عظیم پیشواؤں کا ہمیشہ اس بات پر اصرار رہا ہے کہ خط کو مختصر مگر جامع انداز میں تحریر کیا جائے جو تمام غیر متعلق اور بے فائدہ باتوں سے بالکل پاک ہو اور ہمیشہ سوچ سمجھ کر خط لکھا جائے۔

حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اپنے ملازمین اور نمائندوں کو خط کے بارے میں باقاعدہ سرکاری طور پر یہ ہدایات جاری فرمائیں:

"ادقوا اقلامکم وقاربوا بین سطورکم، واحذفوا عنی فضولکم، واقصدوا قصد المعانی، وایاکم والاکثار، فان اموال المسلمین لا تحتمل الاضرار"

نوک قلم باریک رکھو، سطروں کو نزدیک رکھو، میرے لیے لکھے جانے والے خطوط میں زائد اور اضافی باتوں کو نکال دیا کرو، معانی پر زیادہ توجہ رکھا کرو، زیادہ باتوں سے پرہیز کرو

Marfat.com

کیونکہ مسلمانوں کے اموال ایسی فضول خرچیاں برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں [1]
نوک قلم کو باریک کرنے سے الفاظ چھوٹے لکھے جائیں گے اور سطور کو قریب قریب کرکے لکھنے اور بے فائدہ اور اضافی چیزوں کو حذف کر دینے سے نہ صرف مسلمانوں کے بیت المال یا ذاتی اموال میں بحث ہوگی بلکہ لکھنے اور پڑھنے والے کا وقت بھی بچے گا حتیٰ کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تکلفات پر مبنی عبارت تحریر کرنے سے اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے جس سے نہ تو لکھنے والے کو کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی پڑھنے والا اس سے کچھ سمجھ پاتا ہے۔

گزشتہ دنوں یہ معمول ہو گیا تھا کہ ابتدائے اسلام کے طریقہ کار کے خلاف لوگ خط لکھنے لگے تھے۔
ان میں القاب، الفاظ اور تکلفات کی بھرمار ہوا کرتی تھی جس سے ایک تو قیمتی وقت ضائع ہوتا اور دوسرے سرمایہ۔
یہ نکتہ بھی خصوصی طور پر قابل توجہ ہے کہ اس دور میں جبکہ کسی خط کو مخصوص قاصد کے ذریعے بھیجا جاتا اور جس کے پہنچانے کے لیے بسا اوقات کئی ہفتے درکار ہوتے تھے اور کافی سرمایہ خرچ ہوتا تھا اس کے باوجود نہایت ہی اختصار کو مدنظر رکھا جاتا تھا جس کا نمونہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خسرو پرویز، قیصر روم اور ان جیسے دوسرے لوگوں کے نام خطوط میں دیکھا جاسکتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ کسی کا خط اس کی شخصیت کا اسی طرح آئینہ دار ہوتا ہے جس طرح اس کا ایلچی اور پیغام رساں۔ جیسا کہ نہج البلاغہ میں حضرت علیؑ کا فرمان ہے:

رسولك ترجمان عقلك وكتابك ابلغ من ينطق عنك

تمہارا ایلچی تمہاری عقل کا ترجمان ہوتا ہے اور تمہارا خط تمہاری طرف سے سب سے بہتر بات کرنے والا ہوتا ہے [2]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"يستدل بكتاب الرجل على عقله. وموضع بصيرته، وبرسوله على فهمه وفطنته"

کسی شخص کا خط بتاتا ہے کہ اس میں کتنی عقل و بصیرت ہے اور اس کا ایلچی اس کی فہم و ذکا کی نشانی ہوتا ہے [3]

اس نکتے کا ذکر ضروری ہے کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ خط کا جواب بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح سلام کا جواب۔
حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی حدیث ہے:

---

[1] بحار الانوار جلد ۶، ص ۴۹۔

[2] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۳۰۱۔

[3] بحار الانوار جلد ۶، ص ۵۰۔

Marfat.com

رد جواب الکتاب واجب کوجوب رد السلام

خط کا جواب دینا اسی طرح واجب ہے جس طرح سلام کا جواب[1]

چونکہ عام طور پر خط میں سلام دوعا ہوتا ہے لہٰذا بعید نہیں ہے کہ اس آیت شریفہ کے ضمن میں آتا ہو:

واذا حییتم بتحیة فحیوا باحسن منها او ردوها

جب تمھیں دعا وسلام کہا جائے تو تم بھی اس کا اس سے بہتر یا اسی جیسا جواب دیا کرو۔
(نساء / ۸۶)

۲۔ آیا سلیمانؑ نے اپنی پیروی کی دعوت دی؟ بعض مفسرین نے جناب سلیمان کے خط سے ظاہراً یہ سمجھا ہے کہ اہلِ سبا کو اپنی دعوت بلادلیل قبول کرنے پر آمادہ کرنا چاہتے تھے۔

پھر انھوں نے اس کا جواب بھی خود ہی دیا ہے کہ ہُدہُد کا معجزانہ طور پر ان لوگوں کے پاس آنا بذاتِ خود حضرت سلیمان کی دعوت کے برحق ہونے کی دلیل ہے[2]

لیکن ہمارے خیال میں اس قسم کے جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیونکہ انبیاء کا کام دعوت دینا ہے اور دوسروں کا کام اس کی تحقیق کرنا ہے بالفاظ دیگر دعوت تحقیق کا سبب ہے جیسا کہ ملکہ سباء نے یہ کام انجام دیا اور حضرت سلیمان کی دعوت کی تحقیق کی کہ کیا وہ ایک بادشاہ ہیں یا خدا کے پیغمبر؟

۳۔ اس داستان کے اہم اشارے: حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان کے اس حصّے میں بھی بعض اہم مطالب کی طرف مختصر اشارے ملتے ہیں۔

۱۔ انبیاء کی دعوت ہر قسم کی خواہش برتری اور تکبر کی نفی کرتی ہے جو درحقیقت ہر قسم کے استعمار کی نفی اور قانونِ حق کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کا دوسرا نام ہے۔

۲۔ جب ملکہ سبا کے مصاحبین نے جنگ کے لیے آمادگی کا اعلان کیا تو چونکہ اس کی زنانہ طبع نازک جنگ کے حق میں نہیں تھی لہٰذا اس نے ان لوگوں کی توجہ دوسرے مسائل کی جانب موڑ دی۔

۳۔ اس کے علاوہ اگر وہ ان کے جنگ پر مبنی مشورے کو مان لیتی تو راہِ حقیقت سے ہٹ جاتی اور جیسا کہ ہم آگے پڑھیں گے کہ اس نے قاصد کے ذریعے تحفے تحائف بھیج کر سلیمان کی جس طرح سے آزمائش کی اس کے بہترین نتائج ظاہر ہوئے جو خود اس کی ذات کے لیے بھی اور ملک سبا کے باشندوں کے لیے بھی نہایت مفید ثابت ہوئے اور اس بات کا موجب بن گئے کہ وہ حق کی راہ کو پالیں اور خوں ریزی سے بچ جائیں۔

۴۔ اس واقعے سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ضروری نہیں کہ شوریٰ کا نظام ہمیشہ حق پر انجام پذیر ہو۔ کیونکہ یہاں پر

---

[1] وسائل الشیعہ جلد ۸ ص ۴۳۷ (کتاب الحج ابواب العشرۃ باب ۳۳)۔

[2] تفسیر فخر رازی، انہی آیات کے ذیل میں۔

Marfat.com

ملکہ سبا کے اکثر ساتھیوں کا یہ نظریہ تھا کہ فوجی طاقت کا مظاہرہ دوسری تمام باتوں پر فوقیت رکھتا ہے جبکہ ملکہ کا نظریہ اس کے بالکل برعکس تھا اور اس داستان کے آخر میں جا کر معلوم ہو گا کہ حق ملکہ کے ساتھ تھا۔

یہاں پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اس قسم کے مشورے ان مشوروں سے بالکل جُدا ہیں جو آج کل ہمارا معمول بن چکے ہیں کیونکہ ہم اکثریت کے نظریے کو معیار سمجھتے ہیں اور فیصلے کا حق اکثریت کو دیتے ہیں جبکہ اس قسم کے مشوروں میں کسی قسم کے فیصلے کا حق عوام کے قائد کو ہوتا ہے اور مشیر لوگ صرف مشورہ ہی دے سکتے ہیں اور مندرجہ ذیل آیت مشورے کی اسی دوسری قسم کی طرف اشارہ ہے:

شاورهم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی الله

اپنے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کریں اور جب کوئی فیصلہ کر لیں تو پھر خدا پر بھروسہ کریں (آلِ عمران/١٥٩)

جبکہ سورۂ شوریٰ کی آیت ٣٨ ظاہراً مشورے کی پہلی قسم کی طرف اشارہ ہے، فرمایا گیا ہے:

وامرهم شوریٰ بینهم

مومنین کا کام مشورے سے انجام پانا چاہیے[1]

۵۔ ملکہ سبا کے مشیروں نے اسے کہا کہ ہم صاحبِ قوت اور جنگجو ہیں۔ ممکن ہے کہ ان دو لفظوں کا باہمی فرق یہ ہو کہ "قوۃ" لشکر کی عظیم تعداد کی طرف اشارہ ہو اور "باس شدید" ان کے جنگی کاموں اور طریقہ کار سے واقفیت اور فوج کی شجاعت کی طرف اشارہ ہو یعنی وہ زبانِ حال سے یہ کہنا چاہتے ہوں کہ ہم لشکر کی تعداد کے لحاظ سے بھی اور اس کی کیفیت کے لحاظ سے بھی دشمن کے ساتھ لڑنے کے لیے بالکل آمادہ ہیں۔

۴۔ **بادشاہوں کی علامت:** ان آیات سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ استبدادی حکومت اور سلطنت ہر جگہ پر فساد و تباہی اور کسی قوم کے باعزت افراد کو ذلیل کرنے کا اہم ذریعہ ہے کیونکہ اس میں باحیثیت افراد کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے اور چاپلوس اور خوشامدی لوگوں کو آگے لایا جاتا ہے ہر ہر قدم پر انھیں اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے انھیں صرف تحفے تحائف بھیجنے والوں، رشوت دینے والوں اور زر و جواہرات پیش کرنے والوں سے ہی سروکار ہوتا ہے پھر جو ظالم لوگ ان امور پر دسترس رکھتے ہیں، فطری طور پر ان کے منظورِ نظر اور محبوبِ خاطر ہوتے ہیں۔

بادشاہوں کا تو دھیان ہی ہمیشہ مقام و منصب، تحفے تحائف اور زر و جواہر کی طرف ہوتا ہے۔ جبکہ انبیاءِ الٰہی کے سامنے اُمت کی اصلاح کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

---

[1] مشورے کے بارے میں مزید وضاحت کے لیے تفسیر نمونہ جلد ٢ میں سورہ آلِ عمران کی آیت ١٥٩ کی تفسیر ملاحظہ فرمائیں۔

Marfat.com

۳۶۔ فَلَمَّا جَآءَ سُلَيْمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوْنَنِ بِمَالٍ فَمَآ اٰتٰىنِۦَ اللّٰهُ خَيْرٌ
مِّمَّآ اٰتٰىكُمْ بَلْ اَنْتُمْ بِهَدِيَّتِكُمْ تَفْرَحُوْنَ ○
۳۷۔ اِرْجِعْ اِلَيْهِمْ فَلَنَاْتِيَنَّهُمْ بِجُنُوْدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمْ بِهَا وَلَنُخْرِجَنَّهُمْ
مِّنْهَآ اَذِلَّةً وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ○

ترجمہ

۳۶۔ جب (ملکہ سباء کے ایلچی) سلیمان کے پاس آئے تو اس نے کہا، تم مجھے مال کے ذریعے کمک دینا (اور فریب دینا) چاہتے ہو، جو کچھ خدا نے مجھے عطا کیا ہے اس سے کہیں بہتر ہے جو اس نے تمھیں دیا ہے یہ تو تم ہی لوگ ہو جو تحفوں پر خوش ہوتے ہو۔

۳۷۔ ان کے پاس لوٹ جاؤ (اور انھیں جا کر بتا دو کہ) ہم ایسے لشکروں کے ساتھ ان کی طرف آئیں گے جن سے مقابلے کی طاقت ان میں نہیں ہوگی اور انھیں وہاں (کی سرزمین) سے ذلیل اور حقیر بنا کر نکال دیں گے۔

تفسیر

مجھے مال کے ذریعہ نہ ورغلاؤ

ملکہ سبا کے روانہ کیے ہوئے افراد نے سرزمین یمن کو خیرباد کہا اور شام اور جناب سلیمان کے مرکزِ حکومت کی طرف چل دیئے۔ دل میں یہی تصور لیے ہوئے کہ سلیمان ان کے تحائف قبول کریں گے اور خوش ہو کر انھیں شاباش کہیں گے۔

لیکن جوں ہی وہ سلیمان کے حضور پیش ہوئے (فلما جاء سلیمان) تو وہاں پر عجیب و غریب منظر دیکھا۔ سلیمان نے نہ صرف ان کا استقبال نہیں کیا بلکہ انھیں یہ بھی کہا "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ (اپنے) مال کے ذریعے میری مدد کرو؟ حالانکہ یہ مال میری نگاہ میں بالکل بے قیمت سی چیز ہے جو کچھ خدا نے مجھے عطا فرمایا ہے اس سے کئی حصے بہتر اور کہیں قیمتی ہے (قال اتمدونن بمال فما اٰتانی اللہ خیر مما اٰتاکم)۔

نبوت، علم و دانش، ہدایت اور تقویٰ کے مقابلے میں مال کی کیا حیثیت ہے؟

Marfat.com

"یہ تو تم ہو جو اپنے تحفے تحائف پر خوش ہوتے ہو" (بل انتم بهديتكم تفرحون)۔
جی ہاں! یہ تمھی لوگ ہو کہ اس قسم کے حسین اور قیمتی تحفے اگر میرے لیے بھی بھیجو تو اس قدر مسرور و شادماں نظر آتے ہو کہ خوشی کی چمک تمھاری آنکھوں سے نمایاں ہوتی ہے لیکن میری نگاہوں میں ان کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہے۔
اس طرح سے جناب سلیمان علیہ السّلام نے ان کی اقدار اور معیار کی نفی کردی اور تحائف کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر ثابت کردیا کہ ان کے نزدیک اقدار اور معیار کچھ اور ہیں۔ دنیا پرستوں کے مقرر کردہ معیار جن کے سامنے ہیچ اور بے قیمت ہیں۔
جناب سلیمان نے حق و باطل کے مسئلے میں اپنے اس عزم بالجزم کو ثابت کرنے کے لیے ملکہ سبا کے خاص ایلچی سے فرمایا: تم ان کی طرف واپس پلٹ جاؤ (اور اپنے یہ تحفے بھی ساتھ لے جاؤ) لیکن یہ ضرور یاد رکھو کہ ہم کئی لشکر لے کر ان کے پاس بہت جلد پہنچ رہے ہیں جن کے مقابلے کی طاقت ان میں نہیں ہوگی (ارجع اليهم فلنأتينهم بجنود لا قبل لهم بها)۔
اور ہم انھیں اس سرزمین سے ذلیل کرکے نکال دیں گے اور وہ نہایت ہی حقیر ہوں گے (ولنخرجنهم منها اذلة وهم صاغرون)۔
درحقیقت "اذلة" پہلا حال ہے اور "هم صاغرون" دوسرا حال جس کا معنی یہ ہے کہ ہم نہ صرف اس سرزمین سے انھیں نکال باہر کریں گے بلکہ نہایت ہی ذلت اور حقارت کی حالت میں انھیں ملک بدر کردیں گے اور وہ اپنے تمام محلات و قصور، مال و دولت اور جاہ و جلال سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے کیونکہ انھوں نے آئینِ حق کے سامنے جھک کر ہماری طرف رجوع نہیں کیا بلکہ مکر و فریب کے ذریعے ہم سے رابطہ کیا ہے۔
جناب سلیمان کی یہ دھمکی ان لوگوں کے نزدیک صحیح اور قابلِ عمل بھی تھی کیونکہ انھوں نے جناب سلیمان اور ان کے جاہ و جلال اور فوج و لشکر کو نزدیک سے دیکھا تھا۔
پہلے کی آیات جو ابھی ہم پڑھ چکے ہیں اگر ان کی طرف رجوع کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جناب سلیمان نے ان سے دو چیزوں کا تقاضا کیا تھا ایک تو "برتری طلبی کو ترک کردیں" اور دوسرے "حق کے آگے جھک جائیں"۔
اہلِ سبا کا ان دونوں چیزوں کا مثبت جواب نہ دینا اور اس کی بجائے تحائف کا بھیجنا اس بات کی دلیل تھا کہ وہ حق کو قبول نہیں کرتے اور نہ ہی برتری طلبی سے باز آتے ہیں لہٰذا سلیمان نے انھیں پر فوجی دباؤ ڈالنے کی کوشش کی۔
جبکہ ملکہ سبا اور اس کے درباریوں نے دلیل اور ثبوت یا معجزہ وغیرہ کا مطالبہ کیا تھا لہٰذا انھیں موقع فراہم کیا کہ مزید تحقیق کریں لیکن تحفوں کے بھیجنے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انکار کرچکے ہیں۔
یہ بات بھی ہمیں معلوم ہے کہ جناب سلیمان کو ہُدہُد نے جو ناخوشگوار خبر سنائی تھی وہ یہ کہ ملکِ سبا کے لوگ سورج پرست ہیں اور غیب و حضور کے جاننے والے خدا سے روگردانی کیے ہوئے ہیں اور مخلوق کے آگے جھکے ہوئے ہیں۔
حضرت سلیمان کو اسی بات سے سخت دکھ پہنچا تھا اور ہم جانتے ہیں کہ بت پرستی ایک ایسی بات ہے جس کے سامنے کوئی بھی خدائی دین خاموش تماشائی نہیں بن سکتا اور نہ ہی بت پرستوں کو ایک مذہبی اقلیت مان سکتا ہے بلکہ بوقتِ ضرورت زبردستی بھی بتکدوں کو مسمار اور شرک و بت پرستی کو نیست و نابود کرسکتا ہے۔

Marfat.com

مندرجہ بالا توضیحات سے بخوبی معلوم ہوتا ہے سلیمانؑ کی یہ دھمکی " لا اکراہ فی الدین " کے بنیادی اصول سے بھی متصادم نہیں ہے کیونکہ بت پرستی کوئی دین نہیں بلکہ ایک خرافات اور راہِ حق سے انحراف ہے ۔

چند ایک نکات

۱۔ زہد مادی وسائل سے استفادہ نہ کرنے کا نام نہیں :۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدا کے کسی بھی دین میں زہد کا معنی یہ نہیں کہ انسان مال و دولت اور دنیاوی وسائل سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ زہد کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کے ہاتھوں "اسیر" ہو کر نہ رہ جائے بلکہ ان پر "امیر" ہو کر رہے۔ خدا کے عظیم پیغمبر جناب سلیمانؑ نے ملکہ سبا کے قیمتی تحائف کو ٹھکرا کر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ "امیر" ہیں "اسیر" نہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک حدیث میں ہے :

الدنیا اصغر قدرًا عند الله و عند انبیائه و اولیائه من ان یفرحوا بشیءٍ منها او یحزنوا علیه فلا ینبغی لعالم و لا لعاقل ان یفرح بعرض الدنیا

دنیا خداوند عالم، اس کے انبیاء اور اولیاء کے نزدیک اس قدر پست اور حقیر ہے کہ وہ اس سے کبھی خوش نہیں ہوتے، اور نہ ہی اس کے ہاتھ سے چلے جانے سے غمگین ہوتے ہیں بنا بریں کسی عالم اور عاقل کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ دنیا کی متاعِ ناپائیدار پر خوشی منائے [1]

۲۔ کچھ سبق آموز باتیں :۔ داستان کے اس حصے میں بھی چند سبق آموز باتیں موجود ہیں جو پُر معانی آیات میں موجود ہیں ۔ مثلاً :

الف : لشکر کشی کا یہ ہدف نہیں تھا کہ انسانوں کا قتل عام کیا جائے بلکہ اس کا مقصد دشمن کو اس حد تک ڈرانا تھا کہ وہ مقابلے کی جرأت نہ کر سکے (جنود لا قبل لھم بھا)۔

یہ تعبیر بعینہ اس آیت کے مترادف ہے جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے :

واعدوا لھم ما استطعتم من قوة ..... ترھبون به عدو الله

(الانفال / ۶۰)

اس قدر طاقت فراہم کرو کہ دشمن پر اس کا خوف طاری ہو جائے ۔

ب : حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے مخالفین کو قتل کی دھمکی نہیں دی بلکہ انھیں ان کے محلات سے ذلت و خواری کے ساتھ نکال باہر کرنے کی دھمکی دی ہے۔

---

[1] تفسیر روح البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

ج : حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے مخالفین کو غفلت میں نہیں ڈالا بلکہ انھیں حملہ کرنے کی صاف صاف دھمکی دی ۔

د : جناب سلیمان علیہ السلام دوسروں کے مال پر نظریں نہیں ڈالتے بلکہ فرماتے ہیں :
جو کچھ خدا نے مجھے عطا فرمایا ہے وہ سب سے بہتر ہے ۔ وہ خدائی عنایات کو مادی اور مالی چیزوں میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ علم وایمان اور معنوی عطاء وبخشش پر نازاں ہیں ۔

Marfat.com

۳۸۔ قَالَ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝
۳۹۔ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ۝
۴۰۔ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ۭ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۣ لِيَبْلُوَنِيْٓ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ۭ وَمَنْ شَكَرَ فَاِنَّمَا يَشْكُرُ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ رَبِّيْ غَنِيٌّ كَرِيْمٌ ۝

ترجمہ

۳۸۔ (سلیمان نے) کہا اے سردارو! تم میں سے کون شخص اس کا تخت، ان کے مجھ تک پہنچنے سے پہلے لاسکتا ہے۔

۳۹۔ جنوں میں سے ایک عفریت نے کہا: میں اسے آپ کے مجلس سے اٹھنے سے پہلے آپ کے پاس لے آؤں گا اور میں اس کو لانے کی طاقت بھی رکھتا ہوں اور امین بھی ہوں۔

۴۰۔ لیکن جس کے پاس (آسمانی) کتاب کا کچھ علم تھا، اس نے کہا میں اسے آپ کے پلک جھپکنے سے پہلے لے آؤں گا اور جب سلیمان نے اس (تخت) کو اپنے پاس موجود دیکھا تو کہا کہ یہ سب میرے پروردگار کے فضل سے ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ کیا میں اس کا شکر ادا کرتا ہوں یا کفرانِ نعمت، کیونکہ جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدے میں شکر کرتا ہے اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے، سو میرا رب بے نیاز اور کریم ہے۔

Marfat.com

تفسیر

پلک جھپکتے ہی تخت موجود

آخر کار ملکہ کے کارندے اپنے تحفے تحائف اور سازو سامان اکٹھا کر کے اپنے ملک واپس چلے گئے اور سارا ماجرا ملکہ اور اس کے مصاحبین سے جا کر بیان کیا، اسی طرح حضرت سلیمانؑ کے ملک کی معجزانہ عظمت بھی بیان کی جن میں سے ہر ایک بات اس امر کی دلیل تھی کہ وہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی عام دنیاوی بادشاہ ہیں بلکہ خدا کے سچے پیغمبر ہیں اور ان کی حکومت ایک خدائی حکومت ہے۔

یہاں پر ان کے لیے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ نہ صرف جناب سلیمان کے ساتھ فوجی مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے بلکہ اگر بالفرض مقابلہ کریں بھی تو قوی احتمال یہی ہے کہ ان کا خدا کے ایک زبردست طاقتور نبی سے مقابلہ ہو گا۔

لہٰذا ملکہ سبا نے اپنی قوم کے بہت سے سرداروں کے ساتھ مشورے کے بعد فیصلہ کیا کہ سلیمان کے پاس ذاتی طور پر جا کر اس اہم مسئلے کی بارے میں تحقیقات کریں تاکہ پتہ چل سکے کہ سلیمانؑ کا کیا مسلک ہے؟

کسی بھی صورت میں یہ خبر حضرت سلیمان تک بھی پہنچ گئی لہٰذا انھوں نے فیصلہ کیا کہ اب جبکہ ملکہ اور اس کے ساتھی راستے میں ہیں انھیں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تاکہ انھیں پہلے سے زیادہ ان کے اعجاز کی حقیقت کا علم ہو جائے اور وہ ان کی دعوت قبول کر لیں۔

لہٰذا حضرت سلیمان نے اپنے درباریوں سے مخاطب ہو کر کہا اے بزرگو! تم میں سے کون شخص اس بات کی قدرت رکھتا ہے کہ اس کا تخت میرے پاس لے آئے قبل اس کے کہ وہ خود میرے پاس آئیں اور سر تسلیم خم کریں (قال یا ایھا الملؤ ایکم یأتینی بعرشھا قبل ان یأتونی مسلمین)۔

اگر چہ بعض مفسرین نے ملکہ سبا کے تخت کو یہاں پر لانے کی دلیل کے سلسلے میں اپنے آپ کو بہت زحمت میں ڈالا ہے بلکہ کچھ ایسے احتمالات بھی ذکر کیے ہیں جو کسی بھی صورت میں آیت کے موضوع سے مناسبت نہیں رکھتے لیکن واضح سی بات ہے کہ جناب سلیمان کے اس کام کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ وہ تو ان سے اپنی طاقت کا لوہا منوانا چاہتے تھے تاکہ اس طرح سے ایک نہایت اہم مقصد حاصل ہو یعنی اس طرح سے ان کے غیر مشروط طور پر ان کے دین کے آگے جھکنے اور قدرتِ خدا پر ایمان لانے کے راستے ہموار ہو جائیں اور میدان جنگ میں جانے اور خوں ریزی کی نوبت نہ آنے پائے۔

وہ چاہتے تھے کہ ملکہ سبا اور اس کے رفقاءِ کار کے وجود کی گہرائیوں میں ایمان اچھی طرح راسخ ہو جائے تاکہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی ایمان لانے کی دعوت دے سکیں۔

اس موقع پر دو قسم کے افراد نے کہا کہ ہم یہ کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ جن میں سے ایک عجیب اور دوسرا عجیب تر تھا۔

Marfat.com

سب سے پہلے جنّوں میں سے ایک عفریت نے ان کی طرف منہ کرکے کہا: میں اس کا تخت آپ کے مجلس سے اٹھنے سے پہلے پہلے آپ کے پاس لادوں گا (قال عفریت من الجن انا اٰتیك به قبل ان تقوم من مقامك)۔[1]

یہ کام میرے لیے مشکل نہیں ہے اور نہ ہی میں اس بارے میں کسی قسم کی خیانت کروں گا کیونکہ میں اس سلسلے میں طاقتور بھی ہوں اور امین بھی (و انی علیه لقوی امین)۔

"عفریت" کا معنی ہے مغرور، سرکش اور خبیث اور "انی علیه لقوی امین" کے جملہ کی کئی لحاظ سے تاکید کی گئی ہے ("ان" لفظ اسمیہ اور لام کے ساتھ) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عفریت میں کئی لحاظ سے خیانت کا اندیشہ تھا لہٰذا اسے اپنا دفاع کرنا پڑا اور امانت ووفاداری کا یقین دلانا پڑا۔

صورت حال خواہ کچھ ہو جناب سلیمان کی زندگی عجائبات اور معجزات سے بھری پڑی ہے اور کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے کہ ایک عفریت اس قسم کا کارنامہ ایک یا چند گھنٹوں میں انجام دے یعنی جتنی دیر سلیمانؑ لوگوں میں فیصلے کے لیے یا امور مملکت میں غور وفکر کے لیے یا عوام کو وعظ ونصیحت کے لیے بیٹھتے ہیں اتنی دیر میں وہ بھی ملکہ سبا کا تخت لاکر حاضر کر دیتا۔

دوسرا ایک صالح اور متقی انسان تھا اور "کتاب خدا" سے بھی اسے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ جیسا کہ اس شخص کے بارے میں خود قرآن کہتا ہے "جس کے پاس کتاب کا کچھ علم تھا اس نے کہا میں آپ کے پلک جھپکنے سے بھی پہلے اس تخت کو لے آؤں گا" (قال الذی عنده علم من الکتاب انا اٰتیك به قبل ان یرتد الیك طرفك)۔

جب حضرت سلیمانؑ نے اس کی پیش کش منظور کرلی تو اس نے بھی اپنی معنوی طاقت کے ذریعے ملکہ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں آپ کے پاس حاضر کردیا اور جب سلیمانؑ نے اسے اپنے پاس موجود پایا تو خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہنے لگے: یہ میرے پروردگار کا فضل ہے تاکہ مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر بجالاتا ہوں یا کفرانِ نعمت کرتا ہوں (فلما راٰه مستقرًا عنده قال هٰذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر)۔

پھر خود ہی فرماتے ہیں: جو شخص شکر کرتا ہے وہ اپنے ہی فائدہ میں شکر کرتا ہے اور جو کفرانِ نعمت کرتا ہے سو میرا پروردگار بے نیاز اور کریم ہے (ومن شکر فانما یشکر لنفسه ومن کفر فان ربی غنی کریم)۔

یہ شخص کون تھا، اسے یہ عجیب وغریب طاقت کہاں سے ملی اور علم الکتاب سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ شخص جناب سلیمان کے مومن اور قریبی رشتہ داروں اور خاص دوستوں میں سے تھا۔

---

[1] "اٰتی" کے بارے میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ وہ "اتی" مادہ سے "اسم فاعل" ہو اور دوسرا اسی مادہ سے "فعل مضارع" بھی ہو سکتا ہے لیکن پہلا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

تواریخ میں اس کا نام "آصف بن برخیا" لکھا ہے۔ وہ جناب سلیمان علیہ السّلام کے وزیر اور بھانجے تھے [١]
اور "علم کتاب" سے ان کی آسمانی کتابوں سے واقفیت مراد ہے ایسی عمیق اور گہری واقفیت جس سے ان کے لیے ممکن ہوگیا کہ وہ اس طرح کا معجزانہ کارنامہ انجام دیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے یعنی علم الٰہی کی لوح اور اس کے صرف ایک گوشے کا اس بندۂ خدا کو علم حاصل تھا جس کی وجہ سے وہ ملکہ کے تخت کو "سبا" سے آنکھ جھپکنے کی دیر میں لانے پر قادر تھا۔

بہت سے مفسّرین اور غیر مفسّرین کا کہنا ہے کہ یہ مردِ مومن اللہ تعالیٰ کے اسمِ اعظم سے باخبر تھا۔ یعنی ایسا باعظمت اور بزرگ نام جس کے سامنے دنیا کی ہر چیز سر جھکائے ہوئے ہے اور وہ انسان کو بے حد و انداز قدرت عطا کرتا ہے۔

اس نکتے کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسمِ اعظم سے مراد یہ ہے کہ کسی خاص کلمہ کے زبان سے نکال دینے سے اس کے اس قدر عجیب و غریب اثرات ظاہر ہوجاتے ہیں ایسی بات نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس نام اور اس کی صفات کو اپنانا ہوتا ہے اور دل و جان سے اس پر عمل کرنا ہوتا ہے اور علم، اخلاق، تقویٰ اور ایمان کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو کر خود کو اس کا مظہر بنانا ہوتا ہے تب کہیں جا کر اس اسمِ اعظم کے پرتو میں انسان کے اندر معجزانہ امور کی انجام دہی کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے [٢]

"قبل ان یرتد الیک طرفک" کے بارے میں بھی مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں لیکن اگر قرآنِ مجید کی دوسری آیات کو مدِنظر رکھا جائے تو اس جملے کی حقیقت واضح ہوجائے گی۔

چنانچہ سورۂ ابراہیم آیت ۴۳ میں ہے:

لا یرتد الیهم طرفهم

لوگ بروزِ قیامت اس قدر وحشت زدہ ہوجائیں گے کہ ان کی آنکھیں پتھرا جائیں گی حتیٰ کہ وہ جھپکیں گی بھی نہیں۔

کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ خوف و وحشت کی حالت میں انسان کی آنکھیں پتھرا کر کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں، جیسے مردے کی آنکھوں کی کیفیت ہوتی ہے۔

بنابریں اس کا معنی یہ ہوگا کہ آپ کی آنکھ جھپکنے سے پہلے میں ملکہ سبا کا تخت آپ کے سامنے لے آؤں گا [٣]

---

[١] بعض لوگوں نے اس سے حضرت سلیمانؑ یا جناب جبرئیلؑ مراد لیے ہیں ان کا یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور پھر حضرت سلیمانؑ کے بارے میں تو ظاہر آیات کے بھی قطعاً خلاف ہے۔

[٢] خدا کے "اسمِ اعظم" کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد، (سورہ اعراف کی آیت ١٨٠ کے ذیل میں) ملاحظہ فرمائیں ہم نے وہاں تفصیلی بحث کی ہے۔

[٣] بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "یرتد الیک طرفک" سے مراد کسی چیز پر نگاہ ڈالنا اور نظر کا انسان کی طرف واپس لوٹ آنا ہے لیکن اس کے اس مدعا پر کوئی دلیل نہیں ہے اسی طرح یہ جملہ آنکھ سے شعاع کے "نکلنے" کے نظریہ پر بھی دلیل واقع نہیں ہو سکتا جو فلسفۂ قدیم میں موجود ہے (غور کیجیے گا)۔

Marfat.com

چند ایک نکات

۱۔ چند سوال اور ان کے جواب :۔ مندرجہ بالا آیات کے ضمن میں چند ایک سوال پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ کہ آخر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ معجزانہ کام خود کیوں انجام نہیں دیا ؟ جب وہ خود اللہ کے عظیم پیغمبر اور صاحبِ معجزہ نبی تھے تو پھر آپ نے یہ فریضہ جناب آصف بن برخیا کے ذمہ کیوں لگایا ؟

جواباً عرض ہے کہ یہ ممکن ہے کہ یہ اس لیے ہو کہ وہ جناب سلیمان علیہ السلام کے وصی تھے اور وہ اس ذریعے سے اپنے طاقت ور وصی کا تمام لوگوں سے تعارف کرانا چاہتے ہوں[۱] علاوہ ازیں یہ بات بہت اہم ہے کہ استاد ضروری مواقع پر اپنے شاگردوں کو آزماتا ہے تاکہ ان کی استعداد، لیاقت اور اہلیت سے مطلع ہو اور اصولی طور پر شاگردوں کی لیاقت اور اہلیت استاد کی اہلیت اور لیاقت کی واضح دلیل ہوتی ہے ۔ اگر شاگرد کوئی اہم کارنامہ انجام دیں تو استاد زیادہ قابلِ تعریف ہوتا ہے ۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے کس بناء پر ملکہ سبا کا تخت اس کی اجازت کے بغیر اپنے پاس منگوایا ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اس کا ایک نہایت عظیم ہدف ہو اور اس سے ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی اور انھیں معجزہ دکھانا مقصود ہو ۔

علاوہ ازیں ہم جانتے ہیں کہ بادشاہوں کا مال اپنا مال تو ہوتا نہیں بلکہ عام طور پر دوسرے لوگوں کا غصب کردہ مال ہوتا ہے ۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ عفریت جن میں ایسے خارقِ عادت کام انجام دینے کی طاقت کیونکر ہو سکتی ہے ؟

اس کا جواب تو ہم اعجاز سے متعلق بحث میں دے چکے ہیں اور وہاں پر بتا چکے ہیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ غیر مومن لوگ بھی زبردست ریاضتوں اور مشقتوں کی وجہ سے کچھ ایسے امور کی انجام دہی پر قادر ہو جاتے ہیں جو عموماً خلافِ معمول ہوتے ہیں لیکن ان کے کاموں میں اور معجزات میں فرق ہوتا ہے کیونکہ ان کے اس قسم کے کام محدود بشری طاقت کے مرہونِ منت ہوتے ہیں جبکہ معجزات کا دار و مدار خداوندِ عالم کی بے پایاں اور لازوال قدرت پر ہوتا ہے جو خود خدا کی دوسری صفات کی مانند غیر محدود ہوتی ہے ۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ عفریت جن اپنی توانائی کو ملکہ سبا کے تخت کو لانے کے لیے جناب سلیمان کی مجلس برخاست کرنے میں محدود کرتا ہے جبکہ جناب آصف بن برخیا نے اپنی توانائی کو کسی حد میں محدود نہیں کیا اگر وہ پلک جھپکنے کی بات بھی کرتے ہیں تو در حقیقت ایک کم از کم مدت کی طرف اشارہ ہے جس سے کم مدت اور کوئی ہو نہیں سکتی ۔

اور مسلّم ہے کہ جناب سلیمان بھی اس قسم کے کاموں میں صالح شخص کی حمایت کریں گے کیونکہ اس طرح سے اس کا تعارف ہو گا

---

[۱] یہ جواب تفسیر عیاشی میں حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے منقول ہے جو آپ نے تفصیل کے ساتھ یحییٰ بن اکثم کو دیا تھا (تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹۱)

Marfat.com

اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے نہ کہ ایک عفریت کی کہ جس کی وجہ سے کوتاہ بین لوگ شک میں پڑ جائیں اور اسے اس کی پاکیزگی اور اچھائی کی دلیل سمجھنے لگ جائیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص کسی معاشرے میں کوئی اہم کام انجام دے اور لوگوں میں بھی مقبول ہو جائے تو وہ اپنے نظریے کا پرچار بھی شروع کر دیتا ہے لہٰذا جناب سلیمان کی حکومت الٰہیہ میں امور مملکت کی باگ ڈور اور ان کی ترویج عفریت کے ہاتھوں میں نہیں آنی چاہیے تھی۔ بلکہ جن لوگوں کے پاس کتاب الٰہی کا کچھ علم تھا انھی کو لوگوں کے افکار و اذہان پر حکومت کرنا چاہیے تھی۔

۲۔ **دو اہم چیزیں۔ طاقت اور امانت:۔** مندرجہ بالا آیات اور سورۂ قصص کی آیت ۲۶ میں کسی اچھے اور مثالی کارکن اور کام کرنے والے کے لیے دو چیزیں اہم شرائط کے طور پر بیان ہوئی ہیں ایک طاقت و توانائی اور دوسرے امانت و دیانت داری۔

البتہ کبھی تو انسان کی اپنی فکری اور اخلاقی بنیادیں اس بات کی متقاضی ہوتی ہیں کہ اس میں یہ شرائط پائی جائیں (جیسا کہ سورۂ قصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مذکور ہوا ہے) اور کبھی معاشرتی نظام اور صالح حکومت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ عفریت جن جیسے افراد بھی ان دو صفات سے ضرور متصف ہوں لیکن صورت خواہ کچھ بھی ہو جب تک معاشرے میں یہ دو بنیادی شرائط نہ پائی جائیں کوئی بھی چھوٹا یا بڑا کام انجام کی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ شرائط خواہ انسان کے ذاتی تقویٰ کی وجہ سے پیدا ہوں یا معاشرے کے قانونی نظام کی وجہ سے (غور کیجیے گا)۔

۳۔ **"علم من الکتاب" اور "علم الکتاب" میں فرق:۔** زیر نظر آیات میں جس شخص نے ملکہ سباء کا تخت پلک جھپکنے کی تھوڑی سی مدت میں سلیمان کے دربار میں لا کر حاضر کیا اس کے بارے میں ہے کہ اس کے پاس "علم من الکتاب" (کتاب کا کچھ علم) تھا۔ جبکہ سورۂ رعد کی آیت ۴۳ میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے گواہوں کی حقانیت کے بارے میں ہے:

قل کفٰی باللہ شہیدًا بینی و بینکم و من عندہ علم الکتاب

کہہ دیجیے کہ میرے اور تمھارے درمیان گواہی کے لیے ایک تو خدا کافی ہے اور دوسرے وہ شخص جس کے پاس "کتاب کا علم" ہے۔

ابو سعید خدری سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ وہ کہتے ہیں میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے (سلیمانؑ کی داستان میں مذکور) "الذی عندہ علم من الکتاب" کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

وہ میرے بھائی سلیمان بن داؤد کے وصی تھے۔

تو پھر میں نے "ومن عندہ علم الکتاب" کے متعلق پوچھا تو فرمایا:

ذالک اخی علی بن ابی طالب

وہ میرے بھائی علی بن ابی طالب ہیں[۱]

"علم من الکتاب" جو جزوی علم کو ظاہر کرتا ہے اور "علم الکتاب" جو کلی علم کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے

۱۔ حاشیہ اگلے صفحہ پر

Marfat.com

درمیان فرق کو دیکھا جائے تو اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ جناب آصف اور حضرت علی کے درمیان کتنا فرق ہے؟

یہی وجہ ہے کہ بہت سی روایات میں ہے کہ خداوندعالم کے اس اسم اعظم کے تہتر حروف ہیں جن میں سے صرف ایک "آصف بن برخیا" کے پاس تھا جس کی وجہ سے انھوں نے ایسا معجزانہ کام انجام دیا کہ پلک جھپکنے کی دیر میں تخت ملکہ سبا کو سلیمان کے قدموں میں پہنچا دیا اور آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے پاس بہتّر حروف ہیں اور ایک حرف صرف اور صرف ذاتِ خداوندِعالم کے ساتھ مخصوص ہے[۱]

۴۔ "هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ": مغرور دنیا پرست جب برسراقتدار آجاتے ہیں تو اپنے سوا سب کچھ بھلا دیتے ہیں اور جب تمام مادی وسائل پر قابض ہو جاتے ہیں تو قارون کی مانند ہر چیز کو اپنی طرف سے سمجھتے ہیں کسی اور کی جانب سے نہیں جیسا کہ قارون نے کہا ہے:

انما اوتيته على علم عندی

میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میرے اپنے علم کی بناء پر ہے۔ (قصص / ۷۸)

جبکہ خدا کے نیک بندے کسی بھی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اور منصب پر پہنچ جانے کے بعد بھی یہی کہتے ہیں:

هٰذا من فضل ربی

یہ سب کچھ میرے پروردگار کا عطیہ ہے۔

پھر قابلِ توجہ بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے ملکہ سبا کا تخت اپنے پاس پاکر صرف یہی نہیں کہا بلکہ یہ بھی فرمایا کہ یہ اس لیے ہے تاکہ میرا خدا مجھے آزمائے کہ میں اس کا شکر بھی ادا کرتا ہوں یا نہیں؟

اسی سورت کے اوائل میں بھی ہم پڑھ چکے ہیں کہ جناب سلیمان اپنی تمام نعمتوں کو خداوندِعالم کا عطیہ سمجھتے ہیں اور نہایت ہی خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

پروردگارا! مجھے ان تمام نعمتوں کے شکر کی توفیق عطا فرما اور اپنی رضا کے حصول کی توفیق دے۔

مغرور دنیا پرستوں اور خدا کے خالص توحید پرستوں کے فرق کا یہی معیار ہے اور کم ظرف خود پرستوں اور باظرف و باکردار شخصیتوں میں یہی فرق ہے۔

اگرچہ اب یہ معمول سا بن گیا ہے کہ بعض ظاہر پسند اور ریاکار لوگ جناب حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس معنی خیز جملے "هٰذا من فضل ربی" کو اپنے طاغوتی محلات اور عمارتوں کی پیشانی پر بڑے جلی حروف میں تحریر کرتے ہیں

حاشیہ پچھلے صفحہ کا:۔ اس حدیث کو بہت سے مفسرین اور علماءِ اہلِ سنت نے بیان فرمایا ہے بالکل اس عبارت کے ساتھ یا اس سے ملتی جلتی عبارت کے ساتھ۔ مزید تفصیل کے لیے احقاق الحق کی تیسری جلد ص ۲۸۰ اور ص ۲۸۱ ملاحظہ فرمائیں۔

[۱] اصول کافی اور تفسیر نور الثقلین کی طرف رجوع فرمائیں۔

Marfat.com

جبکہ نہ تو اس پر ان کا ایمان ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے عمل سے ذرہ برابر بھی کوئی اشارہ ملتا ہے۔

لیکن جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح عمارتوں کی پیشانی پر اسے جلی حروف میں لکھا جاتا ہے اسی طرح یہ انسان کی اپنی پیشانی پر اور اس کے دل میں بھی نقش ہو اور وہ اپنے عمل سے یہ بات ظاہر کرے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ فضلِ خداوندی ہے اور اسی کی جانب سے عطا کردہ ہے۔ پھر اس کا شکر بھی بجالائے اور شکر بھی ایسا جو اس کے اعمال اور وجود سے ظاہر ہو نہ کہ صرف زبان سے۔[۱]

۵۔ **تخت کو کیسے حاضر کر دیا؟** یہ پہلا خارقِ عادت کام نہیں ہے جو ہم حضرت سلیمان علیہ السلام کی داستان میں پڑھ رہے ہیں یا بطورِ کلی انبیاء کی داستان میں دیکھ رہے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی تعبیرات کی توجیہ کر کے ان کے ظاہری معنی کو بدل دینا چاہتے ہیں اور انھیں کنایہ یا کوئی اور معنوی رنگ دینا چاہتے ہیں انھیں چاہیئے کہ وہ انبیاء کے معجزات کے بارے میں اپنے نظریے کا دوٹوک اظہار کریں اور بتائیں کہ معجزات کے بارے میں ان کا کیا عقیدہ ہے۔ کیا وہ انبیاء یا ان کے جانشینوں سے خارقِ عادت کاموں کے انجام پانے کو محال سمجھتے ہیں اور مکمل طور پر اس کا انکار کرتے ہیں؟

اگر ان کا یہی عقیدہ ہے تو پھر یہ عقیدہ نہ تو توحید اور کائنات پر حکم فرما قدرتِ خداوندی کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے جو تمام قوانینِ ہستی پر حکم فرما ہیں اور نہ ہی قرآن کی بہت سی صریح آیات سے مطابقت رکھتا ہے۔

لیکن اگر وہ معجزے کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر حضرت عیسیٰ کے ہاتھوں مُردوں کا زندہ ہونا ہو یا مادرزاد اندھوں کو شفا ملنا ہو یا آصف بن برخیا کے ذریعے سبا سے ملکہ کا تخت آنا ہو ان سب میں کوئی فرق نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ یہاں پر مرموز روابط اور ان جانی علّتیں کارفرما ہیں جن سے ہمارا محدود علم بالکل ناآشنا ہے۔ ہم تو صرف اس قدر جانتے ہیں کہ اس قسم کا کام محال ہرگز نہیں ہے۔

آیا آصف بن برخیا نے ملکہ سبا کے تخت کو نور کی لہروں میں تبدیل کر کے ایک ہی لمحے میں اسے سلیمان کے پاس پہنچایا اور دوبارہ اسے اپنے اصلی مادے میں تبدیل کر دیا؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہمیں اس کا پورا علم نہیں ہے۔

ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ سائنس کی موجودہ ترقی کے ذریعہ آج انسان ایسے ایسے کارنامے انجام دے رہا ہے کہ اگر ان کارناموں کا ذکر آج سے دو سو سال قبل کیا جاتا تو ممکن ہے لوگ اسے محال سمجھتے۔ مثلاً اگر چند سو سال پہلے کسی کو کہا جاتا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اگر ایک شخص مشرق میں بیٹھ کر گفتگو کرے گا تو اسی وقت مغرب میں رہنے والے لوگ اس کی باتوں کو بھی سنیں گے اور اس کی صورت کو بھی دیکھیں گے تو اس زمانے کے لوگ اسے مجذوب کی بڑ یا پریشان خیالی کا نمونہ سمجھتے۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انسان ہر چیز کو اپنے محدود علم کے پیمانوں میں پرکھنا چاہتا ہے جبکہ اس کے علم و قدرت کے ماوراء کروڑوں اسرار و رموز موجود ہیں۔

---

[۱] شکر کی اہمیت اور نعمتوں کی فراوانی میں اس کی تاثیر اور شکر کی اقسام (شکر تکوینی اور شکر تشریعی) کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۱۰ (سورۂ ابراہیم کی آیت ، کے ذیل) میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

Marfat.com

۴۱۔ قَالَ نَكِّرُوا لَهَا عَرْشَهَا نَنْظُرْ اَتَهْتَدِيْٓ اَمْ تَكُوْنُ مِنَ الَّذِيْنَ لَا يَهْتَدُوْنَ ○

۴۲۔ فَلَمَّا جَآءَتْ قِيْلَ اَهٰكَذَا عَرْشُكِ ؕ قَالَتْ كَاَنَّهٗ هُوَ ۚ وَاُوْتِيْنَا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهَا وَكُنَّا مُسْلِمِيْنَ ○

۴۳۔ وَصَدَّهَا مَا كَانَتْ تَّعْبُدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ○

۴۴۔ قِيْلَ لَهَا ادْخُلِي الصَّرْحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّكَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ؕ قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ع

ترجمہ

۴۱۔ (سلیمانؑ نے) کہا: اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کر دو تاکہ ہم دیکھیں کہ وہ سمجھتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو ہدایت نہیں پائیں گے۔

۴۲۔ جب وہ آگئی تو اسے کہا گیا کہ کیا تمھارا تخت اس جیسا ہے (جواب میں) اس نے کہا: یہ تو خود وہی معلوم ہوتا ہے، ہم تو پہلے ہی جان چکے تھے اور اسلام لا چکے تھے۔

۴۳۔ اور اسے (سلیمانؑ نے) غیر خدا کی عبادت سے روک دیا کیونکہ وہ کافروں میں سے تھی۔

۴۴۔ اسے کہا گیا کہ محل کے صحن میں داخل ہو جائے لیکن جب اس نے دیکھا تو سمجھا کہ یہ پانی کی نہر ہے اس نے (گزرنے کے لیے پائنچے اٹھائے اور) اپنی پنڈلیاں ظاہر کر دیں (لیکن سلیمان نے) کہا یہ (پانی نہیں بلکہ) صاف بلور کا محل ہے (ملکہ سبا) کہنے لگی: پروردگارا! میں تو اپنے آپ پر ظلم کرتی رہی اور اب سلیمان کے ساتھ مل کر عالمین کے پروردگار کو تسلیم کرتی ہوں۔

Marfat.com

تفسیر

ملکہ سبا کے دل میں نور ایمان

ان آیات میں سلیمان اور ملکہ سبا کی سبق آموز داستان سے متعلق ایک اور پہلو پیش کیا گیا ہے۔
حضرت سلیمان علیہ السّلام نے ملکہ سباء کی عقل وخرد کو آزمانے اور خدا پر اس کے ایمان لانے کے لیے راہ ہموار کرنے کی غرض سے اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کرنے کا حکم دیا۔ تاکہ وہ پہچانا نہ جا سکے چنانچہ انھوں نے کہا: اس کے تخت میں کچھ تبدیلی کر دو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ سمجھ پاتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو ہدایت نہیں پاتے (قال نکروا لها عرشها ننظر اتهتدی ام تکون من الذین لا یهتدون)۔
اگرچہ ملکہ کے تخت کا سبائے سے شام میں آجانا ہی اس بات کے لیے کافی تھا کہ وہ اسے آسانی کے ساتھ نہ پہچان سکے لیکن اس کے باوجود جناب سلیمان نے حکم دیا کہ اس میں کچھ تبدیلیاں بھی کر دی جائیں۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلیاں بعض علامتوں اور جواہرات کو ادھر اُدھر کرکے کی گئی ہوں یا بعض رنگوں کو تبدیل کر دیا گیا ہو لیکن یہاں پر جو سوال درپیش ہے وہ یہ ہے کہ آخر جناب سلیمان، اس کی عقل وخرد اور فہم وذکا کو کیوں آزمانا چاہتے تھے۔
ہوسکتا ہے اس لیے تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ اس کے ساتھ کس انداز میں پیش آنا چاہیے اور اپنے عقیدہ کے اثبات کے لیے کون سی دلیل پیش کرنی چاہیے۔
یا ان کا خیال تھا کہ اسے شادی کی پیش کش کریں لہٰذا وہ دیکھنا یہ چاہتے تھے کیا اس میں آپ کی زوجیت کی لیاقت بھی ہے یا نہیں؟ یا ہوسکتا ہے کہ اس کے ایمان لانے کے بعد کچھ اہم امور کی ذمہ داری اسے سونپنا چاہتے ہوں لہٰذا وہ اس طرح سے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی اہلیّت کو جاننا چاہتے ہوں۔
" اتهتدی " کے بارے میں دو تفسیریں ذکر ہوئی ہیں بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد اس کے اپنے تخت کی پہچان ہے اور بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد معجزات دیکھ کر راہِ خدا کی ہدایت حاصل کرنا ہے۔
لیکن ظاہراً پہلا معنی زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے اگرچہ پہلا معنی دوسرے معنی کا مقدمہ ہے۔
صورتِ حال خواہ کچھ ہو جب ملکہ پہنچی تو کسی نے (تخت کی طرف اشارہ کرکے) کہا: کیا آپ کا تخت اسی طرح کا ہے (فلما جاءت قیل اهکذا عرشك)۔
ظاہراً یہ جملہ کہنے والے خود حضرت سلیمانؑ نہیں تھے ورگرنہ "قیل" (کہا گیا) کی تعبیر مناسب نہیں تھی کیونکہ جناب سلیمان کا نام اس سے پہلے آچکا ہے اور بعد میں بھی۔ اور ان کی باتوں کو "قال" کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔
پھر جناب سلیمانؑ کے شایانِ شان بھی نہیں تھا کہ وہ اس کے آتے ہی اپنی بات کا آغاز ان الفاظ سے کرتے۔
لیکن سوال خواہ کسی نے کیا ہو ملکہ سبا نے نہایت ہی زیرکانہ انداز میں ایک بہت ہی شستہ اور جچا تلا جواب دیتے ہوئے کہا

Marfat.com

یہ تو خود وہی تخت معلوم ہوتا ہے (قالت کانہ ھو)۔
اگر وہ کہتی کہ اس جیسا ہے تو جواب صحیح نہ ہوتا اور اگر کہتی کہ بالکل وہی ہے تو خلاف احتیاط بات تھی کیونکہ اس قدر لمبے فاصلوں سے اس کے تخت کا سرزمین سلیمان میں آنا عام حالات میں ممکن نہیں تھا۔ اس کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے معجزہ۔

اس کے علاوہ تاریخ میں ہے کہ ملکہ نے اپنے اس گراں قیمت تخت کی بڑی حفاظت کی تھی اسے اپنے خصوصی محل کے خاص کمرے میں اہم مقام پر نصب کیا ہوا تھا جس کی حفاظت کے لیے خصوصی دستہ مقرر تھا اور اس محل کو نہایت مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔

لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود ملکہ نے اپنے تخت کو پہچان لیا تھا۔

اس نے فوراً کہا: ہم تو اسے پہلے ہی جان چکے تھے اور سرِ تسلیم خم کر چکے تھے (واوتینا العلم من قبلھا وکنا مسلمین)۔

گویا وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ ان سارے کاموں سے سلیمان کا مقصد یہ تھا کہ ہم اس کے معجزے پر ایمان لے آئیں لیکن ہم تو اس سے پہلے ہی دوسری علامتوں کی وجہ سے ان کی حقانیت کے معترف ہو چکے ہیں اور ان غیر معمولی چیزوں کو دیکھنے سے پہلے ہی ان پر ایمان لا چکے ہیں اس طرح کے کاموں کی اب چنداں ضرورت نہیں تھی۔

تو اس طرح سے (سلیمان نے) اسے ہر غیر خدا کی عبادت سے روک دیا (وصدھا ما کانت تعبد من دون اللہ)[1]۔

ہر چند کہ وہ اس سے پہلے کافروں میں سے تھی (انھا کانت من قوم کافرین)۔

تو اس نے یہ واضح اور روشن علامات دیکھ کر اپنے تاریک ماضی کو الوداع کہا اور اپنی زندگی کے نئے مرحلے میں قدم رکھا، جو نورِ ایمان و یقین سے بھرپور تھا۔

اس سلسلے کی آخری آیت میں اس داستان کا ایک اور منظر پیش کیا گیا ہے اور وہ ہے ملکہ سباء کا حضرت سلیمانؑ کے

---

[1] "صد" کا فاعل کون ہے اور اسی طرح "ما کانت" میں "ما" موصولہ ہے یا مصدریہ؟ اس سلسلے میں مفسرین نے مختلف آراء پیش کی ہیں۔ بعض نے (جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں) اس کا فاعل سلیمان کو جانا ہے اور بعض نے خداوند عالم کو۔ لیکن نتیجے کے لحاظ سے ان دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ ان دونوں تفسیروں کے مطابق "ھا" کی ضمیر مفعول اول ہے اور "ما کانت" حرف "جار" کے حذف کے ساتھ دوسرا مفعول ہے اور اس کی تقدیر یوں ہوگی "صدھا سلیمان ... یا، صدھا اللہ عما کانت تعبد من دون اللہ" لیکن بعض دوسرے مفسرین نے "ما کانت" کو "صدھا" کا فاعل جانا ہے تو ایسی صورت میں اس کا معنی یوں ہوگا ملکہ کے معبودوں نے اسے حق کی پرستش سے روک دیا۔ لیکن چونکہ یہاں پر اس کے ایمان کی گفتگو ہو رہی ہے نہ کہ کفر کی۔ لہٰذا پہلی تفسیر زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ "ما" یہاں پر موصولہ ہو یا مصدریہ ہو۔

Marfat.com

خصوصی محل میں داخلہ۔

حضرت سلیمانؑ نے حکم دے دیا تھا کہ ان کے ایک محل کے صحن کو بلور سے تیار کیا جائے اور اس کے نیچے پانی چلا دیا جائے۔

توجب ملکہ سبا، وہاں پہنچی تو اسے کہا گیا کہ محل کے صحن میں داخل ہوجاؤ (قیل لها ادخلی الصرح)[1]

ملکہ نے جب صحن کو دیکھا تو اس نے سمجھا کہ پانی کی نہر چل رہی ہے اس نے پنڈلی سے کپڑا اٹھایا تاکہ پانی کو عبور کرے (اور وہ تعجب میں غرق تھی کہ پانی کی نہر کا یہاں کیا کام؟) (فلما رأته حسبته لجة و کشفت عن ساقیها)[2]

لیکن سلیمان نے اسے کہا محل کا صحن صاف وشفاف بلور سے بنا ہوا ہے (یہ پانی نہیں ہے کہ جسے عبور کرنے کے لیے تم نے پائنچے اٹھا رکھے ہیں)۔ (قال انه صرح ممرد من قواریر)[3]

اس مقام پر ایک نہایت ہی اہم سوال پیش آتا ہے اور وہ یہ کہ جناب سلیمانؑ اللہ کے ایک عظیم پیغمبر تھے وہ اس قدر آرائشی اور زیبائشی کاموں میں کیوں لگ گئے؟ یہ ٹھیک ہے کہ وہ ایک بادشاہ اور فرمانروا تھے لیکن دوسرے انبیاء کی طرح کیا وہ سادگی کو اختیار نہیں کرسکتے تھے؟

جواباً عرض ہے کہ اگر حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کو مسلمان بنانے کے لیے اس طرح کی آرائش وزیبائش سے کام لیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ خصوصاً جبکہ ملک اپنی تمام طاقت وعظمت خوبصورت تاج وتخت، باشکوہ محل وقصر اور زرق برق آرائش وزیبائش میں ہی سمجھتی تھی چنانچہ جب حضرت سلیمان نے اسے اپنی سلطنت کی ایک جھلک دکھائی تو ملکہ کی آنکھوں کے سامنے اپنی حکومت کی تمام سج دھج ماند پڑگئی اور حقیر دکھائی دینے لگی اور یہی بات اس کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہوئی جس میں اسے اقدار اور معیارِ زندگی کے بارے میں تبدیلی کرنا پڑی۔

آخر اس بات میں کیا حرج ہے کہ انھوں نے نقصان دہ اور خونریز لشکر کشی کی بجائے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی کہ ملکہ کا دماغ چکرانے لگا وہ اس قدر مبہوت ہوگئی کہ جنگ کا تصور ہی اس کے دماغ سے کافور ہوگیا خصوصاً جبکہ وہ ایک عورت تھی اور عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس قسم کے تکلفات ہوتے ہیں کیونکہ عورت ایسے تکلفات کو بہت اہمیت دیتی ہے۔

بہت سے مفسرین نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ ملکہ سبا کے سرزمین شام میں قدم رکھنے سے پہلے حضرت سلیمان نے حکم

---

[1] "صرح" (بروزن "طرح") کا ایک معنی تو وسیع وعریض فضا ہے اور دوسرا معنی بلند وبالا عمارت یا محل۔ لیکن یہاں پر بظاہر محل کے دالان کے معنی میں ہے۔

[2] "لجہ" دراصل "لجاج" کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی کام کی انجام دہی میں سختی کرنا۔ پھر گلے میں آواز کی آمدورفت پر "لجہ" (بروزن "ضجہ") کا اطلاق ہونے لگا اور سمندر کی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی موجوں کو "لجہ" (بروزن "حُجّہ") کہتے ہیں۔ مذکورہ آیت میں موجزن اور ٹھاٹھیں مارتے ہوئے پانی کی طرف اشارہ ہے۔

[3] "ممرد" کے معنی "صاف وشفاف" کے ہیں اور "قواریر" "قارورۃ" کی جمع ہے جس کا معنی بلور اور شیشہ ہے۔

Marfat.com

جاری کر دیا تھا کہ اس قسم کا ایک عظیم محل تیار کیا جائے جس سے ان کا مقصد ملکہ کو مطیع کرنے کے لیے اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا اور اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ ظاہری طاقت کے لحاظ سے بھی عظیم جناب سلیمان کے پاس ایک بڑی طاقت ہے جس کے ذریعے انھوں نے ایسا کام انجام دیا ہے۔

دوسرے لفظوں میں ایک وسیع و عریض علاقے کا امن و امان، دینِ حق کی قبولیت اور بے پناہ جنگی اخراجات سے بچنے کے لیے اس قسم کے اخراجات کوئی بڑی بات نہیں تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ سبا نے ان مناظر کو دیکھا تو فوراً کہا: پروردگارا! میں نے تو اپنے اوپر ظلم کیا ہے (قالت رب انی ظلمت نفسی)۔

اور اب میں سلیمان کے ساتھ مل کر اس اللہ کی بارگاہ میں سر تسلیم خم کر چکی ہوں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے (واسلمت مع سلیمان للہ رب العالمین)۔

میں پہلے سورج کی پوجا کیا کرتی تھی، زیب و زینت میں کھو چکی تھی اور خود کو دنیا کا سب سے بہتر اور برتر انسان سمجھتی تھی۔

لیکن اب پتہ چلا ہے کہ میری طاقت کتنی کمزور اور حقیر تھی بلکہ اصولی طور پر یہ زر و جواہر اور قیمتی زیورات انسانی روح کو کبھی سیراب نہیں کر سکتے۔

خداوندا! میں اپنے رہبر سلیمان کے ساتھ مل کر تیری بارگاہ میں حاضر ہوں، اپنے کیے پر نادم ہوں اور تیرے آستانِ قدس پر میں نے اپنا سر جھکا دیا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں پر لفظ "مع" استعمال کیا گیا ہے (یعنی سلیمانؑ کے ساتھ) تاکہ واضح ہو جائے کہ راہِ خدا میں سب برابر ہیں نہ کہ ظالم اور جابر بادشاہوں کی مانند کہ جن کے ہاں ایک دوسرے پر مسلط ہوتا ہے خدا کے سامنے نہ کوئی غالب ہے اور نہ مغلوب، جب حق کو قبول کر لیا تو سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ ملکہ سبا اس سے پہلے بھی اپنے ایمان کا اعلان کر چکی تھی جیسا کہ ہم گزشتہ آیات میں اس کی اپنی زبانی سن چکے ہیں کہ:

واوتینا العلم من قبلھا وکنا مسلمین

ہم اس تخت کو یہاں پر لائے جانے سے پہلے ہی جان چکے تھے اور اسلام قبول کر چکے تھے۔

لیکن اس مرحلے پر پہنچ کر ملکہ کا اسلام اپنے عروج کو جا پہنچا لہٰذا اس نے پہلے سے زیادہ زوردار طریقے سے اس کا اظہار کیا۔

ملکہ دعوتِ سلیمان کی حقانیت کی علامتیں پہلے سے دیکھ چکی تھی:

ہدہد کا اس خاص انداز میں آنا۔

ملکہ کی طرف سے ارسال شدہ عظیم تحائف کا واپس لوٹا دینا۔

Marfat.com

مختصر سے عرصہ میں دور دراز کے سفر سے اس کا تخت یہاں پر لانا۔
المختصر سلیمان کی انتہائی زیادہ عظمت وطاقت کا مشاہدہ کرنا اور پھر اس سب کچھ کے باوجود جناب سلیمان کا عظیم اخلاق دیکھنا کہ جو بادشاہوں کے اخلاق سے ذرہ بھر بھی مشابہت نہیں رکھتا۔

چند اہم نکات

۱۔ ملکہ سباء کا انجام:۔ ملکہ سبا کے بارے میں جو کچھ قرآن مجید نے بیان کیا ہے وہی ہے جو ہم نے ابھی پڑھا ہے۔ آخر کار وہ ایمان لے آئی اور صالحین کے کارواں میں شامل ہو گئی اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ ایمان اختیار کرنے کے بعد اپنے ملک کو واپس لوٹ گئی اور سلیمان کی طرف سے ملک پر حکمرانی کرتی رہی یا سلیمان کے پاس رہ گئی اور انھی کے ساتھ شادی کر لی۔ یا سلیمان کے مشورے پر یمن کے کسی بادشاہ جسے "تبع" کہا جاتا تھا، کے ساتھ عقد کر لیا۔ اس بارے میں قرآن نے کچھ نہیں بتایا۔

چونکہ قرآن کا ہدف اصلی تربیتی مسائل بیان کرنا ہے اور یہ بات ان مسائل سے غیر متعلق تھی لہٰذا اسے بیان کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی لیکن مفسرین اور مورخین نے اس بارے میں مختلف راستے اختیار کیے ہیں جن کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین کے بقول مشہور و معروف یہی ہے کہ وہ حضرت سلیمان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئی[1]

البتہ اس مقام پر اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جناب سلیمان اور ان کے لشکر و حکومت کے بارے میں نیز ملکہ سباء اور اس کی تفصیلی زندگی کے بارے میں بہت ہی افسانہ طرازی کی گئی ہے کہ بعض مواقع پر تو عوام الناس کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے اور بعض موقعوں پر اس صحیح تاریخی واقعے پر ایسے تاریک پردے ڈال دیئے جاتے ہیں کہ اس کی اصلیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور یہ سب کچھ ان خرافات کا غلط نتیجہ ہوتا ہے جو حقائق کے ساتھ ملا دیئے جاتے ہیں لہٰذا ایسے خرافات سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے۔

۲۔ سلیمان کی داستان کا خلاصہ:۔ حضرت سلیمان کے حالات کا کچھ حصہ جو مندرجہ بالا تیس آیات میں ذکر ہوا ہے، بہت سے مسائل بیان کرتا ہے کہ جن میں سے کچھ تو ہم تفصیلی طور پر پڑھ چکے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن پر ایک سرسری سی نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ یہ داستان، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کو خدا کی طرف سے علم ہونے کے ذکر سے شروع ہوتی ہے توحید و فرمانِ الٰہی کے سامنے جھک جانے پر ختم ہو جاتی ہے اور توحید بھی ایسی کہ جس کا مرکز "علم" ہے۔

۲۔ یہ داستان بتاتی ہے کہ کسی پرندے کا غائب ہو جانا اور کسی علاقے پر اس کا پرواز کرنا بعض اوقات کسی ملت کی تاریخ کے دھاروں کو بھی بدل سکتا ہے اسے شرک سے ایمان کی طرف اور برائی سے اچھائی کی طرف پلٹا سکتا ہے اور یہی چیز پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ اور حکومتِ حقہ کا ایک ادنیٰ سا نمونہ ہے۔

---

[1] روح المعانی از آلوسی۔

Marfat.com

۳۔ اس داستان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ نورِ توحید تمام دلوں میں جلوہ فگن ہے حتیٰ کہ ایک پرندہ بھی جو ظاہراً خاموش ہے توحید کے اسرار پوشیدہ کی خبر دیتا ہے۔

۴۔ کسی انسان کو اس کی اصلی قدر و قیمت کی طرف توجہ دلانے اور اسے اللہ کی طرف ہدایت دینے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس کی رعونت اور تکبر کو توڑا جائے تاکہ آنکھوں پر پڑے ہوئے تاریک پردے اس کی حقیقت بین نگاہوں کے آگے سے ہٹ جائیں جیسا کہ جناب سلیمان نے دو کام کر کے ملکہ کے غرور و تکبر کو چکنا چور کر دیا، ایک تو اس کا تخت منگا کر اور دوسرے اپنے محل کے ایک حصے میں اسے مغالطے میں ڈال کر۔

۵۔ انبیاء کرام کی حکومت میں ان کا منتہائے مقصود کشور کشائی نہیں ہوتا بلکہ وہی کچھ ہوتا ہے جو اس سلسلے کی آخری آیت میں ہم نے پڑھا ہے یعنی سرکش لوگ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور رب العالمین کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیں اسی لیے قرآن مجید نے بھی اس داستان کا اختتام اسی نکتے پر کیا ہے۔

۶۔ "ایمان" کی روح "تسلیم" ہے یہی وجہ ہے کہ جناب سلیمانؑ نے بھی اپنے خط میں اسی بات پر زور دیا تھا اور ملکہ سبا بھی آخر میں یہی کہتی ہے۔

۷۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی انسان کے پاس دنیا کی بہت طاقت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود اسے پرندے جیسی کمزور سی مخلوق کی ضرورت پڑ جاتی ہے کہ وہ نہ صرف اس کے علم سے بلکہ اس کے کام سے بھی استفادہ کرتا ہے اور کبھی چیونٹی جیسی کمزور و ناتواں مخلوق اس کی تحقیر کر دیتی ہے۔

۸۔ ان آیات کا مکہ میں اس وقت نازل ہونا جب مسلمان زبردست مشکلات کا شکار تھے اور دشمن نے ہر طرف سے ان کا گھیراؤ کر رکھا تھا، مسلمانوں کی دلجوئی اور ان کی تقویت کا باعث تھا اور انھیں مستقبل میں خدا کی طرف سے کامیابیوں کی امید دلانے کا باعث تھا۔

Marfat.com

۴۵۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ
فَرِيْقٰنِ يَخْتَصِمُوْنَ ○
۴۶۔ قَالَ يٰقَوْمِ لِمَ تَسْتَعْجِلُوْنَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ لَوْلَا تَسْتَغْفِرُوْنَ
اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○
۴۷۔ قَالُوا اطَّيَّرْنَا بِكَ وَبِمَنْ مَّعَكَ قَالَ طٰٓئِرُكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ بَلْ اَنْتُمْ
قَوْمٌ تُفْتَنُوْنَ ○

ترجمہ

۴۵۔ اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو بھیجا کہ خدائے واحد کی عبادت کرو، لیکن وہ دو حصّوں میں تقسیم ہو کر جھگڑا کرنے لگے۔

۴۶۔ (صالح نے) کہا: اے میری قوم! تم نیکی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی کرتے ہو (اور عذاب الٰہی کو دعوت دیتے ہو اس کی رحمت کو نہیں) خداوند عالم سے اپنی بخشش کی درخواست کیوں نہیں کرتے ہو تاکہ تم بھی رحمتِ الٰہی میں شامل ہو جاؤ۔

۴۷۔ انھوں نے کہا: ہم نے تھیں بھی اور جو لوگ تمھارے ساتھ ہیں انھیں بھی فالِ بد سمجھا ہے (صالح نے) کہا بد (اور نیک) فال تو خدا کے پاس ہے (اور تمھاری تقدیر اسی سے وابستہ ہے) تم ایسے لوگ ہو جنھیں آزمایا جا رہا ہے۔

تفسیر

حضرت صالحؑ اپنی قوم کے سامنے

گذشتہ آیات میں خداوند عالم کے تین پیغمبروں موسیٰ، داؤد اور سلیمان علیہم السّلام کا تذکرہ ہے اب یہاں پر جس چوتھے نبی اور اس کی قوم کا ذکر ہوا ہے وہ حضرت صالح علیہ السّلام اور ان کی قوم ثمود ہے۔

Marfat.com

پہلے فرمایا گیا ہے: ہم نے قوم ثمود کی طرف اس کے بھائی صالح کو بھیجا اور اسے حکم دیا کہ وہ ان لوگوں کو عبادتِ خدا کی دعوت دیں (ولقد ارسلنا الی ثمود اخاھم صالحًا ان اعبدوا اللہ)۔[1]

جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ انبیاء کی داستان میں "اخاھم" (ان کے بھائی) کی تعبیر کا مقصد ان انبیاء کے اپنی قوم سے نہایت دلسوزی اور محبت کے اظہار کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور بعض مقامات پر اس کے علاوہ رشتہ داری کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔

بہر حال اللہ کے اس باعظمت نبی کی دعوت اور تبلیغ کو صرف ایک جملے میں خلاصہ کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ "ان اعبدوا اللہ" یقیناً عبادتِ خداوندی ہی تمام خدائی پیغمبروں کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔

پھر فرمایا گیا ہے: وہ لوگ صالح کی دعوت کے سلسلے میں دو حصوں میں بٹ گئے اور لڑنے جھگڑنے لگے (ایک طرف مومن تھے اور دوسری طرف ضدی مزاج منکر)۔ (فاذا ھم فریقان یختصمون)۔[2]

سورۂ اعراف کی ۷۵ ویں اور ۷۶ ویں آیت میں ان دو گروہوں کو "مستکبرین" اور "مستضعفین" کے نام سے یاد کیا گیا ہے، ملاحظہ ہو:

قال الملاُ الذین استکبروا من قومه للذین استضعفوا لمن اٰمن منھم اتعلمون ان صالحًا مرسل من ربه قالوا انا بما ارسل به مؤمنون. قال الذین استکبروا انا بالذی اٰمنتم به کافرون

قوم صالح کے بڑے بڑے مستکبرین نے مستضعف مومنین سے کہا کیا تمھیں یقین ہے کہ صالح اپنے پروردگار کی طرف سے بھیجے گئے ہیں؟ تو انھوں نے کہا جی ہاں! ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو وہ لے کر آئے ہیں، لیکن مستکبرین نے کہا جس چیز پر تم ایمان لائے ہم اس کا انکار کرتے ہیں۔

البتہ مومنین اور کافرین کے درمیان اس قسم کی لڑائی اکثر انبیاء کے زمانے میں رہی ہے ہر چند کہ بعض انبیاء تو اتنی مقدار میں بھی طرف داروں سے محروم رہے ہیں اور تقریباً سب لوگ ان کے منکرین کی صف میں شامل ہو گئے تھے۔

حضرت صالح علیہ السلام نے انھیں بیدار کرنے کے لیے انھیں تنبیہ کرنا شروع کی اور دردناک عذاب میں مبتلا ہونے سے بچانے کی کوشش کی، لیکن ان لوگوں نے نہ صرف نصیحت حاصل نہ کی اور بیدار نہ ہوئے بلکہ اسی چیز کو اپنی ہٹ دھرمی کی ایک

---

[1] "ان اعبدوا اللہ" کا جملہ اس حرف جر کے ساتھ مجرور ہے جو مقدر ہے اور اس کی اصل یوں ہے "ولقد ارسلنا الی ثمود اخاھم صالحًا بعبادۃ اللہ"۔

[2] "فریقان" تثنیہ ہے اور اس کا فعل "یختصمون" جمع کی صورت میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فریق ایک گروہ سے تشکیل پاتا ہے اور مل ملا کر ایک مجموعہ بنتا ہے۔

Marfat.com

آڑ بنا کر اس بات پر اصرار کرنے لگے کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو پھر ہم پر عذابِ الٰہی کیوں نازل نہیں ہوتا؟ (یہی چیز سورہ اعراف کی آیت ۷۷ میں واضح طور پر بیان ہوئی ہے)۔

لیکن صالح علیہ السّلام نے انھیں کہا: اے میری قوم! تم نیکیوں کی کوشش اور ان کی تلاش سے پہلے ہی عذاب اور برائیوں کے لیے جلدی کیوں کرتے ہو؟ (قال یاقوم لم تستعجلون بالسیئة قبل الحسنة)۔

تم اپنی تمام تر فکر عذابِ الٰہی کے نازل ہونے پر ہی کیوں مرکوز کرتے ہو؟ اگر تم پر عذاب نازل ہو گیا تو پھر تمھارا خاتمہ ہو جائے گا اور ایمان لانے کا موقع بھی ہاتھ سے چلا جائے گا۔ آؤ اور خدا کی برکت اور اس کی رحمت کے ساتھ ایمان کے زیر سایہ میری سچائی کو آزماؤ، تم خدا کی بارگاہ سے اپنے گناہوں کی بخشش کا سوال کیوں نہیں کرتے؟ تاکہ اس کی رحمت میں شامل ہو جاؤ (لو لا تستغفرون الله لعلکم ترحمون)۔

صرف برائیوں اور عذاب نازل ہونے کا تقاضا کیوں کرتے ہو؟ یہ ہٹ دھرمی اور پاگل پن کی باتیں آخر کس لیے؟

یہ صرف صالح علیہ السّلام کی قوم کے افراد ہی نہیں تھے جنھوں نے ان کی دعوت کو ٹھکرا کر موعود عذاب کا تقاضا کیا بلکہ قرآن مجید میں اس قسم کے اور بھی کئی واقعات ملتے ہیں جن میں سے ایک قوم ہود کا واقعہ بھی ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ اعراف آیت ۷۰۔ حضرت پیغمبر اسلام صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم اور سرکش متعصب مشرکین کے بارے میں ہے:

وا ذ قالوا اللّٰھم ان کان ھٰذا ھو الحق من عندك فامطر علینا حجارة من السماء او ائتنا بعذاب الیم

وہ وقت یاد کرو جب انھوں نے کہا: پروردگارا! اگر محمد کی یہ دعوت برحق ہے اور تیری جانب سے ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا، یا ہمیں دردناک عذاب میں مبتلا کر دے۔

(انفال / ۳۲)

یہ بات واقعاً عجیب ہے کہ انسان دعوائے محبت کی صداقت کو تباہ کن عذاب کے ذریعے جانچ رہا ہے نہ کہ رحمت کا سوال کر کے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ قلبی طور پر انبیاءِ کرام علیہم السّلام کی صداقت کے معترف تھے لیکن زبان سے اس کا انکار کیا کرتے تھے۔

اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے کوئی شخص علم طب کا مدعی ہو اور اسے معلوم ہو کہ فلاں دوا سے صحت اور شفا حاصل ہوتی ہے اور فلاں سے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے لیکن وہ ایسی دوا حاصل کرنے کی کوشش کرے جو مہلک ہے نہ کہ وہ جو مفید اور شفا بخش ہے۔

یہ جہالت، نادانی اور تعصب کی نہایت ہی بدترین مثال ہو گی اور جہالت کے اس قسم کے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔

بہرحال اس سرکش قوم نے اس عظیم پیغمبر کی ہمدردانہ نصیحتوں کو دل کے کانوں سے سننے اور ان پر عمل درآمد کرنے کی بجائے واہیات اور بے کار باتوں کے ذریعے ان کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی منجملہ اور باتوں کے انھوں نے کہا ہم تمھیں اور جو لوگ تمھارے ساتھ ہیں سب کو ایک بری فال سمجھتے ہیں (قالوا اطیرنا بك و بمن معك)۔

Marfat.com

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ سال خشک سالی اور قحط سالی کا تھا اسی لیے وہ صالح علیہ السلام سے کہنے لگے کہ یہ سب کچھ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے نامبارک قدموں کی بدولت ہوا ہے۔ تم منحوس لوگ ہو ہمارے معاشرے میں تم ہی بدبختی اور نحوست لائے ہو وہ بری فال کو اس بہانے سے جو درحقیقت بے کار اور شر پر لوگوں کا بہانہ ہوتا ہے، جناب صالح علیہ السلام کے وزنی دلائل کو کمزور کرنا چاہتے تھے۔

لیکن جناب صالحؑ نے جواب میں کہا: بُری فال (اور تمھارا نصیب) تو خدا کے پاس ہی ہے (قال طائرکم عند اللہ)۔

اسی نے تمھارے اعمال کی وجہ سے تمھیں ان مصائب میں ڈال دیا ہے اور تمھارے اعمال ہی تمھاری اس سزا کا سبب بنے ہیں۔

درحقیقت تمھارے لیے یہ خدا کی ایک عظیم آزمائش ہے جی ہاں! "تم ہی ایسے لوگ ہو جن کی آزمائش کی جائے گی" (بل انتم قوم تفتنون)۔

یہ خدا کی آزمائش ہوتی ہے اور خبردار کرنے والی چیزیں ہوتی ہیں تاکہ جو لوگ سنبھل جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ سنبھل جائیں، خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں غلط راستے کو چھوڑ کر خدائی راستے کو اختیار کر لیں۔

ایک نکتہ

"فال" اور "تطیر" : "تطیر" (بدشگونی) "طیر" کے مادہ سے پرندے کے معنی میں ہے۔ چونکہ عرب لوگ پرندوں کے ذریعے بُری فال لیا کرتے تھے لہٰذا "تطیر" بُری فال (بدشگونی) کے معنی میں آتا ہے۔ جو "تفأل" یعنی نیک فال کے مقابلے میں ہے۔

قرآنِ مجید میں بارہا یہ بات بیان ہوئی ہے کہ بے ہودہ مشرکین، انبیاء کرامؑ کے مقابلے میں اسی حربے سے کام لیا کرتے تھے جیسا کہ جناب موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں ہے کہ:

وان تصبھم سیئة یطیروا بموسٰی ومن معہ

جب بھی فرعون والوں کو کوئی تکلیف پہنچتی تو وہ اسے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست سمجھتے۔ (اعراف ــــ ۱۳۱)

زیر نظر آیات کے مطابق قوم ثمود کے مشرکین نے صالح علیہ السلام کے بارے میں یہی منطق اختیار کی۔

سورۂ یٰسٓ کے مطابق (انطاکیہ کی طرف) حضرت مسیحؑ کے نمائندوں کے مقابلے میں بھی مشرکین نے یہی منطق اپنائی اور انھیں بدشگونی کا الزام دیا۔ (یٰسٓ ــــ ۱۸)

بات دراصل یہ ہے کہ انسان حوادثات کے اسباب وعلل سے لاتعلق نہیں رہ سکتا، اسے ہر حادثے اور وقوع پذیر ہونے والے ہر واقعے کی علت کی تلاش رہتی ہے اگر تو وہ موحد اور خدا پرست ہے اور واقعات کے اسباب کا مرکز ذات

Marfat.com

خداوند ذوالجلال کو سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اس کی حکمت کے تحت ہی ہر کام کسی حساب کے تحت انجام پاتا ہے اور قدرتی علت و معلول کے لحاظ سے بھی اپنے علم پر انحصار کرتا ہے پھر تو اس کی مشکل حل ہو جاتی ہے وگرنہ موہوم اور خرافاتی علتوں کا ایک سلسلہ از خود گھڑنا شروع کر دیتا ہے کہ جس کی نہ تو کوئی حد ہوتی ہے اور نہ ہی حساب! جس کا ایک واضح نمونہ یہی بدشگونی کا نظریہ ہے۔

زمانہ جاہلیت کے عربوں میں تھا کہ اگر پرندہ ان کی دائیں طرف سے گزر جاتا تو اسے نیک فال اور کامیابی کی دلیل سمجھتے تھے اور اگر بائیں طرف سے حرکت کرتا تو اسے بدشگونی تصور کرتے اور اپنی ناکامی اور شکست کی دلیل سمجھتے تھے ان کے اندر اس قسم کے اور بھی کئی خرافات اور موہومات پائے جاتے تھے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی کچھ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ان خرافات اور موہومات پر بہت ایمان رکھتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کا خدا پر ایمان نہیں ہوتا اگرچہ جدید علم کے لحاظ سے وہ بہت بڑے عہدوں پر فائز ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایک نمکدانی کا زمین پر گر جانا انھیں سخت پریشان کر دیتا ہے اور جس گھر یا میز یا کرسی کا نمبر ۱۳ ہو وہ اس سے گھبرا جاتے ہیں۔ اب بھی رمالوں اور فال نکالنے والوں کا بازار گرم ہے اور یہ مسئلہ ابھی تک بہت رائج ہے۔

لیکن قرآن صرف ایک مختصر سے جملے میں اس بات کا جواب دیتا ہے کہ " طائرکم عند الله " یعنی تمھارا بخت و طالع، فتح و شکست اور کامیابی و ناکامی غرض سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے وہ خدا جو صاحب حکمت ہے اور اپنی نعمتیں، لیاقتوں اور صلاحیتوں کی بنا پر عطا کرتا ہے جو انسان کے ایمان و عمل اور گفتار و کردار کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

تو اس طرح اسلام اپنے پیروکاروں کو خرافات سے حقیقت اور بے راہروی سے صراط مستقیم کی طرف دعوت دیتا ہے۔
(فال اور شگون کے بارے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی جلد ۶ سورہ اعراف کی ۱۳۱ ویں آیت کے ذیل میں تفصیل سے گفتگو کی ہے)

Marfat.com

۴۸۔ وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ
وَلَا يُصْلِحُونَ ○
۴۹۔ قَالُوا تَقَاسَمُوا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُولَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا
شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○
۵۰۔ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ○
۵۱۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ○
۵۲۔ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ○
۵۳۔ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ○

ترجمہ

۴۸۔ اور اس شہر میں نو ٹولے تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح کرنے والے نہیں تھے۔

۴۹۔ انھوں نے کہا آؤ اور خدا کی قسم اٹھاؤ کہ اس (صالح) پر اور اس کے خاندان پر شب خون ماریں گے اور انھیں قتل کر دیں گے پھر اس کے خون کے وارث سے کہہ دیں گے کہ ہمیں اس کے اہل خاندان کی ہلاکت کی کوئی خبر نہیں ہے اور ہم اپنی اس بات میں بالکل سچے ہیں۔

۵۰۔ انھوں نے ایک اہم منصوبہ بنایا اور ہم نے بھی اہم منصوبہ بنایا جبکہ وہ اس سے بے خبر تھے۔

۵۱۔ تو دیکھو کہ ان کی سازش کا کیا انجام ہوا؟ کہ ہم نے انھیں اور ان کی ساری قوم کو نیست و نابود کر دیا۔

۵۲۔ سو یہ ان کے گھر ہیں جو ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے خالی ہو چکے ہیں اس میں ان لوگوں کے لیے واضح نشانی ہے جو آگاہی رکھتے ہیں۔

۵۳۔ اور ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لائے تھے اور جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا تھا۔

Marfat.com

تفسیر

نو مفسد ٹولوں کی سازش

یہاں پر حضرت صالح اور ان کی قوم کی داستان کا ایک اور حصہ بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت گزشتہ حصے کا تتمہ ہے اور اسی پر اس داستان کا اختتام ہوتا ہے اس میں حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کے منصوبے کا ذکر ہے جو نو کافر اور منافق ٹولوں نے تیار کیا تھا اور خدا نے ان کے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔

فرمایا گیا ہے: اس شہر (وادی القریٰ) میں نو ٹولے تھے جو زمین میں فساد برپا کرتے تھے اور اصلاح نہیں کرتے تھے (وکان فی المدینۃ تسعۃ رھط یفسدون فی الارض ولا یصلحون)۔

چونکہ "رھط" کا معنی ہے دس سے کم یا چالیس سے کم افراد کا مجموعہ۔ اس لیے یہاں سے یہ بات بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے ٹولے تھے جن میں سے ہر ایک کی اپنی علیحدہ پالیسی تھی اور ان کی قدر مشترک زمین میں فساد پھیلانا اور اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا اور اعتقادی و اخلاقی بنیادوں کا اکھیڑنا تھا اور "لا یصلحون" اسی بات کی تاکید ہے کیونکہ بعض اوقات انسان فساد برپا کرتا ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ وہ اپنے کیے پر نادم ہو جاتا ہے اور پھر اصلاح کی ترکیبیں سوچتا ہے۔ لیکن حقیقی مفسد ایسا نہیں کرتے ان کا کام ہمیشہ فساد برپا کرنا ہوتا ہے وہ کبھی بھی اصلاح کی نہیں سوچتے۔ بالخصوص جبکہ "یفسدون" فعل مضارع ہے جو استمرار پر دلالت کرتا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان کا یہ کام مسلسل ہوتا ہے۔

ان نو میں سے ہر گروہ کا ایک ایک سربراہ بھی تھا اور شاید ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی قبیلے کی طرف منسوب بھی تھا۔

ظاہر ہے کہ جب صالح علیہ السلام نے ظہور فرمایا اور اپنا مقدس اور اصلاحی آئین لوگوں کے سامنے پیش کیا تو ان ٹولوں پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد والی آیت کے مطابق انھوں نے کہا: آؤ خدا کی قسم اٹھا کر عہد کریں کہ صالح اور ان کے خاندان پر شب خون مار کر انھیں قتل کر دیں گے پھر ان کے خون کے وارث سے کہیں گے کہ ہمیں اس کے خاندان کے قتل کی کوئی خبر نہیں اور اپنی اس بات میں ہم بالکل سچے ہیں (قالوا تقاسموا باللہ لنبیتنہ واھلہ ثم لنقولن لولیہ ما شھدنا مھلک اھلہ وانا لصادقون)۔

"تقاسموا" فعل امر ہے جس کا معنی ہے قسم اٹھانے میں سب شریک ہو جاؤ اور اس بڑی سازش میں ایسا عہد کرو جس میں کوئی لچک نہ ہو۔

پھر لائق غور بات یہ ہے کہ انھوں نے قسم بھی "اللہ" کی اٹھائی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بتوں کو پوجنے کے علاوہ زمین و آسمان کے خالق اللہ پر بھی عقیدہ رکھتے تھے اور اپنے اہم مسائل میں اسی کے نام کی قسم کھاتے تھے۔ یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ وہ اتنے مغرور اور بدمست ہو چکے تھے کہ اس قدر ہولناک جرم کے ارتکاب کے لیے بھی انھوں نے خدا ہی کا نام لیا۔ گویا وہ کوئی اہم عبادت یا کوئی ایسا کام انجام دینے لگے ہوں جو اللہ کو بہت منظور ہے۔ خدا سے بے خبر مغرور اور گمراہ

Marfat.com

لوگوں کا وطیرہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔

" لنبیتنه " " تبییت " کے مادہ سے ہے جس کا معنی شب خون مارنا اور رات کے وقت غافل پاکر حملہ کرنا ہے۔ اس تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صالح علیہ السلام کے ہمنواؤں اور ان کے قوم و قبیلہ سے خوف کھاتے تھے۔ لہذا انھوں نے ایسا منصوبہ بنایا کہ جس سے وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہوجائیں اور صالح کے طرفداروں کے غیظ و غضب کا شکار بھی نہ ہوں۔ گویا وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ بنابریں انھوں نے رات کے وقت حملے کی ترکیب سوچی اور طے کرلیا کہ جب بھی کوئی شخص ان سے پوچھ گچھ کرے گا تو سب متفق ہوکر قسم اٹھائیں گے کہ اس منصوبے میں ان کا کوئی عمل دخل نہیں تھا حتیٰ کہ وہ اس وقت موجود بھی نہیں تھے۔ (کیونکہ ان کی صالح کے ساتھ مخالفت پہلے سے دنیا کو معلوم تھی)۔

تاریخوں میں ہے کہ ان کی سازش کچھ یوں تھی کہ شہر کے اطراف میں ایک پہاڑ تھا اور پہاڑ میں ایک غار تھی جس میں جناب صالح علیہ السلام عبادت کیا کرتے تھے اور کبھی کبھار وہ رات کو بھی اسی غار میں جاکر اپنے پروردگار کی عبادت کرتے تھے اور اس سے رازونیاز کیا کرتے تھے۔

انھوں نے طے کرلیا کہ وہاں کمین لگا کر بیٹھ جائیں گے جب بھی صالح وہاں آئیں گے انھیں قتل کردیں گے۔ ان کی شہادت کے بعد ان کے اہل خانہ پر حملہ کرکے انھیں بھی راتوں رات موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ پھر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے اگر ان سے اس بارے میں کسی نے پوچھ بھی لیا تو اس سے لاعلمی کا اظہار کردیں گے۔

لیکن خداوند عالم نے ان کی اس سازش کو عجیب و غریب طریقے سے ناکام بنادیا اور ان کے اس منصوبے کو نقش برآب کردیا۔

جب وہ ایک کونے میں گھات لگائے بیٹھے تھے تو پہاڑ سے پتھر گرنے لگے اور ایک بہت بڑا ٹکڑا پہاڑ کی چوٹی سے گرا اور آن کی آن میں اس نے ان سب کا صفایا کردیا۔

لہذا قرآن مجید بعد والی آیت میں کہتا ہے: اُدھر انھوں نے ایک اہم منصوبہ بنایا اور اِدھر ہم نے زبردست منصوبہ تیار کیا اور انھیں اس کا کوئی علم نہیں تھا (ومکروا مکرًا ومکرنا مکرًا وهم لا یشعرون)۔

پھر فرمایا گیا ہے: ذرا دیکھو کہ ان کی سازش اور مکاری کا انجام کیا ہوا؟ کہ ہم نے ان کو اور ان کی تمام قوم اور طرفداروں کو نیست و نابود کردیا (فانظر کیف کان عاقبة مکرهم انا دمرناهم وقومهم اجمعین)۔

" مکر " کا لفظ جیسا کہ ہم پہلے (تفسیر نمونہ کی دوسری جلد ص ۲۳۹ پر) بھی بتا چکے ہیں کہ عربی ادب میں ہر قسم کی چارہ جوئی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے آج کل فارسی میں یہ لفظ شیطانی چالوں اور نقصان دہ منصوبوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں ایسا نہیں ہے بلکہ اچھے اور برے دونوں طرح کے منصوبوں اور چارہ جوئی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے[1]۔

راغب " مفردات " میں کہتے ہیں:

---

[1] اردو میں بھی یہ لفظ فارسی مفہوم سے ہم آہنگ ہے۔ (مترجم)

Marfat.com

المکر صرف الغیر عما یقصده

مکر یہ ہے کہ کسی کو اپنے مقصد تک پہنچنے سے روکا جائے۔

بنا بریں جب یہ لفظ خداوند عالم کے بارے میں استعمال ہو تو اس کا مفہوم ہوگا کسی نقصان دہ منصوبے اور سازش کو ناکام بنانا اور جب فسادی لوگوں کے بارے میں استعمال ہوگا تو اس کا معنی ہوگا اصلاحی منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچنے سے روکنا۔

پھر قرآن پاک ان کی ہلاکت کی کیفیت اور ان کے انجام کو یوں بیان کرتا ہے: دیکھو یہ ان لوگوں ہی کے گھر ہیں کہ جو اب ان کے ظلم و ستم کی وجہ سے ویران پڑے ہیں (فتلك بیوتهم خاویة بما ظلموا)۔

نہ وہاں سے کوئی آواز سنائی دیتی ہے،

نہ کسی قسم کا شور شرابہ سننے میں آتا ہے۔

اور نہ ہی وہ زرق برق گناہ بھری محفلیں دکھائی دیتی ہیں،

جی ہاں: وہاں پر ظلم و ستم کی آگ بھڑکی جس نے سب کو جلا کر راکھ کر دیا۔

ظالموں کے اس انجام میں خداوند عالم کی قدرت کی واضح نشانی اور درسِ عبرت ہے ان لوگوں کے لیے جو علم و آگہی رکھتے ہیں (ان فی ذٰلك لاٰیة لقوم یعلمون)۔

لیکن اس بھٹی میں سب خشک و تر نہیں جلے بلکہ بے گناہ افراد گناہ گاروں کی آگ میں جلنے سے بچ گئے۔ ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو ایمان لا چکے تھے اور تقویٰ اختیار کر چکے تھے (و انجینا الذین اٰمنوا و کانوا یتقون)۔

چند اہم نکات

۱۔ **قوم ثمود کو کیا سزا ملی؟** اس سرکش اور ظالم قوم کے بارے میں کبھی تو قرآن یوں فرماتا ہے:

فاخذتهم الرجفة

انھیں زلزلے نے آلیا اور تباہ و برباد کر دیا۔ (اعراف / ۷۸)

کبھی فرماتا ہے:

فاخذتهم الصاعقة

کڑکنے والی بجلی ان پر گری۔ (ذاریات / ۴۴)

اور کبھی کہتا ہے:

و اخذ الذین ظلموا الصیحة

آسمانی چیخ نے ان کا کام تمام کر دیا۔ (ہود / ۶۷)

اگر غور کیا جائے تو ان تینوں تعبیروں میں کسی قسم کا تضاد نہیں پایا جاتا کیونکہ "صاعقة" بھی بجلی کی بہت بڑی چنگاری ہوتی ہے جو بادل کے ٹکڑوں اور زمین کے درمیان آتی جاتی رہتی ہے عظیم اور مہیب آواز بھی اس کے ہمراہ ہوتی ہے اور

Marfat.com

اطراف زمین میں شدید قسم کا زلزلہ بھی ساتھ لاتی ہے (آسمانی چیخ کے بارے میں مزید تفصیل ہم نے تفسیر نمونہ جلد ۹ سورۂ ہود کی آیت ۶۷ کی تفسیر میں بیان کی ہے)۔

۲۔ بچ جانے والے :۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ حضرت صالح علیہ السلام کے دوستوں کی تعداد چار ہزار تھی جو آپ کے ساتھ عذاب سے بچ گئے تھے اور حکم پروردگار کے مطابق فساد و گناہ سے لبریز اس علاقے سے کوچ کر کے حضر موت جا پہنچے تھے[1]

۳۔ "خاویہ" کا مفہوم :۔ "خاویة" "خواء" (بروزن "ھواء") کے مادہ سے ہے جس کا ایک معنی تو سقوط کرنا اور ویران ہونا ہے اور ایک معنی خالی ہونا۔ اور شہابی ستاروں کے بارے میں بھی یہی تعبیر استعمال کی جاتی ہے جیسا کہ کہتے ہیں : " خوی النجم " یعنی ستارہ گرا۔

راغب اپنی کتاب مفردات میں کہتے ہیں " خوی " کا اصلی معنی خالی ہونا ہے اور بھوکے پیٹ، خالی اخروٹ اور بارش سے خالی ستاروں کے بارے میں اس کا اطلاق ہوتا ہے (زمانہ جاہلیت کے عربوں کا نظریہ تھا کہ جو ستارہ بھی افق میں ظاہر ہوتا ہے اپنے ساتھ بارش لاتا ہے)۔

۴۔ ظلم کا نتیجہ :۔ ایک روایت میں ابن عباس سے مروی ہے کہ

قرآن مجید سے مجھے اس بات کا بخوبی علم ہوا ہے کہ ظلم گھروں کو اجاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

پھر انھوں نے اس آیت کو اپنے مدعا کے ثبوت میں پیش کیا "فتلك بيوتهم خاوية بما ظلموا"[2]

اور حقیقت یہ ہے کہ شہروں کی تباہی اور معاشروں کی بربادی میں ظلم ایک ایسا عنصر ہے جس کے ساتھ کسی اور چیز کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

ظلم مار ڈالنے والی گرجدار بجلی ہے،

ظلم اجاڑ کر رکھ دینے والا زلزلہ ہے،

اور ظلم آسمانی چیخ کی مانند تباہ کر دینے والا موت کا پیغام ہے۔

تاریخ نے بارہا کے تجربات سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ممکن ہے دنیا کفر کے ساتھ تو برقرار رہ جائے لیکن ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی۔

۵۔ قوم ثمود کو سزا کب ملی ؟ اس میں شک نہیں ہے کہ قوم ثمود کو عمومی طور پر سزا ناقۂ صالح کے قتل کرنے کے بعد ملی جیسا کہ سورۂ ہود کی آیت ۶۵ تا ۶۷ میں ہے کہ جب انھوں نے ناقہ کو قتل کر دیا تو صالحؑ نے فرمایا :

تم تین دن تک اپنے گھروں میں فائدہ اٹھا لو اس کے بعد تمھیں خدا کا عذاب ضرور اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔

---

[1] طبرسی نے مجمع البیان میں، آلوسی نے روح المعانی میں، اور قرطبی نے اپنی مشہور تفسیر میں، انھی آیات کے ذیل میں یہ بات لکھی ہے۔

[2] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اور جب ہمارا حکم پہنچ گیا تو ہم نے صالح اور ان لوگوں کو نجات دے دی جو صالح پر ایمان لا چکے تھے اور ظالموں کو آسمانی چیخ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اپنے ہی گھروں میں زمین پر گر پڑے اور مر گئے ۔

بنابریں حضرت صالح کے قتل کی سازش کے بعد ہی عذاب نازل نہیں ہوا بلکہ قوی احتمال یہ ہے کہ خدا کے اس پیغمبر کے قتل کی سازش کے واقعے میں فقط سازشی ٹولے ہلاک ہوئے اور دوسرے ظالموں کو سنبھل جانے کے لیے مہلت دی گئی، لیکن ناقہ کے قتل کے بعد تمام ظالم اور بے ایمان گناہ گار فنا ہو گئے۔ لہٰذا اس سورہ کی اور سورۂ ہود اور سورۂ اعراف کی آیات کے ملانے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے ۔

بالفاظ دیگر زیر نظر آیات میں حضرت صالحؑ اور ان کے اہل خانہ کے قتل کی سازش کے نتیجے میں نازل ہونے والے عذاب کا تذکرہ ہے اور سورۂ اعراف اور ہود کی آیات میں ناقہ صالح کے قتل کے نتیجے میں عذاب کے نازل ہونے کا بیان ہے تو ان دونوں صورتوں کو ملا کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ ان ظالموں نے پہلے تو جناب صالح کے قتل کے منصوبے بنائے لیکن جب اس میں انھیں کامیابی نہ ہوئی تو پھر ان کے عظیم معجزہ یعنی ناقہ کو قتل کر دیا اور تین دن کی مہلت کے بعد انھیں دردناک عذاب نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ انھوں نے پہلے تو ناقہ کو قتل کیا ہو اور جب جناب صالح علیہ السّلام نے انھیں تین دن کے بعد نازل ہونے والے عذاب سے ڈرایا ہو تو انھیں بھی شہید کرنے کی ٹھان لی ہو لیکن اس شیطانی منصوبے میں ناکامی کے بعد تباہ و برباد ہو گئے ہوں [1]

---

[1] تفسیر "روح البیان" اسی آیت کے ذیل میں ۔

Marfat.com

۵۴۔ وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ○
۵۵۔ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنتُمْ
قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ○

ترجمہ

۵۴۔ اور لُوط کو یاد کیجیے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بُرے کاموں کی طرف جاتے ہو؟ جبکہ (ان کی برائی اور غلط نتائج) تم دیکھ رہے ہو۔
۵۵۔ کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر شہوت سے مردوں کے پاس آتے ہو؟ تم تو جاہل قوم ہو۔

تفسیر

قومِ لُوط کی بے راہروی

حضرت موسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ اور حضرت صالحؑ اور ان کی اقوام کے واقعات بیان کرنے کے بعد جس پانچویں پیغمبر کی زندگی کی طرف اس سورہ میں اشارہ کیا گیا ہے وہ خدا کے باعظمت نبی حضرت لوط علیہ السلام ہیں۔

قرآن نے ان کے واقعات صرف اسی مقام پر بیان نہیں کیے بلکہ کئی اور مقامات پر بھی ان کے واقعات بیان کیے جا چکے ہیں مثلاً سورۂ حجر، ہود، شعراء اور اعراف میں ان کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔

ایسے واقعات کا تکرار اس لیے ہے کیونکہ قرآن کوئی تاریخی کتاب تو ہے نہیں کہ ایک مرتبہ کسی واقعے کو مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد پھر اس کا تذکرہ ہی نہ کرے بلکہ یہ ایک انسان ساز اور تربیتی کتاب ہے اور ہر ایک کو معلوم ہے کہ تربیتی مسائل میں بعض اوقات ضرورت پیش آجاتی ہے کہ کسی ایک واقعے کو ایک نہیں کئی مرتبہ دہرایا جائے اس کے مختلف زاویوں کو دیکھا جائے اور مختلف لحاظ سے اس سے نتائج اخذ کیے جائیں۔

بہرحال قوم لوط کی جنسی بے راہروی، ہم جنس بازی اور دوسری برائیوں کی داستانیں مشہورِ عالم ہیں اور اسی طرح اس قوم کا دردناک انجام ان لوگوں کے لیے درس عبرت ثابت ہو سکتا ہے جو شہوات اور خواہشات نفسانی کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور چونکہ یہ آلودگی اور بے حیائی لوگوں میں سرایت کر چکی ہے لہٰذا ضروری ہو جاتا ہے کہ اس واقعے کو بار بار دہرایا جائے۔

زیر نظر آیات میں سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: اور لُوط کو یاد کیجیے جب انھوں نے اپنی قوم سے کہا: کیا تم بُرے کاموں کی طرف جاتے ہو۔ جبکہ (ان کی برائی اور غلط نتائج) تم دیکھ رہے ہو (ولوطا اذ قال لقومہ اتأتون

Marfat.com

الفاحشۃ وانتم تبصرون)۔[1]

"فاحشۃ" کے بارے میں ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ان کاموں کو کہا جاتا ہے جن کی برائی اور قباحت واضح اور آشکار ہو۔ یہاں پر اس سے مراد "لواطہ" اور ہم جنس بازی کا فعل قبیح ہے۔

"انتم تبصرون" اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس قبیح فعل کی قباحت اور برائیاں نیز اس کے شرمناک اور خطرناک نتائج دیکھ رہے ہو کہ کس طرح اس نے تمھارے معاشرے کو ناپاک اور آلودہ کر کے رکھ دیا ہے حتیٰ کہ تمھارے چھوٹے چھوٹے اور کمسن بچے بھی اس گناہ سے محفوظ نہیں ہیں آخر کیا وجہ ہے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود تم بیدار نہیں ہوتے۔

بعض مفسرین نے اس مقام پر یہ احتمال پیش کیا ہے کہ یہ آیت شاید اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ اس فعل قبیح کا ارتکاب ایک دوسرے کے سامنے کرتے تھے یہ بات ظاہری عبارت سے ہرگز مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ لوط چاہتے تھے کہ ان کے خوابیدہ ضمیر کو جھنجھوڑیں اور بیدار کریں اور ان کی باطنی آواز کو ان کے کانوں تک پہنچائیں۔ درحقیقت وہ ان کی بصیرت کو دعوت دے رہے تھے۔ اس فعل کے تباہ کن نتائج اور انھیں بیدار کرنے کی بات کر رہے ہیں۔

آگے چل کر قرآن فرماتا ہے: کیا تم عورتوں کی بجائے شہوت کے ساتھ مردوں کے پاس جاتے ہو؟ (ائنکم لتأتون الرجال شھوۃ من دون النساء)۔

درحقیقت پہلے تو اس قبیح فعل کو "فاحشہ" (برا کام) کہا پھر اسے مزید واضح کر کے بیان کر دیا تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہ جائے یہ انداز اہم ترین مسائل کو بیان کرنے کے فنونِ بلاغت میں سے ایک ہے چونکہ اس برے کام کا سبب جہالت اور نادانی ہے لہٰذا قرآن آگے فرماتا ہے: تم تو نادان اور جاہل قوم ہو (بل انتم قوم تجھلون)۔

خدا سے جہالت، مقصد تخلیق سے جہالت، ناموسِ خلقت سے جہالت اور اس بے شرمانہ گناہ کے آثار و نتائج سے جہالت اگر تم خوب غور سے کام لو اور خوب سوچو تو اس حقیقت کو یقیناً سمجھ لو گے کہ یہ قبیح فعل کس حد تک جاہلانہ کام ہے۔ اس جملے کو استفہام کی صورت میں بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا جواب وہ اپنے ضمیر سے خود سنیں تاکہ اس کا بہتر اثر ہو۔

---

[1] ممکن ہے کہ "لوطا" "ارسلنا" فعل کی وجہ سے منسوب ہو جو سابقہ آیات میں گزر چکا ہے یا "اذکر" جیسے مقدر فعل کی وجہ سے منصوب ہو لیکن "اذ قال" کے جملے کے پیشِ نظر دوسرا احتمال زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

۵۶۔ فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ
قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝
۵۷۔ فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۡ قَدَّرْنٰهَا مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝
۵۸۔ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ۝
۵۹۔ قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ
خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

ترجمہ

۵۶۔ انھوں نے اس کا جواب صرف یہ دیا کہ ایک دوسرے سے کہا: لوط کے خاندان کو اپنے شہر اور علاقے سے نکال باہر کرو کہ یہ بڑے پاکدامن لوگ ہیں۔

۵۷۔ ہم نے اسے اور اس کے اہل خاندان کو نجات دی سوائے اس کی بیوی کے کہ ہم نے مقدر کر دیا کہ وہ باقی رہ جانے والوں میں سے ہو۔

۵۸۔ پھر ہم نے ان پر (پتھروں کی) بارش برسائی (کہ وہ سب کے سب اس میں دب کر مر گئے) اور یہ کتنی بُری بارش ہے ان کے لیے جنھیں ڈرایا گیا تھا۔

۵۹۔ کہہ دیجیے: حمد خدا ہی کے ساتھ مخصوص ہے اور (درود) سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر۔ تو کیا خداوند عالم بہتر ہے یا وہ بُت کہ جنھیں خدا کا شریک بناتے ہیں۔

تفسیر

جہاں پاکدامنی عیب بن جاتی ہے

گزشتہ گفتگو میں ہم اللہ کے عظیم نبی جناب لوط علیہ السلام کے منطقی دلائل کو ملاحظہ کر چکے ہیں جو انھوں نے گناہوں سے آلودہ بے راہروی کے شکار لوگوں کے سامنے پیش کیے تھے۔ یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ انھوں نے کس عمدہ اور استدلالی انداز میں

Marfat.com

لواطہ جیسے قبیح فعل سے انھیں روکنے کی کوشش کی ہے۔ اور کس طرح انھیں سمجھایا ہے کہ یہ کام جہالت و نادانی اور قانونِ فطرت اور دوسرے تمام انسانی اقدار سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

اب دیکھنا یہ چاہیے کہ اس کثیف اور خبیث قوم نے آپ کی اس منطقی گفتار کا کیا جواب دیا؟ تو قرآن کی زبانی سن لیجیے قرآن کہتا ہے ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی جواب نہیں تھا کہ ایک دوسرے سے کہا: لوط کے خاندان کو اپنے شہر اور علاقے سے نکال باہر کرو کیونکہ یہ بڑے پاکباز لوگ ہیں اور یہ اپنے تئیں ہم سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے (فما کان جواب قومہ الا ان قالوا اخرجوا اٰل لوط من قریتکم انهم اناس یتطهرون)۔

یہ ایک ایسا جواب ہے جو ان کی فکری پستی اور انتہائی اخلاقی تنزل کا آئینہ دار ہے۔

جی ہاں: مجرم اور گناہ سے آلودہ ماحول میں پاکیزگی ایک جرم و عیب ہوا کرتی ہے۔ یوسف جیسے پاکدامن کو عفت و پارسائی کے جرم میں زندانوں میں ڈالا جاتا ہے۔ خدا کے باعظمت نبی جناب لوط کے خاندان کو گناہوں سے پرہیز اور دوری اختیار کرنے کی پاداش میں شہر بدر کیا جاتا ہے جبکہ زلیخائیں اس ماحول میں آزاد اور صاحبِ جاہ و مقام ہوا کرتی ہیں اور قومِ لوط اپنے اپنے گھروں میں آرام و آسائش کے ساتھ رہتی ہے۔

یہیں پر قرآن مجید کا مصداق واضح ہو جاتا ہے جو وہ گمراہ لوگوں کے بارے میں کہتا ہے کہ:

> ہم (ان کے اپنے اعمال کی بنا پر) ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتے ہیں اور ان کے کان بہرے ہو چکے ہیں۔

ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ گناہوں کی دلدل میں اس حد تک پھنس چکے تھے کہ لوط کے خاندان کا تمسخر اڑا کر کہتے تھے کہ وہ ہمیں ناپاک سمجھتے ہیں اور خود بڑے پاکباز بنتے ہیں یہ کیسا مذاق ہے؟

یہ عجیب بات نہیں تو اور کیا ہے کہ بے حیائی اور بے شرمی کے فعل سے مانوس ہو جانے کی وجہ سے انسان کی حس شناخت ہی یکسر بدل جائے۔ یہ بالکل اس چمڑا رنگنے والے کی مثال ہے جو بدبو سے مانوس ہو چکا تھا اور جب ایک مرتبہ وہ عطاروں کے بازار سے گزر رہا تھا تو عطر کی نامانوس بو کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا جب اسے حکیم کے پاس لے گئے تو اس نے حکم دیا کہ اسے دوبارہ چمڑا رنگنے والوں کے بازار میں لے جایا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ ہوش میں آ گیا اور مرنے سے بچ گیا اور واقعاً اس بارے میں یہ ایک دلچسپ حسّی مثال ہے۔

روایات میں ہے کہ جناب لوط علیہ السّلام نے اس قوم کو تیس سال تک تبلیغ کی لیکن اپنے خاندان کے سوا (اور وہ بھی بیوی کو مستثنیٰ کر کے کیونکہ وہ مشرکین کے ساتھ ہم عقیدہ ہو گئی تھی) اور کوئی بھی آپ پر ایمان نہیں لایا۔[1]

اور ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی اصلاح کی امید بالکل ختم ہو جائے انھیں دنیا میں جینے کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تو بہتر ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید بعد والی آیت میں فرماتا ہے: ہم نے لوط اور ان کے اہلِ خانہ کو

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۲ ص ۲۸۲۔

Marfat.com

نجات دی۔ سوائے لوط کی زوجہ کے کہ جس کا مقدر ہم نے باقی رہ جانے والوں سے منسلک کر دیا تھا (فانجیناہ واھلہ الا امرأتہ قدرناھا من الغابرین)[1]۔

ایک مقررہ وقت کے مطابق ان کے باہر نکل جانے کے بعد (اس رات کی صبح کو جبکہ شہر گناہوں میں پوری طرح غرق ہو چکا تھا) صبح کا وقت ہوا تو ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کر دی (کہ وہ سب لوگ اس میں دفن ہو کر رہ گئے اور وہ پلاس وقت ہوا جب زلزلے نے مکمل طور پر ان کو تہ و بالا کر دیا)۔ (و امطرنا علیھم مطرًا)۔

"اور کس قدر بری سخت اور ناگوار ہے ڈرائے جانے والے لوگوں پر پتھروں کی یہ بارش" (فساء مطر المنذرین)۔

قوم لوطؑ اس کے انجام اور ہم جنس بازی کے برے اثرات کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۹ (سورۂ ہود کی آیات ۷۷تا۸۳) میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں لہٰذا یہاں پر دہرانے کی ضرورت نہیں۔

یہاں پر ہم صرف ایک نکتے کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ:

قانونِ خلقت نے ہمارے لیے ایک ایسے راستے کی نشاندہی کر دی ہے کہ جس پر چل کر ہم ارتقائی مراحل طے کر سکتے ہیں اور اسی میں ہماری زندگی کا راز مضمر ہے اور اس کی مخالفت ہماری پستی اور موت کا سبب بن جاتی ہے۔

قانونِ خلقت نے جنسی جذبے کو ــــــ نسلِ انسانی کی بقا اور انسان کی روحانی تسکین کو ــــــ دو مخالف جنسوں میں قرار دیا ہے اگر یہ راستہ "ہم جنس بازی" کی سمت موڑ دیا جائے تو نہ صرف اس سے روحانی تسکین ختم ہو جاتی ہے بلکہ اجتماعی سکون بھی غارت ہو جاتا ہے اور چونکہ اجتماعی قوانین کے ڈانڈے فطرت سے جا ملتے ہیں لہٰذا ان کی مخالفت انسان کی جسمانی ساخت پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔

خدا کے باعظمت نبی جناب لوط علیہ السلام نے اپنی گمراہ اور بے راہرو قوم کو بھی اسی فطری امر کی طرف توجہ دلائی اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر فرمایا کیا تم ایسی برائی کے پیچھے لگے ہوئے ہو حالانکہ تم اس کے خطرناک نتائج کو بھی دیکھ رہے ہو، تمھاری یہ جہالت قانونِ حیات سے لاعلمی درحقیقت تمھاری حماقت، نادانی اور بے وقوفی ہے جو تمھیں اس حد تک بے راہ رو اور گمراہ کر چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر اس گمراہ قوم کے بارے میں دوسرے قوانین بھی تبدیل ہو جائیں تو مقام تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پانی جو کہ مایہ زندگی ہے کی بجائے پتھر برسنے لگ جائیں اور امن و سکون کا گہوارہ ان کی سرزمین زلزلوں کی وجہ سے تہ و بالا ہو جائے اور وہ صرف نیست و نابود ہی نہ ہو جائیں بلکہ ان کا نشان تک بھی باقی نہ رہے تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پانچ عظیم انبیاء کے تفصیلی حالات اور ان کی قوموں کا انجام بیان کرنے کے بعد گزشتہ واقعات کو بطور نتیجہ اور مشرکین سے گفتگو کے مقدمہ کے عنوان سے روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے۔

---

[1] "غابر" اسے کہتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کے چلے جانے کے بعد ٹھہرا رہے۔

Marfat.com

کہہ دیجیے: حمد وستائش ذاتِ خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے (قل الحمد للہ)۔

حمد وتعریف صرف اس خدا کے لیے مخصوص ہے جس نے قومِ لوط جیسی بے حیا قوم کو نیست ونابود کر دیا تاکہ ان کے اس قبیح فعل کی آلودگیوں سے باقی دنیا محفوظ رہ جائے۔

حمد وستائش اس خدا کے ساتھ مخصوص ہے جس نے ثمود جیسی فاسد ومفسد قوم کو اور فرعونیوں اور فرعون جیسے متکبرین کو ملکِ عدم میں بھیج دیا تاکہ ان کا طرزِ عمل دوسروں کے لیے اسوہ اور نمونہ قرار پاجائے۔

اور تمام تعریفیں صرف اس کے لیے مخصوص ہیں جس نے اپنی ہر طرح کی نعمتیں داؤد وسلیمان جیسے اپنے باایمان بندوں کو عطا فرمائیں اور قومِ سبا جیسی گمراہ ملت کو ان کے ذریعے ہدایت بخشی۔

پھر فرمایا گیا ہے: درود وسلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر (وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ)۔

سلام ہو موسیٰؑ، صالحؑ، لوطؑ، سلیمان اور داؤدؑ پر اور سلام ہو تمام انبیاء اور ان کے سچے جانشینوں پر۔

بعد میں فرمایا گیا ہے: کیا وہ خدا بہتر ہے جس نے یہ سب توانائی قدرت وطاقت، نعمت وانعام عطا فرمائے ہیں یا وہ بت جو مطلقاً کسی چیز کی استطاعت نہیں رکھتے اور یہ لوگ انھیں خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں (آللہ خیر اما یشرکون)[1]

ہم نے انبیائے ماسلف کی ان داستانوں میں دیکھ لیا ہے کہ عذاب کے نزول کے موقع پر بت اپنے عبادت گزاروں کی ذرہ بھر بھی امداد نہ کر سکے۔ جبکہ خداوندِ عالم نے کسی بھی مشکل مرحلے میں مومنین کو تنہا نہیں چھوڑا اور اس کی بے پایاں رحمت ہر وقت ان کی مدد کو پہنچی۔

---

[1] "آللہ" دراصل "أ اللہ" تھا اور اس میں سے ایک ہمزہ الف میں تبدیل کر دینے سے مد کی صورت اختیار کر گیا اور "امایشرکون" دراصل "ام ما یشرکون" تھا۔ کیونکہ "ام" استفہام کے لیے ہے اور "ما" موصولہ ہے، دونوں میم آپس میں مدغم کر دی گئی ہیں۔

Marfat.com

بیسواں ۲۰ پارہ

سورۂ نمل کی

آیت ۶۰ سے شروع ہوتا ہے

Marfat.com

۶۰۔ اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَنْۢبَتْنَا
بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ ۚ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا ؕ ءَاِلٰهٌ
مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ ؕ ۝

۶۱۔ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا
رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ بَلْ
اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ ۝

۶۲۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ
خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ؕ ۝

۶۳۔ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ
الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ تَعٰلَى اللّٰهُ
عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ؕ ۝

۶۴۔ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ
وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۰۔ کیا جو بت تمھارے معبود ہیں وہ بہتر ہیں یا وہ ذات جس نے آسمان اور زمین کو خلق فرمایا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا ہے پھر ہم ہی نے اس کے ذریعے خوبصورت اور سرور انگیز باغات اگائے اور تمھارے بس کی تو بات ہی نہ تھی کہ تم ان کے درخت اگا سکتے کیا خدا کے ساتھ کوئی اور

Marfat.com

معبود ہے؟ نہیں بلکہ وہ تو ایسے نادان ہیں کہ خدا کی مخلوق کو اس کے برابر قرار دیتے ہیں۔
۶۱۔ یا وہ جس نے زمین کو جائے آرام و قرار بنایا ہے اور اس میں دریا جاری کیے ہیں اور زمین کے لیے ثابت و محکم پہاڑ بنائے ہیں اور دو سمندروں کے درمیان حدِ فاصل بنائی ہے (تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں، تو اس حالت میں) کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ نہیں بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے (اور جاہل ہیں)۔
۶۲۔ یا وہ جو مضطر و بے چین کی دعا قبول کرتا ہے اور اس کی مصیبت دُور کرتا ہے اور تمھیں زمین پر خلیفہ بناتا ہے تو کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ تم میں سے بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہیں۔
۶۳۔ یا وہ جو تمھیں صحرا کی تاریکیوں اور سمندر میں رستہ دکھاتا ہے اور وہ جو اپنی رحمت کے نازل ہونے سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیج دیتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ اللہ اس بات سے برتر و بالا ہے کہ اس کے ساتھ شریک قرار دیں۔
۶۴۔ یا وہ جس نے خلقت کا آغاز کیا اور پھر اسے پلٹائے گا اور وہ جو تمھیں زمین و آسمان سے روزی عطا کرتا ہے کیا کوئی اور معبود خدا کے ساتھ ہے؟ کہہ دیجیے کہ اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو؟

تفسیر

یہ دلائل اور پھر بھی شرک

گزشتہ گفتگو کے سلسلہ آیات کی آخری آیت میں (پانچ عظیم انبیاء کی چونکا دینے والی داستانوں کے بعد) ایک مختصر مگر جامع سوال کیا گیا ہے کہ "کیا خداوند قادر و توانا بہتر ہے یا ان کے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بے قدر و قیمت بُت؟"

زیر نظر آیات میں اس جملے کی تشریح کی گئی ہے اور پانچ آیات میں پانچ جچے تُلے سوال کیے گئے ہیں۔ اور مشرکین کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرکے ان سوالات کا جواب طلب کیا گیا ہے تو پانچ آیات میں خداوند عالم کی بارہ عظیم نعمتیں توحید کے دلائل کے طور پر ذکر کی گئی ہیں۔

سب سے پہلے آسمان و زمین کی خلقت، بارانِ رحمت کا نزول اور اس سے پیدا ہونے والی برکتوں کو بیان کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: کیا وہ بُت بہتر ہیں جو تمھارے معبود ہیں یا وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا ہے اور تمھارے لیے آسمان سے پانی نازل کیا ہے اور ہم نے اس سے خوبصورت اور سرور انگیز باغات اگائے ہیں (امن خلق السماوات والارض وانزل لکم من السماء ماء فانبتنا به حدائق ذات بهجة)[1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

Marfat.com

"حدائق" "حدیقہ" کی جمع ہے اور جس طرح بہت سے مفسرین نے کہا ہے کہ اس باغ کے معنی میں ہے جس کے اطراف میں دیوار کھینچی گئی ہو اور ہر لحاظ سے محفوظ ہو جیسا کہ آنکھ کا "حدقہ" (ڈھیلا) پلکوں کے درمیان محصور ہے۔ راغب اصفہانی اپنی کتاب "مفردات" میں کہتے ہیں:

حدیقہ دراصل اس زمین کو کہتے ہیں جس میں پانی ٹھہرا ہے جیسا کہ آنکھ کا حدقہ (ڈھیلا) ہے کہ ہمیشہ پانی اس میں موجود رہتا ہے۔

توان دونوں اقوال کو ملا کر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ "حدیقہ" اس باغ کو کہتے ہیں جس کے اطراف میں دیوار بھی ہو اور اس میں پانی بھی خوب موجود ہو۔

"بھجۃ" (بروزن "لھجۃ") کا معنی رنگ کی ایسی زیبائی اور ظاہری خوبصورتی ہے جسے دیکھتے ہی لوگ خوشی میں ڈوب جائیں۔[1]

اسی آیت میں روئے سخن بندوں کی طرف کر کے فرمایا گیا ہے: تمھارے بس سے یہ بات باہر ہے کہ تم ایسے خوش نما درخت اگاسکو (ما کان لکم ان تنبتوا شجرھا)۔

تمھارا کام صرف اور صرف بیج ڈالنا اور آبپاشی کرنا ہے اور بس، جو ذات ان بیجوں کے دل میں روح حیات ڈالتی ہے اور ان کے اگانے کے لیے نورِ آفتاب، قطراتِ باران اور ذراتِ خاک کو مامور کرتی ہے وہ ذات خداوند ذوالجلال ہی ہے۔

یہ ایسے حقائق ہیں جن سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا اور نہ ہی انھیں غیر خدا کی طرف نسبت دے سکتا ہے وہ خدا ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو خلق فرمایا ہے، وہی بارش نازل کرتا ہے اور وہی عالمِ حیات میں حسن و جمال اور زیبائی و خوشنمائی کا خالق ہے۔

حتیٰ کہ اگر ایک خوش نما پھول کی رنگ آمیزی کے بارے میں غور کیا جائے اور لطیف اور منظم پتیوں کو غور سے دیکھا جائے جو ایک دوسرے کے اندر رہ کر پھول کے مرکزی حصّے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے زندگی کا راگ الاپ رہی ہیں تو کافی ہو جائے گا کہ انسان اس کے خالق کی عظمت، قدرت اور حکمت کو سمجھ جائے، یہی چیزیں انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتی ہیں اور خالق کائنات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

دوسرے لفظوں میں خلقت میں توحید (توحیدِ خالق) اور ربوبیت میں توحید (مدبّر کائنات کی توحید) کو "معبود کی توحید"

(حاشیہ پچھلے صفحہ کا) درحقیقت اس کا ایک محذوف ہے اور اس کی تقدیر یوں ہے "ما یشرکون خیرا من خلق السماوات والارض" درحقیقت اس سے پہلی آیت میں سوال یوں تھا کہ آیا وہ خدا جو بندوں کو نجات دیتا ہے بہتر ہے یا وہ بت کہ جنھیں لوگ اس کا شریک بناتے ہیں؟ لیکن اس آیت میں سوال بتوں سے شروع کرتا ہے کہ آیا وہ بہتر ہیں یا خداوند متعال جو آسمانوں اور زمین کا خالق ہے۔

[1] "ذات بھجۃ" میں "ذات" کا لفظ مفرد آیا ہے جبکہ "حدائق" جمع کا صیغہ ہے اور اس کا موصوف ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ حدائق جمع مکسر ہے اور جمع مکسر کبھی "جماعت" کے مفہوم میں بھی آتی ہے جو کہ مفرد ہے اور مفرد کی صفت بھی مفرد ہوا کرتی ہے۔

Marfat.com

کے بنیادی ستون شمار کیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ءَ الٰہ مع اللہ)۔

لیکن وہ نادان لوگ ہیں جو پروردگارِ عالم سے منہ موڑ کر غیر اللہ کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں جس میں کچھ بھی قدرت نہیں ہے (بل ھم قوم یعدلون)۔[1]

دوسرا سوال زمین کی آرام و سکون کی نعمت اور اس جہان میں انسان کی قرارگاہ کے بارے میں ہے: کیا ان کے بناوٹی معبوٗد بہتر ہیں یا وہ کہ جس نے زمین کو آرام کی جگہ بنایا ہے اور اس میں دریا چلائے ہیں اور زمین کے لیے محکم اور ٹھہرے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں (تاکہ زمین کو زلزلے سے محفوظ رکھیں)۔ (امن جعل الارض قرارًا وجعل خلالھا انھارًا وجعل لھا رواسی)۔[2]

نیز" دو (میٹھے اور کڑوے) سمندروں کے درمیان ایک حدِ فاصل قرار دی ہے تاکہ وہ آپس میں مل نہ جائیں (وجعل بین البحرین حاجزًا)۔

تو اس طرح سے اس آیت میں چار عظیم نعمتوں کا ذکر آیا ہے اور تین حصوں میں آرام و سکون کی بات کی گئی ہے۔

زمین کا اپنا آرام کہ اس کے اپنے محور اور سورج کے گرد تیز رفتاری کے ساتھ گھومنے اور مجموعی طور پر نظامِ شمسی کی حرکت کے باوجود یہ زمین اس قدر ایک حالت پر قائم اور پُرسکون ہے کہ اس کے اوپر رہنے والوں کو اس کی حرکت کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا گویا وہ ایک جگہ پر ایسی گڑی ہوئی ہے کہ حرکت کا نام و نشان ہی نہیں ملتا۔

دوسری نعمت پہاڑوں کی ہے (جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ وہ زمین کے چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کی بنیادیں آپس میں پیوستہ ہیں جو ایک طاقتور زرہ کا کام دیتے ہیں اور زمین کے اندرونی دباؤ اور بیرونی مدوجزر کا جو چاند کی کشش کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں اور ایسے عظیم طوفانوں سے زمین کو بچاتے ہیں جو زمینی زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیں۔[3]

ایک اور نعمت قدرتی حدِ فاصل ہے جو سمندروں کے میٹھے اور کڑوے پانی کو ایک دوسرے سے الگ تھلگ رکھتی ہے اور یہ نادیدہ حجاب میٹھے اور کڑوے پانی کے ہلکے اور بھاری درجوں کے فرق کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں جسے اصطلاح میں "مخصوص

۱۔ "یعدلون" کے بارے میں ایک احتمال یہ ہے کہ ممکن ہے کہ وہ "عدول" انحراف اور حق سے باطل کی طرف لوٹ جانے کے معنی میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ "عدل" (بروزن "فکر") برابر، مشابہ اور نظیر کے معنی میں ہو پہلی صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ خدائے وحدہٗ لاشریک سے انحراف و عدول کرتے ہیں اور دوسری صورت میں اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ وہ انھیں اس کے مشابہ، ہم پلہ اور نظیر تسلیم کرتے ہیں۔

۲۔ "خلال" دراصل دو چیزوں کے درمیانی شگاف کو کہتے ہیں اور "رواسی" "راسیة" کی جمع ہے جس کا معنی ہے ٹھہرا ہوا اور برقرار۔

۳۔ زمین کے برقرار اور رُکے رہنے میں پہاڑ کیا کردار ادا کرتے ہیں اور ان کے اور کیا فوائد ہیں۔ اس کی تفصیل ہم تفسیر نمونہ جلد ۱۰ (سورۂ رعد کی آیت ۲ کے ذیل) میں بیان کر چکے ہیں۔

Marfat.com

وزن کا فرق" کہا جاتا ہے اور یہ اس بات کا سبب بن جاتا ہے کہ جب بڑے بڑے دریاؤں کا پانی سمندروں میں گرتا ہے تو بہت عرصے میں نمکین پانی میں تحلیل ہوجاتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس پانی کو سمندر کا مدوجزر ساحل کے وسیع و عریض علاقے میں دھکیل دیتا ہے اور اس سے زراعت کے لیے آبپاشی کی جاتی ہے۔

اس کی تفصیل ہم اسی جلد میں سورہ فرقان کی آیت ۵۲ کے ذیل میں بیان کرچکے ہیں۔

اس کے باوجود زمین کے مختلف حصوں میں پانی کی نہریں اور دریا جاری ہیں جو حیات اور زندگی کا سرمایہ، شادابی و تازگی کا سرچشمہ اور لہلہاتے کھیتوں اور ثمر آور باغات کا ذریعہ حیات ہیں۔ یہ پانی کچھ تو پہاڑوں کے اندر موجود ہے اور کچھ خود زمین کے اندر۔

تو کیا اس قسم کا منظم اور جچا تلا نظام اندھے اور بہرے " اتفاق " اور عقل و خرد سے عاری " مبداء" کا شاہکار ہوسکتا ہے؟

کیا اس حیرت انگیز اور تعجب خیز نظام میں بتوں کا کوئی حصہ ہوسکتا ہے؟

(نہیں اور ہرگز نہیں!!) حتیٰ کہ خود بُت پرستوں نے بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا۔

یہی وجہ ہے کہ آیت کے آخر میں اس سوال کو ایک بار پھر دہراتا ہے کہ کیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟ (ء الٰہ مع اللہ)۔

نہیں کوئی نہیں" بلکہ ان میں سے اکثر لوگ نادان اور بے خبر ہیں (بل اکثرھم لا یعلمون)۔

اسی سلسلے کے پانچ سوال ہیں جو درحقیقت ایک معنوی اور باطنی مقدمے کی تفتیش کے سلسلہ میں ہیں۔ تیسرے سوال میں حل مشکلات، رکاوٹوں کے دور کرنے اور دعا کے قبول ہونے کی بات ہوتی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: کیا تمھارے بے قدر و قیمت معبود بہتر ہیں یا وہ جو عاجز و درماندہ اور مضطر انسان کی دعا قبول کرتا اور اس کی مشکلات کو دور کرتا ہے (امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء)۔

جی ہاں! جب عالمِ اسباب کے تمام دروازے انسان پر بند ہوجاتے ہیں، جب وہ مایوس اور پریشان اور درماندہ اور مضطر ہوجاتا ہے تو خدا ہی ان مشکلات کو حل کرتا ہے، مایوسیوں کو دور کرتا ہے، امید کی کرن دلوں میں روشن کرتا ہے اور عاجز و درماندہ لوگوں پر اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔ یہ صرف اور صرف اس کی پاک ذات ہوسکتی ہے اور کوئی نہیں۔

چونکہ یہ حقیقت ایک فطری احساس کے طور پر تمام انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے تو بُت پرست بھی جب سمندر کی بے رحم موجوں کا شکار ہوجاتے ہیں تو اپنے تمام بناوٹی خداؤں کو فراموش کرکے حقیقی معبود " اللہ" کی رحمت کا سہارا طلب کرتے ہیں، جیسا کہ قرآن فرماتا ہے:

فاذا رکبوا فی الفلک دعوا اللہ مخلصین لہ الدین

جب وہ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو خدا ہی کو پکارتے اور عبادت و پرستش بھی اسی کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں۔ (عنکبوت ــــــ ۶۵)

پھر فرمایا گیا ہے کہ نہ صرف اللہ مشکلات اور مصائب کو دور کرتا ہے بلکہ "تمھیں زمین کے خلفاء بھی قرار دیتا ہے (و یجعلکم خلفاء الارض)۔

Marfat.com

تو کیا پھر بھی خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے (ء اللہ مع اللہ)۔

"تم لوگ بہت کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو اور ان واضح دلائل کے باوجود تم کوئی نصیحت حاصل نہیں کرتے" (قلیلًا ما تذکرون)۔[1]

"مضطر" کے مفہوم اور قبولیتِ دعا اور ان کی شرائط کے بارے میں انھی آیات کے آخر میں نکات کی بحث میں مفصل گفتگو ہوگی۔

"خلفاء الارض" سے ممکن ہے ساکنین وصاحبان زمین مراد ہوں کیونکہ خداوند عالم نے زمین میں جو امن وسکون، آرام و اطمینان، نعمتیں اور اسباب رفاہ قرار دیئے ہیں اس کے باوجود انسان کو اس کرہ خاکی کا حکمران بنایا ہے اور اس پر تسلّط حاصل کرنے کے لیے اسے صلاحیت عطا کی ہے۔

خاص طور پر جب انسان حالتِ اضطرار میں ہوتا ہے اور مشکلات میں گھر جاتا ہے تو وہ بارگاہِ خداوندی کی طرف رُخ کرتا ہے اور خدا بھی اپنی مہربانی سے اس کی تمام مشکلات و مصائب کو دور کر دیتا ہے تو اس خلافت کا پایہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے (اور یہیں سے آیت کے ان دونوں حصّوں کا باہمی ربط بھی واضح ہو جاتا ہے)۔

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ چیز اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ خداوند عالم نے سلسلہ حیات کو کچھ اس طرح خلق فرمایا ہے کہ ہمیشہ کچھ قومیں آتی رہتی ہیں اور دوسری قوموں کی جانشین ہوتی رہتی ہیں۔ اگر باریوں کا یہ سلسلہ نہ ہو تو ارتقاء اور تکامل کبھی بھی واقع نہ ہو۔[2]

چوتھے سوال میں مسئلہ ہدایت پیش کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: کیا یہ بہتر ہیں یا وہ جو تمھیں صحراؤں اور سمندروں کی تاریکیوں میں (ستاروں کے ذریعے) ہدایت کرتا ہے؟ (امن یھدیکم فی ظلمات البر والبحر)۔

"اور وہ جو اپنی رحمت کے نزول سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے" (ومن یرسل الریاح بشرًا بین یدی رحمتہ)۔

ہوائیں بارش کے نزول کا پیش خیمہ ہوتی ہیں اور خوشخبری دینے والے قاصد کی مانند اس کے آگے آگے چلتی رہتی ہیں درحقیقت ان کا کام بھی نزولِ باران کی جانب لوگوں کو ہدایت کرنا ہوتا ہے۔

ہواؤں کے بارے میں "بشرًا" (خوشخبری دینے والی) اور بارش کے بارے میں "رحمت" کی تعبیریں بھی دلچسپ ہیں کیونکہ یہ ہوائیں ہی ہوتی ہیں جو سمندروں سے رطوبت اور بادلوں کے ٹکڑوں کو اپنے دوش پر سوار کر کے خشک اور پیاسے علاقوں میں لے جاتی ہیں اور بارش کی تشریف آوری کی خبر دیتی ہیں۔

---

[1] "قلیلًا ما تذکرون" میں بظاہر "ما" زائدہ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر حروف زائدہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تاکید کا معنی دیتے ہیں اور "قلیلًا" "مصدر محذوف کی صفت ہے جو تقدیری طور پر یوں ہے" تتذکرون تذکرًا قلیلًا"۔

[2] بنابریں "خلفاء الارض" کا معنی "خلفاء فی الارض" ہوگا۔

Marfat.com

اسی طرح بارش ہے جو تمام کرہ خاکی پر زندگی اور حیات کا اعلان کرتی ہے اور جہاں پر بھی نازل ہوتی ہے خیر و برکت اور رحمت و حیات کو وجود میں لے آتی ہے۔[1]

(مزید تفصیل تفسیر نمونہ کی جلد ۶ سورۂ اعراف کی ، ۵۷ ویں آیت کے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں کہ بارش برسانے میں ہوائیں کیا کردار ادا کرتی ہیں ؟)

آیت کے آخر میں مشرکین کو ایک بار پھر خطاب کرکے قرآن فرماتا ہے : آیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے ؟ (ء اله مع الله)۔

پھر ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی فرماتا ہے : خدا اس سے بلند و بالا ہے کہ اس کا شریک قرار دیں۔ (تعالی الله عما یشرکون)۔

اسی سلسلے کی آخری آیت میں پانچویں سوال کو پیش فرماتا ہے جو مبداء اور معاد سے متعلق ہے۔ سوال یہ ہے : کیا تمھارے وہ معبود بہتر ہیں یا وہ جس نے خلقت کا آغاز کیا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا (امن یبدؤا الخلق ثم یعیده)۔

اور وہ جو تمھیں آغاز اور انجام کے اس دورانیے میں آسمان و زمین سے روزی عطا کرتا ہے (ومن یرزقکم من السمآء والارض)۔

کیا پھر بھی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ) خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟ (ء اله مع الله)۔

"تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر تمھارا عقیدہ یہی ہے تو اپنی دلیل لے آؤ اگر سچ کہتے ہو (قل هاتوا برهانکم ان کنتم صادقین)۔

درحقیقت گزشتہ آیات سب کی سب مبداء اور عالم ہستی میں خداوند عالم کی عظمت اور اس کی نعمتوں کی علامات کے بارے میں گفتگو کر رہی تھیں لیکن آخری آیت میں بڑے لطیف انداز میں گفتگو کا رُخ معاد کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ کیونکہ آغازِ آفرینش بذاتِ خود اس کے انجام کی دلیل ہے اور تخلیق کی قدرت بذاتہٖ معاد کی ایک واضح اور روشن برہان ہے۔

اسی سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے جسے بہت سے مفسرین پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ان آیات کا روئے سخن مشرکین کی طرف ہے اور مشرکین ہی ان کے مخاطب ہیں اور اکثر مشرکین معاد (جسمانی) کے قائل نہیں ہیں تو پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان سے سوال کرکے اس چیز کا اقرار لیا جائے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سوال دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جس سے فریق مخالف کو اقرار پر آمادہ کیا گیا ہے کیونکہ اگر وہ صرف یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ آغاز آفرینش اسی کی طرف سے ہے اور یہ تمام نعمتیں اور رزق و روزی بھی وہی ذات کردگار عطا

---

[1] "بُشُر" (بروزن "عُشُر") جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ "بُشُر" (بروزن "کُتُب") کا مخفف ہے جس کی جمع "بشور" (بروزن قبول) آتی ہے جس کا معنی ہے مبشر یعنی بشارت دینے والا۔

Marfat.com

فرماتی ہے تو یہی بات اس اقرار کے لیے کافی ہے کہ یہ چیز بھی تسلیم کریں کہ بروزِ قیامت دوبارہ جی اٹھنے کا امکان بھی موجود ہے۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ "آسمان کے رزق" سے مراد بارش، سورج کی روشنی اور ان جیسے امور ہیں اور "زمین کے رزق" سے مراد نباتات اور مختلف غذائیں اور اناج ہے جو یا تو براہ راست زمین سے اگتے ہیں یا بالواسطہ اس سے کمک حاصل کرتے ہیں جیسے چوپائے وغیرہ یا معدنیات اور دوسری گوناگوں چیزیں کہ جن سے انسان اپنی زندگی میں بہرہ مند ہوتا ہے۔

چند اہم نکات

۱۔ مضطر کون ہے؟ اگرچہ خداوندِ عالم (شرائط کی موجودگی میں) ہر ایک کی دعا کو قبول فرماتا ہے؛ لیکن مندرجہ بالا آیات میں "مضطر" کا خصوصی طور پر بیان کیا گیا ہے کیونکہ قبولیت دعا کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ انسان اپنی آنکھیں مکمل طور پر عالم اسباب سے ہٹا کر اپنے دل وجان کو پوری طرح خدا کے اختیار میں دے دے۔ سب کچھ اسی کی طرف سے جانے اور ہر مشکل کا حل اسی کی طرف سے سمجھے اور یہ سب اضطرار کی حالت میں حاصل ہوتا ہے۔

یہ ٹھیک ہے کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور مومن شخص اس بارے میں اپنی تمام تر کوششوں کو بروئے کار لاتا ہے لیکن وہ کسی بھی صورت میں عالم اسباب میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ عالم اسباب کے وسائل وذرائع کو بھی اسی کا عطیہ سمجھتا ہے اور اسباب کے پس پردہ "مسبب الاسباب" کی ذات کو دیکھتا ہے اور سب کچھ اسی سے طلب کرتا ہے۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ بعض روایات میں اس آیت کی تفسیر حضرت مہدی (صلوات اللہ وسلامہ علیہ) کے ظہور سے کی گئی ہے چنانچہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک روایت میں ہے:

و اللہ لکانی انظر الی القائم وقد اسند ظھرہ الی الحجر ثم ینشد اللہ حقہ .... قال ھو و اللہ المضطر فی کتاب اللہ فی قولہ، امن یجیب المضطر اذا دعاہ و یکشف السوء و یجعلکم خلفاء الارض

خدا کی قسم! میں مہدی کو دیکھ رہا ہوں کہ حجر اسود سے ٹیک لگائے خدا کو اپنے حق کی قسم دے کر دعا مانگ رہے ہیں۔

پھر آپ نے فرمایا:

خدا کی قسم! قرآن مجید کی آیت " امن یجیب المضطر......" میں "مضطر" سے مراد بھی وہی ہیں"۔ [1]

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی ایک اور حدیث میں ہے:

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹۴۔

Marfat.com

نزلت فی القائم من آل محمد علیهم السلام هو و الله المضطر اذا صلی فی المقام رکعتین و دعا الی الله عز وجل فاجابه و یکشف السوء و یجعله خلیفة فی الارض

یہ آیت مہدی آلِ محمدؐ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، خدا کی قسم وہی مضطر ہے، جب وہ مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز بجالائے گا اور خدا کی بارگاہ میں دست بدعا ہو کر اس سے سوال کرے گا تو خدا اس کی دعا کو قبول فرمائے گا۔ اس کی مشکلات کو دُور کر کے اسے زمین کا خلیفہ بنائے گا۔[1]

جیسا کہ اور مقامات پر بھی اس قسم کی تفسیریں بیان ہو چکی ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ آیت کو حضرت مہدی کے وجودِ ذی جود میں منحصر کیا جائے بلکہ آیت کا مفہوم وسیع ہے کہ جس کا ایک واضح مصداق حضرت مہدی کا وجود گرامی بھی ہے کہ اس دور میں جبکہ ہر طرف فتنہ و فساد پھیل چکا ہوگا، امیدوں کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے انسانی مصیبتیں انتہا کو پہنچ چکی ہوں گی بشریت چلا رہی ہوگی تمام کائنات پر اضطرار کی حکومت ہوگی تو ایسی حالت میں وہ روئے زمین کے مقدس ترین حصے پر دعا کے لیے ہاتھ بلند کر کے مشکلات کے دور ہونے کی دعا کریں گے اور خداوند عالم ان کی اس دعا کو مقدس عالمی انقلاب کا پیش خیمہ قرار دے گا۔ "ویجعلکم خلفاء الارض" کے مصداق انھیں اور ان کے یار و انصار کو روئے زمین کا وارث اور خلیفہ بنائے گا۔[2]

دعا کی اہمیت، اس کی قبولیت کی شرائط اور بعض دعاؤں کے قبول نہ ہونے کے اسباب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد اول سورہ بقرہ کی آیت ۱۸۶ کے ذیل میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں۔

۲۔ ہر جگہ منطقی دلائل کی دعوت: ہم قرآن مجید میں کئی مرتبہ پڑھ چکے ہیں کہ وہ اپنے مخالفین سے دلیل کا مطالبہ کرتا ہے خاص کر "ھاتوا برھانکم" (اپنی دلیل لے آؤ) کا جملہ چار مقامات پر دہرایا گیا ہے (سورۂ بقرہ کی آیت ۱۱۱، سورہ انبیاء کی آیت ۲۴، سورہ نمل کی آیت ۶۴ اور سورہ قصص کی آیت ۷۵ میں) اور ان کے علاوہ دوسرے کئی مقامات پر لفظ "برھان" پر خصوصی طور پر زور دیا گیا ہے (برہان ایسی محکم دلیل کو کہتے ہیں جس میں ہمیشہ سچائی پائی جائے)۔

اسلام کی برہان طلبی کی یہ منطق درحقیقت اس کے قوی اور بے نیاز ہونے پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اسلام کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ اپنے مخالفین سے بھی منطق کی رُو سے مقابلہ کرتا ہے جب وہ دوسروں سے برہان و دلیل کا مطالبہ کرتا ہے تو پھر خود اس سے کیونکر بے پرواہ ہو سکتا ہے؟ قرآنی آیات مختلف مسائل میں مختلف سطح پر منطقی دلائل اور علمی براہین سے چھلک رہی ہیں۔

---

[1] تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۹۴۔

[2] عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ گفتگو بھی ٹھیک ۱۵ ر شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ بروز ولادت با سعادت حضرت مہدی آخر الزمان عج معرضِ تحریر میں آئی ہے۔

Marfat.com

یہ چیز آج کی تحریف شدہ مسیحیت کے بالکل برعکس ہے کہ جس پر آج کی عیسائیت انحصار کیے ہوئے ہے اور مذہب کو دل کے تابع سمجھے ہوئے ہے اور عقل کو مذہب سے کوسوں دور سمجھتی ہے بلکہ عقلی تضادات (توحید در تثلیث جیسے مسائل) کو مذہب کا جزو سمجھتی ہے یہی وجہ ہے کہ مذہب میں طرح طرح کے خرافات داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے حالانکہ اگر مذہب کو عقل سے جدا کر دیا جائے تو اس کی حقانیت کی دلیل ہی باقی نہیں رہ جاتی اور مذہب اور اس کی ضد میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔

اسلام کے اس طرز عمل (برہان پر انحصار اور مخالفین کو منطقی دلائل کی دعوت) کی اہمیت اس وقت زیادہ آشکار ہوتی ہے جب ہم اس بات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ اسلام ایک ایسے ماحول میں نمودار ہوا تھا جس میں بے اساس خرافات اور غیر منطقی مسائل کی حکمرانی تھی۔

۲۔ **گزشتہ آیات کا خلاصہ**:۔ گزشتہ آیات میں قرآن مجید نے توحیدِ معبود کو ثابت کرنے کے لیے "توحید خالق" اور "توحید رب" (تخلیق و تدبیر کی توحید) پر زیادہ زور دیا ہے اور کائنات میں خداوند عالم کی بارہ عظیم نشانیوں کا ذکر کیا ہے (آسمان و زمین، نزولِ باران، بارش کے حیات بخش اثرات، انسان کی قرارگاہ کا سکون، جاری دریا، عظیم اور ساکن پہاڑ، میٹھے اور کڑوے پانی کے درمیان حد فاصل، بندوں کی دعا کی قبولیت، خشکی اور تری میں ان کی راہنمائی، نزولِ باران کا پیغام لانے والی ہوائیں، مخلوق کی تجدید حیات اور انسان کو زمین و آسمان سے روزی کی فراہمی)۔

یہ بارہ نعمتیں پانچ آیات میں پانچ سوالوں کے ضمن میں بیان ہوئی ہیں جو بالترتیب ان پانچ مسائل کو بیان کرتی ہیں۔

خلقت، سکون، حل مشکلات، ہدایت اور دوبارہ زندگی کی طرف بازگشت۔

اس ہر ایک سوال کے ذیل میں اس جملے کو دہرایا گیا ہے۔

ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ

آیا خدا کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟

اس سوال کے بعد پہلی آیت میں فوراً ہی ان کے حق سے انحراف کی طرف اشارہ ہوا ہے، دوسری آیت میں ان کی جہالت و نادانی کی طرف، تیسری آیت میں ان کے سوچ بچار سے کام نہ لینے، چوتھی آیت میں ان کی فکری پستی کی طرف اور پانچویں آیت میں ان سے استدلال کا مطالبہ کیا گیا ہے جو مل کر ایک متحد اور منظم بات کی نشاندہی کرتا ہے۔

Marfat.com

۶۵۔ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا
يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝
۶۶۔ بَلِ ادّٰرَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ ۣ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْهَا ۣ بَلْ هُمْ
مِّنْهَا عَمُوْنَ ۝
۶۷۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا وَّاٰبَاۗؤُنَآ اَىِٕنَّا لَمُخْرَجُوْنَ ۝
۶۸۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَاۗؤُنَا مِنْ قَبْلُ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ
الْاَوَّلِيْنَ ۝

ترجمہ

۶۵۔ کہہ دو: جو بھی زمین و آسمان میں ہیں ان میں سے کوئی بھی خدا کے سوا غیب سے آگاہ نہیں ہے اور وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔

۶۶۔ یہ مشرک لوگ آخرت کے بارے میں کچھ بھی صحیح علم نہیں رکھتے بلکہ یہ خود اس کے بپا ہونے کے بارے میں بھی شک کرتے ہیں، بلکہ یہ تو اس سے بالکل اندھے ہیں۔

۶۷۔ کافروں نے کہا: جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر دوبارہ نکالے جائیں گے؟

۶۸۔ یہ وہی وعدہ ہے جو ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے ہیں۔

تفسیر

گزشتہ آیات کے آخر میں قیامت اور معاد کی بات ہو رہی تھی لہٰذا ان آیات میں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالی جا رہی ہے۔

Marfat.com

سب سے پہلے اس سوال کا جواب دیا جا رہا ہے جو بارہا مشرکین کی طرف سے کیا جاتا تھا کہ قیامت کب بپا ہوگی؟ ارشاد ہوتا ہے: کہہ دو کہ اللہ کے سوا زمین و آسمان کے سب باسی غیب سے آگاہ نہیں ہیں، وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب دوبارہ اٹھائے جائیں گے (قل لا یعلم من فی السماوات و الارض الغیب الا اللہ وما یشعرون ایان یبعثون)۔

اس میں شک نہیں ہے کہ قیامِ قیامت کی تاریخ سمیت غیب کا علم خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کچھ علمِ غیب کسی کے بھی اختیار میں دے دے۔ جیسا کہ سورہ جن کی آیات ۲۶ اور ۲۷ میں فرمایا گیا ہے:

عالم الغیب فلا یظھر علی غیبہ احدًا الّا من ارتضٰی من رسول

خدا عالمِ غیب ہے اور کسی کو بھی اپنے غیب سے آگاہ نہیں کرتا مگر جس رسول پر راضی ہو جائے اور اسے نبوت کے لیے چُن لے۔

دوسرے لفظوں میں علمِ غیب ذاتی طور پر، مستقل صورت میں اور غیر محدود انداز میں تو خدا کے ساتھ ہی مخصوص ہے اور اس کے علاوہ دوسرے افراد جو کچھ بھی جانتے ہیں اسی کی جانب سے عطا کردہ ہوتا ہے لیکن قیامت کی تاریخ کا علم پھر بھی اس سے مستثنیٰ ہے اور کوئی بھی شخص اس سے ہرگز آگاہ نہیں ہے [1]۔

پھر مشرکین کی قیامت سے بے خبری اور اس کے بارے میں ان کے شک کے متعلق فرمایا گیا ہے: وہ مرنے کے بعد کی دنیا سے آگاہ نہیں ہیں بلکہ وہ دراصل شک میں پڑے ہوئے ہیں بلکہ وہ تو اندھے ہیں (بل ادارك علمھم فی الأخرۃ بل ھم فی شك منھا بل ھم منھا عمون)۔

" اِدّارك " دراصل " تدارک " تھا جس کا معنی ایک دوسرے کے پیچھے قرار پانا ہے بنا بریں " بل ادارك علمھم فی الأخرۃ " کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے آخرت کے بارے میں اپنی تمام معلومات سے کام تو لیا ہے لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ لہٰذا اس کے بعد فرمایا گیا ہے: وہ اس کے بارے میں شک میں مبتلا ہیں بلکہ اندھے ہیں کیونکہ آخرت کی نشانیاں تو اسی دنیا میں آشکار ہیں مثلاً موسم بہار میں مردہ زمینوں کا زندہ ہو جانا، موسم خزاں میں خشک ہو جانے والے درختوں کا بار آور ہو جانا اور مجموعی طور پر عالمِ آفرینش میں عظمتِ الٰہی کا مشاہدہ، غرض سب کے سب دوبارہ زندگی کے امکان پر دلالت کرتے ہیں لیکن مشرک لوگ اندھوں کی مانند ان کے پاس سے گزر جاتے ہیں اور غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔

البتہ بعض مفسرین نے مندرجہ بالا جملے کی اور بھی کچھ تفسیریں بیان کی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ " ادارك علمھم فی الأخرۃ " سے مراد یہ ہے کہ آخرت کے بارے میں حصولِ علم کے اسباب بہت سے ہیں اور یکے بعد دیگرے موجود ہیں لیکن ان کی آنکھیں ان کو دیکھ نہیں پاتیں۔

---

[1] علمِ غیب کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ کی جلد ۵ ص ۲۶۲ اور جلد ۷ ص ۲۹۶ پر بڑی تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔

Marfat.com

بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ مشرکین اگلے جہان میں حقائق سے باخبر ہوں گے ۔ جب تمام پردے ہٹا دیئے جائیں گے ۔

لیکن ان تینوں تفاسیر میں سے پہلی تفسیر آیت کے دوسرے جملوں اور بعد کی آیات میں آنے والی گفتگو سے زیادہ ہم آہنگ ہے ۔

اس طرح سے آخرت کے منکرین کی جہالت کی تین نشانیاں بیان ہوئی ہیں :

پہلی یہ کہ ان کا انکار اور اعتراض اس بناء پر ہے کہ وہ آخرت کی خصوصیات کو نہیں جانتے اور جس نے حقیقت کو سمجھا ہی نہیں وہ افسانہ طرازیاں ہی کرتا ہے ۔

دوسری یہ کہ وہ اصل آخرت کے وجود میں شک کرتے ہیں اسی لیے وہ قیامت کے قیام کی تاریخ کا سوال کرتے ہیں ۔

تیسری یہ کہ ان کی یہ جہالت اور شک اس وجہ سے نہیں کہ آخرت کے بارے میں ان کے پاس کوئی کافی اور شافی دلیل نہیں ۔ بلکہ دلائل تو بہت ہیں لیکن وہ آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان دلائل کو نہیں دیکھ پاتے ۔

بعد والی آیت روزِ قیامت کے منکرین کی منطق کو ایک جملے میں بیان کرتی ہے ، کافروں نے کہا کہ جب ہم اور ہمارے آباؤ اجداد خاک ہو جائیں گے تو کیا پھر بھی اسی خاک سے نکالے جائیں گے (وقال الذین کفروا ءاذا کنا ترابًا و اٰباؤنا ائنا لمخرجون) ۔

انھوں نے اسی پر اکتفا کر لیا ہے کہ یہ ان ہونی بات ہے کہ انسان ایک مرتبہ گل سڑ کر خاک بن جائے اور پھر زندہ ہو جائے ، حالانکہ انھیں یہ معلوم نہیں کہ پہلے بھی تو وہ خاک تھے اور خاک ہی سے اٹھائے گئے ہیں تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ ایک مرتبہ پھر خاک میں تبدیل ہو کر جی اٹھیں ۔

اور پھر مزے کی بات ہے کہ قرآن مجید کے آٹھ مقامات پر ہمیں کفار کی اس قسم کی گفتگو ملتی ہے کہ وہ فقط اس بات کو بعید سمجھنے کی وجہ سے منکرِ قیامت ہو جاتے ہیں ۔

پھر وہ کہتے ہیں : ۔ " یہ بے اساس وعدہ ہے جو ہم سے اور ہمارے آباؤ اجداد سے پہلے بھی کیا جا چکا ہے " اس کا قطعًا کوئی اثر نہ تو ظاہر ہوا ہے اور نہ ہی ہو گا ۔ (لقد وعدنا ھٰذا نحن و اٰباؤنا من قبل) ۔

" یہ سب کچھ گزشتہ لوگوں کے قصے کہانیاں ہیں " اور ان کی اوہام و خرافات سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں (ان ھٰذا الا اساطیر الاولین) ۔

بنا بریں سب سے پہلے انھوں نے استبعاد سے سلسلہ گفتگو شروع کیا تھا اور انکار مطلق پر آکر تان توڑی ، گویا وہ منتظر تھے کہ قیامت جلد رونما ہونے والی ہے اور چونکہ انھوں نے اس کا اپنی آنکھوں سے

Marfat.com

مشاہدہ نہیں کیا لہٰذا اس کے منکر ہو گئے۔

بہرحال ان کی اس قسم کی باتیں ان کے غرور اور غفلت کی علامت ہیں۔

ضمنی طور پر یہ بھی بتاتے چلیں کہ وہ اس طرح سے قیامت کے بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین و تحقیر کرنا چاہتے تھے اور یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ وہی پرانے وعدے ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں ہے جو دوسرے انبیاء ہمارے آباؤ اجداد سے کرتے رہے ہیں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جس پر سوچ بچار کی جا سکے۔

Marfat.com

۶۹۔ قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُجْرِمِيْنَ ○

۷۰۔ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُنْ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ○
۷۱۔ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○
۷۲۔ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ رَدِفَ لَكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ
تَسْتَعْجِلُوْنَ ○

۷۳۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ
لَا يَشْكُرُوْنَ ○

۷۴۔ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَعْلَمُ مَا تُكِنُّ صُدُوْرُهُمْ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○
۷۵۔ وَمَا مِنْ غَآئِبَةٍ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ
مُّبِيْنٍ ○

ترجمہ

۶۹۔ کہہ دیجیے: روئے زمین پر چل پھر کے دیکھو کہ مجرموں کا کیا انجام ہوا؟

۷۰۔ ان کے جھٹلانے اور انکار کرنے سے نہ گھبراؤ۔ اور نہ ہی تجھے ان کی سازشوں سے دل تنگ ہونا چاہیے۔

۷۱۔ وہ کہتے ہیں کہ (عذاب کا) یہ وعدہ (جو تو ہم سے کر رہا ہے) اگر تو سچا ہے تو بتا کہ وہ کب آئے گا؟

۷۲۔ تو کہہ دو کہ جس کے بارے میں تم جلدی کرتے ہو شاید اس کا کچھ حصہ تمھارے نزدیک اور آس پاس ہی ہو۔

۷۳۔ اور تمھارا پروردگار لوگوں پر فضل و رحمت کرنے والا ہے لیکن ان میں سے اکثر شکر گزار نہیں ہیں۔

۷۴۔ اور تمھارا رب اس چیز سے بھی آگاہ ہے جو وہ اپنے سینوں میں چھپاتے ہیں اور اس سے بھی باخبر ہے جو وہ کھلم کھلا کرتے ہیں۔

Marfat.com

۷۵۔ اور زمین و آسمان میں کوئی ایسی مخفی چیز نہیں ہے کہ جو کتاب مبین (لوحِ محفوظ اور پروردگار کے غیر متناہی علم) میں موجود نہ ہو۔

تفسیر

ان کی سازشوں سے نہ گھبرائیں

گزشتہ آیات میں متعصب کفار کی طرف سے معاد کے انکار کے بارے میں گفتگو تھی۔

چونکہ اس ہٹ دھرم قوم کے ساتھ منطقی بحث بیکار تھی اور پھر یہ بھی کہ قرآن مجید کی اور بھی بہت سی آیات میں معاد قیامت کے بارے میں دلائل پیش کیے جا چکے ہیں اور ایسے دلائل بھی موجود ہیں جو عالم نباتات، عالم جنین اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کیے جاتے ہیں لہٰذا زیر تفسیر آیات میں ان کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل پیش کرنے کی بجائے انھیں درپیش آنے والے عذاب الٰہی سے ڈرایا جا رہا ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: کہہ دو کہ روئے زمین میں چلو پھرو، گزشتہ لوگوں کے آثار اور نشانیوں کو دیکھو اور یہ بھی دیکھو کہ مجرموں اور گناہگاروں کا کیا انجام ہوا ہے (قل سیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المجرمین)۔

تم کہتے ہو کہ اس قسم کے وعدے ہمارے باپ دادا سے بھی کیے جا چکے ہیں اور انھوں نے بھی ایسے وعدوں کی پرواہ نہیں کی اور کوئی نقصان بھی نہیں اٹھایا۔ لیکن اگر تم تھوڑا سا بھی اس دنیا میں چلو پھرو اور مجرموں، گناہ گاروں اور توحید و قیامت کے منکروں کے آثار دیکھو، خاص طور پر ان آثار کو دیکھو جو تمھاری اسی سرزمین حجاز کے اردگرد بکھرے پڑے ہیں تو تمھیں خود اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت کچھ اور ہے۔

عنقریب تمھاری باری بھی آ جائے گی، جلدی کیوں کرتے ہو؟ اگر تم نے بھی ان جیسا طریقۂ کار جاری رکھا تو تمھارا بھی وہی بُرا انجام ہوگا۔

قرآن مجید نے بارہا لوگوں کو گھومنے پھرنے اور سیر کرنے کی دعوت دی ہے تاکہ وہ زمین میں چل پھر کر گزشتہ لوگوں کے آثار اور ان اقوام کی تباہ شدہ سرزمین کو دیکھیں جو عذاب میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ بادشاہوں کے ٹوٹے پھوٹے محلات اور مستکبرین کی تباہ حال قبروں اور بوسیدہ ہڈیوں کو ملاحظہ کریں۔ مغرور ثروت مندوں کے مال و دولت کو دیکھیں جن کا اب اپنا کوئی وارث نہیں رہا۔ پھر اس بات کی خصوصی طور پر صراحت کی گئی ہے کہ گزشتہ لوگوں کے ان آثار کا مطالعہ جو ایک زندہ، گویا اور محسوس تاریخ ہے دلوں کو بیدار اور آنکھوں کو بینا کرتا ہے اور یہ ہے بھی حقیقت، کیونکہ بعض اوقات آثار قدیمہ میں سے کسی ایک کا مشاہدہ انسان کے قلب و روح میں اس قدر طوفان برپا کر دیتا ہے کہ تاریخ کی کئی موٹی موٹی کتابوں کے مطالعے سے بھی اس قدر تاثیر نہیں ہوتی۔

Marfat.com

اس سلسلے میں ہم نے تفسیر نمونہ کی تیسری جلد (سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۲۰ کی تفسیر) میں بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہاں پر "مکذبین" (قیامت کو جھٹلانے والوں) کی بجائے "مجرمین" کہا گیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کی تکذیب اس وجہ سے نہیں تھی کہ انھوں نے تحقیق کرنے میں غلطی کی ہے بلکہ ان کی تکذیب کا اصل سبب ہٹ دھرمی، ضد، عناد، دشمنی اور مختلف جرائم میں ملوث ہونا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے انکار اور مخالفت کا سخت دکھ ہوتا تھا اور وہ دل ہی میں ان کے لیے رنجیدہ رہتے تھے کیونکہ وہ سچے دل سے ان کی ہدایت اور بیداری کے خواہاں تھے لیکن دوسری طرف انھیں متواتر ان کی سازشوں کا سامنا بھی تھا لہٰذا بعد والی آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلجوئی کرتے ہوئے کہتی ہے: تم ان کی تکذیب وانکار سے گھبراؤ نہیں اور غم نہ کھاؤ (ولا تحزن علیہم)۔

ان کی سازشوں سے پریشان نہ ہو اور اس وجہ سے تمھیں رنجیدہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ ہم تمھارے حامی وناصر ہیں۔ (ولا تکن فی ضیق مما یمکرون)۔

لیکن یہ ضدی مزاج منکر بجائے اس کے کہ اپنے مہربان غم خوار پیغمبر کی نصیحتوں پر عمل کرتے اور مجرمین کے انجام سے عبرت حاصل کرتے، الٹا مذاق اڑانے پر تُل گئے اور انھوں نے کہا کہ اگر تم سچ کہتے ہو تو عذابِ الٰہی کا یہ وعدہ کب پورا ہوگا (و یقولون متٰی ھٰذا الوعد ان کنتم صادقین)۔

باوجودیکہ ان کے مخاطب پیغمبر اسلام تھے لیکن وہ یہ بات جمع کے صیغے کے ساتھ کر رہے ہیں کیونکہ سچے مومن بھی اس گفتگو میں آنحضرتؐ کے ہم صدا تھے لہٰذا طبعی طور پر وہ بھی ان کے مخاطب تھے۔

اس موقع پر قرآن مجید ان کے مذاق کو حقیقی سمجھ کر انھیں حقیقت پر مبنی جواب دیتا ہے کہ "انھیں کہہ دو: کہ جس عذاب کی تم جلدی کرتے ہو شاید اس کا کچھ حصہ تمھارے نزدیک اور آس پاس ہی ہو" (قل عسٰی ان یکون ردف لکم بعض الذی تستعجلون)۔

جلدی کیوں کر رہے ہو؟ عذابِ الٰہی کو حقیر کیوں سمجھ رہے ہو؟ کیوں اپنے آپ پر رحم نہیں کرتے ہو؟ آخر عذابِ خداوندی کوئی مذاق نہیں ہے۔ سمجھ لو کہ بس تمھارے انھی الفاظ کی وجہ سے عذابِ الٰہی اور قہر وغضبِ ذوالجلال تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور ابھی تم پر نازل ہوا ہی چاہتا ہے اور تمھیں نیست ونابود کر کے رکھ دینے کے لیے بالکل تیار کھڑا ہے، اتنے ہٹ دھرم کیوں بن رہے ہو؟

"ردف" (بروزن "حرف") کسی چیز کے پیچھے آنے کے معنی میں ہے لہٰذا جو شخص گھوڑے پر کسی کے پیچھے بیٹھتا ہے اسے "ردیف" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ان افراد اور چیزوں کو بھی "ردیف" کہتے ہیں جو ایک دوسرے کے پیچھے ہوتی ہیں۔

اس عذاب سے کیا مراد ہے؟ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ سخت وار ہے جو ان سرکش اور ہٹ دھرم مجرمین کے

Marfat.com

پیکر پر جنگ بدر کے دن پڑا ۔ جنگ بدر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان ہونے والی سب سے پہلی جنگ ہے جس میں کفار کے ستر نامی گرامی افراد مارے گئے اور ستر آدمی اسیر ہوئے ۔

یہ احتمال بھی ہے کہ اس سے مراد عمومی دردناک عذاب ہو لیکن "رحمۃ للعالمین" نبیؐ کے وجود اقدس کی وجہ سے ان سے ہٹا لیا گیا ہو۔ سورہ انفال کی آیت ۳۳ اسی بات کی شاہد ہے، خدا فرماتا ہے :

وما کان اللہ لیعذبھم و انت فیھم

جب تک تم ان لوگوں میں موجود ہو خداوند عالم ان کو معذب نہیں کرے گا ۔

"عسیٰ" (شاید) کی تعبیر پیغمبر اسلامؐ کی زبانی ہے بلکہ (بعض لوگوں کی سوچ کے برعکس) کلام الٰہی میں بھی اس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ کسی چیز کے مقدمات اور اقتضاء کے وجود کی طرف اشارہ ہے ہر چند کہ ممکن ہے ان مقدمات کو کوئی رکاوٹ اور مانع پیش آجائے اور وہ چیز اپنے آخری مقصد تک نہ پہنچ سکے (غور کیجیے گا) ۔

پھر اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر خداوند عالم تمھیں عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا تو اس کی وجہ اس کا تم پر فضل و رحمت ہے تاکہ تمھیں اپنی اصلاح اور گناہوں کی تلافی کا موقع مل سکے ۔ ارشاد ہوتا ہے : تمھارا رب تمام لوگوں پر فضل و رحمت کرنے والا ہے ، لیکن ان میں سے اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہیں (وان ربك لذو فضل علی الناس و لکن اکثرھم لا یشکرون) ۔

اگر ان کا یہ خیال ہو کہ خداوند عالم انھیں عذاب اس لیے نہیں کرتا کہ وہ ان کی بری نیتوں اور غلط سوچوں سے بے خبر ہے تو یہ ان کی بہت بڑی غلط فہمی ہے کیونکہ "تمھارا پروردگار تو اس چیز کو بھی بخوبی جانتا ہے جو وہ سینوں میں چھپاتے ہیں اور اس سے بھی باخبر ہے جسے وہ اعلانیہ انجام دیتے ہیں" (وان ربك لیعلم ما تکن صدورھم و ما یعلنون)[1] ۔

وہ ان کے باطن سے بھی اسی قدر آگاہ ہے جس قدر ظاہر سے ، اصولی طور پر ظاہر و باطن اور غیب و شہود اس کے لیے سب یکساں ہیں ۔ یہ تو ہمارا محدود علم ہے کہ ہم نے ایسے مفاہیم وضع کر لیے ہیں ورنہ ایک غیر محدود اور لامتناہی ذات کے لیے تو ایسے مفاہیم کی کوئی حیثیت نہیں ۔

یہاں پر خداوند عالم کے عالم الغیب ہونے کا ذکر افعال کے عالم ہونے پر مقدم ہے اور یہ نیت اور ارادے کے اہم ہونے کی وجہ سے ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس لیے ہو کہ ظاہری افعال کا سرچشمہ داخلی نیت ہی ہوتی ہے اور علت کے علم کو معلول کے علم پر مقدم ذکر کیا گیا ہے ۔

پھر قرآن فرماتا ہے کہ خدا صرف ان کے ظاہری اور باطنی حالات و کردار ہی کو نہیں جانتا بلکہ اس کا علم اس قدر وسیع اور محیط ہے کہ آسمان و زمین میں کوئی موجود بھی ایسا پنہاں اور مخفی نہیں ہے جو (علم پروردگار کی) کتاب مبین میں درج نہ ہو

---

[1] "تکن" "کن" (بر وزن "جن") کے مادہ سے ہے اور اس چیز کو کہا جاتا ہے جس میں دوسری اشیاء کو چھپا کر رکھا جاتا ہے اور یہاں پر مراد کفار کے اسرار، افکار اور سازشیں ہیں جنھیں وہ دل میں چھپا کر رکھتے ہیں ۔

Marfat.com

(وما من غائبۃ فی السماء والارض الا فی کتاب مبین)[۱]

ظاہر سی بات ہے کہ " غائبۃ " کا ایک وسیع معنی ہے جو بھی ہماری حس سے مخفی ہے وہ اس کے دائرے میں آجاتا ہے خواہ وہ بندوں کے مخفی اعمال ہوں یا ان کی باطنی نیتیں ، خواہ وہ آسمان و زمین کے مخفی اسرار ہوں یا قیامت کا برپا ہونا اور عذاب کے نزول کا زمانہ وغیرہ ، اور اگر ہم غائبۃ کی مذکورہ امور میں سے کسی ایک سے تفسیر کریں گے تو یہ بلا دلیل ہو گی ۔

" کتاب مبین " سے مراد لوحِ محفوظ ہے۔ یہ خداوندِ عالم کے لامحدود علم کا دوسرا نام ہے جس کی تفصیل تفسیر نمونہ کی پانچویں جلد (سورہ انعام کی آیت ۵۹ کی تفسیر) میں گزر چکی ہے ۔

ایک نکتہ

آیاتِ بالا میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاد کے منکر لوگ قیامت پر ایمان لانے اور اس ایمان کی وجہ سے عائد ہونے والے فرائض سے جان چھڑانے کے لیے تین طرح کے اشکال کیا کرتے تھے ۔

۱۔ خاک ہو جانے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کو وہ بعید سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کے نظریے کے مطابق خاک سرچشمہ حیات نہیں ہو سکتی ۔

۲۔ یہ ایک پرانا عقیدہ ہے کوئی نئی بات اس میں دکھائی نہیں دیتی ۔

۳۔ منکرینِ معاد پر عذاب نازل نہیں ہوتا کیونکہ اگر منکرینِ معاد واقعاً عذاب میں مبتلا ہوں گے تو پھر یہ ان پر کیوں نازل نہیں ہوتا ۔

قرآن مجید نے پہلے اور دوسرے سوال کا جواب تو اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ یہ بالکل واضح ہے ۔ کیونکہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں کہ مٹی زندگی کا سرچشمہ بنتی ہے کیونکہ خود ہم بھی پہلے مٹی تھے پھر ہم نے ایک زندہ موجود کی صورت اختیار کر لی ۔

نیز کسی چیز کا قدیمی ہونا اس کی اہمیت کو ہرگز کم نہیں کر دیتا ، کیونکہ اس کائنات کے اصلی اور بنیادی قوانین ازل سے ابد تک ثابت ، اٹل اور برقرار ہیں ۔ اصول فلسفہ ہوں یا مسائل ریاضی اور دوسرے علوم، ان میں سے اکثر بیشتر اٹل اور ناقابلِ انکار ہیں ۔

مثلاً کیا اجتماعِ نقیضین کا محال ہونا یا فیثا غورث کا جدول ضرب اپنے قدیمی ہونے کی وجہ سے قابلِ قبول نہیں

۱۔ " غائبۃ " ایک صفت ہے اور بعض مفسرین کے نظریہ کے مطابق اس میں " تاء " تانیث کی نہیں ہے بلکہ مبالغہ کے لیے ہے اور یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے جو بہت زیادہ مخفی اور پوشیدہ ہیں ۔ لیکن اس کے ساتھ ایک یہ احتمال بھی ہے کہ شاید " تاء " تانیث کی ہو اور اس کا موصوف یا تو لفظ " اشیاء " ہے اور یا " خصلت " وغیرہ ہو کہ محذوف ہے ۔

Marfat.com

ہوں گے؟

یا اگر ہم دیکھتے ہیں کہ عدالت اچھی چیز ہے اور ظلم بری چیز اور ان کی یہ اچھائی اور برائی ہمیشہ سے چلی آرہی ہے اور ہمیشہ تک رہے گی تو کیا یہ ان کے باطل ہونے کی دلیل ہے؟ بلکہ اصولی طور پر تو کسی چیز کا قدیم ہونا اس کی اصالت پر دلالت کرتا ہے۔

تیسرے اعتراض کا یوں جواب دیا گیا ہے کہ نزولِ عذاب کے بارے میں عجلت سے کام نہ لو یہ تو خدا کی مہربانی ہے کہ تمھیں جلد عذاب نہیں دیتا تاکہ تمھیں کچھ مہلت مل جائے اور سمجھ جاؤ لیکن یہ بات ضرور ذہن نشین کر لو "کہ عذابِ الٰہی اگرچہ دیر سے آئے لیکن آئے گا ضرور"۔

Marfat.com

۷۶۔ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○
۷۷۔ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ○
۷۸۔ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ○
۷۹۔ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ○
۸۰۔ اِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا
وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ ○
۸۱۔ وَمَآ اَنْتَ بِهٰدِي الْعُمْيِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ ۭ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ
يُّؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○

ترجمہ

۷۶۔ یہ قرآن بنی اسرائیل کے لیے ان اکثر چیزوں کو بیان کرتا ہے جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

۷۷۔ اور مومنین کے لیے یہ ہدایت و رحمت ہے۔

۷۸۔ بے شک تمھارا پروردگار قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کردے گا اور وہ قادر و علیم ہے۔

۷۹۔ پس تم خدا پر توکل کرو کیونکہ تم واضح حق پر ہو۔

۸۰۔ تم نہ تو اپنی باتیں مُردوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو اور نہ ہی ان بہروں کو بلا سکتے ہو جب وہ منہ پھیر کر پیچھے کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

۸۱۔ اور نہ ہی تم اندھوں کو گمراہی سے نجات دلا سکتے ہو تم تو فقط ان لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لانے کے لیے تیار ہوں اور حق کے سامنے جُھک جائیں۔

Marfat.com

تفسیر

اندھے اور بہرے آپ کی بات نہیں مانیں گے

گزشتہ آیات میں مبداء اور معاد کی بات ہورہی تھی اور زیر نظر آیات میں نبوت اور قرآن کی حقانیت کو بیان کرنے کے بعد اس گفتگو کو مکمل کردیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ گزشتہ آیات میں خداوندِ عالم کے غیر محدود اور لاتناہی علم کی بات ہورہی تھی اور زیر نظر آیات میں اس کی مزید تفصیل بیان ہوئی ہے۔

پھر یہ کہ گزشتہ آیات میں روئے سخن مشرکین کی طرف تھا جبکہ ان آیات میں دوسرے کفار مثلاً یہود اور ان کے درمیان اختلافات کی بات ہورہی ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: یہ قرآن بنی اسرائیل کے لیے اکثر ان چیزوں کو بیان کرتا ہے جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے (ان ھٰذا القراٰن یقص علی بنی اسرائیل اکثر الذی ھم فیہ یختلفون)۔

بنی اسرائیل کا آپس میں بہت سے مسائل میں اختلاف تھا۔ جناب مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا اختلاف تھا، جس پیغمبر کے بارے میں تورات میں خوشخبری دی جاچکی تھی اس میں ان کا اختلاف تھا کہ وہ کون پیغمبر ہے اور اسی طرح بہت سے دینی اور مذہبی احکام میں ان کے اختلافات تھے قرآن نے آکر اس سلسلے میں حق مطلب ادا کردیا اور فرمایا:

مسیح نے صریح الفاظ میں اپنا تعارف یوں کروایا کہ میں خدا کا بندہ ہوں اسی نے مجھے (آسمانی) کتاب عطا کی ہے اور مجھے پیغمبر بنایا ہے قال انی عبد اللّٰہ اٰتانی الکتاب وجعلنی نبیًّا (مریم ۳۰)

اور قرآن نے اس بات کی بھی وضاحت کردی کہ جناب عیسیٰ علیہ السلام صرف باپ کے بغیر پیدا ہوگئے ہیں اور یہ بات خدا کے لیے محال نہیں ہے کیونکہ اس نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر آدم کو خلق فرمایا ہے:

ان مثل عیسٰی عند اللّٰہ کمثل اٰدم خلقہ من تراب

(آل عمران / ۵۹)

جس پیغمبر کی نشانیاں تورات میں بتائی گئی تھیں وہ سب کی سب پیغمبر اسلامؐ پر منطبق بتائیں کیونکہ آپ کے علاوہ کسی اور پر صادق نہیں آتیں۔

بہرحال قرآن مجید کے دیگر فرائض کے علاوہ ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ ان اختلافات کا ڈٹ کر مقابلہ کرے اور اپنا صحیح فیصلہ سنائے جو خرافات، انبیاء کی تعلیمات کے حقائق کے ساتھ مل جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں اور یہ ہر نبی اور رسول کا فرض بنتا ہے کہ تحریفات اور باطل کے حق کے ساتھ گڈمڈ ہوجانے کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہوں ان کا خاتمہ کرے اور لوگوں کو صحیح راہ کی طرف راہنمائی کرے۔ چونکہ یہ کام دور جہالت میں رہنے والے اور کسی کے آگے زانوئے تلمذ نہ کرنے والے

Marfat.com

شخص سے انجام پا رہا ہے لہذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس شخص کا نہیں بلکہ خداوند عالم ہی کا کام ہے۔

نیز ہر قسم کے اختلافات کا نتیجہ ہدایت و رحمت کا سبب ہوتا ہے لہذا بعد والی آیت میں ایک قاعدہ کلیہ کی صورت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اس میں قطعاً کوئی شک نہیں کہ قرآن مومنین کے لیے ہدایت و رحمت ہے (و انہ لھدی و رحمۃ للمؤمنین)۔

ہدایت و رحمت اس لحاظ سے ہے کہ اختلافات کو دور کرتا اور خرافات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔

ہدایت اور رحمت اس لحاظ سے ہے کہ اس کی عظمت کی دلیل اس کے عظیم مطالب میں مضمر ہے۔

ہدایت اور رحمت ہے اس لحاظ سے کہ صحیح راہ کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور راہ پر چلنے کے انداز بھی بتاتا ہے۔

اور "مومنین" کا اس مقام پر خصوصی ذکر اس لیے ہے (جیسا کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں) کہ جب تک انسان کے اندر حق کی قبولیت اور پروردگارِ عالم کے سامنے سر جھکا دینے کی آمادگی نہیں پائی جائے گی اس وقت تک وہ اس منبع فیضِ الٰہی سے کماحقہ بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

بنی اسرائیل کے کچھ گروہ قرآنِ مجید کی طرف سے حقائق بیان ہونے کے باوجود اپنی ضد پر قائم رہے اور انھوں نے حقائق تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے، تمھارا پروردگار ان کے درمیان اپنا فیصلہ کرے گا اور وہی غالب اور عالم ہے (ان ربك يقضي بينهم بحكمه وهو العزيز العليم)۔

اگرچہ مندرجہ بالا آیت میں اس بات کی توصراحت نہیں کی گئی کہ آخری فیصلہ بروز قیامت سنایا جائے گا لیکن دو دوسری آیات کے قرینے کی رو سے جن میں بنی اسرائیل کے اختلافات اور خداوندِ عالم کے فیصلے کا واضح طور پر ذکر ہے، زیر نظر آیت میں بھی یہی چیز مقصود ہے۔

سورۂ جاثیہ کی آیت ۱۷ میں ہے:

ان ربك يقضي بينهم يوم القيامة فيما كانوا فيه يختلفون

تمھارا پروردگار قیامت کے دن ان لوگوں کے درمیان ان چیزوں میں فیصلہ کرے گا جن کے بارے میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

اسی قسم کا مفہوم سورۂ یونس کی آیت ۹۳ میں بھی آیا ہے۔

یہاں پر خداوند عالم کی دو اوصاف کے ساتھ توصیف کی گئی ہے ایک "عزیز" اور دوسرے "علیم" اور یہ ان دو اوصاف کی طرف اشارہ ہے جو کسی قاضی میں ضرور ہونی چاہئیں۔ ایک تو کافی حد تک علم ہو اور دوسرے فیصلے پر عمل درآمد کروانے کی طاقت ہو اور خدا میں یہ دونوں صفات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ کیونکہ وہ سب سے زیادہ آگاہ اور سب سے زیادہ قدرت مند ہے۔

چونکہ یہ الفاظ قرآنِ مجید کی عظمت بیان کرنے اور بنی اسرائیل کو متنبہ کرنے کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسکین اور قلبی سکون کا سبب بھی ہیں لہذا بعد والی آیت میں فرمایا گیا ہے: بنا بریں خدا پر بھروسہ کرو۔

Marfat.com

(فتوکل علی اللہ) ۔

اس خدا پر بھروسہ کرو جو غالب اور ناقابلِ تسخیر ہے اور دنیا کی ہر چیز سے آگاہ ہے ۔ اس خدا پر بھروسہ کرو جس نے اس قدر باعظمت قرآن تمھیں عطا فرمایا ہے ۔

اس پر توکل کرو اور ان لوگوں کی مخالفت سے نہ گھبراؤ کیونکہ تم واضح حق پر ہو (انك علی الحق المبین) ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن واضح طور پر حق ہے تو پھر یہ لوگ اس کی اس حد تک مخالفت کیوں کرتے ہیں ؟ بعد والی آیات درحقیقت اس سوال کا جواب دے رہی ہیں کہ :

اگر وہ حق مبین کو قبول نہیں کرتے اور تمھاری گرما دینے والی باتیں ان کے سرد دلوں پر اثر نہیں کرتیں تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کیونکہ تم مُردوں کے کانوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے (انك لا تسمع الموتی)[۱]

میرے پیغمبر ! تمھارے مخاطب تو زندہ لوگ ہیں ، جن میں زندہ ، بیدار اور حق طلب روح پائی جاتی ہے نہ کہ زندہ نما مردہ لوگ کہ تعصب ، ضد اور گناہوں پر اصرار نے ان سے ان کی سوچ اور فہم و فراست کو سلب کر لیا ہے ۔

حتیٰ کہ ان لوگوں تک بھی تم اپنی آواز نہیں پہنچا سکتے جو زندہ تو ہیں لیکن بہرے ہیں خاص طور پر جب وہ تم سے پشت پھیر لیں اور تم سے دُور ہو جائیں (ولا تسمع الصم الدعآء اذا ولوا مدبرین) ۔

اگر وہ تمھارے قریب ہوتے پھر تو ممکن تھا کہ تم اپنا منہ ان کے کانوں کے نزدیک لے جا کر بلند آواز سے ان تک حق کی آواز پہنچاتے اور شاید ان کے بہرے کان کچھ نہ کچھ سن لیتے ۔ لیکن وہ تو ایسے بہرے ہیں جو تم سے روز بروز دور بھاگتے نظر آتے ہیں ۔

پھر بھی اگر سننے والے کانوں کی بجائے ان کی دیکھنے والی آنکھیں ہی ہوتیں ۔ اگرچہ ان کے کانوں تک کسی قسم کی آواز نہ پہنچتی ، لیکن ممکن تھا کہ علامتوں اور اشاروں سے ہی صراطِ مستقیم تلاش کر لیتے لیکن افسوس کہ وہ نابینا بھی ہیں " اور تم نابیناؤں کو ان کی گمراہی سے نہ باز رکھ سکتے ہو نہ انھیں ہدایت کر سکتے ہو " (و ما انت بهادی العمی عن ضلالتهم) ۔

" تم تو صرف اپنی حق باتیں ان لوگوں کے کانوں تک پہنچا سکتے ہو جو ہماری آیات پر ایمان لے آتے ہیں اور حق کے آگے سر جھکانے کی روح اپنے اندر رکھتے ہیں " (ان تسمع الا من یؤمن بایاتنا فهم مسلمون) ۔

درحقیقت مندرجہ بالا دونوں آیات انسان کی بیرونی دنیا سے شناخت کے عوامل اور اس کے اس جہان سے مربوط ہونے کے طریقوں کا ایک واضح مجموعہ ہیں ۔

دل کے مُردہ ہو جانے کے مقابلے میں " تشخیص کی حس " اور بیدار عقل ۔

قوتِ سامعہ کے ذریعے حق بات کو قبول کرنے کے لیے " سننے والے کان " ۔

---

[۱] بعض مفسرین نے اس جملے اور بعد والے جملوں کو پیغمبر اکرم کے توکل بر خدا کرنے اور مایوس نہ ہونے کی دلیل مانا ہے جب کہ ظاہری طور پر یہ اس سوال کا جواب ہے جو قرآن کے " حق مبین " ہونے کے بارے میں ہوا ہے ۔

Marfat.com

قوتِ باصرہ کے ذریعہ حق و باطل کے چہروں کو دیکھنے کے لیے " دیکھنے والی آنکھ "۔
لیکن ان کی ہٹ دھرمی، ضد اور اندھی تقلید اور ارتکاب گناہ نے ان کی حقیقت بین آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا بلکہ ان کی عقل و دل کو بے کار کر کے رکھ دیا ہے، اگر اس قسم کے لوگوں کو تمام انبیاء، اولیاء اور فرشتے بھی مل کر ہدایت کریں پھر بھی وہ ہدایت حاصل نہیں کریں گے، کیونکہ ان کا اپنے وجود کی بیرونی دنیا سے رابطہ بالکل منقطع ہو چکا ہوتا ہے اور وہ صرف اپنے من کی دنیا میں ہی ڈوب چکے ہوتے ہیں۔
اس قسم کا مفہوم سورۂ بقرہ، سورہ رُوم اور قرآن مجید کی کئی اور سورتوں میں بھی ملتا ہے اور ہم نے "شناخت کے آلات کی نعمت" کی اہمیت کے بارے میں تفسیر نمونہ جلد ۱۱ میں سورہ نحل کی آیت ۸، کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔
ایک مرتبہ پھر ہم اس بات کی وضاحت کرتے چلیں کہ ایمان اور تسلیم کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان دینی حقائق کو پہلے سے قبول کر چکا ہو کیونکہ اس سے تحصیل حاصل لازم آئے گی بلکہ مقصد یہ ہے کہ جب تک انسان کے اندر فرمانِ خدا کے آگے خضوع اور حق طلبی کی روح پیدا نہیں ہوگی اس وقت تک وہ انبیاء کی باتوں پر کان نہیں دھرے گا۔

چند ایک نکات

۱۔ **توکّل کے اسباب:** "توکل"، "وکالت" کے مادہ سے ہے، قرآنی منطق کی رُو سے خدا کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرنے، اسے اپنا ولی اور وکیل بنانے اور ہزاروں قسم کی مشکلات اور رکاوٹوں سے نہ گھبرانے کے معنی میں ہے۔ یہ ایمان کی ایک اہم ترین نشانی اور مشکلات سے نبرد آزمائی میں کامیابی کے حصول کے لیے اہم ترین عوامل میں سے ہے۔
دلچسپ بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا آیات میں توکّل کی دلیل دو چیزیں بیان کی گئی ہیں:
ایک تو قدرت اور علم و آگاہی کہ جس کی وجہ سے انسان خدا پر اعتماد کرتا ہے اور دوسری اس راہ کا روشن ہونا ہے جسے انسان نے اختیار کیا ہے۔
درحقیقت وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ آپ کو گھبرانے اور خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کی امیدوں کا سہارا اور آپ کی آرزوؤں کا مرکز وہ خدا ہے جو عزیز اور ناقابلِ تسخیر بھی ہے اور علیم و آگاہ بھی ہے نیز آپ بھی حقِ مبین کی راہ پر گامزن ہیں جو شخص حقِ مبین کا دفاع کر رہا ہو اسے کیوں گھبرانا اور خوف کھانا چاہیے۔
اگر آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ کچھ لوگ آپ کے مخالف ہیں تو آپ کو اس چیز کی ہرگز پرواہ نہیں کرنا چاہیے نہ تو ان کی آنکھیں بینا ہیں نہ کان سنتے ہیں اور نہ ہی قلوب زندہ ہیں بلکہ اصولی طور پر وہ تو آپ کے حلقۂ تبلیغ سے ہی خارج ہیں۔ صرف حق طلب، خدا کے عاشق اور عدالت کے پیاسے ہی آپ کے قرآنی چشمۂ آبِ زلال کی طرف لپک کر آئیں گے تاکہ اس سے سیراب ہو سکیں۔
۲۔ **موت اور حیات قرآن کی رُو سے:** بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو مختلف زاویۂ فکر سے اپنے لیے مختلف معانی پیدا کر لیتے ہیں جن میں "موت" اور "حیات" کے الفاظ بھی ہیں جنھیں اگر مادّی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ان کا صرف طبیعیاتی (Physical) معنی ہی ہوگا یعنی جب تک دل کام کرتا رہے، اعضاءِ بدن میں خون کی گردش جاری رہے

Marfat.com

جسم میں حس وحرکت اور جاذبہ و دافعہ کا سلسلہ جاری رہے تو کہا جاتا ہے کہ انسان زندہ ہے لیکن جب یہ سلسلہ رُک جائے تو اس کی موت کی قطعی دلیل بن جاتا ہے اور اس امر کا پتہ اچھی طرح دیکھ بھال کے ذریعے تھوڑی سی دیر میں لگایا جاسکتا ہے۔

لیکن قرآنی منطق کی رُو سے بہت سے ایسے افراد ہیں جو طبیعیاتی طور پر تو زندہ ہیں لیکن ان کا شمار مُردوں میں ہوتا ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی طرف آیات زیرِ بحث میں اشارہ کیا جاچکا ہے اور اس کے برعکس کچھ افراد وہ بھی ہیں جو ظاہراً تو مردہ ہیں لیکن درحقیقت زندہ جاوید ہیں جیسے شہداء راہِ خدا۔

ان مختلف نظریات کا سبب یہ ہے کہ اسلام نے جہاں انسانی زندگی اور اس کی شخصیت کا معیار اس کی روحانی اقدار میں منحصر کیا ہے وہاں پر وجود کے فائدہ مند ہونے کو حیات اور بے فائدہ ہونے کو عدمِ حیات پر محمول کیا ہے۔

جو شخص ظاہری طور پر زندہ ہے لیکن وہ نفسیاتی خواہشات میں اس قدر مگن ہوچکا ہے کہ نہ تو کسی مظلوم کی فریاد سنتا ہے نہ ہی منادیٔ حق کی آواز سنتا ہے نہ کسی بے نوا کا چہرہ دیکھتا ہے اور نہ ہی عالمِ وجود میں پروردگار کی عظمت کے نشانات پر نظر کرتا ہے حتیٰ کہ اپنے ماضی اور مستقبل پر ایک لحظے کے لیے نہیں سوچ سکتا تو قرآنی منطق کی رُو سے ایسا شخص مُردہ ہے لیکن جو لوگ اپنے مرنے کے بعد بھی ایسے آثار چھوڑ گئے ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے افکار اور بتائے ہوئے راستے دنیا والوں کے لیے اسوہ، نمونہ اور راہنما اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں تو ایسے لوگ زندہ جاوید ہیں [۱]

ان سب سے ہٹ کر بھی ہمارے پاس بہت سے ایسے ثبوت ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسانوں کی برزخی زندگی کو تسلیم کرتا ہے اور تعجب تو ان بعض بے خبر "وہابیوں" پر ہوتا ہے جو پیغمبر اسلام کی ذات تک کے لیے بھی حیات بعد از موت کے قائل نہیں ہیں یعنی انھیں بھی مُردہ تسلیم کرتے ہیں اور آپ کو وسیلہ نہ ماننے کے لیے ان کی ایک دلیل یہی ہے کہ مُردوں کو وسیلہ نہیں بنایا جاسکتا وہ کہتے ہیں کہ وہ تو مر چکے ہیں اور مُردے کوئی بھی کام نہیں کرسکتے۔ اس سے بڑھ کر قابلِ تعجب بات یہ ہے کہ وہ اپنے مدعا پر زیرِ نظر آیات سے استدلال کرتے ہیں۔

جبکہ بعض دوسرے وہابیوں نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک طرح کی برزخی زندگی ہے یہ زندگی حیاتِ شہداء سے بھی بڑھ کر ہے جس کے بارے میں قرآن نے تصریح کردی ہے حتیٰ کہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ آنحضرتؐ ان لوگوں کے سلام کو بھی سنتے ہیں جو آپ پر سلام بھیجتے ہیں [۲]

شیعہ اور سنی کتابوں میں اس بارے میں بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جو بتاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اور حضرات آئمہ اطہار علیہم السلام) ان لوگوں کا سلام سُن لیتے ہیں جو ان پر دور یا نزدیک سے بھیجتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں حتیٰ کہ اُمت کے اعمال بھی ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں [۳]

---

[۱] روحانی زندگی اور موت کے بارے میں ہم تفسیر نمونہ جلد ۷، سورہ انفال کی آیت ۲۴ میں تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں۔

[۲] محمد بن عبدالوہاب کے رسائل "الہدیۃ السنیۃ" میں سے دوسرا رسالہ ص ۴۱۔

[۳] مزید تفصیل کے لیے سید محسن امین عاملی کی کتاب "کشف الارتیاب" ص ۱۰۹ کا مطالعہ کیجیے۔

Marfat.com

جنگ بدر کے بارے میں صحیح بخاری میں ایک حدیث یوں مرقوم ہے :

کفار کی شکست اور جنگ کے خاتمے کے بعد رسول اللہؐ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ اس کنوئیں کے پاس پہنچے جہاں مشرکین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں آپ نے انھیں نام لے لے کر پکارا اور فرمایا "کیا بہتر نہیں تھا کہ تم خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ؟ جو وعدہ ہم سے خدا نے کیا تھا اسے تو ہم نے پا لیا ہے کیا تم نے بھی اپنے پروردگار کے وعدہ کو پالیا ہے" ۔ اس موقع پر جب حضرت عمر نے کہا یا رسول اللہؐ ! آپ ایسے جسموں سے ہم کلام ہیں جن میں روح نہیں ہے ، تو آنحضرتؐ نے فرمایا :

والذی نفس محمد بیدہ ما انتم باسمع لما اقول منہم

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمدؐ کی جان ہے جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم ان سے زیادہ نہیں سن سکتے ہو۔[1]

جنگ جمل کے واقعات میں ہے کہ اصحاب جمل کی شکست کے بعد حضرت علی مقتولین کے درمیان سے گزر رہے تھے جب قاضی بصرہ کعب بن سور کی نعش کے پاس پہنچے تو فرمایا اسے بٹھا دیا جائے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا پھر آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا :

کعب ! وائے ہو تم پر ، تمھارے پاس علم کا خزانہ تو تھا لیکن اس نے تمھیں ذرہ بھر فائدہ نہ پہنچایا اور شیطان نے تجھے گمراہ کر کے جہنم بھیج دیا۔[2]

نہج البلاغہ میں ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام جنگ صفین سے کوفہ واپس لوٹ رہے تھے تو شہر کوفہ کی دیوار کے اس طرف ایک قبرستان تھا ، آپ قبرستان کے قریب پہنچے تو مُردوں سے مخاطب ہو کر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے سلسلے میں ارشاد فرمایا :

یہ تو ہمارے ہاں کی خبر تھی ، تمھارے ہاں کی کیا خبر ہے ؟

پھر آپؑ نے خود ہی ارشاد فرمایا :

اما لو اذن لھم فی الکلام لاخبر وکم ان خیر الزاد التقوٰی

اگر انھیں بات کرنے کی اجازت دی جائے تو بتائیں کہ آخرت کا بہترین توشہ اور زادِ راہ تقویٰ ہے ۔

اور یہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مُردے بھی باتیں سنتے ہیں اور باتوں کا جواب بھی دے سکتے ہیں لیکن انھیں بولنے کی اجازت نہیں ہے۔[3]

یہ سب تعبیرات انسان کی برزخی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۵ ص ۹۷ (باب قتل ابوجہل) ۔

[2] شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید جلد ۱ ص ۲۴۸ ۔

[3] نہج البلاغہ کلمات قصار جملہ ۱۳۰ ۔

Marfat.com

۸۲۔ وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ ○

۸۳۔ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ ○

۸۴۔ حَتّٰٓى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّاذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۸۵۔ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ ○

ترجمہ

۸۲۔ اور جب ان پر عذاب کا حکم آ پہنچے گا (اور وہ قیامت کے کنارے پہنچ جائیں گے) تو ہم ایک چلنے والا زمین سے نکالیں گے کہ جو ان سے گفتگو کرے گا اور کہے گا کہ لوگ ہماری آیات پر ایمان نہیں لاتے۔

۸۳۔ اس دن کا سوچو جب ہم ہر اُمت سے ایک ایسے گروہ کو محشور کریں گے جو ہماری آیات کو جھٹلایا کرتے تھے اور انھیں روکے رکھیں گے یہاں تک کہ وہ ایک دوسرے سے آملیں گے۔

۸۴۔ یہاں تک (کہ جب وہ حساب کے لیے) پیش ہوں گے تو ان سے کہے گا کہ کیا تم نے میری آیات کو جھٹلایا ہے اور تحقیق سے کام نہیں لیا؟ تم کیا اعمال انجام دیتے رہے ہو؟

۸۵۔ تو اس وقت ان پر ان کے کردہ ظلم کی وجہ سے عذاب آجائے گا اور وہ کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔

تفسیر

گزشتہ آیات میں عذاب اور قیامت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں کفار کی جلد بازی کا ذکر تھا اور وہ بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کیا کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کرتے تھے کہ جس عذاب کا آپ وعدہ کیا کرتے ہیں وہ ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا؟ قیامت کیوں نہیں برپا ہوتی؟ زیر نظر آیات میں ایسے چند واقعات کی طرف اشارہ ہے جو قیامت کے قریب واقع ہوں گے نیز ہٹ دھرم منکرین کا دردناک انجام بیان کیا گیا ہے۔

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے: جب عذاب کا حکم آپہنچے گا اور وہ قیامت کے کنارے پہنچ جائیں گے تو ہم ان کے لیے زمین سے ایک چلنے والا ظاہر کریں گے جو ان سے باتیں کرے گا اور وہ کہے گا کہ لوگ خدا کی آیات پر ایمان نہیں لاتے (و اذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دآبۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بآیاتنا لا یوقنون)۔

"وقع القول علیھم" سے مراد یا تو خدا کا فرمان اور وہ عذاب ہے جس کا ان لوگوں سے وعدہ کیا گیا ہے یا پھر قیامت کا قیام اور اس کی علامتوں کا ظہور ہے ایسی علامات جن کو دیکھ کر ہر شخص سرِ تسلیم خم کر لے گا اور اسے یقین آجائے گا کہ خدائی وعدے برحق تھے اور قیامت بالکل قریب ہے تو اس وقت توبہ کے دروازے بند ہو جائیں گے کیونکہ ان حالات میں ایمان لانا ایک اضطراری عمل ہوگا۔

البتہ یہ دونوں معانی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں کیونکہ قربِ قیامت اور گنہ گاروں پر عذاب دونوں اکٹھے ہوں گے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "دآبۃ الارض" کیا ہے اور کون ہے؟ اس کا کیا کام ہوگا؟ قرآن نے اسے مجمل صورت میں ذکر کیا ہے اور گویا اجمال کی صورت میں ہی اس سے گزرنا چاہتا ہے بعض اوقات بعض باتیں اس وقت موثر ہوتی ہیں جب کسی ہولناک بات کو در پردہ بیان کیا جائے۔

قرآن صرف یہ کہتا ہے کہ وہ ایک متحرک اور چلنے والا ہے، خداوندِ عالم اسے قیامت کے قریب زمین سے ظاہر کر دے گا وہ لوگوں سے باتیں کرے گا اور کہے گا کہ لوگ آیاتِ خدا پر ایمان نہیں لاتے۔

دوسرے لفظوں میں اس کا کام مختلف لوگوں میں ایسی تمیز کرنا ہے کہ منکر اور منافق لوگ خالص مومنین سے الگ ہو جائیں۔

ظاہر ہے کہ منکر لوگ یہ کیفیت دیکھ کر ٹھٹک جائیں گے اور اپنے تاریک ماضی پر پشیمان ہوں گے لیکن کیا فائدہ، جب توبہ کے دروازے ہی بند ہو چکے ہوں گے۔

"دآبۃ الارض" کی تفصیلات، صفات اور خصوصیات کے بارے میں متعدد روایات موجود ہیں شیعہ اور سُنی حضرات کی تفسیر اور حدیث کی کتابوں میں بہت کچھ بیان ہوا ہے اس پر ہم انشاء اللہ نکات کی بحث میں تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

پھر قیامت کی ایک اور علامت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: اس دن کا سوچو کہ جب ہم ہر اُمت میں سے ان لوگوں کے گروہ محشور کریں گے جو ہماری نشانیوں کو جھٹلایا کرتے تھے اور انھیں روکے رکھیں گے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں (ویوم نحشر من کل امۃ فوجا ممن یکذب بآیاتنا فھم یوزعون)۔

"حشر" کا معنی کسی گروہ کو اس کے اپنے ٹھکانے سے نکال کر میدان (جنگ) وغیرہ کی طرف حرکت دینا ہے۔

جیسا کہ راغب نے "مفردات" میں بتایا ہے "فوج" کا معنی ہے ایسا گروہ جو جلدی جلدی چلتا ہے۔

"یوزعون" کا معنی ہے افراد کی بہت بڑی تعداد کو روکے رکھنا تاکہ دوسرے تمام گروہ بھی ان سے آملیں۔ یہ لفظ عموماً افراد کی بہت بڑی اور کثیر تعداد کے لیے بولا جاتا ہے جیسا کہ اسی سورت میں ہم حضرت سلیمانؑ کے لشکر کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔

Marfat.com

بنا بریں مجموعی طور پر آیت سے یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ خداوندِ عالم ہر قوم سے ایک ایک گروہ کو محشور کرے گا اور انھیں اپنے کیے کی سزا کے لیے حاضر کرے گا۔

بعض بزرگ مفسرین اس آیت کو مسئلہ رجعت اور قیامت سے نزدیک نیک اور بد لوگوں کے گروہوں کو اسی دنیا میں پھر لوٹ آنے کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں کیونکہ اگر اس سے قیامت کی طرف اشارہ ہو تو پھر "من کل امة فوجًا" (ہر قوم سے ایک گروہ) کی تعبیر صحیح نہیں ہوگی وہ اس لیے کہ قیامت میں تو سب کے سب لوگ جی اٹھیں گے جیسا کہ خود قرآن مجید سورۂ کہف کی آیت ۴۷ میں کہتا ہے:

وحشرناهم فلم نغادر منهم احدًا

ہم ان سب کو محشور کریں گے اور کسی ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

اس کا ایک اور شاہد اسی آیت سے پہلے والی آیت ہے جس میں اس دنیا کے خاتمے پر قیامت کی نشانیاں بتائی گئی ہیں اور بعد کی آیات میں بھی اسی موضوع کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بنا بریں یہ بات معلوم بعید ہوتی ہے کہ قبل اور بعد والی آیت تو قیامت سے پہلے واقع ہونے والی چیزوں کے بارے میں گفتگو کریں اور درمیانی آیت خود قیامت کے بارے میں۔ آیات کی ہم آہنگی اس بات کی متقاضی ہے کہ تمام آیات قبل از قیامت کے بارے میں ہوں۔

اس سلسلے میں بہت سی روایات بھی موجود ہیں جنھیں ہم نکات کی گفتگو میں "رجعت" کی تفسیر کے ضمن میں بیان کریں گے۔

البتہ مفسرین اہلسنت عام طور پر اس آیت کو قیامت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور لفظ "فوج" کو ہر گروہ اور قوم کے سرداروں کی طرف اشارہ قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں آیات کی عدم موافقت اور ناہم آہنگی کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ وہ تاخیر اور تقدیم کے حکم میں ہیں گویا آیت ۸۲ آیت ۸۵ کے بعد قرار پاتی ہے۔

لیکن معلوم ہے کہ ایک تو لفظ فوج کی تفسیر اس معنی میں خلافِ ظاہر ہے اور دوسرے آیات کی تاخیر اور تقدیم کے ساتھ بھی یہ تفسیر خلافِ ظاہر ہے۔

انجامِ کار اس گروہ کو احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے گا اور اللہ ان سے کہے گا کہ تم نے میری آیات کو جھٹلایا، جبکہ اس سے تم آگاہ بھی نہیں تھے اور تم نے تحقیق سے بھی کام نہیں لیا" (حتّٰی اذا جاءو قال اکذبتم بایاتی ولم تحیطوا بها علمًا)۔

"اور تم کیا کام کیا کرتے تھے" (اما ذا کنتم تعملون[1])۔

---

[1] "اما ذا کنتم تعملون" جملہ استفہامیہ ہے اور "اما" مرکب ہے "ام" اور "ما" سے جبکہ "ام" حرفِ عطف ہے اور عموماً ہمزہ استفہام کے بعد دو چیزوں کی برابری کے لیے آتا ہے اور "ما" استفہامیہ ہے اور اس کا مجموعی طور پر یہ معنی بنے گا "او ای شیء کنتم تعملونه"۔

Marfat.com

یہ بات کہنے والا خداوند عالم ہے اور آیات سے مراد انبیاء علیہم السلام کے معجزات یا فرامین الٰہی ہیں یا یہ سب۔

"ولم تحیطوا بھا علمًا" سے مراد یہ ہے کہ تم کسی قسم کی تحقیق کیے بغیر اور حقیقت امر سے آگاہی حاصل کیے بغیر جھٹلانے لگ گئے تھے اور جہالت اور نادانی کی یہ انتہا ہے کہ انسان کسی قسم کی تحقیق کیے بغیر اور معلومات حاصل کیے بغیر کسی چیز کو جھٹلانے لگ جائے۔

درحقیقت ان سے ایک سوال تو یہ ہوگا کہ بغیر تحقیق اور معلومات حاصل کیے بغیر حقائق کو کیوں جھٹلایا؟ اور دوسرا سوال ان کے دیگر اعمال کے بارے میں ہوگا۔

اگر مندرجہ بالا آیت روزِ قیامت اور معاد کے بارے میں ہو تو اس کا مفہوم واضح ہے لیکن اگر مسئلہ رجعت کی طرف اشارہ ہو جیسا کہ آیات کی ہم آہنگی کا تقاضا ہے تو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہوگا کہ اس دنیا میں کچھ بدکار لوگوں کی رجعت کے وقت خدا کا نمائندہ اور ولیِ امر ان سے بازپرس کرے گا پھر اسے ان کے کیے کی دنیاوی سزا دے گا اور اس سزا کا یہ مطلب نہیں کہ انھیں آخرت کا عذاب نہیں ہوگا۔ جیسا کہ بہت سے مجرم لوگوں پر اس دنیا میں شرعی حدود جاری کی جاتی ہیں لیکن توبہ کرنے کی صورت میں انھیں آخرت میں بھی سزا ضرور ملے گی۔

ظاہر ہے کہ ان مجرمین کے پاس ان دو سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا لہٰذا زیرِ تفسیر آیات کے سلسلے کی آخری آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ان کے بارے میں عذابِ الٰہی کا حکم جاری ہوگا اور ان کے پاس کرنے کی کوئی بات نہیں ہوگی (ووقع القول علیھم بما ظلموا فھم لا ینطقون)۔

اگر اس آیت کو رجعت کے معنی میں لیں تو یہ عذاب، دنیاوی عذاب ہوگا اور اگر آیت کو قیامت کے معنی میں لیں تو یہ عذاب آخرت کا عذاب ہوگا۔

چند ایک نکات

۱۔ "دابۃ الارض" سے کیا مراد ہے؟ "دابۃ" بمعنی "چلنے والا" اور "ارض" کا معنی ہے "زمین"۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا اطلاق صرف غیر انسان پر ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ انسان پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسا کہ سورہ ہود کی چھٹی آیت میں ہے:

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا

زمین میں کوئی بھی چلنے والا ایسا نہیں کہ جس کی روزی خدا کے ذمہ نہ ہو۔

نیز سورۂ نحل کی آیت ۶۱ میں ہے:

ولو یؤاخذ اللہ الناس بظلمھم ما ترک علیھا من دابۃ

اگر خدا لوگوں سے ان کے ظلم کا مواخذہ کرنے لگ جائے تو روئے زمین پر ایک بھی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑے۔

Marfat.com

سورۂ انفال کی آیت ۲۲ میں ہے:

ان شر الدوآب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون

اللہ کے نزدیک چلنے پھرنے والوں میں سے بدترین وہ گونگے اور بہرے افراد ہیں جو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔

لیکن اس کلمے کی تطبیق کے سلسلے میں، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک اجمالی بات کی ہے صرف ایک صفت بیان کی ہے کہ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا، اور بے ایمان افراد کو اجمالاً مشخص کرے گا لیکن اس بارے میں روایات میں اور مفسرین کی گفتگو میں بہت بحث کی گئی ہے جس کا ان دو نکات میں خلاصہ پیش کیا جا سکتا ہے:

۱۔ بعض نے اسے ایک ایسی جاندار مخلوق سمجھا ہے جو عجیب و غریب ہو گی اور انسانوں میں سے بھی نہیں ہو گی اس کے لیے انھوں نے کئی عجیب و غریب باتیں نقل کی ہیں جو خارقِ عادت ہیں اور انبیاء کے معجزات سے مشابہت رکھتی ہیں۔

۲۔ بعض دیگر نے اس سلسلے میں وارد ہونے والی بہت سی روایات کی روشنی میں اس سے مراد ایک انسان لیا ہے، ایک غیر معمولی انسان، ایک متحرک اور فعّال انسان، جس کا ایک اصلی کام ہی مومنین کی صفوں سے منافقین کو جدا کرنا اور ان کی نشاندہی کرنا ہو گا بلکہ بعض روایات سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جناب موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی بھی اس کے پاس ہو گی۔ ہم جانتے ہیں کہ عصائے موسیٰ قدرت اور اعجاز کی علامت ہے اور سلیمانؑ کی انگشتری خدائی حکومت اور تسلط کی نشانی ہے گویا وہ ایک طاقتور اور حقائق واضح کرنے والا انسان ہو گا۔

حذیفہ یمانی سے مروی ہے کہ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "دابۃ الارض" کی ان الفاظ میں تعریف فرمائی ہے:

لا یدرکھا طالب و لا یفوتھا ھارب فتسم المؤمن بین عینیہ، و یکتب بین عینیہ مؤمن، و تسم الکافر بین عینیہ و تکتب بین عینیہ کافر، و معھا عصا موسی وخاتم سلیمان

وہ اس قدر طاقت ور ہو گا کہ کوئی شخص اسے نہیں پا سکے گا اور کوئی شخص اس سے بچ کر نہیں جا سکے گا وہ مومن کی پیشانی پر نشان لگائے گا تو "مومن" لکھا جائے گا اور کافر کی پیشانی کو داغے گا تو "کافر" لکھا جائے گا، اس کے پاس عصائے موسیٰ اور سلیمان کی انگشتری بھی ہو گی۔[1]

متعدد روایات میں یہ علامات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پر صادق آتی ہیں۔

تفسیر علی بن ابراہیم میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے کہ:

ایک شخص نے عمار یاسر سے کہا کہ قرآن مجید میں ایک ایسی آیت ہے جس نے پریشان فکر کر رکھا ہے اور مجھے شک میں ڈال دیا ہے۔ عمار نے کہا: وہ کون سی آیت ہے؟ اس نے کہا کہ یہ آیت ہے

---

[1] تفسیر مجمع البیان، اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم ان الناس کانوا بآیاتنا لا یوقنون ۔ آپ بتائیں کہ یہ "دابۃ الارض" کیا چیز ہے؟

عمار نے کہا: خدا کی قسم! جب تک میں تمھیں وہ "دابۃ الارض" نہ دکھا دوں، زمین پر نہ بیٹھوں گا نہ کھانا کھاؤں گا اور نہ ہی پانی پیوں گا۔

یہ کہہ کر وہ اسے حضرت علی کی خدمت میں لے آئے۔ آپ اس وقت کھانا کھا رہے تھے، جب امام علیہ السلام کی نگاہ عمار پر پڑی تو آپ نے فرمایا: ادھر آؤ، عمار امام کی خدمت میں پہنچے اور بیٹھ کر ان کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔

وہ شخص بہت حیران ہوا اور اس منظر کو بہت غور سے دیکھنے لگا، کیونکہ عمار نے اس سے قسم کھا کر کہا تھا کہ جب تک اپنا وعدہ پورا نہیں کرے گا اس وقت تک وہ کھانا نہیں کھائے گا اس نے خیال کیا کہ شاید عمار نے اپنی قسم فراموش کر دی ہے۔

جب عمار اٹھے اور حضرت امیرؑ سے خدا حافظی کی تو اس شخص نے عمار سے مخاطب ہو کر کہا: حیرت ہے آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ جب تک آپ مجھے " دابۃ الارض " نہیں دکھا پائیں گے اس وقت تک آپ کھانا کھائیں گے نہ پانی پئیں گے اور نہ ہی زمین پر بیٹھیں گے، آپ نے یہ کیا کیا؟

عمار نے کہا:

اریتکھا ان کنت تعقل

اگر تمھیں سمجھ ہوتی تو میں اسے تمھیں دکھا چکا ہوں اور وہ تم دیکھ چکے ہو[1]

اسی طرح کی ایک اور روایت جناب ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی تفسیر عیاشی میں نقل ہوئی ہے[2]

علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار میں معتبر سند کے ساتھ امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک حدیث اس قسم کی نقل کی ہے کہ:

علی مسجد میں سوئے ہوئے تھے کہ پیغمبر خداؐ وہاں تشریف لائے علی کو بیدار کر کے فرمایا:

قم یا دابۃ اللہ

اے دابۃ اللہ اٹھو۔

رسول اللہؐ کے ساتھیوں میں سے کسی نے عرض کی یا رسول اللہ کیا ہمیں بھی یہ حق حاصل ہے کہ ایک دوسرے کو اس نام سے پکاریں تو آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا نہ یہ علی کا خاص نام ہے

---

[1]، [2] مجمع البیان اسی آیت کے ذیل میں۔

Marfat.com

اور یہ وہی " دابة الارض " ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں آیا ہے: "و اذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابة من الارض....."

پھر آپ نے فرمایا: علی! آخری زمانے میں خداوندِ عالم تمھیں بہترین صورت میں زندہ کرے گا اور تمھارے ہاتھ میں ایک ایسی چیز عطا فرمائے گا جس سے تم دشمنوں پر نشان لگاؤ گے[1]

مرحوم ابوالفتوح رازی اپنی تفسیر میں مندرجہ بالا آیت کے ضمن میں فرماتے ہیں:

ان روایات کی رُو سے جو ہمارے علماء کے ذریعے ہم تک پہنچی ہیں " دابة الارض " حضرت امام مہدی علیہ السلام کے لیے کنایہ ہے[2]

اس حدیث کو اور مندرجہ بالا دوسری احادیث کو پیشِ نظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ " دآبة الارض " کا ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر اس عظیم پیشوا پر صادق آتا ہے جو آخری زمانے میں قیام فرمائے گا اور ایک عظیم تحرک کرے گا اور حق و باطل اور مومن و کافر کو ایک دوسرے سے جُدا کرے گا۔

یہ جو روایات میں مذکور ہوا ہے کہ اس کے پاس موسیٰ کا عصا اور سلیمان کی انگشتری ہوگی اور یہ دونوں چیزیں قوت، طاقت فتح و کامرانی اور حکومت کی علامت ہیں، اس پر دلالت کرتی ہے " دابة الارض " سے مراد ایک نہایت ہی فعال انسان ہے نہ کہ کوئی حیوان۔

اور یہ چیز جو روایات میں بیان ہوئی ہے کہ وہ مومن اور کافر کو نشان لگا کر انھیں ایک دوسرے سے جُدا کرے گا یہ بھی کسی انسان سے متعلق ہو سکتی ہے۔

قرآن کی آیت کے مطابق اس کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں سے باتیں کرے گا۔ یہ بات بھی اسی معنی سے مطابقت رکھتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام گفتگو کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک طرف تو لفظ " دابة " کا استعمال بیشتر انسان کے علاوہ پر استعمال ہوتا ہے (ہر چند کہ قرآن میں اس کا استعمال انسان اور غیر انسان یا صرف انسان کے لیے بھی ہوا ہے) دوسری طرف خود آیت میں متعدد قرینے پائے جاتے ہیں اور اس آیت کی تفسیر میں وارد ہونے والی بہت سی روایات بھی بتلاتی ہیں کہ اس آیت میں "دابة الارض" سے مراد آیت ہیں مذکور خصوصیات کا حامل نہایت ہی فعال انسان ہے جو حق کو باطل سے اور مومنین کو منافقین و کفار کی صفوں سے جُدا کرے گا وہ ایسا انسان ہے جو قیامت سے پہلے پہلے ظاہر ہوگا اور وہ خود بھی عظمت پروردگار کی آیات میں سے ایک آیت ہوگا۔

۲۔ "رجعت" کتاب و سنت کی روشنی میں:۔ مندرجہ بالا آیات میں جو مسائل غور طلب اور قابلِ تشریح ہیں

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۲ ص ۵۲۔

[2] تفسیر ابوالفتوح رازی جلد ۸ ص ۴۲۳۔

Marfat.com

ان میں سے ایک مسئلہ رجعت بھی ہے۔

"رجعت" مذہب شیعہ کے مشہور عقائد میں سے ہے جس کی تفسیر ایک مختصر سے جملہ میں یوں کی گئی ہے:

حضرت امام مہدی علیہ السّلام کے ظہور کے بعد اور قیامت کے نزدیک کچھ "خالص مومنین" اور کچھ "نہایت ہی شریر باغی اور کافر لوگ" اس دنیا میں واپس لائے جائیں گے پہلا گروہ کمال کے مدارج طے کرے گا اور دوسرے گروہ کو سخت سزا ملے گی۔

مرحوم سیّد مرتضیٰ جن کا شمار مذہب شیعہ کے اکابر علماء میں ہوتا ہے، اس سلسلے میں یوں فرماتے ہیں:

خداوند متعال امام مہدی علیہ السلام کے ظہور کے بعد کچھ ایسے لوگوں کو اس دنیا میں واپس بھیجے گا۔ جو قبل ازاں وفات پا چکے ہوں گے تاکہ وہ امام کی نصرت کا اعزاز اور ثواب حاصل کر سکیں اور ساری دنیا پر حق کی حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں، اسی طرح وہ سخت دشمنوں کو بھی زندہ کرے گا تاکہ ان سے انتقام لیا جائے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:

اس عقیدے کی درستی کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی عقل منداس بارے میں قدرتِ خدا کا انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ بات محال نہیں ہے جبکہ ہمارے کچھ مخالف حضرات اس امر کا انکار کرتے ہیں گویا وہ اسے محال اور ناممکن سمجھتے ہیں۔

پھر فرماتے ہیں:

اس عقیدے کے ثبوت کی دلیل مذہب امامیہ کا اس پر اجماع ہے کیونکہ اس مذہب کے کسی بھی پیروکار نے اس عقیدے کی مخالفت نہیں کی ہے[1]

البتہ بعض قدیم شیعہ علماء مثلاً مرحوم طبرسی کی تفسیر مجمع البیان کے الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب کی ایک نہایت ہی قلیل تعداد اس عقیدے کی مخالف بھی ان کے نزدیک رجعت سے مراد اہلِ بیت علیہم السلام کی حکومت اور سلطنت ہے نہ کہ مُردوں کا دوبارہ زندہ ہونا، لیکن ان کی مخالفت ایسی ہے جس سے اجماع کو کوئی خدشہ لاحق نہیں ہے۔

بہرحال اس سلسلے میں بہت گفتگو کی گئی ہے لہٰذا ہم چاہتے ہیں کہ اس کے بارے میں کچھ باتیں مختصر اور جامع انداز میں حدودِ تفسیر کے اندر رہتے ہوئے بیان کر دیں:

(۱) اس بات میں قطعاً شک نہیں ہے کہ اس دنیا میں بعض مُردوں کا زندہ کیا جانا کوئی محال بات نہیں ہے، جس طرح قیامت کے دن تمام انسانوں کو زندہ کیا جانا ناممکن نہیں ہے۔ اس امر پر تعجب کرنا ایسے ہے جیسے زمانہ جاہلیت کے مشرکین مسئلہ معاد پر تعجب کیا کرتے تھے اس مسئلے کا مذاق اڑانا بھی مشرکین کے مسئلہ معاد کے مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔ کیونکہ ایسے کام کو

---

[1] سفینۃ البحار جلد اوّل ص ۵۱۱ (مادہ رجع)۔

Marfat.com

عقلِ سلیم محال نہیں سمجھتی اور خدا کی قدرت اس قدر وسیع اور حاوی ہے کہ اس قسم کے تمام امور اس کے سامنے آسان اور معمولی ہیں ۔

(۲) قرآن مجید میں پانچ مقامات پر گزشتہ امتوں میں رجعت کے وقوع کا اجمالی تذکرہ آیا ہے ؛

الف :۔ اس پیغمبر کے بارے میں جو ایک گاؤں سے گزر رہے تھے دیکھا کہ بستی کی دیواریں گر چکی ہیں اور بستی میں رہنے والوں کے اجسام اور ہڈیاں اِدھر اُدھر بکھری پڑی ہیں ، انھوں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ خداوندِ عالم انھیں مرنے کے بعد کیونکر زندہ کرے گا ؟ تو خداوندِ عالم نے انھیں ایک سو سال تک موت دے دی اور پھر زندہ کیا اور پوچھا کہ تم کتنا عرصہ سوئے رہے ہو ؟ تو انھوں نے عرض کیا ، ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ ۔ خدا نے فرمایا : نہیں بلکہ پورے ایک سو سال تم پر بیت چکے ہیں ۔

(بقرہ / ۲۵۹)

یہ پیغمبر جناب عزیر ہوں یا کوئی اور ، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اہم بات یہ ہے کہ خداوندِ عالم نے انھیں مرنے کے بعد اسی دنیا میں دوبارہ زندہ کیا (فاماته الله مأة عام ثم بعثه) ۔

ب :۔ سورۂ بقرہ ہی کی آیت ۲۴۳ میں کچھ اور لوگوں کا ذکر ہے جو موت کے ڈر سے (بعض مفسرین کے بقول میدانِ جہاد میں شرکت کے خوف سے طاعون کا بہانہ بنا کر) اپنے گھر بار چھوڑ کر باہر چلے گئے ، تو خداوندِ عالم نے موت کا حکم دے دیا ۔ اور انھیں دوبارہ زندہ کیا : (فقال لهم الله موتوا ثم احیاهم) ۔

اگر چہ بعض مفسرین اس غیر معمولی واقعے کو برداشت نہیں کر سکے لہٰذا انھوں نے اسے مثال شمار کیا ہے لیکن واضح ہے کہ آیت کے ظہور بلکہ صراحت کے مطابق یہ واقعہ رونما ہوا ہے اس کے مقابلے میں اس قسم کی تاویلیں قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں ۔

ج :۔ سورۂ بقرہ کی آیات نمبر ۵۵ اور ۵۶ جو بنی اسرائیل کے بارے میں ہیں کے مطابق کچھ لوگوں نے خدا کے دیدار کی درخواست کی تو وہ مہلک بجلی کا شکار ہو گئے اور اس دنیا سے چل بسے ، خداوندِ عالم نے انھیں دوبارہ زندہ کیا تاکہ وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں (ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون) ۔

د :۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے ذکر میں ہم پڑھتے ہیں :

واذ تخرج الموتی باذنی

تم میرے فرمان کے مطابق مُردوں کو زندہ کیا کرتے تھے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے (مُردوں کے زندہ کرنے والے) اس معجزے کو دنیا کے سامنے پیش کیا بلکہ فعل مضارع (تخرج) کی تعبیر سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اسے بار بار دہرایا ۔ بعض لوگوں کے نزدیک یہ بھی رجعت کی ایک قسم ہے ۔

Marfat.com

۵:۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲، میں بنی اسرائیل کے اس مقتول کے قاتل کا سراغ لگانے کا واقعہ ہے کہ جس کے بارے میں تنازعہ کھڑا ہوگیا تھا، قرآن کہتا ہے:

حکم ملا کہ ایک گائے کو ذبح کیا جائے جس کی خاص علامتیں ہوں تاکہ اس کے بدن کا ایک ٹکڑا مقتول کو مارا جائے اور وہ اس سے زندہ ہو جائے (اور قاتل کا نام و نشان بتائے جس سے اس جھگڑے کا خاتمہ ہو) (فقلنا اضربوہ ببعضھا کذٰلک یحیی اللہ الموتٰی و یریکم اٰیاتہ لعلکم تعقلون)۔

ان پانچ مقامات کے علاوہ اور بھی کئی مقامات قرآن میں ملتے ہیں۔ اسی طرح اصحاب کہف کی داستان بھی رجعت سے ملتی جلتی ہے نیز حضرت ابراہیم کے ان چار پرندوں کا واقعہ بھی رجعت کے حوالے سے قابلِ غور ہے اس واقعے میں ان پرندوں کو ذبح کرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا تاکہ ان لوگوں کے بارے میں معاد کے امکان کو واضح کیا جا سکے۔

بات خواہ کچھ ہو یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص قرآنِ مجید کو ایک آسمانی کتاب کی حیثیت سے بھی مانے اور پھر اس قدر واضح اور روشن آیات کے باوجود رجعت کے امکان کا انکار کردے۔ کیا اصولی طور پر "رجعت" کا معنی مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے علاوہ کچھ اور ہے؟

کیا رجعت اس چھوٹی سی دنیا میں قیامت (معاد) کا ایک چھوٹا سا نمونہ نہیں ہے؟

جو شخص قیامت کو اس وسعت کے ساتھ مانتا ہے وہ مسئلہ رجعت کا اس قدر جلدی انکار کیوں کر دیتا ہے یا اس کا مذاق کیوں اڑاتا ہے؟ جیسا کہ احمد امین مصری اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں کہتا ہے:

الیھودیۃ ظھرت بالتشیع بالقول بالرجعۃ

رجعت کے عقیدے کی وجہ سے مذہب شیعہ میں یہودیت نمایاں نظر آتی ہے[1]

اب آپ ہی بتائیے کہ احمد امین مصری کی ان باتوں میں اور زمانہ جاہلیت کے عربوں کے جسمانی معاد کے انکار میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟

(۳) اب تک جو کچھ ہم نے بتایا ہے وہ رجعت کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں ہے کہ یہ بات قطعاً ناممکن نہیں ہے اور اس بات کی تائید بہت سی روایات سے ہوتی ہے جنھیں بہت سے ثقہ راویوں نے آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام سے نقل کیا ہے۔

ان سب روایات کے یہاں پر لکھنے کی گنجائش نہیں ہے لہٰذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ وہ اعداد و شمار درج کر دیں جو علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے جمع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص آئمہ اہلِ بیت علیہم السلام کے اقوال کی صداقت پر تو ایمان

---

[1] "عقائد الامامیہ" از شیخ محمد رضا مظفر ص ۷۱۔

Marfat.com

رکھتا ہو لیکن رجعت کے بارے میں متواتر حدیث کو قبول نہ کرے اس بارے میں دو سو کے نزدیک صریح احادیث موجود ہیں جنھیں چالیس سے زیادہ ثقہ راویوں اور علماءِ اعلام نے پچاس سے زیادہ کتابوں میں درج کیا ہے .... اگر یہ احادیث متواتر نہیں ہیں تو پھر کونسی حدیث متواتر ہوگی ۔[1]

(۴) **رجعت کا فلسفہ :** عام طور پر اس عقیدے کے بارے میں جو اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ قیامِ قیامت سے قبل رجعت کے وقوع پذیر ہونے کا کیا فلسفہ ہے ؟

روایاتِ اسلامی کے پیش نظر رجعت سب کے لیے نہیں ہے بلکہ ایسے خاص خاص نیک اور صالح مومنین کے لیے مخصوص ہے جو ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں اسی طرح ان کفار اور سرکش ظالموں کے لیے کہ جو کفر و ظلم کے لحاظ سے نہایت ہی پستی کا شکار تھے ۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان دونوں قسم کے لوگوں کا دنیاوی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوگا کہ پہلا گروہ کمال و ارتقاء کے اعلیٰ ترین مرحلے کو پہنچ جائے اور دوسرا گروہ اس دنیاوی عذاب کا مزہ بھی چکھ لے ۔

بالفاظِ دیگر وہ خالص مومنین جو اپنی زندگی میں کچھ رکاوٹوں کی وجہ سے اعلیٰ ارتقائی مرحلے تک نہیں پہنچ سکے ، حکمتِ الٰہی اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ دوبارہ اسی دنیا میں جاکر اپنا ارتقائی سفر طے کریں اور حق و عدالت کی عالمی حکومت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اس حکومت کی تشکیل میں حصہ لیں کیونکہ ایسی حکومت کی تشکیل بھی ایک بہت بڑا اعزاز ہے ۔

اس کے برعکس بڑے منافق اور ظالم لوگ بھی قیامت کے دن اپنی مخصوص سزا کے علاوہ اس دنیا میں بھی اپنی سزا پالیں اور اپنے کیے کا مزہ چکھ لیں جس طرح سابقہ امتوں کے سرکش افراد نے اس دنیا میں بھی سزا پائی تھی ۔ جیسے فرعون اور اس کے ماننے والے ، عاد و ثمود اور قوم لوط وغیرہ اسی دنیا میں عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئے اور اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے " رجعت "۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام ایک حدیث میں ارشاد فرماتے ہیں :

ان الرجعة ليست بعامة ، وهى خاصة ، لا يرجع الا من محض الايمان محضًا ، او محض الشرك محضًا

رجعت عمومی نہیں بلکہ خصوصی ہے جس میں صرف اور صرف وہی لوگ واپس لوٹیں گے جو خالص مومن یا خالص مشرک ہوں گے ۔[2]

ممکن ہے کہ سورہ انبیاء آیت ۹۵ بھی اسی امر کی طرف اشارہ کر رہی ہو جس میں کہا گیا ہے :

" وحرام على قرية اهلكناها انهم لا يرجعون "

---

[1] بحار الانوار جلد ۵۳ ص ۱۲۲ ۔

[2] بحار الانوار جلد ۵۳ ص ۳۹ ۔

Marfat.com

یعنی جس شہر و دیار والوں کو ہم نے (ان کے گناہوں کی وجہ سے) تباہ و برباد کر دیا تھا ان پر حرام ہے کہ وہ واپس لوٹ آئیں۔

کیونکہ یہ واپس نہ لوٹنے کا فیصلہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اس دنیا میں اپنی سخت ترین سزا پا چکے ہیں لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ایسی سزائیں نہیں ملی ہیں وہی واپس لوٹیں گے اور سزا پائیں گے (غور کیجیے گا)۔

یہ احتمال بھی موجود ہے کہ ایسے لوگوں کا تاریخ بشریت کے ایک اہم موڑ پر اس دنیا میں واپس آنا ممکن ہے کہ دو عظیم درس ہوں اور عظمت الٰہی اور قیامت کے بارے میں دوامی ترین نشانیاں ہوں۔ تاکہ اسے دیکھ کر یہ لوگ اپنے معنوی ارتقاء اور کمال ایمان کی آخری حدوں تک پہنچ جائیں اور کسی قسم کی کوئی کمی نہ پائی جائے۔

۴۔ **رجعت اور ارادے کی آزادی**:۔ بعض لوگوں کے گمان کے مطابق رجعت کا عقیدہ انسان کی آزادی، ارادہ اور اختیار کے منافی ہے۔

لیکن جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ یہ محض ایک غلط فہمی ہے کیونکہ ان کا اس دنیا میں لوٹ آنا عام حالات کے تحت ہوگا جن میں وہ مکمل طور پر آزاد اور صاحب اختیار ہوں گے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ظالم اور کافر لوگ اس دنیا میں واپس آکر توبہ کر لیں گے اور راہ حق اختیار کر لیں گے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے لوگ ظلم و جور میں اس حد تک غرق ہو چکے ہوں گے کہ یہ امور ان کے وجود میں رچ بس چکے ہوں گے اور ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکے ہوں گے جن سے جدا ہونے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

جیسا کہ خداوند عالم ان اہل دوزخ کے جواب میں فرماتا ہے جو بروز قیامت درخواست کریں گے کہ انھیں دنیا میں لوٹ جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ وہاں اپنی غلط کاریوں کا ازالہ کر سکیں:

ولو ردوا لعادوا لما نھوا عنہ

اگر وہ واپس آ بھی جائیں تو وہی کچھ کریں گے جن سے انھیں روکا گیا تھا۔ (انعام / ۲۸)

نیز بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ رجعت کا مفہوم سورہ مومنون کی آیت ۱۰۰ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ مشرک لوگ دنیا میں واپس لوٹ آنے کی درخواست کریں گے تاکہ وہ نیک اعمال بجالائیں اور کہیں گے:

رب ارجعون لعلی اعمل صالحا فیما ترکت

پروردگارا! ہمیں لوٹا دے تاکہ جو نیک کام ہم سے رہ گئے ہیں ہم انھیں انجام دے سکیں۔

تو انھیں منفی جواب ملے گا اور کہا جائے گا:

کلا انھا کلمۃ ھو قائلھا

یہ سب ان کی باتیں ہیں اور کچھ نہیں۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ آیت عام ہے اور رجعت کا مفہوم خاص ہے (خوب غور کیجیے گا)۔

۵۔ **عقیدہ رجعت اسلام کی بنیادی شرائط میں سے نہیں**:۔ اس سلسلے کی آخری بات کے طور پر عرض کرتے

Marfat.com

چلیں۔ اگرچہ شیعوں نے اپنا یہ عقیدہ مکتب اہل بیت اور آئمہ اطہار سے لیا ہے لیکن وہ رجعت کے منکرین کو کافر نہیں سمجھتے کیونکہ رجعت شیعہ ہونے کے لحاظ سے ضروری ہے لیکن مسلمان ہونے کی ضروری شرائط میں سے نہیں ہے۔ بنابریں اس عقیدے کی وجہ سے مسلمانوں کا اسلامی رشتہ اخوت آپس میں نہیں ٹوٹتا۔ البتہ شیعہ حضرات منطقی طریقے سے اپنے اس عقیدہ کا دفاع ضرور کرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ بعض اوقات مسئلہ رجعت کے ساتھ بعض ایسی خرافاتی باتیں ملا دی جاتی ہیں جن سے بعض لوگوں کے سامنے اس کا صحیح چہرہ پیش نہیں ہوتا لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی بنیاد صحیح احادیث پر رکھی جائے اور مشکوک و مخدوش احادیث سے پرہیز کیا جائے۔

ہم نے یہاں پر رجعت سے متعلق مباحث کا ایک خلاصہ پیش کیا ہے مزید تفصیلات اور معلومات کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیا جائے جو اس سلسلے میں تحریر کی گئی ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات کو پیشِ نظر رکھ کر ان حملوں کا بخوبی جواب دیا جا سکتا ہے جو بعض ناآگاہ اہلسنت مفسرین نے مذہب شیعہ پر کیے ہیں (جیسا کہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں انھی آیات کے ذیل میں کیا ہے) کیونکہ ایسے معترضین نے حقیقتِ حال کو سمجھے بغیر ہی اسے افسانہ بنا دیا ہے۔

Marfat.com

۸۶۔ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا الَّيْلَ لِيَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○
۸۷۔ وَيَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ فَفَزِعَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا
مَنْ شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَكُلٌّ اَتَوْهُ دٰخِرِيْنَ ○
۸۸۔ وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ
اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ○

ترجمہ

۸۶۔ کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات اس لیے بنائی ہے تاکہ وہ اس میں آرام کریں اور دن کو روشنی دینے والا بنایا ہے ان امور میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو ایمان لانے کو تیار ہیں۔

۸۷۔ اس دن کا سوچو جب صور پھونکا جائے گا اور تمام لوگ جو کہ آسمانوں میں ہیں یا زمین میں، سب کے سب وحشت زدہ ہو جائیں گے سوائے ان لوگوں کے جنھیں خدا بچانا چاہے گا اور سب لوگ خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

۸۸۔ تم پہاڑوں کو دیکھو تو سمجھتے ہو کہ ساکن و جامد ہیں حالانکہ وہ بادل کی مانند چل رہے ہیں یہ خداوند عالم کی صناعت اور تخلیق ہے جس نے ہر چیز کو پختہ بنایا ہے وہ تمھارے ان کاموں سے بھی باخبر ہے جنھیں تم انجام دیتے ہو۔

تفسیر

زمین کی حرکت ـــــــ قرآن کا ایک سائنسی معجزہ

قرآن مجید ایک بار پھر ان آیات میں، مبداء و معاد اور کائنات میں خداوند عالم کی قدرت و عظمت کی نشانیوں اور اسی طرح حوادث قیامت کو بیان کرتا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے رات کو ان کے آرام کے لیے

Marfat.com

بنایا ہے (الم یروا انا جعلنا اللیل لیسکنوا فیہ)۔
اور دن کو روشنی عطا کرنے والا (والنہار مبصرًا)۔
ان امور میں خدا کی قدرت وحکمت کی روشن نشانیاں اور دلائل ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں (ان فی ذلک لآیات لقوم یؤمنون)۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہے کہ قرآن مجید رات اور دن کے حیات بخش آثار اور نور وظلمت کے نظام کے بارے میں گفتگو کر رہا ہو اور نہ ہی اس سلسلے کی یہ آخری گفتگو ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید تعلیم وتربیت اور انسان سازی کی کتاب ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ تعلیم وتربیت کے اصول کبھی اس امر کے متقاضی ہوتے ہیں کہ ایک ہی موضوع کو مختلف حوالوں کے ساتھ مختلف مواقع پر پیش کیا جائے اور اسے بار بار دہرایا جائے تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

تاریکیٔ شب کی وجہ سے حاصل ہونے والا سکون ایک ناقابلِ تردید علمی حقیقت ہے۔ رات کے تاریک پردے دن کی سرگرمیوں کو جبری طور پر روکنے کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ انسان اور دوسرے جانداروں کے اعصاب پر بھی ان کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ آرام کرتے اور گہری نیند کے مزے لیتے ہیں (اس بات کو قرآن مجید نے "سکوت" سے تعبیر کیا ہے)۔

اسی طرح دن کی روشنی کا حرکت اور دوڑ دھوپ سے تعلق بھی سائنسی نقطہ نظر سے ناقابلِ تردید ہے۔ آفتاب کا نور صرف مناظر زندگی ہی کو منور اور آنکھ کو فعال نہیں کرتا، بلکہ وجود انسانی کے تمام ذرات کو بھی بیدار اور فعال بنا دیتا ہے۔

یہ آیت "توحید ربوبی" کے ایک گوشے کو بیان کر رہی ہے اور چونکہ معبودِ حقیقی، عالم ہستی کا رب اور منتظم ومدبر ہی ہے لہذا قرآن اس سے دوسرے تمام بتوں اور بناوٹی معبودوں پر خط تنسیخ کھینچ کر مشرکین کو اپنے عقائد پر نظرثانی کی دعوت دے رہا ہے۔

اس نکتے کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ خود کو اس نظام سے ہم آہنگ کرے۔ رات کو آرام کرے اور دن کو اپنی دوڑ دھوپ میں لگ جائے۔ تاکہ ہمیشہ صحیح وسالم رہے۔ ان ہوس کے بندوں کی مانند نہیں جو راتوں کو تو جاگتے رہتے ہیں لیکن دن کو دوپہر تک سوئے رہتے ہیں۔

یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ "مبصر" کا لفظ جو دراصل "بینا" (یعنی دیکھنے والا) کے معنی میں ہے یہ دن کی صفت کے طور پر بیان ہو رہا ہے جبکہ یہ دن کے وقت انسانوں کی صفت ہونا چاہیے یہ ایک طرح کی عمدہ تاکید ہے جس طرح بعض اوقات "سو جانا" رات کی صفت کے طور پر آتا ہے اور کہتے ہیں "لیل نائم" (سو جانے والی رات)۔

روز وشب کے فوائد میں آیت میں دو مختلف تعبیریں بیان کی گئی ہیں ایک جگہ "لتسکنوا فیہ" فرمایا گیا ہے اور دوسری جگہ "مبصرًا" اور ممکن ہے یہ اس طرف اشارہ ہو کہ رات کا اصل مقصد تو سکون اور آرام ہے لیکن دن کی روشنی کا اصل مقصد صرف دیکھتے رہنا نہیں بلکہ دیکھنا تو زندگی کی نعمتوں تک پہنچنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ایک ذریعہ ہے۔
(غور کیجیے گا)

بہرحال یہ آیت اگرچہ براہِ راست توحید اور کائنات کے نظام کو چلانے کی بات کر رہی ہے لیکن معاد کے مسئلے کی طرف

Marfat.com

بھی ایک لطیف سا اشارہ کر رہی ہے کیونکہ نیند موت کی مانند ہے اور بیداری مرنے کے بعد جی اٹھنے کی مانند۔

بعد والی آیت معاد اور اس کے مقدمات کو بیان کرتے ہوئے کہتی ہے: اس دن کا سوچیے کہ جب صور پھونکا جائے گا اور ہر کوئی خواہ وہ آسمانوں میں ہے یا زمین میں وحشت زدہ ہوجائے گا سوائے ان لوگوں کے جنھیں خدا بچانا چاہے گا اور سب لوگ خضوع و خشوع کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے (و یوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السماوات و من فی الارض الا من شاء اللہ و کل اتوہ داخرین)۔

قرآن مجید کی آیات کے مجموعی مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ دو یا تین مرتبہ صور پھونکا جائے گا ایک تو اس وقت جب دنیا ختم ہونے کے قریب اور قیامت کے دہانے پر پہنچ جائے گی اس وقت تمام لوگ گھبرا جائیں گے۔

دوسری بار تمام دنیا اس کے سنتے ہی مر جائے گی ممکن ہے کہ یہ دونوں یکے بعد دیگرے ہوں۔

تیسری بار دوبارہ جی اٹھنے اور قیامت کے قائم ہونے کے وقت کیوں کہ صور پھونکے جاتے ہی تمام مُردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔

اس آیت میں پہلی اور دوسری مرتبہ صور پھونکنے کی طرف اشارہ ہے یا تیسری مرتبہ کی طرف؟ اس بارے میں مفسرین کے درمیان اختلاف ہے خود اسی آیت میں اور بعد والی آیات میں ایسے قرینے موجود ہیں جو دونوں نظریات کی تائید کرتے ہیں۔ بعض مفسرین نے اس سے مذکورہ تمام صور پھونکنا مراد لیا ہے۔

اگر آیت کے ظاہری معنی کو دیکھا جائے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلی مرتبہ پھونکے جانے کی طرف اشارہ ہے جو کہ دنیا کے اختتام کے نزدیک ہوگا کیونکہ "فزع" کا معنی ایسا خوف اور وحشت ہے جو انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دے اور اسے پہلی مرتبہ کی پھونک کے آثار میں سے شمار کیا گیا ہے کیونکہ قیامت کی پھونک سے جو خوف و وحشت طاری ہوگی وہ اعمال کی وجہ سے ہوگی نہ کہ پھونک کے اثر سے۔

بالفاظ دیگر "ففزع" میں "فاء تفریع" ظاہراً اس لیے ہے کہ یہ "فزع" یعنی خوف و وحشت صور پھونکے جانے کی وجہ سے ہوگی اور یہ "فزع" پہلی پھونک کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ آخری پھونک تو صرف دہلا دینے والی ہی نہیں ہوگی بلکہ زندگی اور تحرک کا سبب بھی ہوگی اگر وحشت ہوگی بھی تو انسان کے اپنے اعمال کی وجہ سے ہوگی۔

اب ہم "نفخ صور" کے مفہوم کی طرف آتے ہیں۔ "نفخ" کے معنی پھونکنے کے ہیں اور "صور" کا معنی "قرنا" ہے۔ یہاں پر اس تعبیر سے کیا مراد ہے؟ تو اس بارے میں کرنے کی بہت سی باتیں ہیں جنھیں ہم انشاء اللہ تعالیٰ سورۂ زمر کی ۶۸ ویں آیت کے ضمن میں بیان کریں گے۔

اسی آیت میں ایک جملہ ہے "الا من شاء اللہ" کہ جس میں اس عمومی خوف و وحشت سے کچھ افراد کے لیے استثناء کا تذکرہ ہے جو نیک اور پاک افراد کی طرف اشارہ ہے خواہ وہ فرشتے ہوں یا وہ مومن جو آسمانوں اور زمین میں رہتے ہیں تو یہ سب افراد ایمان کے زیر سایہ ایک خاص اطمینان و سکون سے بہرہ ور ہوں گے نہ تو انھیں پہلی پھونک سے کوئی گھبراہٹ ہوگی اور نہ ہی آخری پھونک سے کوئی وحشت۔ پھر والی آیت میں بھی ہے کہ جو لوگ نیکی بھرے دامن سے بارگاہ رب العزت میں

Marfat.com

حاضر ہوں گے وہ اس دن کے ہر طرح کے خوف و وحشت سے امان میں ہوں گے :

من جاء بالحسنة فله خير منها و هم من فزع يومئذ امنون

" كل اتوه داخرين " یعنی سب کے سب اس کی بارگاہ میں خضوع و خشوع کے ساتھ سر جھکائے پیش ہوں گے یہ جملہ بظاہر عام ہے اور اس میں کسی قسم کا استثناء بھی نہیں ہے حتیٰ کہ انبیاء اور اولیاء بھی اس کی بارگاہِ اقدس میں خاضع اور خاشع ہوں گے اور اگر ہم سورۂ صافات کی آیت ۱۲۷ ، ۱۲۸ میں پڑھتے ہیں کہ :

فانهم لمحضرون الا عباد الله المخلصين

سب لوگ اس کے حضور پیش ہوں گے سوائے خدا کے مخلص بندوں کے ۔

تو اس کا زیرِ تفسیر آیت کی عمومیت سے کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ زیرِ تفسیر آیت بروزِ محشر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہونے کی طرف اشارہ ہے اور دوسری آیت حساب و کتاب اور اعمال کے مواخذے کی جانب اشارہ ہے ۔

بعد والی آیت کائنات میں عظمتِ الٰہی کی آیات میں سے ایک آیت کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے : تم پہاڑوں کو دیکھو گے تو انھیں ٹھہرا ہوا سمجھو گے جبکہ وہ بادل کی مانند حرکت کر رہے ہیں ۔ (و ترى الجبال تحسبها جامدة وهي تمر مر السحاب) ۔

یہ اس اللہ کی صناعی اور تخلیق ہے جس نے ہر چیز کو محکم اور متقن بنایا ہے (صنع الله الذي اتقن كل شيء)[1]

جس کا تخلیقی نظام اس قدر منظم اور حساب شدہ ہے وہ یقیناً تمھارے ان کاموں سے (بھی) باخبر ہے جو تم انجام دیتے ہو (انه خبير بما تفعلون) ۔

بہت سے مفسرین کا نظریہ ہے کہ مندرجہ بالا آیت ، قیامت کے قریب کے حالات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا کے اختتام اور دوسرے جہان کے آغاز کے موقع پر زلزلے ، دھماکے اور دوسری عظیم تبدیلیاں رونما ہوں گی پہاڑ ایک دوسرے سے کٹ کٹ کر جدا ہو جائیں گے ۔ یہ نکتہ قرآن مجید کی بہت سی آخری سورتوں میں بھی صریحاً بیان ہوا ہے ۔

اس آیت کا قیامت کے سلسلے کی دو دوسری آیات کے درمیان آنا اسی تفسیر کا شاہد ہے ۔

البتہ بہت سے دوسرے ایسے قرائن بھی ملتے ہیں جو ایک اور تفسیر کی تائید کرتے ہیں اور وہ یہ کہ یہ آیت اسی دنیا میں خداوندِ عالم کی توحید اور اس کی عظمت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور یہ کرۂ زمین کی حرکت کی طرف اشارہ ہے جسے ہم محسوس نہیں کرتے ۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ :

۱۔ آیت مذکورہ کے الفاظ ہیں کہ تم سمجھتے ہو کہ پہاڑ ٹھہرے ہوئے ہیں حالانکہ وہ بادل کی طرح حرکت کر رہے ہیں ۔ واضح ہے کہ اس قسم کی تعبیر آغازِ قیامت کے تغیرات سے ہم آہنگ نہیں ہے کیونکہ یہ حوادث اس قدر آشکار ہوں گے کہ خود

---

[1] " صنع الله " " انذر " یا " صَنَعَ " جیسے فعل مقدر کی وجہ سے منصوب ہے ۔

Marfat.com

قرآن کے الفاظ میں " ان کو دیکھ کر مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو بھول جائیں گی اور حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے ۔ اور لوگ سخت وحشت کی وجہ سے حواس کھو بیٹھیں گے حالانکہ وہ مست نہیں ہوں گے ۔ (سورۂ حج / ۲)

۲۔ بادلوں کی حرکت کے ساتھ تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک حالت میں ، بالکل نرمی کے ساتھ اور بغیر کسی شور و غل کے ہے نہ کہ کسی دھماکے کے ساتھ ۔ جبکہ رعد کی ایک معمولی کڑک سے بھی کان گویا پھٹے جاتے ہیں ۔

۳۔ مذکورہ بالا تعبیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہاڑ ظاہراً ٹھہرے ہوتے ہیں حالانکہ درحقیقت وہ تیزی سے حرکت کر رہے ہیں (یعنی ایک چیز کی ایک ہی آن میں دو مختلف حالتوں کو بیان کیا جا رہا ہے) ۔

۴۔ اتقان کا معنی ہے منظم اور محکم بنانا ، یہ تعبیر بھی اس زمانے سے ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے جب یہ نظام برقرار و بحال ہو نہ کہ اس دور انیے سے جبکہ یہ نظام تباہ ہو رہا ہو ۔

۵۔ " انه خبیر بما تفعلون " کا جملہ خاص کر " تفعلون " کا کلمہ جو کہ فعل مضارع ہے بتا رہا ہے کہ یہ اسی دنیا سے متعلق ہے کیونکہ قرآن فرماتا ہے جو اعمال بھی تم زمانہ حال یا آئندہ زمانے میں انجام دو گے اس سے وہ اچھی طرح باخبر ہے اور اگر اس کا تعلق اس دنیا کے خاتمے سے ہوتا تو یوں فرماتا " ما فعلتم " جو کام تم نے انجام دیا ہے اس سے باخبر ہے ۔
(غور کیجیے گا)

ان تمام قرائن سے اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ یہ آیت تخلیق کائنات کی ایک اور عجیب چیز کو بیان کر رہی ہے جو درحقیقت پہلی دو آیات میں بیان ہونے والے عجائبات کی طرح ہے یعنی " الم یروا انا جعلنا اللیل لیسکنوا فیه ..... " ۔

پس معلوم ہوا کہ زیر نظر آیات کا کچھ حصہ توحید کے بارے میں ہے اور کچھ معاد کے سلسلے میں ۔

اس تفسیر سے ہم جو نتیجہ نکالتے ہیں وہ یہ ہے کہ جن پہاڑوں کو ہم ساکن تصور کرتے ہیں وہ بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں اور یقینی بات ہے کہ پہاڑوں کی حرکت ان سے متصل زمین کی حرکت کے بغیر بے معنی ہے ۔ لہٰذا دوسرے لفظوں میں آیت کا مفہوم یہ بنے گا کہ زمین بڑی تیزی کے ساتھ حرکت کر رہی ہے جیسے بادل حرکت کرتے ہیں ۔

دور حاضر کے سائنس دانوں کے نزدیک زمین ، اپنے محور کے گرد ۳۰ کلومیٹر فی منٹ کے حساب سے گھومتی ہے جبکہ سورج کے گرد اس کی رفتار اس سے بھی زیادہ ہے ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن نے پہاڑوں ہی کو مرکز گفتگو کیوں قرار دیا ہے ؟ تو شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑوں کا ثقل ، بوجھ اور ٹھہراؤ ضرب المثل ہے اور یہ قدرت الٰہی کی وضاحت اور تشریح کے لیے بہترین نمونہ سمجھے جا سکتے ہیں یعنی جہاں پر پہاڑ اپنی اس عظمت اور بوجھ کے باوجود بحکم خدا سے (زمین سمیت) حرکت کر رہے ہوں تو دوسری تمام چیزوں پر اس کی قدرت و طاقت مسلّم ہو گی ۔

بہر حال مندرجہ بالا آیت قرآن مجید کے سائنسی معجزوں میں سے ہے کیونکہ جن سائنس دانوں نے سب سے پہلے زمین کی حرکت کا انکشاف کیا وہ اٹلی کے گلیلیو اور پولینڈ کے " کوپرنک " تھے ۔ انھوں نے سولہویں صدی عیسوی کے آخر اور سترھویں صدی کے آغاز میں اس نظریے کا اظہار کیا جس سے انھیں ارباب کلیسا کے زبردست دباؤ کا سامنا بھی کرنا پڑا ۔

Marfat.com

لیکن قرآن مجید نے توان سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے ہی اس حقیقت سے پردہ اٹھا دیا تھا اور مندرجہ بالا صورت میں اسے توحید کی علامتوں سے ایک علامت کے عنوان سے پیش کیا۔

بعض مسلمان فلاسفہ دوسری تفسیر (اسی دنیا میں پہاڑوں کی حرکت) کو قبول کرنے کے باوجود آیت کو چیزوں کی "حرکت جوہری" کے بارے میں سمجھتے ہیں اور اسے مشہور جوہری حرکت کے نظریہ کا مؤید سمجھتے ہیں[1]

حالانکہ آیت کی تعبیرات اس نظریے کے بارے میں نہیں ہیں کیوں کہ پہاڑوں کی حرکت کو بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دینا مکانی حرکت (اَین میں حرکت) سے تو مناسبت رکھتی ہے جوہری حرکت سے نہیں۔

بنا بریں ظاہری طور پر آیت صرف ایک ہی تفسیر کو قبول کرتی ہے اور وہ ہے زمین کی (اپنے یا سورج کے گرد) مکینکل حرکت۔

---

[1] حرکت جوہری سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی مادّی اشیاء کی کیفیت، کمیت اور مکان وغیرہ میں مختلف تبدیلیوں کے علاوہ اپنی ذات کے اندر بھی حرکت موجود رہتی ہے یعنی ان کی ذات ایک متحرک وجود ہے اور ان میں ظاہری تبدیلیاں دراصل نتیجہ ہوتی ہیں ان کی مسلسل باطنی تبدیلیوں کا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے دو وجود ہیں جو ذاتی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں ایک ثابت وجود (جو مادی وجود سے ماوراء ہوتا ہے) اور دوسرا متحرک وجود (جو مادی وجود کہلاتا ہے) اور اس نظریہ کے ثبوت کی اہم ترین دلیل مادی اشیاء کا ایک زمانے کا حامل ہونا اور اندرونی تبدیلیوں سے بیرونی تبدیلی ہرگز جدا نہیں ہے۔ اس بحث کی تفصیل ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

Marfat.com

۸۹۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ
اٰمِنُوْنَ ○

۹۰۔ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوْهُهُمْ فِى النَّارِ ؕ هَلْ تُجْزَوْنَ
اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

۹۱۔ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِىْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ
كُلُّ شَىْءٍ ۡ وَّاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○

۹۲۔ وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ
وَمَنْ ضَلَّ فَقُلْ اِنَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○

۹۳۔ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

ترجمہ

۸۹۔ جو لوگ نیک کام کرتے ہیں وہ اس کی جزا اس سے بہتر پائیں گے اور وہی لوگ اس دن کی وحشت سے امان میں ہوں گے۔

۹۰۔ اور جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں وہ منہ کے بل جہنم میں ڈالے جائیں گے کیا جو کام تم انجام دیتے ہو اس کے علاوہ تمھیں جزا ملے گی؟

۹۱۔ (کہہ دو) مجھے حکم دیا جا چکا ہے کہ میں اس (مقدّس) شہر (مکّہ) کے پروردگار کی عبادت کروں، اسی کی جس نے اس شہر کو حرمت عطا فرمائی ہے اور سب کچھ اسی کا ہے اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں۔

۹۲۔ اور قرآن کی تلاوت کروں پس جو شخص ہدایت پائے وہ اپنے لیے ہدایت پائے گا اور جو گمراہ ہو جائے (تو

Marfat.com

اس کا گناہ خود اسی کی گردن پر ہے) کہہ دو: کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں۔
۹۲۔ کہہ دو کہ حمد ذاتِ خدا کے لیے مخصوص ہے وہ بہت جلد اپنی نشانیاں تمھیں دکھلائے گا تاکہ تم انھیں پہچان لو اور جو کچھ تم انجام دیتے ہو تمھارا پروردگار اس سے غافل نہیں ہے۔

تفسیر

رسول اللہؐ کی ذمہ داری

گزشتہ آیات میں بندوں کے اعمال اور خدا کی ان اعمال سے آگاہی کا ذکر تھا، زیرِ نظر آیات میں سب سے پہلے نیک اعمال کی جزا اور قیامت کی ہلاکت آفرینیوں سے ان کے محفوظ رہنے کی بات ہو رہی ہے۔

فرمایا گیا ہے: جو لوگ نیک اعمال بجا لائیں گے وہ ان کی جزا ان سے بہتر پائیں گے اور اس دن کی وحشت سے امان میں ہوں گے (من جاء بالحسنة فله خير منها وهم من فزع يومئذ آمنون)۔

"حسنة" سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین نے مختلف آراء بیان کی ہیں:

کوئی کہتا ہے کہ اس سے مراد کلمہ توحید "لا اله الا الله" اور خدا پر ایمان ہے۔

بعض مفسرین اسے امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ولایت کی طرف اشارہ سمجھتے ہیں اور اس بارے میں اہلبیت اطہار کے حوالے سے وارد ہونے والی متعدد روایات بھی اسی نظریہ کی تائید کرتی ہیں منجملہ ان کے:

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں ہے کہ:

حضرت علی علیہ السلام کے دوستوں میں سے ایک شخص ابو عبداللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام نے فرمایا: کیا خدا کے اس فرمان "من جاء بالحسنة فله خير منها ....." (آیت کے آخر تک) کے بارے میں تمھیں بتاؤں؟ انھوں نے عرض کیا: جی ہاں امیر المومنین! میں آپ پر قربان جاؤں۔

تو امام نے فرمایا:

الحسنة معرفة الولاية و حبنا اهل البيت والسيئة انكار الولاية و بغضنا اهل البيت

حسنة ہماری ولایت اور ہم اہل بیت کی دوستی کی شناخت کا نام ہے اور "سیئہ" ہم اہلبیت کی ولایت کا انکار اور دشمنی کا نام ہے[1]

[1] اصول کافی منقول از تفسیر نور الثقلین جلد ۴ ص ۱۰۴۔

Marfat.com

البتہ جیسا کہ ہم پہلے بھی بارہا بتا چکے ہیں کہ آیات کا معنی وسیع ہوتا ہے اور یہاں پر "حسنہ" اور "سیئہ" کا معنی بھی وسیع ہے جو تمام نیکیوں پر محیط ہے جن میں خدا و رسول اور آئمہ کی ولایت پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے جو تمام نیکیوں کے سرفہرست ہے اور یہ امر اس بات سے بھی مانع نہیں ہے کہ دیگر اعمالِ صالحہ بھی اس آیت کا مصداق ہیں۔

بعض لوگوں کو لفظ "خیر" کی عمومیت دیکھ کر ایک پریشانی ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ایمانِ خدا سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے جس کی جزا زیادہ ہو تو اس کا جواب واضح ہے اور وہ یہ کہ خدا کی رضا اور خوشنودی اس پر ایمان سے بھی بالاتر ہے بالفاظ دیگر یہ سب کچھ خوشنودی رب کا مقدمہ ہیں اور ہر چیز اپنے مقدمہ سے افضل ہوتی ہے۔

ایک اور سوال جو یہاں پر پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ (سورۂ حج کی آیت ۲ جیسی) بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے خوف کی لپیٹ میں سب لوگ آجائیں گے تو پھر نیکوکار اس سے کیونکر مستثنیٰ ہوں گے۔

سورہ انبیاء کی آیت ۱۰۲ اس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ جس میں ہے:

صالح مومنین اس عظیم وحشت سے امان میں ہوں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ اس عظیم وحشت سے مراد روزِ قیامت اور جہنم کا خوف ہے نہ کہ وہ خوف کہ جو صور پھونکنے کے وقت لاحق ہوگا۔ (غور کیجیے گا)

پھر اس گروہ کے مدمقابل گروہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے: جو لوگ بُرے کام کریں گے وہ منہ کے بل آتش جہنم میں ڈالے جائیں گے (ومن جاء بالسیئة فکبت وجوههم فی النار)۔

اور انھیں اس کے علاوہ کوئی اور توقع رکھنا بھی نہیں چاہیے "کیا تمھارے ان اعمال کی پاداش اس کے علاوہ کچھ اور ہو سکتی ہے؟" (هل تجزون الا ما کنتم تعملون)۔

"کبت" "کب" (بروزن "حد") کے مادہ سے ہے جس کا معنی ہے کسی چیز کو اوندھے منہ زمین پر ڈالنا آیت میں لفظ "وجوہ" کا ذکر تاکید کے لیے ہے۔

ایسے لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالنا عذاب کی ایک بدترین قسم ہوگا۔ علاوہ ازیں جب یہ لوگ حق سے اپنا منہ موڑ لیا کرتے تھے اور اسی منہ کے ساتھ گناہوں کا استقبال کیا کرتے تھے اب انھیں سزا بھی اسی نوعیت کی ملنی چاہیے۔

ممکن ہے کہ "هل تجزون الا ما کنتم تعملون" کا جملہ اس سوال کا جواب ہو جو یہاں پر پیش آسکتا ہے اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص کہے "یہ بہت ہی سخت قسم کی سزا ہے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا یہ وہی تمھارے اعمال ہیں جو تمھیں دامن گیر ہو چکے ہیں اور تمھاری جزا صرف تمھارے اعمال ہی ہیں۔ (غور کیجیے گا)

پھر آخری تین آیات میں روئے سخن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہوتا ہے اور آپ سے کچھ حقائق بیان کیے جاتے ہیں جو دراصل اس حقیقت کو بیان کر رہے ہیں کہ آپ ان سے کہہ دیجیے میں تو اپنے فرائض بجا لاتا رہوں گا خواہ تم ہٹ دھرم مشرکین ایمان لاؤ یا نہ لاؤ۔

سب سے پہلے فرمایا گیا ہے: (کہہ دو) مجھے حکم دیا جا چکا ہے کہ اس (مقدس) شہر (مکہ) کے پروردگار کی عبادت

Marfat.com

کرتا رہوں (انما امرت ان اعبد رب ھٰذہ البلدۃ)۔

یہ ایک ایسا مقدس شہر ہے جس سے تمھارے تمام اعزازات اور آبروئیں وابستہ ہیں ایسا مقدس شہر ہے کہ جس کی برکتیں خدا نے تمھیں عنایت فرمائی ہیں لیکن تم اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی بجائے انکار کرتے ہو۔

ایسا مقدس شہر حرم امن خدا بھی ہے، روئے زمین کا معزز ترین نقطہ بھی ہے اور توحید کی قدیم ترین عبادت گاہ بھی۔

جی ہاں مجھے تو حکم ہی یہ ہے کہ "میں اسی پروردگار کی عبادت کروں جس نے اس شہر کو حرمت بخشی ہے۔ (الذی حرمھا)۔

اللہ نے اس شہر کو کچھ خصوصیات عطا فرمائی ہیں، کچھ خوبیاں بخشی ہیں، اس کے لیے کچھ خاص احترام اور احکام مقرر فرمائے ہیں، اس کے لیے کچھ پابندیاں مقرر کی ہیں جو دوسرے شہروں کے لیے نہیں ہیں۔

لیکن تم یہ بھی نہ سمجھ لینا کہ صرف یہی سرزمین خدا کی ملکیت ہے اور بس! نہیں بلکہ کائنات کی ہر شے اسی کے لیے ہے (ولہ کل شیء)۔

اور دوسرا حکم جو مجھے دیا گیا ہے یہ ہے کہ "میں مامور ہوں کہ مسلمین میں سے رہوں" پروردگار عالم کے حکم کے سامنے غیر مشروط طور پر سر جھکائے رہوں نہ کہ اس کے غیر کے سامنے (وامرت ان اکون من المسلمین)۔

تو اس طرح سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دو اہم ذمہ داریوں اور فرائض منصبی کو بیان کر دیا۔ ایک تو "خداوند وحدہ لاشریک کی عبادت" اور دوسرے "اس کے حکم کی غیر مشروط طور پر پابندی"۔

پھر ان دو مقاصد تک پہنچنے کا ذریعہ یوں بیان کرتے ہیں "مجھے حکم ہے کہ میں قرآن کی تلاوت کروں (وان اتلوا القرآن)۔

اس کے چراغ سے روشنی حاصل کروں، اس کے چشمۂ آب حیات سے پانی پیوں اور اپنی زندگی کے تمام پروگراموں میں اس سے راہنمائی حاصل کروں کیوں کہ ان دو مقدس مقاصد تک پہنچنے کے لیے یہ میرا وسیلہ ہے اور یہ ہر قسم کے شرک، کج روی اور گمراہی سے نجات کا ذریعہ ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: تم یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ایمان لانے سے میرا یا اس سے بڑھ کر خداوند عظیم کا کوئی فائدہ ہو گا نہیں نہیں" بلکہ جو ہدایت پا جائے گا وہ اپنے لیے ہدایت پائے گا" (فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ)۔

اور اس ہدایت سے حاصل ہونے والے فوائد خواہ اس دنیا میں ہوں یا آخرت میں تمھارے ہی لیے ہوں گے۔

اور جو شخص گمراہ ہو جائے گا تو اس کا بوجھ اور وبال اس کے اپنے ہی اوپر ہو گا اور تم کہہ دو کہ میں تو صرف ڈرانے والوں میں سے ہوں (ومن ضل فقل انما انا من المنذرین)۔

اس کے خطرناک نتائج میرا گریبان نہیں پکڑیں گے۔ میرا کام تو واضح تبلیغ ہے۔ میرا فریضہ یہی ہے کہ میں تمھیں سیدھی راہ کی ہدایت کرتا رہوں لیکن جو شخص اس بات پر مصر ہے کہ گمراہی میں ہی پڑا رہے تو وہ اپنے آپ ہی کو بدبخت کرے گا۔

یہاں پر یہ بات بھی بڑی دلچسپ ہے کہ ہدایت کے بارے میں قرآن فرماتا ہے جو شخص ہدایت پائے گا اس کے اپنے

Marfat.com

مفاد میں ہوگا لیکن گمراہی کے بارے میں نہیں فرماتا کہ جو گمراہ ہوگا اس کا اپنا نقصان ہوگا بلکہ رسول اللہ کی زبانی فرماتا ہے کہ "میں تو ڈرانے والوں میں سے ہوں"، ممکن ہے کہ تعبیرات کا یہ اختلاف اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ میں گمراہ لوگوں کے سامنے کبھی خاموشی اختیار نہیں کروں گا انھیں اپنے حال پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ انھیں برابر ڈراتا رہوں گا اور اس کام سے کبھی نہ تو باز آؤں گا اور نہ ہی کسی قسم کی تھکاوٹ کا اظہار کروں گا کیونکہ میں "نذیر" ہوں (البتہ قرآن کی بعض دوسری آیات میں دونوں تعبیریں ایک جیسی آئی ہیں لیکن واضح ہے کہ تعبیرات ہمیشہ موقع ومحل کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہیں اور بعض اوقات مختلف معانی کو بیان کرنے کے لیے بھی مختلف تعبیریں استعمال ہوتی ہیں)۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ یہ سورت قرآن مجید کی اہمیت کے ذکر سے شروع ہوئی اور تلاوتِ قرآن کی تاکید پر ختم ہو رہی ہے گویا اس کا آغاز بھی قرآن کے سلسلے سے ہوا اور انجام بھی اسی پر۔

اور آخر میں اسی سورہ کی آخری آیت میں پیغمبر اکرم کو حکم دیا جارہا ہے کہ وہ خداوند عالم کی اس قدر عظیم نعمتوں خاص کر ہدایت جیسی نعمت کے بدلے میں خدا کی حمد بجالائیں، ارشاد ہوتا ہے:

اور کہہ دو کہ تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں (و قل الحمد لله)۔

ہوسکتا ہے کہ یہ حمد اور تعریف قرآن جیسی نعمت اور ہدایت الٰہی کی عنایت پر ادا کی جارہی ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بعد والے جملے کے لیے مقدمہ بن رہی ہو جس میں فرمایا گیا ہے:

بہت جلد خدا تمھیں اپنی نشانیاں دکھائے گا تاکہ تم انھیں پہچان لو (سیریکم اٰیاته فتعرفونها)۔

یہ تعبیر اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرورِ زمان اور انسان کے علم ودانش اور عقل وخرد کی ترقی کے ساتھ ساتھ نت نئی نشانیوں اور عالمِ ہستی کے تازہ ترین اسرار سے پردہ اٹھتا جائے گا اور تم پروردگار کی عظیم قدرت وحکمت سے روز بروز بیشتر آشنائی حاصل کرتے رہو گے اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا اور کبھی منقطع ہونے میں نہیں آئے گا جب تک بنی نوعِ انسان اس دنیا میں موجود ہے آیاتِ الٰہی کا یہ سلسلہ بھی قائم اور برقرار ہے۔

لیکن اس کے باوجود اگر تم غلط راستے پر چل نکلو گے یا راہِ راست سے ہٹ جاؤ گے تو یاد رکھو تمھارا پروردگار ہرگز تمھارے ان کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم انجام دیتے ہو (و ما ربك بغافل عما تعملون)۔

اگر خداوند عالم اپنی مہربانی کی وجہ سے تمھاری سزاؤں میں تاخیر سے کام لیتا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ وہ تمھارے اعمال سے آگاہ نہیں یا اس کا حساب وکتاب غیر محفوظ ہے۔

"و ما ربك بغافل عما تعملون" کا جملہ بعینہ یا تھوڑے سے فرق کے ساتھ ——— قرآن مجید میں نو مقامات پر آیا ہے جو ہے تو ایک مختصر سا جملہ لیکن تمام انسانوں کے لیے ایک معنی خیز تنبیہ اور زبردست دھمکی کی حیثیت رکھتا ہے۔

سورہ نمل کی اس آخری آیت کے ساتھ ہی تفسیر نمونہ کی پندرھویں جلد کا اختتام ہوتا ہے۔ اس وقت ۱۴۰۳ھ کے ماہ شعبان کا

Marfat.com

آخری دن ہے اور عنقریب ماہِ رمضان کا چاند دکھائی دینے والا ہے ۔

پروردگارا! ہم تجھے تیرے ان باعظمت مہینوں کی قسم دے کر سوال کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی خالص بندگی، اپنے فرمان کے آگے سر جھکا دینے اور اپنے قرآن مجید کی تلاوت کی توفیق عنایت فرما ۔

خداوندا! ہمیں ہر روز اپنی نت نئی نشانیاں دکھلا تاکہ ہم تجھے ہر روز پہلے سے بہتر پہچانتے رہیں اور ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہیں جو تو نے ہمیں عطا فرمائی ہیں ۔

بارالٰہا! ہمارے اسلامی معاشرے کو گوناگوں مشکلات نے گھیر رکھا ہے اور اندرونی اور بیرونی دشمن اس بات کی زبردست کوشش کر رہے ہیں کہ تیرے نور کو بجھا دیں ۔

لیکن تو نے ہی سلیمان کو اس قدر قدرت عطا فرمائی، موسیٰ کو فرعون اور فرعونیوں کے مقابلے میں اس قدر قوت عطا فرمائی، ہمیں بھی ان دشمنوں پر کامیابی عطا فرما اور جو لوگ قابلِ ہدایت نہیں انھیں قوم عاد، قوم ہود و ثمود اور قوم لوط کی طرح نیست و نابود فرما ۔

والحمد للّٰہ رب العالمین

۲۰ رشعبان ۱۴۰۳ ہجری

تفسیر نمونہ کی پندرھویں جلد کا ترجمہ بروز پیر بوقت پونے تین بجے سہ پہر بتاریخ ۲۶ رشوال ۱۴۰۵ ہجری مطابق ۱۵ جولائی ۱۹۸۵ عیسوی بر مکان عزیزم محمد حسن فرزند سیٹھ نوازش علی سیٹھ برادرز بہادر یار جنگ روڈ کراچی میں حقیر پرتقصیر سید صفدر حسین نجفی فرزند سید غلام سرور نقوی کے ہاتھوں اختتام پذیر ہوا ۔

الحمد للّٰہ اوّلاً و آخرًا

والصلوٰۃ والسلام محمد و آلہ دائمًا سرمدًا

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اِدارہ اِمامیہ قِرأت کالج

سرٹیفکیٹ تصحیح

میں نے قرآنِ پاک (تفسیر نمونہ جلد ۱۵)
کے اس نسخہ کو حرف بحرف بغور پڑھا میں
تصدیق کرتا ہوں کہ متن میں کوئی اعرابی
یا لفظی غلطی نہیں ہے۔

وَاللہ اعلم بالصواب

حافظ محمد طفیل (سلطان الافاضل)

مدرس / مینیجر

امامیہ قرأت کالج

اندرون موچی دروازہ ۔ لاہور

Marfat.com